دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
مئی 2017
نگران اعلیٰ
معراج رسول
MAY 2017

محترم قارئین

اگر آپ کو ہماری یہ کتاب اچھی لگے تو ہماری حوصلہ افزائی کے لیے

Google پر جا کر **Urdu Novels** سرچ کر کے ہماری ویب سائٹ

www.urdusoftbooks.com کو ایک مرتبہ وِزٹ کر لیں

اگر آپ کو ہماری ویب سائٹ Google کے پہلے پیج پر نظر نہ آئے تو

دوسرے یا تیسرے پیج پر چیک کر لیں،

وہاں آپ کو مزید اچھی کُتب ڈاؤن لوڈ کرنے کو ملیں گی۔ شُکریہ

Page 3 of about 5,540,000 results (0.91 seconds)

Urdu Novels Archives - Download Free Pdf Books
pdfbooksfree.pk/category/urdu-novels/
Ambar Naag Maira Maut Ka Taaqub Ki Wapsi series contains 100 complete **novels**. All **novels** of this series promote amazing historical fiction stories for [...].

Urdu Novels | Urdu Books and Urdu Novels - Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com/2017/03/urdu-novels.html
4 days ago - **Urdu novels** are one of the most favorite entertainment of indo-Pak culture. Urdu speaking people in all around the world are very likely read ...

Download urdu novels free | Tune.pk
https://tune.pk/video/2391074/download-urdu-novels-free
http://urdunovels.webs.com Free download **urdu novels** for free of various writers.urdu romanvi nivels, tareekhi novels, islamic book, historic novels, jasoosi ...

Urdu Novels - OLX.com.pk
https://www.olx.com.pk/all-results/q-urdu-novels/
English dictionary,english **novel** & **urdu** lughat feroz sons. Books & Magazines » Education & Training Karachi. Rs 600. 7 Apr ...

جلد 47 • شمارہ 05 • مئی 2017 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •

خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: (021)35895313 فیکس (021)35802551 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

معزز قارئین آپ سے التماس ہے کہ ہم www.urdusoftbooks.com پر آپ حضرات کے لیے مسلسل اچھی کُتب فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جس کے لیے وقت اور رقم دونوں صرف ہوتے ہیں جس کی غرض سے ہماری اِس ویب سائٹ کُچھ سپانسر اشتہارات لگائے گئے ہیں جب ویب سائٹ وزٹرز اُن اشتہارات میں سے کسی اشتہار پر کلک کرتے ہیں تو ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن حاصل ہوتی ہے، یہ آمدن ویب سائٹ کے اخراجات کو برداشت کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے اس لیے آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے Google Chrome یا Mozilla Firefox کی Adblocker Extension کو Pause کر دیں یا صرف ہماری ویب سائٹ کے لیے Pause کر دیں۔ نیچے نظر آنے والی تصویر میں دکھایا گیا ہے کہ Adblocker کے Pause ہونے یا انسٹال نہ ہونے کی صورت میں اشتہارات Green Box والی جگہ پر ظاہر ہوں گے۔

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عزیزانِ من...... السلام علیکم......!

مئی کا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ یکم مئی کے مزدوروں کے اس عالمی یادگار دن کی بنیاد یکم مئی 1886ء کو اس وقت پڑی جب شکاگو کے چار لاکھ مزدور 8 گھنٹے یومیہ کام کا مطالبہ لے کر ہڑتال پر گئے۔ اس دن شہر کی دھواں اگلتی تمام چمنیاں ویران اور بے جان تھیں۔ اس وقت جو ہوا سو ہوا مگر وقت اور تاریخ کا پہیا صدیوں بعد بھی ظلم کو بے نقاب کر دیتا ہے۔ یہ الگ بات ہمارے سفاک اور خود غرض پڑوسی نے کبھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ظلم اور بربریت موذی سرکار کا وتیرہ ہی بن گیا ہے۔ کشمیر میں حق رائے دہی کے حصول اور سامراجی تسلط کے خلاف آواز بلند کرنے والے حریت پسندوں کو لاٹھیوں اور گولیوں سے مارا جا رہا ہے، کشمیری نوجوانوں کے خون سے پوری وادی لہولہان ہے۔ گئو رکھشا کے نام پر متعصب ہندو حیلے بہانوں سے جس طرح مسلمانوں پر ستم ڈھا رہے ہیں، ان کا خون بہا رہے ہیں، اس کے خلاف خود سنجیدہ ہندو میڈیا اور ہندو رہنما چیخ اٹھے ہیں۔ ہندو سماج میں ذات پات کا امتیاز نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔ کوئی شودر یا کھتری آج کے دور میں بھی برہمن کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتا۔ ان کو آج بھی نیچ کہا اور برتا جاتا ہے...... مگر موذی میاں گونگے، بہرے اور اندھے بنے ہوئے ہیں، ہمسایوں کے ساتھ سازشی رویہ ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ چین اُن کی نظروں میں کھٹکتا ہے، افغانستان کو سرمایہ کاری کی کھنک سے رام کرنے کے حربے جاری ہیں، نیپال کی سرحد میں گھس کر دو والوں نے ایک ریٹائرڈ پاکستانی کرنل کو اٹھا لیا ہے، پاکستان میں تخریب کار اور برسرکار سرکاری فوجی افسر کل بھوشن رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔ پہلے اسے اپنانے سے کھلا انکار تھا، اسے کورٹ مارشل کے مروجہ قاعدے سے گزار کر سزائے موت سنائی گئی تو یکایک اسے دیش کا بیٹا بنا لیا گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس وسیع جنوبی مملکت کا کیا بنے گا۔ سب بدل سکتا ہے مگر پڑوس نہیں بدل سکتا۔ یہ ہماری مجبوری ہے۔ موذی سرکار کی بڑھتی ہوئی چیرہ دستیوں کے خلاف عالمی اور ہنگامی پیمانے پر سیاسی اور سفارتی محاذ پر کی جانے والی بھرپور کوششیں ہی شاید اس بدطینت پڑوسی کو لگام دے سکیں۔ یہ بات ہم سے زیادہ ہمارے حکمران اور ہنرمند سفارت کار جانتے ہوں گے اور یقیناً ان پہلوؤں پر سرگرمی سے کام ہو رہا ہوگا۔ آنے والے دنوں میں بہتری کی امید کے ساتھ اب بات وہاں کی جہاں بات سے بات نکلتی ہے۔

لیلیٰ کوثر لاشاری کی ملتان سے سرشاری ''جاسوسی کا تازہ شمارہ ملتان کی ایک گرم دوپہر کو ملا۔ سرورق پہ نظر پڑی خوبصورت لڑکی کی خوف صورتی سے ڈر کر بھاگتے ہوئے بندے پر ہنستے ہوئے انسان کو دیکھا۔ جب اس کی اپنی نظر ٹائٹل گرل پر پڑے گی تو اس کا اپنا حال کیا ہوگا۔ لگتا ہے ڈاکر انکل بوڑھے ہو گئے ہیں۔ چینی نکتہ چینی میں گئی وہاں مجھے چائے بنانے کے لیے چینی تو نہ ملی پر نکتے ہی نکتے ملے...... مدیر انکل یہ دکھ سب کا سانجھا ہے معاشرہ الجھ سا گیا۔ ان المیوں سے۔ روز ایک طرز کی خبروں سے جی میلا سا ہونے لگتا ہے۔ یہ کھلاڑی۔ کھیل کو اچھا خاصا بزنس بنا دیا ہے۔ بس ہم دعا ہی کر سکتے ہیں کہ اللہ ہمارے ملک کو ان تمام تر برائیوں سے پاک کر دے آمین۔ پہلی پوزیشن پر براجمان جناب محمد قدرت اللہ نیازی کا تبصرہ پڑھا۔ سرورق کو کیا خوبی سے بیان کیا واہ۔ دوسری پوزیشن جناب بے سری بانسری عرف افتخار حسین اعوان نے سنبھال رکھی تھی لکھنے کے انداز سے محسوس ہوا کہ جناب کاشف زبیر کے فین ہیں پر آخیر میں احمد اقبال کے شکاری کا ذکر کرتے ہوئے ان کے خاص فین لگے۔ تیسری پوزیشن ساگر نے لی۔ پرویز لنگاہ لفاظی واقعی مزے کی تھی۔ لنگاہ بھائی ذرا آسان لفظوں کا استعمال کیا کریں تاکہ ہر بندہ کو سمجھ آسکے جواد رشید صاحب اس تبصرہ نگاری پر ہمیں بھی مظہر سلیم ہاشمی بھائی جان نے لگایا اللہ ہاشمی بھائی جان کا درجہ بلند فرمائے آمین اور جب میں نے ہوش سنبھالا تو ابو اور بھائی کو جاسوسی ڈائجسٹ پڑھتے دیکھا۔ مظفر گڑھ سے شعیب عباس کو ادارے کی طرح ہم بھی خوش آمدید کہتے ہیں۔ بھائی یونہی لکھتے رہو تبصرے۔ سعدیہ باجی آپ کا میرے تبصرے کا بلیک لسٹ ہونے پہ افسوس اچھا لگا۔ بلیک لسٹ ہونے کا بھی اپنا مزہ ہے خیر آپ کا تبصرہ اچھا ہے۔ باقی سب کو مبارک تبصرے کی اشاعت پہ خاص طور پر اعتزاز اینڈ زریاب وصلیٰ ایمان نے، بیمل، بصیر خواجہ، ادریس، اقبال اور بشیر بھائی کو کہانیوں میں انگارے سے آغاز کیا جس میں ہر طرف قتل و غارت مچی ہوئی تھی۔ رائے زل اور ایجنسی کی سفاکیت نے خون کے آنسو رلا دیے۔ ریان فردوس کی بزدلی نے اس کی جان لے لی۔ شاہ زیب اپنے ساتھیوں کے ساتھ مشکلات کا شکار نظر آ رہا ہے۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ آوارہ گرد کی اس قسط میں خاصی پیش رفت ہوئی ہے۔ شہزاد جہاں دشمنوں کی جڑیں کمزور کر رہا ہے، وہیں اپنے ساتھیوں کی حفاظت کا انتظام بھی کر رہا ہے۔ سوشیلا کی خیریت کے ساتھ واپسی سے خوشی محسوس ہوئی۔ پہلا رنگ فاروق انجم صاحب کی تحریر تھی۔ قتل کے اس کیس نے کافی الجھائے رکھا۔ ندا نے دولت کی ہوس میں خونی رشتوں کی پہچان بھلا دی اور خود بھی پکڑی گئی۔ قاتل کا کردار غیر متوقع طور پر کہانی میں آیا۔ اولین

صفحات پر تلاشِ ماضی شاندار تحریر تھی۔ برنیڈا اور جارڈن نے ماں باپ کے قاتلوں کو بے نقاب کیا اور غداری کا داغ بھی دھو دیا۔ رچرڈ کی ذہانت نے بہت متاثر کیا۔ چھوٹی کہانیوں میں زویا اعجاز کی بھرم جدید معاشرے کی برائیاں اجاگر کرتی خوبصورت تحریر تھی۔ شاہنواز کی ایک نیکی نے اس کا گھر بچالیا۔ ثمرین کے کردار نے آج کے لوگوں کی عکاسی کی۔ حادثہ میں مجرموں نے زبردست پلاننگ کی مگر ہاتھ کچھ نہ آیا۔ ہوس زر نے سب کی جان لی تو پلان کا ماسٹر مائنڈ بھی ناکام ٹھہرا۔ باقی ترجمہ شدہ کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔ کبیر عباسی کی کہانی آخری خواہش کافی دلکش لگی۔ کہانی پر رائٹر کی گرفت اور لفظوں کا چناؤ مناسب تھا۔ حقیقی جذبوں پر مبنی عام انسان کی عجب کتھا۔ یہ ایک عجب کہانی ہے جس میں ہیرو نوید احمد نہ ہیرو ہے نہ ولن وہ ایک عام انسان ہے جس میں انسانی خامیوں کے ساتھ اچھی صفات بھی موجود ہیں۔ کہانی پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم سے کسی عام انسان کی زندگی سامنے آگئی ہو۔ اسے مختلف کہانی کہوں گی۔ نوید کا اپنی بیوی نشا پر اندھا اعتماد اسے آسمان سے گرا دیتا ہے جس کے بعد وہ اٹھنے کی سکت کے باوجود اٹھنا نہیں چاہتا۔ نشا نہ صرف نوید کو برباد کرتی ہے بلکہ اس کے والدین کو موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔ مجموعی طور پر کہانی زبردست رہی بس ہیرو کا اپنی بیوی پر اندھا اعتماد اور اس کی بے وفائی کے باوجود اس پر مرنا پسند نہیں آیا۔

کراچی سے ڈاکٹر سبا ارشد کی شمولیت ”مسلسل تیسرے دن اسٹال پر چکر لگانے کے بعد کس طرح جاسوسی وصول کیا۔ یہ کہانی پھر سہی۔ اللہ اللہ کر کے ایک چھٹی ملی تو پڑھنا شروع کیا۔ سب سے پہلے انگارے ہی پڑھی۔ اب اس کی تعریف میں کیا کہیں۔ قسطینا بی بی کا فوت ہونے کا کوئی ارادہ نہیں ہے، جبکہ سیفی میں سیف خان کی جھلک محسوس ہوئی جب جب کہانی میں اس کا ذکر ہوتا چشم تصور میں ہم سیف خان لے آتے۔ کبڈی کی جھپیاں ڈالتے، کرتہ شلوار پہنے، ولسی ککڑوں کی تلاش میں سرگرداں، تاجور کے سپنے دیکھتے سیف خان کی حالت سے محظوظ ہوئے۔ پھر ہم آگئے کبیر عباسی کی آخری خواہش پر۔ میرا مطلب ہے کہانی پر۔ اس دفعہ کبیر نے کافی منفرد انداز اختیار کیا۔ روایتی انداز سے ہٹ کر اسٹائل نے مزہ دیا۔ ہم آنکھیں سکیڑ سکیڑ کر غلطیاں تلاش کرتے رہے لیکن کافی مشکل پیش آئی۔ ان کی ہر تازہ کہانی پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ دن بدن منجھے ہوئے رائٹر بنتے جارہے ہیں۔ بس دو باتیں سمجھ نہیں آئیں۔ نہیں، نہیں غصہ نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس میں میری کم عقلی ہے ورنہ آپ نے پوری وضاحت کی ہوگی۔ لیکن پھر بتادیں۔ یہ جو بے ہوش کرنے والی گیس ہوتی ہے یہ صرف ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے بندے پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ڈرائیور محفوظ رہتا ہے؟ شاید وہ سانس روک لیتا ہے۔ ایک سیکرٹ ایجنٹ اتنی آسانی سے حسن کے جال میں آجائے۔ میں نے تو عام انسانوں کو بھی اتنا بونگا نہیں پایا کہ وہ بغیر چھان بین کے شادی کریں۔ البتہ یہ سبق ضرور ذہن رکھا کہ عورت کے حسن میں بڑی طاقت ہوتی ہے عقلمند سے عقلمند بندے کو بھی کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ کیا یہ درست ہے؟ زویا اعجاز کی بھرم اس ماہ جاسوسی کی زینت ہے۔ مختصر کہانی کی ابتدا کی تو دھڑکا لگا رہا کہ پھر کوئی تلخ سچائی سسکنے پر مجبور کرے گی لیکن شکر ہے انجام خوشگوار رہا۔ ثمرین کا کردار خلاف توقع رہا۔ ہلکی پھلکی کہانی ایک عمدہ سبق رکھتی ہے۔ ہر انسان کی ذات خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہوتی ہے اور رب کی ذات ایک موقع ضرور دیتی ہے۔ کہتے ہیں اگر اللہ کسی کی عیب پوشی کرے تو انسانوں کو بھی دوسروں کے عیب چھپانے چاہئیں ہاں کوئی ایک بار میں نہ سدھرے تو الگ بات۔ زویا اعجاز ایک اچھا اضافہ ہیں جن کی کہانیوں کی نمایاں خوبی سبق آموز ہونا ہے ان کے لیے نیک تمنائیں۔ باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں شاید اگلی صدی تک پڑھ ہی لوں۔ (ارے کیا غضب کرتی ہیں، ہم اتنا انتظار نہیں کریں گے)

بہاولپور سے مومنہ کشف کی نشست۔ ”جاسوسی کا نیا شمارہ اس بار بھائی نے ٹائم پر لادیا اس لیے میں ایک بار پھر سے چیں چیں نکتہ چینی میں گل کھلانے آگئی ہوں۔ ٹائٹل بڑے ہی مزے کا تھا۔ گنجے انکل تو ایسے دیوار میں گھس رہے تھے جیسے کیلے کے چھلکے سے پھسلے ہوں۔ لڑکی بلڑی کم اور پرکٹی کبوتری زیادہ لگ رہی تھی، زرافے جیسی تو اس کی گردن تھی۔ ڈاکر انکل سے کہیں کہ میری جیسی معصوم لڑکیاں پینٹ کیا کریں۔ ساتھ والے انکل کو گلا پھاڑ کر گانے پر لگتا ہے کسی نے پتھر دے مارا ہے لیکن پھر بھی وہ اپنی سنگنگ کے شوق سے باز نہیں آرہے ہیں۔ فہرست میں اپنے پسندیدہ رائٹر امجد رئیس کو دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ لیکن پہلے بات کرتے ہیں چیں نکتہ چینی کی۔ جہاں کڑوی باتیں چینی میں گھول کر پیش کی جاتی ہیں۔ پرویز لنگاہ انکل میں ڈانڈیا تو کھیلوں گی پر اس سے پہلے آپ کے سر پر اگر طبلے کی پریکٹس ہو جائے تو کیا ہی بات ہے؟ ویسے تبصرہ بڑے ہی مزے کا کرتے ہیں آپ، جی کرتا ہے آپ پر پھول نچھاور کروں پندرہ بیس گملوں کے ساتھ۔ جواد رشید آپ میری معصومیت سے کیوں جل رہے ہیں؟ پچھلے ماہ وزیر دیسیوں بھی خوامخواہ میزائل چلا رہے تھے۔ ایمانے کا کیوٹ کیوٹ سا تبصرہ بڑے ہی مزے کا تھا۔ لگتا تھا بیوٹی پارلر میں تیار کرایا تھا۔ احسان سحر عرف دکھی آتما تو پتا نہیں کس کس سے جل کر کباب ہو رہے تھے، ان کو مفت مشورہ ہے میری طرح خوش رہا کریں۔ ممکنو کے وصلی برادران مجھ جیسی معصوم، کم عمر اور شوخ دوشیزہ کو آنٹی کہتے ہوئے کوئی پنکھا بھی نہیں گرا آپ پر۔ میں نے شکایت کر دی نا تو آپ کو آپ کی بیگم سے بھی مار پڑ جانی ہے اس لیے دھیان سے۔ سعدیہ قادری اور شعیب عباس کے تبصرے پسند آئے جبکہ جمیل چودھری کا بالکل بھی نہیں۔ اب اگلے ماہ میرے تبصرے کی برائی نہ اسٹارٹ کر دینا۔ انگارے تو اس بار اتنے مزے کی تھی کہ میں نے سانس روک کر پڑھی، وہ تو چکر آگیا تھا تو سانس لیا ورنہ شاہی کے ساتھ میری جان ہی نکل جانی تھی۔ قسطینا اب اچھی ہیروئن بن گئی ہے بس تاجور کو بار بار یاد کرنا اچھا نہیں لگتا۔ آوارہ گرد کی یہ قسط بڑی

بورنگ سی رہی۔ بالکل بھی اچھی نہیں لگی۔ امجد رئیس کا شاہکار بہت اچھا لگا۔ برنیڈا اور جارڈن بڑے اچھے بہن بھائی تھے۔ پیرس تو میرا ڈریم سٹی ہے، کبھی نہ کبھی تو اُدھر جاؤں گی۔ انگلش کہانیوں میں سب سے زیادہ گمشدہ تصویر پسند آئی۔ جولیس اور اس کے ٹائی پن' اسسٹنٹ آرچی کی کہانیاں بڑے ہی مزے کی ہوتی ہیں۔ پہلے بھی اس سیریز کی ایک کہانی پڑھی تھی جو بہت اچھی لگی تھی۔ ان کو ہر ماہ لایا کریں۔ اقبال کاظمی کی حادثہ پڑھی تو عجیب عجیب سے ناموں کی پہلے تو سمجھ ہی نہیں لگی۔ وہ تو مجھے معصوم کو بھائی نے بتایا کہ یہ ایران کی اسٹوری ہے تو کچھ عقل آئی۔ بڑی ہی مزے کی اسٹوری تھی، ایسا لگا جیسے کوئی انگلش مووی دیکھ لی ہو۔ رنگوں کی دنیا میں واپس آئینہ بہت ہی اچھی رہی۔ میں تو چوکیدار کو ہی قاتل سمجھتی رہی لیکن وہ تو اس کا بیٹا نکلا۔ کبیر عباسی کی پہلی کہانی نے کاشف زبیر کی یاد دلائی تھی لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے خود کو سلیم فاروقی کا جان نشین مان لیا ہے۔ ان کی طرح مزید ار اسٹارٹ لیا اور آخر میں پٹرول مک گیا۔ آخری خواہش کی شروعات بہت اچھی تھی پر اینڈ بڑا بور لگا سارا ہا۔ اور یہ بات بھی سمجھ نہیں آئی کہ یہ نوید احمد جیسے بے وقوف کو انٹیلی جنس میں اتنا اہم عہدہ کس نے دے دیا؟ خیر جی یہ تو تھا میرا تبصرہ امید ہے آپ کو پسند آئے گا۔

ساہیوال سے عاصم جٹ کے سوال "پہلی بار تبصرہ بھیج رہا ہوں، امید ہے کہ حوصلہ افزائی ہوگی (خوش آمدید)۔ میں جاسوسی کا عرصہ دراز سے مستقل قاری ہوں (تو خاموش کیوں تھے؟) انگارے اور آوارہ گرد بہترین سلسلے ہیں اور میں ان کی وجہ سے آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ نا مساعد حالات میں جینے کا ڈھنگ سکھانے والی یہ کہانیاں اپنی مثال آپ ہیں۔ طاہر جاوید مغل صاحب اور ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کا میں بہت بڑا مداح ہوں۔ اگر نئی قسط وار کہانی محمود احمد مودی یا غلام قادر صاحب کی ہو تو کیا ہی بات ہے۔ ویسے یہ دونوں اصحاب کدھر غائب ہیں؟ (ایک کارزار سیاست میں ہیں دوسری صحافت کی دنیا میں مصروف ہیں) پلیز میری تجویز پر غور ضرور کیجیے گا۔ سرورق کے دونوں رنگ بہت اعلیٰ معیار کے تھے۔ نئے رائٹرز اچھا لکھ رہے ہیں۔ فاروق انجم کیا وہی ہیں جو پہلے اخبار جہاں میں لکھتے رہے ہیں؟ (جی۔ اب بھی لکھتے ہیں)۔"

کراچی سے توصیف علی کی روداد سفر "میں بس میں بیٹھا گاڑی چلنے کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک اخبار فروش اخبارات اور رسالے اٹھائے بس میں چڑھ آیا۔ کراچی سے راولپنڈی تک کا سفر کافی طویل تھا، میں نے سوچا کچھ اخبارات ہی خرید لوں تاکہ جب بس میں لگے ٹی وی اور موبائل سے بوریت ہونے لگے تو میرے پاس وقت گزارنے کی ایک مزید چوائس بھی موجود ہو۔ اخبار خریدتے وقت اچانک میری نظر جاسوسی ڈائجسٹ پر پڑی تو میرے ذہن میں یادوں کی ایک ریل سی چلنے لگی۔ آہا، وہ بھی کیا دن تھے جب ہم نکتہ چیں تھے۔ مطلب چینی نکتہ چینی میں اپنے تبصروں کے ذریعے جہاں چینی بکھیرا کرتے تھے وہیں کہانیوں اور تبصرہ نگاروں پر نکتہ چینی بھی اپنا فرض سمجھتے تھے۔ پھر وقت نے ایسی دھول اڑائی کہ ڈائجسٹ پڑھنا اور تبصرے کرنا بھولی بسری یاد بن کے رہ گیا۔ ہم ماضی کی ان یادوں میں ایسا کھوئے کہ اخبار والے کو باقاعدہ ہماری آنکھوں کے سامنے اخبار لہرا کے ہمیں اپنی طرف متوجہ کرنا پڑا۔ ہم نے کھسیاتے ہوئے اس سے جاسوسی ڈائجسٹ کی ڈیمانڈ کر دی۔ ڈائجسٹ ہمارے ہاتھ میں آتے ہی بھولی بسری یادیں ایک بار پھر ہمارے ذہن کے نہاں خانوں سے جھانکنے لگیں۔ کوئی وقت تھا کہ ڈائجسٹ لے کے اسٹال پر ہی ہم قسط وار کہانی کھول کے بیٹھ جاتے تھے۔ اس وقت آتش فشاں اور مداری چلا کرتی تھیں۔ ہر قسط کا اختتام ایسے سنسنی خیز موڑ پر ہوا کرتا تھا کہ مہینے کا انتظار دو بھر ہو جاتا تھا۔ ٹائٹل دیکھتے ہی ہمیں یقین ہو گیا کہ یہ ٹائٹل بھی ذاکر حسین نے ہی بنایا ہے۔ ان کے ٹائٹل پر دستخط دیکھ کے اپنے اندازے کی درستی نے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ کلرز بالوں والی حسینہ واقعی خوبصورت تھی۔ ٹانگوں سے ٹکراتا سیاہ پوش شخص جاسوسیت لیے ہوئے تھا تو ساتھ ایک ہینڈسم سازشی چہرہ لیے شخص جانے قہقہہ لگا رہا تھا یا تکلیف کے باعث چلا رہا تھا۔ بہرحال ذاکر حسین کو داد دینا بنتی ہے کہ اتنے طویل عرصے سے وہ جاسوسی کے سرورق پر اپنے رنگ بکھیر رہے ہیں۔ اللہ پاک ان کی عمر دراز کرے۔ فہرست میں کچھ پرانے نام اور کچھ نئے نام نظر آئے۔ پہلا رنگ پڑھ کر افسوس ہوا۔ انتہائی گھسا پٹا پلاٹ اتنا بھی برا نہ لگتا اگر مصنف کا اندازِ تحریر پختہ ہوتا۔ کہانی میں کوئی دلچسپ اور مضبوط کردار ہوتا جیسا ماضی میں ہوتا تھا مگر افسوس کہانی میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی۔ دوسرے رنگ نے پہلے رنگ کی تلافی کر دی۔ کہانی آغاز سے اختتام تک غیر روایتی رہی۔ اس میں تجسس بھی تھا اور جدیدیت کے تمام ہتھیاروں سے بھی لیس تھی۔ نتاشا کا کردار انتہائی پاورفل تھا۔ نوید کا کردار بہت سے پہلو لیے ہوئے تھا جس کی وجہ سے کہانی کا مزہ دوبالا ہو گیا۔ اولین صفحات پر ترجمہ تحریر دیکھ کے بہت خوشی ہوئی۔ جیمز ہیڈلے اور اسٹینلے گارڈنر کی کہانیوں کے ترجمے جب اثر نعمانی کیا کرتے تھے تو ہم سب سے شوق سے وہی پڑھتے تھے۔ کہانی یہ بھی مزے کی تھی مگر پرانی تھی۔ اگر آج کے دور کی ترجمہ کہانی ہوتی تو زیادہ مزہ آتا۔ ان تین تحریروں کے مطالعے سے ہمارا اچھا خاصا سفر کٹ گیا پھر اچانک خیال آیا کہ کیوں نا تبصرہ لکھ کے پرانی یادیں تازہ کر لی جائیں۔ کاغذ قلم تو میسر تھا نہیں موبائل پر ہی ٹائپ کر کے آپ کو میل کر رہا ہوں۔ امید ہے شائع ہو جائے گا۔

اعتزاز احمد زریاب وصلی کی تاندلیانوالہ سے فرمائش "اپریل کا شمارہ نتیجے کے دن یعنی اکتیس مارچ کو ملا۔ ٹائٹل عجیب تھا۔ جاپانی حسینہ متاثر کرنے میں ناکام رہی۔ ساتھ میں منہ پر خون لگائے بھائی صاحب کی آخر تک سمجھ نہیں آئی کہ قہقہے لگا رہے ہیں یا چیخ رہے ہیں۔ دوسرے بھائی صاحب گرتی ہوئی دیوار کو ایک دھکا اور دے رہے تھے۔ اداریہ تلخ حقائق پر مبنی تھا۔ واقعی ہم کڑھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ چینی نکتہ چینی کے تخت پر قدرت اللہ نیازی براجمان تھے، مبارکباد۔ افتخار حسین اعوان خوبصورت تبصرے کے ساتھ محفل کی جان بنے رہے۔

احسان سحر کے تبصرے کی بوریت کو پرویز لنگاہ کے تبصرے نے دور کیا۔ بہت خوب صورت الفاظ کا چناؤ کیا، ویلڈن لنگاہ بھائی۔ سعدیہ قادری شاندار تبصرے کے ساتھ حاضر تھیں، یاد کرنے کا شکریہ۔ سیدہ ایمانے زارا شاہ کا شاہانہ انداز اچھا لگا۔ شہر بے مثال فیصل آباد سے بیمل چودھری نے اچھی انٹری ماری۔ باقی تبصروں میں ادریس احمد خان اور رانا بشیر احمد ایاز کے تبصرہ پسند آئے۔ کہانیوں میں مغل اعظم کی انگارے سے آغاز کیا جو الیف سولہ بنی ہوئی تھی۔ عزت مآب کی موت کا کچھ خاص افسوس نہیں ہوا جبکہ چیف گیرٹ کا اتنی جلدی مرجانا ہضم نہیں ہوا۔ امید ہے سجاول جلد ٹرانس سے باہر آجائے گا۔ شاہ زیب کے کندھے نے رستم سیال کی ٹانگ یاد دلا دی۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ آوارہ گرد میں شہزی کا کا ڈارک کیسل میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ لگتا ہے اگلی قسط میں بلراج اور ایڈوانی وغیرہ سے جان چھوٹ جائے گی۔ ویسے کہانی میں ہر دوسری لڑکی شہزی کی معصومیت کا امتحان لیتی ہے مگر ہمارا شیر ابھی تک تو ثابت قدم ہے۔ اب کہانی کو کلی منجارین کی قید سے آزادی مل جائے تو مزہ آجائے۔ سرورق کے دونوں رنگ اس بار متاثر نہ کر سکے۔ پہلے رنگ میں فاروق انجم قتل کے ایک کیس کے ساتھ حاضر تھے۔ آغاز سے ہی ندا پر شک ہو گیا تھا جو ٹھیک نکلا۔ قاتل کا کردار زبردستی کہانی میں گھس آیا۔ آخر تک یہ سمجھ نہیں آئی سیٹھ حاکم اچھا ہے یا برا۔ دوسرا رنگ آخری خواہش کبیر عباسی کی تحریر تھی۔ کمزور پلاٹ اور مصنف کی کمزور گرفت نے کہانی کو بورنگ بنا دیا۔ ہیرو صاحب انتہائی جذباتی اور تیز رفتار واقع ہوئے۔ سمجھ نہیں آئی کہ اسے انٹیلی جنس جیسے حساس ادارے میں کس بیوقوف نے سلیکٹ کیا۔ کہانی پڑھتے ہوئے بار بار احساس ہوا کہ یہ کبیر عباسی کے معیار کی نہیں۔ زویا اعجاز کی بھرم نے چھوٹی کہانیوں کا بھرم رکھ لیا۔ تحریر کاٹ دار تھی۔ مصنفہ نے ہمیشہ کی طرح معاشرے کا ایک حساس موضوع چنا اور اس کے ساتھ پورا انصاف کیا۔ ثمرین کے کردار نے چونکا دیا۔ منظر امام کی تحریر کا نام پتھر کے بجائے ماموں کی ڈائری ہونا چاہیے تھا۔ اولین صفحات پر امجد رئیس کی ترجمہ شدہ تحریر نے دل موہ لیا۔ تلاش ماضی بلاشبہ اسٹوری آف دا منتھ ٹھہری۔ سطر سطر رنگ بدلتی تحریر میں برنیڈا اور رچرڈ کے کرداروں نے چار چاند لگائے تو جارڈن اور ایمل فوش بھی کسی طرح کم نہیں تھے۔ سسپنس اور تھرل سے بھرپور تحریر جس کی تعریف کے لیے الفاظ کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ باقی کہانیوں میں اقبال کاظمی کی حادثہ ٹاپ پر رہی۔ دولت کے لالچ نے کئی لوگوں کی جان لی مگر کسی کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ دشمن اور بدنصیب نے بور کیا۔ مجموعی طور پر اپریل کا شمارہ درمیانے درجے کا تھا۔ کافی دنوں سے احمد اقبال صاحب کی تحریر کا انتظار ہے۔"

لاہور سے انیلہ ظفر کی صاف اور کھری باتیں ”اک طویل عرصے کے بعد آج پھر آپ کی محفل کو رونق بخشنے کا خیال آیا۔ انیلہ بھٹی سے انیلہ ظفر بننے کا سفر طے کیا۔ مگر ان رسالوں سے رابطہ ختم تو کیا کم بھی نہیں ہو سکا۔ کئی بار دل چاہا کہ اس جاسوسی پر بات کروں جو پہلے کی طرح پیارا لگتا ہے پر دلچسپ کم ہو گیا ہے۔ مگر بس سستی آڑے آتی رہی۔ آج ہمت کر کے قلم اٹھا ہی لیا ہے تو بتا دوں کہ میں ذہنی طور پر اس دور میں پہنچ گئی ہوں جب بے چینی سے اس کا انتظار ہوتا تھا۔ پڑھنے پر بھی پابندی تھی اس کے باوجود ایک ہی دن میں پڑھ کر تبصرہ بھی بھیجا جاتا تھا۔ اب تو دنوں بعد ختم کیا جاتا اور تبصرہ بھی رہ ہی جاتا۔ خیر دو تاریخ کو فیس بک سے اطلاع ملی کہ جاسوسی آچکا ہے تو اس بار فوراً منگوایا گیا اور فوراً ہی ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ ٹائٹل مزے کا ہے اور بہت عرصہ بعد واقعی ایک خوبصورت حسینہ ٹائٹل کا حصہ بنی دیکھی۔ خوبصورت آنکھوں اور ہونٹوں کی مالک حسینہ نے بالوں پر پتا نہیں ظلم کیوں ڈھایا؟ میرا پسندیدہ شیڈ پر پل خوب جچ رہا تھا۔ منفی کرخت کے دو ممبران موجود تھے اور دونوں ہی خوف، دہشت اور خون خرابہ کا بھرپور تاثر دے رہے تھے۔ پھر انٹری ہوئی اس محفل میں جس کا ایک بھرپور حصہ ہم بھی رہے ہیں۔ سرفہرست قدرت اللہ نیازی تھے۔ اور ان کا تبصرہ واقعی اچھا ہے۔ افتخار اعوان کشمیر کی ٹھنڈی فضاؤں سے مخاطب ہیں اور مزے کی باتیں کر رہے ہیں۔ پرویز لانگاہ، سعدیہ قادری، اعتزاز اور زریاب وصلی سب کے تبصرے مزیدار اور اپنے لگے۔ مظفر گڑھ سے شعیب عباس، سید شکیل کاظمی کو تلاش کرتے نظر آئے۔ ہمارے ساتھ فیس بک گروپ میں کو ایڈمن ہونے کے باوجود انہیں ڈھونڈنا ہی پڑتا ہے۔ وڈے شاہ جی جو ہوئے۔ محفل میں بس اس چیز نے حیران کیا کہ اتنا عرصہ میرے خطوط شامل نہ ہونے کے باوجود یہ محفل اتنی دلچسپ کیسے ہے؟ (تعجب ہمیں بھی ہے)۔ پس آئینہ سرورق کا پہلا رنگ۔ یہ ایک سادہ سی کہانی تھی۔ گھر کے سربراہ کے قتل سے شروع ہونے والی یہ کہانی دولت کے اسی لالچ کے بارے میں تھی جو رشتوں کا خون کرتا اور انسان کو انسانی سطح سے گرانے میں ذرا دیر نہیں لگاتا۔ اک تیز رفتار کہانی کچھ پہلو تشنہ چھوڑ گئی۔ قاتل کی کوئی انٹری ہی نہیں تھی تو کوئی اندازہ کیسے لگاتے؟ ندا اور چوکیدار شروع ہی سے مشکوک تھے اور دونوں ہی مجرم نکلے۔ احمر بے چارہ اپنی اچھائی کے ہاتھوں پھنس گیا۔ ایک عقلمند پولیس والے نے اسے بچا لیا۔ مجھے لگتا ہے رائٹر اس سے زیادہ بہتر لکھ سکتے تھے۔ میں اسے ان کی کمزور کہانی ہی کہوں گی۔ دوسرا رنگ آخری خواہش کبیر عباسی کی اب تک تمام تحریروں میں سب سے کمزور تھی۔ مجھے تو ایسا بزدل اور نالائق افسر ہضم ہی نہیں ہوا۔ شادی سے پہلے تو ہم جیسی عوام بھی اک حد تک تحقیقات کرواتی ہے اور نوید نے اتنے اہم عہدے پر فائز ہونے کے باوجود دو چار سرسری ملاقاتوں پر ہی شادی کا فیصلہ کر لیا۔ وہ لڑکی اس کی ناک تلے اتنے بڑے بڑے گل کھلاتی رہی اور اسے کبھی شک تک نہیں ہوا۔ پھر وہ حساس ادارے کے تین اور بندوں کو بیوقوف بناتی ہے اور کسی کو کچھ پتا نہیں چلتا۔ نوید کا کردار بے حد کمزور تھا جو نہ تو آرمی افسر کی ڈیمانڈ پوری کر سکا اور نہ ہی مشرقی شوہر کے پیمانے پر پورا اتر سکا۔ پاکستانی شوہر اتنے اعلیٰ ظرف نہیں ہوتے کہ ایسی تصاویر ملنے پر بیوی سے کچھ بات نہ کریں اور بندوں کو قتل کرنے چل دیں۔ تجاہل عارفانہ کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور یہاں تو بات والدین کے قتل تک جا پہنچی۔ نوید ایجنٹ کا شوہر، بیوی کو قتل کرنے کے بعد خودکشی تک جا پہنچا تب بھی

اسے کہانی کی اشاعت کی فکر تھی۔ یہ سب عقل کے کسی پیمانے پر پورا نہیں اترتا۔ یہ رنگ متاثر تو کیا کرتا' الٹا کوفت میں مبتلا کر گیا۔ کمزور ترین کہانی اور کرداروں پر گرفت بھی قائم نہ رہ سکی۔ تیسری کہانی بھرم پڑھی۔ بولڈ ہونے کے باوجود یہ کہانی مجھے پسند آئی۔ معاشی اور معاشرتی مجبوریوں میں جکڑے وہ کردار جو اخلاقی حدود کو کراس کرتے جارہے تھے' نیت کی تباہ کاریوں کا شکار ہورہے تھے۔ اس بات سے آگاہ ہی نہیں۔ شاہنواز ایک مضبوط کردار تھا جو اپنی انا اور ضد کی بدولت اپنی اور تحریم کی زندگی مشکلات سے دوچار کررہا تھا۔ اس نازک ترین وقت میں ثمرین سے کی گئی نیکی کا ثمر بلاشبہ اس کی بیوی کی پاکیزگی ہی بنا تھا۔ عمدہ کہانی۔ اس کا بولڈ ہونا کہانی کی اولین ضرورت تھی۔ اس کہانی کا اینڈ میری توقع کے بالکل برخلاف تھا۔ شاکنگ پر مزے دار۔ امجد رئیس کی کہانی اس بار صرف ایوریج تھی۔ اس موضوع پر ہزار ہا ناول پڑھ لیے ہیں۔ سسپنس بھی ناول میں خاص نہیں تھا۔ میڈیلین کی خوبصورتی اور برینڈا کی بہادری نے مجھے متاثر کیا۔ انگارے میں اس بار بھی تیز رفتاری رہی۔ آقا جان کو پڑے تھپڑ کی گونج اب تک سنائی دے رہی ہے۔ یہ ناول بھی مغل صاحب کی سابقہ تحریروں کی طرح دلچسپی کم نہیں ہونے دیتا۔ بدنصیب میں اگر نیرس ایک دن خودکشی موخر کردیتا اور ڈاک پڑھ لیتا تو۔ لیکن اسی کا نام بدنصیبی ہے۔ اقبال کاظمی کی تحریر چوروں کو پڑ گئے مور کی مکمل عکاس رہی۔ وہ حادثہ واقعی ناقابلِ فراموش تھا۔ آوارہ گرد میں شہزی کی صلاحیتیں ماورائی حد تک بڑھ گئی ہیں جو کبھی کبھی حیران سے زیادہ پریشان کردیتی ہیں۔ بھٹی صاحب! ہتھ ہولا رکھیں پلیز! منظر امام کو ایک عرصہ سے پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔ اس تبصرے کو اگر اشاعت کی سند ملی تو دوبارہ بھی حاضری لگواؤں گی۔ جاتے جاتے ایک تجویز ہے کہ اگر آپ اسی اور نوے کی دہائی کی کہانیاں وقفہ سے دوبارہ شائع کریں تو نئے قارئین کے لیے دلچسپی کا معیار بڑھے گا۔ اس وقت سے موازنہ کیا جائے تو موجودہ شمارے کم ہی متاثر کرتے ہیں۔"

لاہور سے انجم فاروق ساحل کی گیلی گیلی مدہم باتیں "امید ہے آپ اور ادارے کے دیگر احباب بخیر و عافیت ہوں گے۔ اس بار جاسوسی کا ٹائٹل منفرد اور جاذبِ نظر تھا۔ خطوط کی محفل خوب بھری بھری تھی۔ قارئین نے دلچسپی اور انہماک سے تبصرے قلم بند کیے۔ ادارتی گفتگو روح عصر کی عکاسی کرتی ہوئی فکر انگیز اور جھنجوڑ دینے والی تھی۔ "تلاشِ ماضی" سسپنس سے بھرپور معیاری کاوش ہے۔ "حادثہ" سسپنس اور ارتکاز کا اچھا امتزاج ہے۔ اقبال کاظمی اور عبدالقیوم شاد اچھے ادیب اور مترجم تھے۔ مختار آزاد بھی اچھا لکھنے والے تھے لیکن افسوس وہ اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین "پس آئینہ" سسپنس، دلچسپی اور ارتکاز سے بھرپور تھی۔ پتھر اور حماقت بھی خوب تھیں۔ "انگارے" اپنے دامن میں ہنگاموں کو سمیٹے خوب صورتی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ کچھ تحریریں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔ جاسوسی مقبول اور بھرپور جریدہ ہے۔ جو پچھلی دو نسلوں کو متاثر کرتا چلا آرہا ہے۔ ہمارے محلے کے ایک بزرگ اپنی بہن کے پندرہ سالہ برخوردار کو جدہ کچھ رسائل بھیجنا چاہتے تھے۔ مجھ سے مشورہ طلب کیا۔ میں نے جاسوسی ڈائجسٹ، اردو ڈائجسٹ اور تعلیم و تربیت تجویز کیے جو روانہ کردیے گئے ہیں۔"
(ساحل صاحب ناراضی اچھی نہیں۔ پرانی کہانیوں کے ساتھ نیا کھاتا کھلا رہنا چاہیے۔ آپ نئی کہانی ارسال فرمائیں)۔

میانوالی سے احسان سحر کی آخری سحر انگیز بات "جانِ غزل آتا کہاں مجھے لفظوں کا استعمال ہے۔ یہ میری شاعری تیری محبت کا کمال ہے۔ واقعی محبت کا دل میں بس جانا۔ انسان کو بہت کچھ سے بنا دیتا۔ بہت طاقت اور سحر ہے محبت میں۔ جاسوسی ملاوٹ ملنے والے ملتے رہتے ہیں۔ ٹائٹل پر تبصرہ نہیں کروں گا کیونکہ ٹائٹل بھی پاکستانی حالات کی طرح بدصورت سے بدصورت اور بے کشش ہوتے جارہے ہیں۔ خطوط کی دنیا میں سب سے نمایاں اس دفعہ قدرت اللہ نیازی صاحب کا قبضہ رہا۔ دنوں سے مسلسل ٹھنڈ کم ہوتی جارہی ہے۔ جیسے انسانوں کے وجود سے برداشت، افتخار حسین اعوان کا اچھا تبصرہ باقی سب دوستوں کے تبصرے اچھے رہے۔ "تلاشِ ماضی" ایک دلچسپ اور سسپنس سے بھرپور ناول برینڈا اجارڈن اور رچرڈ کی بھاگ دوڑ...... ہیلن کا قاتل ثابت ہونا۔ انتہائی شاندار ناول جس نے اینڈ تک سحر زدہ کیے رکھا۔ "دشمن" ایک نازی جرمن کی کتھا جس نے بہادری سے امریکی یہودیوں کا صفایا کیا۔ بہت خوشی ہوئی۔ کیونکہ چوٹ امریکا کو لگے تو مزہ مجھے آتا ہے۔ "اپنے دامن میں" واقعی کبھی کبھی شاطرانہ منصوبہ اپنے گلے کا طوق بھی بن جاتا ہے۔ پالین کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ "بدنصیب" ایک بدنصیب مصنف کی کہانی جو درخت کو ساری عمر پالتا رہا لیکن پھل کھانے سے محروم رہا۔ غلط فہمی اور جلد بازی بعض اوقات تباہ کردیتی ہیں۔ "انگارے" پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔ بہت مایوس کیا ہے اس ناول نے۔ طاہر صاحب کے تمام سلسلوں سے سب سے بور اور بے ڈھنگا سلسلہ...... جس میں زبردستی کرداروں کو شامل کیا گیا۔ معیار کا ایک بھی نہ تھا اور اب جس سطح پر کہانی ہے...... اُف......! "حادثہ" لالچ میں ڈوبے ہوئے خود غرضوں کا ٹولا۔ آدھے جان سے گئے باقیوں کے ہاتھ بھی کچھ نہ آیا۔ شہپر اور پروفیسر پر زیادہ افسوس ہوا۔ "حماقت" ایک دلچسپ کہانی۔ گوہر نایاب ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایڈرین کا ملنا اور پھر انجانے خوف سے چھٹکارا پانے کی خاطر مجرم بن جانا......! "آوارہ گرد" کی یہ قسط بھی سنسنی سے بھرپور رہی۔ سوشیلا کا جلدی چلنا خطرناک بڑھا گیا۔ اگلی ہنگامہ خیز قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ "گواہی" ننھے زشن کا چور ثابت ہونا دلچسپ صورت حال تھی۔ "گمشدہ تصویر" خاصی الجھی ہوئی تھکا دینے والی تحریر ثابت ہوئی۔ کہیں دلچسپی تو کہیں بوریت ساتھ چلتی رہی۔ ملا جلا ماحول رہا۔ "پتھر" کہانی نے بہت زیادہ متاثر کیا۔ حقیقی رشتے کی بے غرض اور پرخلوص قربانی۔ ایسی محبتوں کا کوئی پیمانہ نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ ہی جاسوسی ختم ہوا۔ آخری بات امجبت سحری میں چھپے گئے آخری

گھونٹ جیسی ہونی چاہیے جس کے بعد دوسرے گھونٹ کی گنجائش نہ ہو۔“

عبدالجبار رومی انصاری کی انکساری ”اپریل کا شمارہ سامنے ہے۔ سرورق پر قہقہے لگاتا مرد کسی گہری چوٹ کے زیرِ اثر پاگل نظر آیا اور ایسے میں دوشیزہ کا چہرہ فل فول بنانے والا تھا اور بلیک کیٹ مرد تو سرے سے مجرم ہی لگ رہا تھا۔ نکتہ چینی کی طرف بڑھتے ہیں تو کرپشن زدہ حکوم تو کرپشن روکنے سے رہی اس کا بیڑا عدلیہ نے اٹھالیا ہے جو کافی حوصلہ افزا ہے۔ امید ہے بعد میں چھوٹے اہلکاروں سے بڑے بڑے عہدے دار بھی اس کی لپیٹ میں آجائیں گے، انشاءاللہ۔ اور معاشرے کے بگاڑ میں برداشت اور رواداری کا فقدان ہے ورنہ ایسے حالات پیدا ہی نہ ہوں۔ چھلانگیں مارتے محمد قدرت اللہ نیازی محفل کو خوب صورتی سے سجا رہے تھے اور بچپن کی بانسری کو یاد کرتے افتخار حسین اعوان بھی اچھے لگے۔ جاسوسی میں پہلی حاضری دیتے شعیب عباس اور ایسی ہی جسارت کرتے بصیر غضنفر شاہ کی آمد بھی اچھی لگی، ویلکم جی۔ سیدہ ایمانے زاراشاہ کی شاہانہ باتوں کے ساتھ بسمل چوہدری کی روانی بھی ایک دم زبردست رہی۔ رانا بشیر احمد ایاز بھی آخر میں بھرپور تبصرے کے ساتھ موجود رہے۔ سرورق کی دوسری کہانی ”آخری خواہش“ اچھی تھی۔ کتنی عجیب بات ہے نوید نے ایک ناگن نشا... کی محبت میں اپنے فرض کو ہی پس پشت ڈال دیا اور عینا پر بلاوجہ الزام لگا کے اسے چھوڑ دیا۔ بھی تو آنکھیں بند کیے اندھے کنویں میں گرتا چلا گیا لیکن ایسے زندگی سے منہ موڑنا بھی حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لیں۔ وہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔ ”انگارے“ تو انگارے وادی بن گئی۔ عزت مآب گرے فوجیوں کی بھینٹ چڑھ گیا۔ پورے شہر میں ہنگامے اور شاہ زیب کو دہشت گرد قرار دے دیا۔ سجاول پر جانے کون سی افتاد ٹوٹی کہ وہ بھی پاگل سا لگ رہا تھا۔ اب اس افراتفری میں دیکھو کیا ہوتا ہے۔ بڑی جلد باز لڑکی تھی بس جلدی جائیداد اور بینک بیلنس کا حصہ کریں اور اپنی اپنی زندگی جئیں۔ تدا پر عشق کا بھوت سوار ہوا تو اپنے آشنا کے ساتھ مل کر دادا کا ہی قتل کر دیا اور پھر انسپکٹر نے بھی پس آئینہ ڈھونڈ لیا۔ سرورق کی پہلی کہانی بھی زبردست رہی۔ اب نہیں تو کبھی نہیں...... اب نہیں تو کبھی نہیں! بے چاری سوشیلا اور دیگر ساتھی پہلے ہی بڑی مشکل سے ملے ہیں اگر اب بھی شہزی نہیں جاگا تو ساتھیوں کا برا انجام ہوگا۔ لیجیے شہزی اب اپنی ”آوارہ گرد“ غیرت کو جگا لیجیے اور بلراج اینڈ کمپنی کو سبق سکھا دیجیے۔ سب بدل جاتا ہے، ماضی نہیں بدلتا اور پھر تلاشِ ماضی میں خودسر برینڈا نے اپنے حواس ہی کھو دیے اور ہوش بھی آیا جب اس کا عزیز رچرڈ اسے مل چکا تھا۔ مغرب سے درآمدہ کہانی عمدہ رہی۔ بعض اوقات حماقت میں معمولی سی غلطی بھی برے حالات کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے جیسے کہ ”حماقت“ میں فرینک کے ساتھ ہوا۔ امید ہے ہم دونوں میں تو کوئی بھی کسی قسم کی غلطی کرنے والا نہیں ہے۔ ماموں نے جانے کیا سوچ کر خوشبو کو ڈانٹ دیا اور پھر خوشبو بھی ماند پڑ گئی۔ ماموں سے کٹ گئی تو ایک دن چلی بھی گئی، بعد میں ماموں تھے اور ان کے آنسو۔ ”پتھر“ محبت سے گندھی عمدہ تحریر تھی۔ ہر لمحہ کی سوچ نے اسے منصوبہ ساز بنا دیا اور پھر منوچہر نے شمیر کے ساتھ مل کے ایسی منصوبہ بندی کی کہ کروڑوں مالیت کے ہیرے لے اڑے مگر ایک حادثے کی صورت سب کچھ گنوا بیٹھے۔ وہ حادثہ ان کے ساتھ تو پیش نہیں آیا لیکن یہ اس کی لپیٹ میں ضرور آگئے۔ ”حادثہ“ جرم کی دنیا سے بہترین کہانی تھی۔“

گوجرانوالہ سے آصف محمود کا تنقیدی نقطۂ نظر ”جاسوسی ڈائجسٹ ماہ اپریل تین تاریخ کو ملا۔ سب سے پہلے ٹائٹل کو ہائی جیک کر کے دیکھا۔ بے تاثر خاتون صفحۂ اول پر دیک رہی تھی۔ فوراً ہی طاہر جاوید مغل کی ”انگارے“ کی طرف چھلانگ لگائی اور ایک ہی نشست میں پڑھ کر سانس لیا۔ یہ وضاحت ہو جائے کہ میں انگارے کی اقساط دوبار پڑھتا ہوں۔ انگارے میں کچھ زیادہ ہی جنگ زدہ ماحول پیدا کر دیا گیا جو کسی طرح کرداروں سے میل نہیں کھاتا ہے۔ آقا جان، علمی وغیرہ قسطنیا کو ان کے علاقے میں پہلے ہی پکڑوا سکتے تھے اور علاقے پر قبضہ ہو جاتا ہے۔ علمی کا کردار سطحی سا ہے جب کہ آقا جان غدار کے روپ میں جلوہ گر ہوا ہے۔ سجاول غائب رہ کر پھر منظرِ عام پر آ گیا ہے۔ اتنے مضبوط بندے کو ہپناٹائز کیا گیا ہوگا۔ ایک ہاتھ کے ساتھ شاہ زیب ایسٹرن کنگ کو کنگ ثابت کرنے کی سعی لاحاصل ہے۔ قاری اس بات کو ہضم کرنے سے قاصر ہے۔ اس سطح کی جنگ میں زخمی بازو سے بہادری کے جوہر دکھانا، ون آرمڈ باکسر تا قابلِ یقین ہے۔ کئی کئی ماہ تک عام چوٹ کا بازو درست نہیں ہوتا ہے چہ جائیکہ طاہر جاوید مغل صاحب انہونی کو ہونی بنا رہے ہیں۔ برادرم! انگارے کو صحیح معنوں میں انگارے ہی رہنے دیں۔ اس جنگ وجدل، قتال اور غداری وغیرہ میں زخمی بازو شاہ زیب کو جچا نہیں ہے۔ ہاناوانی ہپناٹائز کے زور پر سجاول جیسے کٹکنے بھیڑیے کو قابو کیوں نہ کر سکتی ہے۔ طاہر جاوید مغل صاحب کہانی جب کہ زوروں پر ہے۔ اسے جنگ وجدل وقتل وغارت سے باہر نکالنے کی سعی کریں۔ اس طرح تو کردار بھٹک سکتے ہیں۔ اپنا اپنا کردار صحیح طریقے سے ادا کرنے سے قاصر ہوں گے۔ جنگ کی ایسی فضاؤں میں خوف و دہشت کے سوا اور کیا ہوگا۔ آقا جان قسطنیا کو دارِ زل کے علاقے میں پکڑوا کر اور شاہ زیب کو بھی پکڑوا کر کہانی ختم کر سکتا تھا۔ سوچیے ذرا اپاہج کردار کیا کر سکے گا؟ عزت مآب عورتوں کے شکاری کا یہی انجام ہونا تھا۔ ”آوارہ گرد“ (انگارے کے بعد عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد جغرافیہ کا مضمون لگی) کوئی سسپنس کشش دلچسپی اس میں نہیں پائی جا رہی ہے۔ سردار بکھر گئے ہیں۔ ذرا بھی دلچسپی نہیں رہی ہے۔ یقین کیجیے تین بار پڑھنے کی کوشش کی صرف چھ صفحے پڑھ سکا ہوں۔ عبدالرب بھٹی صاحب آپ کے قلم کو زنگ لگ گیا ہے کیا؟ کہانی خشک خشک جا رہی ہے۔ ”پس آئینہ“ فاروق انجم کی اچھی کہانی رہی۔ دیگر کہانیوں تک رسائی

فی الحال نہیں ہو رہی ہے۔"

کراچی سے ادریس احمد خان کی پسند "امید ہے کہ آپ و رفقائے کار خیر و عافیت سے ہوں گے۔ جاسوسی ڈائجسٹ کا حصول بروقت ممکن ہوا۔ سرورق حسب معمول بہترین تھا۔ اداریے میں بھی کوئی خوش کن بات نہیں تھی۔ چیں بکتہ چیں میں محمد قدرت اللہ نیازی سرفہرست تھے۔ مبارک باد، باقی دوست بھی اپنی اپنی آراء کا اظہار کر رہے تھے۔ چیں بکتہ چیں سے آگے بڑھ کر پہلی کہانی "تلاش ماضی" تھی جو بہت اچھے انداز میں لکھی گئی۔ دوسری کہانی "دشمن" تھی۔ وہ بھی اثر انگیز تھی۔ آپ اپنے دام میں، جس میں باقاعدہ پلان بنا کر اپنے شوہر کو قتل کرنے کا پروگرام بنایا مگر شوہر کے لیے گڑھا کھودنے والی خود بھی اپنے آپ کو موت سے نہیں بچا سکی۔ اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ دوسروں کے لیے گڑھا کھودنے والے خود بھی اس میں گرتے ہیں۔ "بدنصیب" واقعی بدنصیب تھا کہ جب اس کا ستارہ عروج پر پہنچنے والا تھا تو اس نے اپنا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد سب سے زیادہ پسندیدہ کہانی "انگارے" تھی جو یقیناً سب سے زیادہ پسند کی جانے والی کہانی ہے۔ جس میں زندگی کا ہر رنگ نمایاں ہے۔ "حادثہ" بھی اچھی کہانی تھی جس میں چوروں کو مور پڑ گئے۔ ساری محنت اکارت گئی اور ہیرے کوئی اور لے اُڑا۔ "حماقت" بھی اچھی رہی۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی مقبول کہانی "آوارہ گرد" تھی، وہ بھی اچھے انداز میں جاری و ساری ہے اور شروع قسط سے اب تک دلچسپی قائم ہے۔ "گمشدہ تصویر" بھی متاثر کن کہانی تھی۔ منظر امام کی "پتھر" نے بہت متاثر کیا۔ ان کی ہر کہانی پُراثر ہوتی ہے اور واضح پیغام دیتی محسوس ہوتی ہے جس سے دلوں پر اثر زیادہ ہوتا ہے مگر اسے حساس دل والا ہی محسوس کرتا ہے۔ بے حس آدمی محسوس نہیں کر سکتا۔ "بھرم" بھی اچھی لگی۔ زویا اعجاز کی تحریر بھی خوب صورت ہوتی ہے اور دوسرے ساتھی کبیر عباسی بھی اچھا لکھ رہے ہیں۔ دونوں کے لیے دل سے بہت بہت پُرخلوص دعائیں۔ خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ فاروق انجم اور کبیر عباس کی آخری صفحات کے لیے دونوں ہی کہانیاں بہت اچھی لگیں۔ "کترنیں" بھی مزہ دے گئیں۔"

جاسوسی کے نام اسماعیل خان کا کوہاٹ سے محبت نامہ "میں جاسوسی کا سات سال سے خاموش قاری ہوں اور آج پہلی مرتبہ جاسوسی کو خط لکھنے کے لیے پین کاغذ سنبھال لیا اس امید کے ساتھ کہ پہلا خط سمجھ کر ردی کی ٹوکری میں نہیں ڈالیں گے (بالکل نہیں ڈالیں گے)۔ سات سالوں سے خط اس وجہ سے نہیں لکھا کہ میں پاکستان آرمی میں نوکری کرتا ہوں اور وہ بھی SSG میں یعنی کمانڈو یونٹ میں۔ آج چار اپریل کو جاسوسی میرے ہاتھ میں آ گیا اور آج خوش قسمتی سے میرا برتھ ڈے بھی ہے تو خوشی دگنی ہو گئی۔ سرورق پر نظر ڈالی اور بالکل بھی پسند نہیں آیا۔ اس کے بعد سب کو کراس کر کے سیدھا "انگارے" پر پہنچ گیا۔ کیونکہ شاہ زیب کے ایکشن کو دیکھنے کے لیے پورا مہینا ترستا رہتا ہوں۔ آپ یقین کریں شاہ زیب کے ایکشن مجھے اتنے پسند ہیں کہ میں آپ کو کیا بتاؤں۔ میں دعا گو ہوں کہ شاہ زیب کو تاجور مل جائے۔ جاسوسی کے تمام قارئین سے میری التجا ہے کہ میرے لیے دعا کریں کہ مجھے میری محبت مل جائے کیونکہ میں اپنی محبت کے بغیر بالکل ادھورا ہوں۔ ہم لوگ 2008ء میں سوات آپریشن پر تھے۔ سوات کی تحصیل مدین میں آگے شیگو ایک گاؤں ہے اگر آپ لوگوں نے نام سنا ہو۔ ادھر ہم آپریشن میں مصروف تھے کہ ایک شام ہنگامہ ہوا اور پتا چلا کہ دہشت گردوں نے ایک گھر پر حملہ کر کے ایک لڑکی کو اٹھا لیا ہے جو کہ یتیم بھی ہے۔ بس پھر شاہ زیب کی طرح ایکشن چاہیے تھا اور ماشاء اللہ پاکستان آرمی تو پوری دنیا میں مشہور ہے۔ ہم نے ایکشن کیا اور لڑکی کو دہشت گردوں سے آزاد کرا لیا اور خدا کا کرنا یہ ہوا کہ میرا اس لڑکی سے دل کا رشتہ قائم ہو گیا اور محبت کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا لیکن میرے والد صاحب نہیں مان رہے۔ بس میرے لیے دعا کرنا۔ میں پٹھان ہوں شاید لفظوں میں تھوڑی سی غلطی ہوئی ہو لیکن وہ تو پٹھانوں کے لیے ویسے ہی معاف ہے۔ باقی میں امید کرتا ہوں کہ انشاء اللہ میرا پہلا خط ضرور شائع ہوگا۔"

وحشتِ دل کی خیال آرائی "اس بار جاسوسی قدرے تاخیر سے ملا۔ ٹائٹل اچھا لگا۔ سب سے پہلے ہم نے دہکتے انگاروں پر قدم دھرا جہاں حقیقتاً آگ برستی نظر آئی۔ زینب اور ابراہیم کا ملن اچھا لگا۔ آقا جان کی مکاری کھل ہی گئی اور خود ہمارے اردگرد بھی ایسے کئی آقا جان موجود ہیں۔ جاناں کی موت نے افسردہ کیا اور بالآخر شاہ زیب کو تاجور کی جھلک دکھائی دے ہی گئی۔ باقی تحریروں میں مرحوم اقبال کاظمی کی "راہ گزیدہ" بہترین تھی۔ زویا اعجاز کی "شناخت" ایک حساس موضوع پر تھی۔ واقعی ہم ان لوگوں کو انسانی حقوق نہیں دیتے۔ کبیر عباسی کا "پہلا کیس" اچھا لگا لیکن ہم اُن کے تبصرے کو مس کرتے ہیں۔ ماہ تاب سمیع رانا! ہماری بھانجی کیسی ہیں؟ رضوان تنولی کستوری بہت جھڑ کتے ہیں آپ۔ کہیں کسی وزیر سفیر کے رشتے دار تو نہیں آپ؟ باقی تبصرے سب ہی کے اچھے تھے مگر مرحا گل اور طاہرہ گلزار غائب...... !احسان سحر، ہمارا ذاتی تجربہ ہے کہ وقت اچھا ضرور آتا ہے۔ پر کبھی وقت پر نہیں آتا۔ اور وقت پر نہ آئے تو اس اچھے وقت کا فائدہ؟ آپ لوگ دعا کریں کہ ہمیں ہماری محبت مل جائے۔ ہمایوں سعید، اعجاز احمد راحیل، تفسیر عباس بابر آپ لوگ کیسے ہیں؟"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

کاشف عزیز، کوٹری۔ حرا افتخار، لاہور۔ انصار احمد، کراچی۔ عائشہ راحیل، حیدرآباد۔ جنید خان، پشاور۔ سائرہ اسماعیل، کراچی۔

جنگ دل ربا

ایچ اقبال

جنگ فوجوں کی ہو یا جذبوں کی... انجام کبھی بہتر نہیں ہوتا... ہارنے والا روتا ہے تو جیتنے والا بھی اپنے زخموں پر مرہم پاشی کررہا ہوتا ہے... جنگ کی صورت میں ہونے والی تبدیلیاں دور تک دونوں فریقوں کا پیچھا کرتی ہیں... سائے کی طرح ساتھ ساتھ رہتی ہیں جنہیں بھلایا نہیں جاسکتا... نہ جھٹلایا جاسکتا ہے... ایسے ہی کشیدہ ماحول میں زندگی و جنگ کی بازی میں الجھ جانے والے دو فریقوں کی جدوجہد... ایک جنگ کا مقروض تھا... دوسرے پر محبت کا قرض واجب الادا تھا... رنگین و سنگین لمحوں میں گزرتی ہوئی ایک ایسی دل ربا کہانی جس کے نقوش دیر تک قارئین کے ذہنوں پر ثبت رہیں گے...

ایک ہی مشن پر دو مخالف سمتوں سے کام کرنے والے جاسوسوں کی تہلکہ خیز داستان

کہیں قریب ہی سے سانپ کی پھنکار سن کر گھوڑا بدک کر سرپٹ دوڑ پڑا۔ انور نے اسے قابو میں لانے کی بے حد کوشش کی لیکن اچھا گھڑ سوار ہونے کے باوجود کامیاب نہیں ہوسکا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گھوڑے نے سانپ کی پھنکار نہیں، موت کی آواز سنی ہو۔

شام نہیں ہوئی تھی لیکن اس پہاڑی علاقے کا جنگل اتنا گھنا تھا کہ فضا نیالی سی تھی۔ اس جنگل میں ہرن، بارہ سنگھا اور خرگوش کثرت سے پائے جاتے تھے۔ انور اپنے چند دوستوں کے ساتھ شکار کھیلنے آیا تھا۔ اس کا گھوڑا اس وقت بدکا تھا جب وہ ایک ہرن کا تعاقب کررہا تھا۔ ہرن پر وہ رائفل سے ایک گولی بھی چلا چکا تھا لیکن گولی صحیح نشانے پر نہیں لگی تھی، ہرن کی ٹانگ پر لگی تھی اور غالباً اس کی ہڈی کو متاثر نہیں کرسکی تھی اسی لیے ہرن اس کے بعد بھی برق رفتاری سے دوڑتا رہا۔

گھوڑے کو قابو میں کرنے کی ناکام کوشش کے بعد انور نے رائفل سرعت کے ساتھ اپنے کندھے سے لٹکالی تھی اور آگے جھک کر گھوڑے کی گردن سے لپٹ گیا تھا۔ دراصل اسے خدشہ تھا کہ اونچے نیچے راستے پر دوڑتے ہوئے گھوڑے نے اگر کہیں ٹھوکر کھائی تو وہ اچھل کر گھوڑے کی پشت

سے زمین پر جا گرتا۔

اب اسے یہ احساس بھی ہو چکا تھا کہ وہ اپنے دوستوں سے دور نکل آیا تھا۔ اسے اس کا بھی ہوش نہیں تھا کہ ہرن اپنی جان بچا کر نہ جانے کس طرف نکل گیا اور دوڑتے ہوئے گھوڑے کا رخ کس طرف تھا۔ دو مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ گھوڑا کسی تناور درخت سے رگڑ کھاتا ہوا گزرا تو اس کی زد پر انور کی رانیں بھی آ گئیں جن میں شدید سوزش بھی ہوئی لیکن اس وقت اس سوزش سے زیادہ انور کو یہ فکر لاحق تھی کہ وہ کہیں گھوڑے سے گر نہ پڑے اور گھوڑا کہیں پڑوسی ملک کی سرحد میں داخل نہ ہو جائے۔

دس میل بعد پڑوسی ملک کی سرحد شروع ہو جاتی تھی۔ جبکہ اس کا تعلق شام سے تھا۔ اگر گھوڑا پڑوسی ملک کی طرف نکل جاتا تو انور کے لیے خاصی پریشانی ہو سکتی تھی لیکن وہ کرتا بھی کیا، گھوڑا کسی طرح قابو میں نہیں آ سکا تھا۔ اس کے دماغ میں اپنے باپ کی یہ بات آئی کہ گھڑ سواری کی مہارت حاصل کرنے کے بعد ہی شکار کے لیے گھوڑا استعمال کرنا چاہیے۔

اس کے والد شکاریوں کی دنیا میں خاصی شہرت کے حامل تھے۔ انہوں نے جو کچھ کہا تھا، اپنے تجربات کی روشنی میں کہا تھا۔ انور نے ان کی بات نظر انداز نہیں کی تھی لیکن جب اس نے اپنے دوستوں کے ساتھ شکار کا پروگرام بنایا تو سوچا تھا کہ ہرن اور بارہ سنگھا جیسے جانوروں کے لیے بہت اچھا گھڑ سوار ہونا ضروری نہیں تھا۔ اس جنگل میں درندے تو ہوتے نہیں تھے۔

اس کے والد کو درندوں ہی کے شکار کا شوق رہا تھا۔ شیر، چیتے جیسے شکار انہوں نے اپنے ہی ملک میں نہیں کیے تھے۔ ان کا شوق انہیں دو مرتبہ افریقا بھی لے جا چکا تھا۔

انور کو درندوں کے شکار سے دلچسپی تھی، نہ خرگوش جیسے معصوم جانوروں سے۔ اسے صرف ہرن اور بارہ سنگھوں کے شکار سے دلچسپی تھی۔ کالج کی چھٹیوں میں وہ تین سال سے اس پہاڑی جنگل میں آ رہا تھا لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ اس کا گھوڑا اس بری طرح بدکا کہ کسی طرح اس کے قابو میں نہیں آ سکا۔ دونوں رانوں پر شدید رگڑ لگنے کے کچھ ہی دیر بعد گھوڑے نے کسی بڑی چیز سے ٹھوکر کھائی یا نہ جانے کیا ہوا کہ وہ بہت زور سے اچھلا۔ انور کا سر ایک درخت کی بہت مضبوط اور موٹی ٹہنی سے ٹکرایا اور اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ دو ایک لمحوں میں اس اندھیرے کا تسلط مکمل ہو جاتا۔ انہی دو ایک لمحوں میں اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ اچھل کر گھوڑے سے گرا اور ایک جانب لڑھکتا چلا گیا۔ لڑھکتے ہی اس کے جسم پر جگہ جگہ چوٹیں آنے لگیں لیکن اس وقت تک اس کا دماغ مکمل تاریکی میں جا چکا تھا اور وہ کسی تکلیف کا احساس نہیں کر سکتا تھا۔

جب اسے ہوش آیا تو ایسے موقعوں پر انسان کی تمام حسیات بتدریج بیدار ہوتی ہیں، اسی طرح انور کی حسیات بھی بیدار ہوئیں۔ اس نے خود کو کسی جگہ لیٹا ہوا دیکھا، بستر کا احساس بھی ہوا، جسم میں تکلیف بھی محسوس ہوئی۔ یہ بھی یاد آیا کہ وہ ہرن کے تعاقب میں تھا اور اس کا گھوڑا بے قابو ہو گیا تھا جس کے اچھلنے سے اس کے سر پر چوٹ لگی تھی۔ یہ سوال بھی ذہن میں ابھرے کہ اس کے بعد کیا ہوا؟ اور اب وہ کہاں ہے؟ آنکھوں کے سامنے سے دھند بھی بتدریج کم ہوئی۔ اس نے خود کو ایک کمرے میں پایا۔ اس کے قریب ہی ایک نسوانی چہرہ بھی تھا۔ دھند صاف ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ نسوانی چہرہ اٹھارہ بیس سالہ ایک خوب صورت لڑکی کا تھا۔

یہ سب کچھ بتدریج تو ہوا لیکن اس عمل کا دورانیہ چند لمحات پر محیط تھا۔

"شکر ہے کہ تمہیں ہوش آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی انور!"

انور لڑکی سے اپنا نام سن کر چونکا۔ اس نے غور سے لڑکی کی طرف دیکھا۔ اسے احساس تھا کہ وہ چہرہ اس نے پہلے بھی کبھی دیکھا ہے۔ غور سے دیکھنے پر یہ احساس اور زیادہ قوی ہو گیا۔

"تم..... کون؟" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"اور میں، میں کہاں ہوں؟"

"تم ایک خطرناک جگہ آ گئے ہو انور!" وہ بولی۔ اس کی آواز میں دلآویز سی کھنک تھی۔ "یہ تو میں نے دیکھ لیا ہے کہ تم دانستہ یہاں نہیں آئے لیکن سارا واقعہ کیا ہے، یہ تو تم ہی بتا سکو گے۔ تم سرحد پار آ گئے ہو۔"

"سرحد پار؟" انور چونکا۔

"ہاں۔" جواب دیا گیا۔ "اور خوش قسمت ہو کہ بارڈر پولیس نے تمہیں نہیں دیکھا۔ میں نے بھی دیکھ لیا تو بس اتفاق ہے۔ میں دوربین سے وادی کو گھیرے ہوئے پہاڑوں کی چوٹیاں دیکھ رہی تھی کہ نظر ایک گھوڑے پر پڑی۔ وہ نہ جانے کیوں بہت زور سے اچھلا اور تم اس پر سے گر کر وادی میں لڑھکتے چلے آئے۔ میں فوراً اپنی دو ملازماؤں اور ایک ملازم کے ساتھ اس طرف دوڑی۔ گھنٹے بھر کی تلاش کے بعد تم ملے۔ میں اپنے ملازموں کی مدد

سے تمہیں اٹھا کر اپنے اس ریسٹ ہاؤس میں لے آئی۔ کیونکہ میں میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہوں اس لیے فرسٹ ایڈ باکس ساتھ رکھنے کی بھی عادت پڑ گئی ہے۔ میں نے ہی تمہارے زخموں کی ڈریسنگ کی ہے۔ شکر ہے کہ تمہاری کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی۔''

انور محسوس کر چکا تھا کہ اس کے سر کے علاوہ بھی جسم کے کئی حصوں کی ڈریسنگ کی گئی تھی اور معمولی قسم کی چوٹوں پر دوا لگانے پر ہی اکتفا کی گئی تھی۔ اس کے جسم پر اس کا لباس بھی نہیں تھا۔ ایک چادر اس کے جسم پر پڑی ہوئی تھی۔

''میں تمہارا شکر گزار ہوں۔'' انور حسنین نے کہا۔

اسے یہ احساس بھی تھا کہ وہ واقعی ایک خطرناک جگہ پہنچ گیا ہے۔ خطرناک اس اعتبار سے کہ وہ اپنے ملک کی سرحد پار کر کے پڑوسی ملک کے اندر آ گیا تھا۔ لڑکی بھی کہہ چکی تھی کہ وہ بارڈر پولیس کی نظر میں نہیں آیا تھا۔ اگر آ جاتا تو گرفتار کیا جا چکا ہوتا اور ہوش میں آنے کے بعد جب اس کی آنکھ کھلتی تو وہ خود کو نہ جانے کہاں پاتا!

لڑکی نے اس کی بات کے جواب میں فوراً کہا تھا۔

''دوست کو دوست کا شکر گزار ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کیا تم نے مجھے پہچانا نہیں انور؟ تمہاری ہی طرح میں بھی آٹھ سال میں اتنی زیادہ تبدیل تو نہیں ہوئی کہ تم مجھے پہچان نہ سکو۔''

آٹھ سال! انور کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ آٹھ سال قبل وہ اور اس کا بے حد مختصر خاندان اسی ملک کے باشندے تھے۔ اس کے گھر کے برابر کے گھر میں جو لڑکی رہتی تھی، وہ اس وقت پندرہ سولہ سال کی تھی۔ میٹرک کر چکی تھی اور فرسٹ ایئر میں داخلہ لینے والی تھی۔ وہ اور انور ایک دوسرے سے دوستی کی حد تک مانوس ہو گئے تھے۔ جب انور کے والد نے کسی مصلحت کے تحت ملک شام کی شہریت لے لی تھی تو ان کی روانگی کے وقت لڑکی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''زنوبیا!'' انور کے منہ سے نکلا۔

''شکر ہے۔'' وہ کھل کر مسکرائی۔ ''آخر پہچان لیا تم نے مجھے۔ اتنی دیر سے پہچاننے کا مطلب یہ ہے کہ تم نے مجھے بھلا دیا تھا مگر یقین کرو، میں تمہیں نہیں بھول سکی تھی۔''

''مجھے فوراً پہچان لیا تھا تم نے؟'' انور نے پوچھا۔

''یقین سے تو نہیں پہچانا تھا لیکن خیال آ گیا تھا کہ تم ہی ہو۔ یقین اس وقت آیا جب میں نے تمہاری جیبوں سے سب کچھ نکال کر یکجا کیا۔ تمہارے شناختی کارڈ پر تمہارا پورا نام لکھا ہے۔ انور حسنین، قل زاد۔''

جسم میں جگہ جگہ تکلیف کا احساس تھا لیکن انور مسکرایا۔ ''بہت ہی غیر معمولی اتفاق ہے کہ تم سے اس طرح ملاقات ہوئی۔ میں اس پر شرمندگی کا اظہار ہی کر سکتا ہوں کہ میں نے تمہیں بھلا دیا لیکن میں تمہیں کیسے یاد رہ گیا؟''

زنوبیا اس کا سوال ٹال گئی اور بولی۔ ''اتنی باتیں ہو گئیں۔ مجھے سب سے پہلے یہ پوچھنا چاہیے تھا کہ اب تم خود کو کیسا محسوس کر رہے ہو؟''

''تکلیف تو سارے جسم میں ہے لیکن سر میں زیادہ تکلیف ہے۔''

''لیکن قابلِ برداشت ہے۔ اس کا اندازہ میں تمہارے چہرے سے بھی کر رہی ہوں اور تمہارے باتیں کرنے کے انداز سے بھی ظاہر ہو رہا ہے۔ تمہارے سر کی چوٹ ہے بھی کچھ زیادہ۔ اسی لیے میں تمہیں ایک پین کلر انجکشن لگا چکی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم نقاہت بھی محسوس کر رہے ہو گے۔''

''بالکل ٹھیک سمجھا ہے تم نے۔''

''تمہیں تلاش کرنے میں دیر لگی تھی۔ تمہارے سر سے کافی خون بہہ چکا تھا۔ اس کی وجہ سے نقاہت تو ہونا ہی چاہیے۔''

''میں یہاں خطرے میں تو ہوں۔'' انور سوچتا ہوا بولا۔

''جب تک تم یہاں، میرے ریسٹ ہاؤس میں ہو، تمہارے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' زنوبیا کی مسکراہٹ بھی دلکش تھی۔

''میری چوٹیں کب تک ٹھیک ہوں گی؟''

''دو تین روز تو تم بستر سے اٹھو بھی نہیں۔ سر میں دھمک ہونے لگے گی۔ تین دن بعد تم تھوڑی بہت چہل قدمی کر سکتے ہو۔ سر کا زخم مندمل ہونے میں ایک ہفتہ لگ سکتا ہے۔ میرے پاس ایسی دوا نہیں ہے جو اس زخم کو جلد مندمل کر سکے لیکن اگر میں تمہیں شہر لے جا کر کسی اسپتال میں داخل کراؤں تو اندیشہ ہے کہ تم گرفتار ہو سکتے ہو۔''

انور نے متفکرانہ انداز میں سر کو آہستگی سے اثباتی جنبش دی پھر پوچھا۔ ''وقت کیا ہوا ہے؟''

''سات بج چکے ہیں۔''

''اوہ! میرا خیال ہے، جب میں گرا تھا، اس وقت ساڑھے پانچ بجے ہوں گے۔ میری کلائی پر اس وقت گھڑی بھی نہیں ہے۔''

"جو سامان میں نے تمہاری جیبوں سے نکالا ہے، ان میں کوئی گھڑی نہیں۔ وہ تمہاری کلائی سے کھل کر کہیں گر گئی ہوگی؟"

"موبائل؟"

"وہ بھی کہیں گر گیا ہوگا۔ تمہاری جیبوں سے مجھے صرف تین چیزیں ملی ہیں۔ رومال، ایک والٹ اور تمہارا شناختی کارڈ۔ اور......" وہ مسکرائی۔ "یقین کرو، میں نے تمہارے والٹ سے کوئی رقم چوری نہیں کی ہے۔"

انور دھیرے سے ہنس دیا۔ اسے خاصی حد تک یقین ہو چکا تھا کہ زنوبیا کی وجہ سے وہ کسی مخدوش حالت میں نہیں ہے۔

اچانک زنوبیا اس کے بستر کے قریب ہی رکھی ہوئی کرسی سے اٹھی۔ "میں ابھی آئی، دو تین منٹ میں۔"

"ایک بات بتاتی جاؤ۔" انور جلدی سے بولا۔ "ایک خلش ہے میرے ذہن میں۔"

"کہو۔" زنوبیا بیٹھ گئی۔

"تم نے اپنے ملازموں کو میرے بارے میں کیا بتایا ہے؟"

"ان کی طرف سے تم بے فکر رہو۔ وہ میرے بارے میں یا مجھ سے متعلق کوئی بات بھی کسی کو نہیں بتاتے، البتہ میں نے ان سے کہا ہے کہ میں اتفاق سے تمہیں جانتی ہوں۔ تم یہاں کے ایک شریف گھرانے کے فرد ہو۔ اس طرف گھومنے آنکلے ہو گے۔ تم نے کہیں ٹھوکر کھائی اور ڈھلان پر لڑھکتے ہوئے وادی میں آگرے۔"

"یہ کیا جگہ ہے؟" انور پوچھ بیٹھا۔

"اس طرح تو سوال سے سوال نکلتا چلا آئے گا۔" زنوبیا مسکراتے ہوئے دوبارہ کھڑی ہوئی۔ "یہ سب تفصیلات ابھی آکر بتاؤں گی۔ بس دو تین منٹ۔" وہ جواب کا انتظار کیے بغیر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

انور کو شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ وہ حادثاتی طور پر دوسرے ملک کی حدود میں آگرا تھا جبکہ ان دنوں، دونوں ممالک کے معاملات بھی کشیدگی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اگر وہ بارڈر پولیس کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ لوگ اسے شام کا جاسوس ہی سمجھتے۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ زنوبیا کی پناہ میں آگیا جسے وہ بھول چکا تھا لیکن وہ اسے نہیں بھولی تھی اور اسے کسی مصیبت سے بچانا بھی چاہتی تھی۔ وہ اس ملک کی شہری ضرور تھی لیکن وہاں کے سرکاری مذہب سے اس کا تعلق نہ تھا۔ وہ ایک پارسی خاندان سے تعلق رکھتی تھی جو تجارت پیشہ تھا۔ اس کے ایک چچا نے وہاں کی فوج میں شمولیت اختیار کرلی تھی۔ آٹھ سال قبل وہ کیپٹن تھے۔

زنوبیا جلد ہی واپس آگئی۔ اس کے ہاتھ میں جو گلاس تھا، اس کے مشروب کی رنگت زردی مائل تھی۔

"لو یہ پی لو۔" زنوبیا نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے گلاس اس کی طرف بڑھایا۔ "اس کی رنگت سے کچھ اور نہ سمجھنا۔ یہ دودھ ہے۔ بس ذرا سی ہلدی ملائی ہے میں نے اس میں۔ یہ تمہارے لیے مفید ثابت ہوگی۔"

دودھ کسی قدر گرم تھا۔ انور ایک گھونٹ پی کر ہی رک گیا۔

"ہاں۔" زنوبیا بولی۔ "آہستہ آہستہ ہی پیا جا سکے گا۔"

"اب میرے سوال کا جواب دو۔"

"قدرتی بات ہے کہ تم بہت کچھ جاننے کے لیے بے تاب ہو گے۔ میں بتاتی ہوں تمہیں۔ یہ بڑی خوب صورت وادی ہے۔ یہاں کوئی آبادی نہیں ہے۔ لوگ یہاں صرف گھومنے پھرنے ہی آتے ہیں۔ یہ تو تمہیں شاید یاد ہوگا کہ مجھے بچپن ہی سے ڈرائنگ کا شوق تھا۔ اسی شوق کی پیاس بجھانے میں یہاں آتی ہوں۔ لینڈ اسکیپ بناتی ہوں لیکن صرف ان دنوں میں جب کالج کی چھٹیاں ہوتی ہیں۔"

"کیا؟" انور کو تعجب ہوا۔ "تم نے ابھی تک تعلیم مکمل نہیں کی؟"

"ہاں۔" زنوبیا نے کہا۔ "دو تعلیم کے سلسلے میں کئی سال کا تعطل آگیا تھا۔ تمہیں تو اسی وقت چونکنا چاہیے تھا جب میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہوں۔"

"اس وقت تک میں نے جانا ہی نہیں تھا کہ تم زنوبیا ہو۔"

"ہاں۔" زنوبیا نے سر ہلایا۔ "خیر...... دراصل تعلیم کے سلسلے میں کسی وجہ سے کئی سال کا تعطل آگیا تھا۔ اس کی تفصیل پھر کسی وقت بتاؤں گی۔ میری خواہش تو یہی تھی کہ میں مصوری کی دنیا میں کوئی مقام پیدا کروں لیکن ڈیڈی شدت سے چاہتے تھے کہ میں ڈاکٹر بنوں۔ میں نے ان کی خواہش کا احترام کیا۔ میری تعلیم کا رخ مڑ گیا۔ اب میں فائنل ائیر میں ہوں لیکن میں مصوری سے اپنا ناتا نہیں توڑ سکی۔ لینڈ اسکیپ بنانے کے لیے میں تین سال سے اس وادی میں آرہی ہوں۔ شاید......" اس کے چہرے کے تاثرات میں کچھ تبدیلی آئی۔ "شاید میرا یہ شوق اسی لیے تھا کہ میں آٹھ سال بعد تمہیں اس طرح پاسکوں، میرا مطلب

سے دیکھ سکوں۔"

انور اس کے تاثرات کی تبدیلی کو کوئی معنی نہیں پہنا سکا۔ اس نے دودھ کا ایک گھونٹ لیا، پھر بولا۔ "ان دنوں تم کب سے اس وادی میں ہو؟"

"تین چار روز سے۔" زنوبیا نے جواب دیا۔ "میں عموماً یہاں ایک ماہ گزارتی ہوں۔" پھر ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کچھ سوچنے لگی ہو۔

"اچانک کہاں کھو گئیں؟" انور پوچھ بیٹھا۔

"آں۔" زنوبیا چونکی، پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "تم یہاں سے جلد از جلد واپس جانا چاہو گے نا؟"

"ظاہر ہے زنوبیا! میں اس ملک میں کیسے رہ سکتا ہوں؟"

"ہاں۔" زنوبیا نے ٹھنڈی سانس لی۔ "واپس تو جانا ہی پڑے گا تمہیں۔ میں تمہیں ایک ایسا راستہ بھی دکھا دوں گی کہ تم یہاں کی بارڈر پولیس کی نظر میں آئے بغیر اپنے ملک پہنچ جاؤ لیکن تمہیں ایک ہفتہ تو یہاں گزارنا ہی پڑے گا۔ تمہاری چوٹیں مندمل ہونے میں اتنا وقت تو لیں گی۔"

انور نے اثبات میں سر ہلایا، پھر بولا۔ "میرے دوستوں نے ڈیڈی کو اطلاع تو دے دی ہو گی کہ میں غائب ہو گیا ہوں۔ وہ خاصے پریشان ہوں گے۔ میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارے پاس موبائل تو ہو گا۔"

"ہاں، ہاں کر لو بات۔" زنوبیا نے اپنے پرس سے موبائل نکالا۔

انور اس دوران میں دودھ کا آدھا گلاس ختم کر چکا تھا۔ وہ زنوبیا نے اس سے لے لیا۔ "پہلے بات کر لو مگر...... انہیں بتاؤ گے کیا؟"

"یہ بھی سوچ رہا ہوں۔ شدید الجھن ہے۔" انور نے موبائل اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "دوستوں نے تو انہیں یہی اطلاع دی ہو گی کہ میرا گھوڑا بدک کر کسی طرف بھاگ نکلا تھا اور......"

"ہاں...... میں نے تمہیں گھوڑے ہی سے گرتے دیکھا تھا۔ میں ابھی تک تم سے نہیں پوچھ سکی کہ تم گھوڑے پر تھے لیکن اس طرف کیسے آ نکلے؟"

"میں اپنے دوستوں کے ساتھ پہاڑی جنگل میں شکار کھیل رہا تھا۔" انور نے جواب دیا اور مختصر سا واقعہ زنوبیا کو بتا دیا۔

"تو اب کیا بتاؤ گے اپنے ڈیڈی کو؟"

"یہی تو سوچ رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ سب کچھ سچ سچ بتا دوں۔"

"سچ سچ؟"

"ہاں اگر میں نے بتایا کہ اپنے ہی ملک میں کسی جگہ ہوں تو وہ فوراً میرے پاس پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ کوشش کیا، پہنچ ہی جائیں گے وہاں۔"

زنوبیا نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا۔

انور نے اپنے والد اشرف حسنین گل زاد سے رابطہ کیا۔ وہ انور کی آواز سنتے ہی چیخ پڑے۔ "کہاں ہو؟ خیریت سے ہو؟"

"جی ہاں، میں......"

اشرف حسنین گل زاد اتنے مضطرب تھے کہ اس کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے بولے۔ "تمہارے دوستوں سے معلوم ہوا تھا کہ تمہارا گھوڑا بدک کر بھاگا تو نہ جانے کہاں لے گیا۔ نہ گھوڑا ملا، نہ تم۔ میں اب پولیس سے رابطہ کرنے والا تھا۔"

"میرے بارے میں آپ ابھی کو صرف یہ بتائیے گا کہ میں جہاں بھی ہوں، خیریت سے ہوں۔"

"مگر کہاں ہو؟"

"یہی تو بتانے جا رہا تھا۔" انور نے کہا اور پھر بے کم و کاست سب کچھ بتا دیا۔ حقیقت سن کر وہ پریشان ہوتے رہے۔ بیچ بیچ میں کوئی سوال بھی کر دیتے۔ سب کچھ سننے کے بعد بولے۔

"یہ لڑکی...... زنوبیا، کیا مکمل بھروسا ہے تمہیں اس پر؟"

"جی ہاں ڈیڈی...... آپ کو یاد تو ہو گا، جب آٹھ سال پہلے ہم یہاں رہتے تھے تو ہمارے پڑوس میں شاپور صاحب رہتے تھے۔ یہ انہی کی بیٹی ہیں۔"

"ہاں وہ تو مجھے یاد ہے۔ ان کے ساتھ پولو کھیلا کرتا تھا میں، یاد آ گیا، ان کی بیٹی کا نام زنوبیا تھا۔"

"جی، یہ وہی زنوبیا ہیں۔"

"واپس کیسے آؤ گے؟ کب آؤ گے؟"

"زخم ٹھیک ہونے میں ایک ہفتہ لگ سکتا ہے۔ اس کے بعد ہی واپس آ سکوں گا۔ زنوبیا کی رہنمائی میں کسی محفوظ راستے سے واپس لوٹوں گا۔"

"ایک ہفتہ...... اتنے دن تک پریشان رہوں گا میں۔ مجھے روزانہ فون کرتے رہنا بیٹے!"

"جی، ضرور۔"

گفتگو ختم کرنے کے بعد انور نے زنوبیا کا موبائل

واپس کر دیا۔

☆☆☆

دن گزرتے رہے۔ زنوبیا نے انور کا ہر طرح پورا پورا خیال رکھا۔ اس کے اندازے کے مطابق ساتویں دن انور محسوس کر رہا تھا کہ وہ بالکل ٹھیک ہو چکا ہے۔

''اب مجھے جانا چاہیے زنوبیا!'' اس نے کہا۔ ''تم وعدہ کر چکی ہو کہ مجھے......''

''سب یاد ہے انور!'' زنوبیا نہ جانے کیوں افسردگی سے بولی۔ ''ایک بار پھر بچھڑنے کا وقت آ گیا۔''

''زنوبیا!'' انور نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''اگر دونوں ملکوں کی کشیدگی بڑھتی رہی تو شاید ہم پھر کبھی نہ مل سکیں لیکن تم مجھے ہمیشہ یاد رہو گی۔ ہاں اگر حالات کبھی ٹھیک ہو گئے تو میں پاسپورٹ کے ذریعے آؤں گا تم سے ملنے۔ تمہارا گھر اب بھی وہی ہے نا؟''

زنوبیا نے سر ہلایا، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی آئی جو انور کے خیال کے مطابق جبری تھی، وہ بولی۔ ''ہم آج رات کو یہاں سے روانہ ہوں گے۔ کھانا جلدی کھا لینا۔ اندھیرا پھیلتے ہی روانگی ہوگی۔''

''ٹھیک ہے۔''

پھر باقی دن اس طرح گزرا کہ زنوبیا نے بہت زیادہ وقت انور سے باتیں کرتے ہوئے گزارا۔ باتوں کے دوران میں وہ امراء القیس کے اشعار بھی سناتی رہی۔ دونوں ملکوں کے حالات پر بھی گفتگو ہوئی۔ زنوبیا کا خیال تھا کہ اب ان کی ملاقات پھر کبھی نہیں ہوگی کیونکہ دونوں ملکوں کی بڑھتی ہوئی کشیدگی میں اضافہ یقینی نظر آ رہا تھا جبکہ کشیدگی ختم ہونے کا امکان برائے نام ہی تھا۔

انور نے اس گفتگو میں زنوبیا کے دلی جذبات بھی پڑھ لیے۔ نتیجہ یہ کہ اس کے دل میں بھی زنوبیا کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو گیا۔ اس نے اپنے خیال کے مطابق زنوبیا کا دل رکھنے کے لیے کہا۔ ''کیسا عجیب اتفاق ہوا ہے کہ ہم آٹھ سال بعد حادثاتی طور پر ایک دوسرے سے ملے ہیں۔ کیا عجب کہ ایسا خوش گوار حادثہ دوبارہ بھی ہو جائے۔''

زنوبیا عجیب سے انداز میں ہنس پڑی اور اس نے کہا۔ ''بقول شاعر، دل کو بہلانے کی بات ہے۔ خیر! موبائل فون پر تو ہمارا رابطہ رہے گا۔ تم نے میرا نمبر تو ذہن نشین کر لیا ہے نا؟''

''خوب اچھی طرح۔'' انور نے کہا۔ ''اپنے پاس لکھ کر اس لیے نہیں رکھا کہ اگر یہاں سے جاتے وقت بارڈر پولیس کے ہاتھ لگ جاؤں تو انہیں میرے پاس سے وہ نمبر نہ مل سکے جو تمہارے لیے پریشانی کا سبب بنے۔''

''کوئی امکان نہیں ہے کہ تم بارڈر پولیس کے ہاتھ لگو۔'' زنوبیا نے کہا۔ ''میں اس وادی سے لے کر سرحد تک اس زمین کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ کچھ لوگ کن راستوں سے سرحد پار آتے جاتے رہتے ہیں۔'' زنوبیا کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا لیکن انور احتیاط برتنا چاہتا تھا۔

اس شام اندھیرا پھیلنے تک وہ دونوں کھانا کھا چکے تھے جس کے بعد روانگی تھی۔ انور کے لیے لباس کا بندوبست زنوبیا نے پہلے ہی دن کر دیا تھا۔ اس کا ملازم شہر جا کر وہ سب کچھ لے آیا تھا جو زنوبیا کے خیال کے مطابق انور کے لیے ضروری تھا۔

''ایک وعدہ کرو گے انور؟'' روانگی سے کچھ ہی لمحے پہلے زنوبیا نے کہا۔ ''میں تمہیں ایک لفافے میں بند کوئی چیز دینا چاہتی ہوں جو تم اپنے ملک میں پہنچنے سے پہلے نہیں دیکھو گے۔''

''ایسی کیا چیز ہے؟''

''اگر یہ بتانا ہوتا تو میں تم سے وعدہ کیوں لیتی؟''

''اچھا۔'' انور خفیف سا مسکرایا۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں۔ لاؤ، کہاں ہے لفافہ؟''

''ابھی نہیں۔'' زنوبیا نے کہا۔ ''جب تم سرحد پر جدا ہو گے، تب دوں گی۔ چلو اب اٹھو۔''

انور کھڑا ہو گیا۔

روانگی زنوبیا کی کار میں ہوئی جو ریسٹ ہاؤس کے باہر کھڑی تھی۔ زنوبیا نے انور کو ڈرائیونگ سیٹ کے برابر میں بٹھایا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اس نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا ملازم بھی ڈرائیونگ جانتا ہے لیکن میں عموماً خود ہی ڈرائیو کرتی ہوں۔''

''خود اعتمادی بہت ہے تم میں۔''

زنوبیا مسکرا کر رہ گئی۔

کار کے اس سفر میں انور نے دیکھا کہ وہ وادی کتنی خوب صورت تھی، لیکن کار کے سفر کے لیے خطرناک بھی! راستے ایسے تھے کہ ایک جانب کھائی اور دوسری جانب پہاڑ تھے۔ راستہ بھی اتنا چوڑا نہیں تھا کہ بہ یک وقت دو گاڑیوں سے زیادہ چل سکتیں۔ کار بلندی کی طرف جا رہی تھی۔

زنوبیا بولی۔ ''ایک امکان ہے کہ بارڈر پولیس کے لوگ دوربین سے ہر طرف کی نگرانی کرتے ہوئے یہ کار بھی

دیکھ لیں مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ میری کار پہچانتے ہیں۔ میری ہی کیا، وہ ان سبھی کاروں کو پہچانتے ہیں جو اس وادی میں آتی جاتی رہتی ہیں۔"

"تو وہ مجھے دیکھ سکتے ہیں تمہارے ساتھ بیٹھے ہوئے؟"

"ہاں دیکھ سکتے ہیں کہ میرے ساتھ کوئی ہے مگر انہیں یہ خیال تو نہیں آسکتا کہ تمہارا تعلق اس ملک سے نہیں۔"

انور اردگرد نظر دوڑانے لگا۔ اس نے وادی کے حسن کی تعریف کی۔ انہی باتوں میں کار کا سفر جاری رہا۔ آخر کار ایک جگہ روک دی گئی۔

"یہاں سے آگے کار لے جانا ممکن نہیں ہے۔" زنوبیا نے کہا۔ "ہم اب اس بلندی پر ہیں جہاں سے تم گرے تھے۔ اب ہمیں گھنے درختوں کے درمیان پیدل چلنا ہوگا۔"

جس جگہ کار روکی گئی تھی، وہاں اسے دوربین سے بھی نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔

کار سے اُتر کر انور نے کہا۔ "تم کتنا پیدل چل سکتی ہو؟"

"زیادہ نہیں چلنا ہے۔ پندرہ بیس منٹ بعد تم سرحد پر ہوگے جہاں سے آگے صرف تم جاؤ گے۔ میں تم سے جدا ہو جاؤں گی۔" آخری فقرہ کہتے ہوئے زنوبیا کی آواز بھرا گئی تھی۔

انور نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

ان دونوں نے گھنے جنگل میں آگے بڑھنا شروع کیا۔ انور کے لیے اب تک کوئی خطرہ سامنے نہیں آیا تھا۔ زنوبیا کی یہ بات درست ہی ثابت ہو رہی تھی کہ وہ انور کو کسی خطرے سے دوچار نہیں ہونے دے گی اور وہ سرحد پار اپنے ملک میں پہنچ جائے گا۔

آخر زنوبیا ایک جگہ رک گئی۔

"اب آگے صرف تم جاؤ گے۔" وہ بولی۔ "پانچ منٹ بعد تم اپنے ملک کی سرحد پر ہوگے۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ اپنے ملک کی سرحد کے نگراں فوجیوں کی نظر سے کس طرح بچو گے۔ اگر نہ بچ سکے تو بھی پریشانی وقتی ہوگی۔ پوچھ گچھ کے بعد تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ اس کا امکان بہرحال کم ہے کہ تم کسی پریشانی میں پڑو، میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ اس راستے سے لوگ اکثر آتے جاتے رہتے ہیں۔"

"ہوں۔" انور خفیف سا مسکرایا۔ اندھیرے میں اس کی مسکراہٹ زنوبیا نہیں دیکھ سکی ہوگی۔ درختوں کی بہتات کے باعث تاریکی اتنی ہی گہری تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو ہیولوں کی طرح ہی دیکھ سکتے تھے۔

"تو اب میں تمہیں الوداع کہوں۔" وہ ایک لمحہ رک کر بولا۔

"ہاں۔" زنوبیا کی آواز بھرا گئی اور اس نے ایک لفافہ انور کی طرف بڑھایا۔ "میں نے کہا تھا نا کہ......"

"مجھے یاد ہے۔" انور نے لفافہ لیتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے ملک میں پہنچنے کے بعد ہی دیکھوں گا کہ اس میں کیا ہے۔"

"الوداع انور!"

"تم اس اندھیرے میں اکیلی واپس جاؤ گی۔ ڈر نہیں لگے گا تمہیں؟"

"نہیں۔ میں کئی بار یہاں تک آچکی ہوں۔ بس دیکھنے کے لیے۔ لوگوں سے سنا تھا کہ لوگ یہاں سے سرحد کے پار آتے جاتے رہتے ہیں۔"

"تو اب میں بھی جاؤں؟"

"میں تمہیں الوداع کہہ چکی ہوں۔"

"الوداع زنوبیا!" انور نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ اس وقت اسے پہلی بار اپنے قدم بوجھل ہوتے محسوس ہوئے۔ اسے یہ احساس بھی تھا کہ زنوبیا اس وقت تک اس کی طرف دیکھتی رہے گی جب تک اس کا ہیولا اندھیرے میں مدغم نہیں ہوجائے گا۔

☆☆☆

دوسرے دن انور اپنے گھر پہنچ گیا۔ سرحد کے ایک قریبی شہر سے اس نے فلائٹ لی تھی۔ ٹکٹ کے لیے اس کے پاس ڈالر تھے جو اسے زنوبیا نے دیے تھے۔

"یہ قرض سمجھ کر لے لو۔ اپنے ملک سے تمہیں جب بھی موقع ملے، کسی طرح واپس بھجوا دینا۔ میں نہیں چاہتی کہ تم اسے میرا احسان سمجھو۔"

حالانکہ جو دن اس نے زنوبیا کے ریسٹ ہاؤس میں گزارے تھے وہ بھی اس پر زنوبیا کا احسان ہی تھے۔

اپنے گھر پہنچنے سے پہلے ہی انور فلائٹ میں وہ لفافہ کھول کر دیکھ چکا تھا اور اس میں اسے زنوبیا کے "محبت نامے" ہی کی امید تھی۔ اس نے لکھا تھا۔

"انور! میں اتنے دنوں میں بھی تم سے براہِ راست وہ بات نہیں کہہ سکی جو لکھ رہی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تم نے ان دنوں میں خود بھی سمجھ لیا ہوگا۔ آئی لو یو انور! آئی لو یو سچ! اور یہ

اس اتفاقی ملاقات کے موقع پر نہیں ہوا۔ یہ محبت تو میں آٹھ سال سے اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہوں۔ جب تم میرے ملک میں رہتے تھے، تبھی میں تمہیں پسند کرنے لگی تھی۔ اپنی محبت کی شدت کا احساس مجھے اس دن ہوا تھا جب تم میرا ملک چھوڑ کر جا رہے تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ ان آٹھ سالوں میں کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا ہوگا جب تم میری یاد کے پردے پر نہ جھلملائے ہو۔ ذرا بھی امید نہیں تھی کہ تمہیں پھر بھی دیکھ سکوں گی لیکن آٹھ سال بعد شاید میری محبت ہی تمہیں حادثاتی طور پر یہاں کھینچ لائی۔ یقین کرو، جب تم بے ہوشی کی حالت میں ملے تھے اور میں نے تمہیں پہچانا تھا تو میری آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آگئے تھے لیکن اس مرتبہ یہ خوشی کے آنسو تھے پھر ان چند دنوں میں مجھے یہ ڈر بھی رہا کہ تم پھر بچھڑ جاؤ گے۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ اگر تم نے اپنے وعدے کے مطابق مجھے فون کیا تو میں خوش ہو جاؤں گی کہ تمہارے دل میں بھی میرے لیے تھوڑی بہت جگہ ہے۔ میں بہت بے چینی سے تمہاری کال کا انتظار کروں گی۔ کرو گے نا فون؟ یہ اندازہ تو ہے کہ میں اب تمہیں کبھی نہیں پا سکوں گی، پھر بھی ایسا خوش گوار حادثہ نہیں ہوگا لیکن یہ بھی میرے لیے بہت ہے کہ تم سے کبھی کبھی بات ہو جایا کرے۔ تم اس کاغذ پر کچھ دھبے دیکھ رہے ہو گے۔ یہ میرے آنسو ہیں انور جو یہ خط لکھتے ہوئے میری آنکھوں سے ٹپک رہے ہیں۔ کیا تمہارے دل میں ان آنسوؤں کی قدر ہو گی؟ تم مجھے فون کرو گے نا انور! کرو گے نا؟...... محبت کے معاملے میں بدنصیب، زنوبیا۔"

اس خط کو پڑھتے ہوئے انور بھی جذباتی ہو گیا تھا۔ اس وقت اس کے جو احساسات تھے، ان کی ترجمانی وہ خود بھی نہیں کر سکتا تھا۔ آٹھ سال تک وہ اس بات سے بے خبر رہا کہ ایک خوب صورت لڑکی اس کی محبت میں تڑپتی رہی تھی۔

انور گھر پہنچا تو اس کے والد نے اسے سینے سے لگا لیا۔ خوشی کے آنسو ان کی آنکھوں میں بھی آگئے تھے۔ اس کے بہن بھائی یا والدہ نہیں تھے ورنہ ان کی بھی یہی حالت ہوتی۔ اس کے والد نے اسی وقت کہا کہ بیٹا مل جانے کی خوشی میں وہ اسی رات جشن منائیں گے جس میں تمام جاننے والوں کو مدعو کیا جائے گا پھر انہوں نے اس سے کہا کہ وہ اپنے کمرے میں جا کر آرام کرے۔

اپنے کمرے میں آکر بستر پر لیٹتے ہی اس نے اپنا موبائل نکالا لیکن فوری طور پر زنوبیا کا نمبر نہیں ملا سکا۔

طیارے میں بیٹھنے سے پہلے بھی اس کی خواہش تھی کہ زنوبیا کو فون کرے لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا کہ وہ زنوبیا سے کیا کہے گا اور اب بھی اس کی یہی کیفیت تھی۔ آخر چند منٹ بعد اس نے نمبر ملا ہی لیا۔

دوسری طرف گھنٹی بجی اور فوراً ہی کال ریسیو کی گئی۔

"انور! انور!...... مجھے یقین ہے کہ تم ہی ہو...... مجھے......" زنوبیا یکا یک ہانپنے لگی۔ وہ بالکل ہذیانی انداز میں بولی تھی۔

"ہاں زنوبیا! میں ہی بول رہا ہوں۔" انور کی آواز میں ایسی لرزش تھی جیسے وہ بھی جذباتی ہو گیا ہو۔

"خیریت سے پہنچ گئے تھے نا؟ گھر سے ہی بول رہے ہو؟ میں تو رات سے جاگ رہی ہوں۔ انتظار کرتی رہی تمہارے فون کا...... اس وقت میری آنکھیں خوشی سے بھیگ گئی ہیں انور! مجھے لگتا ہے، میں خوشی سے پاگل ہو جاؤں گی۔ آٹھ سال بعد تم سے ملی اور اب تمہاری آواز سن رہی ہوں۔ تم نے میرا خط پڑھ کر کیا محسوس کیا۔ میں بس یہی سوچتی رہی اور......"

"سانس تو لے لو زنوبی!" انور نے اس کی بات کاٹ دی ورنہ وہ نہ جانے کیا کیا بولتی رہتی۔ انور کے ٹوکنے پر وہ ہنسی۔ ہنسنے کا انداز بھی پاگلوں جیسا تھا۔

"زنوبی کہا تم نے۔" وہ بولی۔ "بہت اچھا لگا انور...... بہت اچھا لگا۔"

"تھوڑا سا پانی پی لو۔ اپنی وحشت پر قابو پاؤ۔"

"تمہاری آواز سن کر میری بھوک پیاس سب اڑ چکی ہے۔"

"میری بات مانو! پانی پی لو۔"

"اچھا، ہولڈ کرنا۔ لائن ڈس کنیکٹ نہ ہو۔"

"میں ہولڈ کیے ہوئے ہوں زنوبی۔"

"اچھا، اچھا۔" دوسری طرف ایک منٹ کے لیے خاموشی چھا گئی، پھر زنوبیا کے ہنسنے کی آواز آئی۔ "پی لیا پانی۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ٹھیک کیا۔ اب تمہاری آواز صاف ہو گئی۔ ہانپ رہی تھیں اور بولے جا رہی تھیں۔"

"میرے سوال کا جواب نہیں دیا تم نے؟"

"تم نے تو ایک سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔ کس سوال کا جواب دوں؟"

"میرا خط پڑھ کر کیا محسوس کیا تم نے؟"

"شرمندہ ہوا کہ ایک خوب صورت لڑکی مجھے آٹھ

سال تک اپنے دل میں بسائے رہی اور میں بے خبر رہا۔"
"خوب صورت ہوں میں؟" وہ زور سے ہنسی۔
"اس سے زیادہ خوب صورت کون ہو سکتا ہے جو مجھے چاہتا ہو۔"
"واہ!" وہ پھر ہنسی۔ "جو لڑکی بھی تمہیں چاہے گی، اسے خوب صورت کہو گے؟"
اب انور کو ہنس کر چپ ہو جانا پڑا۔ زنوبیا نے بات ہی ایسی کہی تھی جس کا جواب نہیں دیا جا سکتا تھا۔
"تمہارے پاس کمپیوٹر، مائک اور کیمرا تو ہوگا؟"
"یقیناً۔"
"میرے پاس بھی ہے۔ اب اسی پر بات کرو۔ میں تمہیں دیکھ سکوں گی، تم مجھے دیکھ سکو گے۔ یہاں تو میرے پاس کمپیوٹر نہیں ہے۔ میں یہاں لیپ ٹاپ اس لیے نہیں لاتی کہ ساری توجہ مصوری پر رہے۔ اب میں کل ہی یہاں سے گھر روانہ ہو جاؤں گی۔ کل تم مجھ سے اسکائپ پر بات کرنا۔"
اس کے بعد بھی زنوبیا بہت سی باتیں کرتی رہی۔ آٹھ سال پہلے کے بہت سے خوش گوار واقعات سناتی رہی۔ وہ واقعہ بھی جس کی وجہ سے اس کے دل میں انور کے لیے پسندیدگی کا جذبہ پیدا ہوا تھا جو بہت تیزی سے بڑھتے ہوئے محبت میں تبدیل ہو گیا۔
زنوبیا نے لفظ "محبت" استعمال کیا تھا لیکن انور نے محسوس کیا تھا کہ زنوبیا اس سے "عشق" کرنے لگی تھی۔ کسی دور چلے جانے والے کو آٹھ سال تک دل میں بسائے رکھنا، پھر ملنے پر خوشی اور دوبارہ بچھڑنے پر آنکھوں میں آنسو صرف محبت کی نہیں، عشق کی علامت تھے۔
وقت گزرتا رہا۔ زنوبیا اپنی اور انور اپنی زندگی کے مراحل طے کرتا رہا۔ ان دونوں میں "اسکائپ" کے ذریعے باتیں ہوتی رہیں، وہ اسکرین پر ایک دوسرے کو دیکھتے بھی رہے۔ وقت بھی طے تھا کہ رات کو وہ کس وقت بات کریں گے۔
کسی کی محبت فریق ثانی کے دل میں بھی محبت کا بیج ڈال دیتی ہے۔ ایسا ہی انور کے ساتھ بھی ہوا۔ اس کے دل میں بھی زنوبیا کے لیے جذبات شدت اختیار کرتے چلے گئے۔ زنوبیا کی طرح وہ بھی محسوس کرنے لگا کہ زنوبیا کے علاوہ کسی اور لڑکی کے ساتھ زندگی گزارنے کا تصور بھی اب اس کے لیے ناممکن ہو چکا ہے اور زنوبیا تو آٹھ سال سے اس کے فراق میں تھی۔

محبتوں میں کوئی سرحد نہیں ہوتی مگر ان کے ملکوں میں تو سرحد تھی۔ حکومتوں کی کشیدگی بڑھنے کے بعد ویزے کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ نہ زنوبیا، انور سے ملنے آ سکتی تھی اور نہ وہ اس سے ملنے جا سکتا تھا۔
پھر کیا ہوگا؟
ان دونوں کی محبت کب تک رنگ لائے گی؟
اس بارے میں دونوں ہی کرب کا شکار تھے۔ دونوں ملکوں کے حالات کی بڑھتی ہوئی سنگینی کے باعث ان کی یہ امید دم توڑتی جا رہی تھی کہ وہ کبھی ایک دوسرے سے مل سکیں گے۔ دونوں عہد کر چکے تھے کہ ان کی زندگی اگر ساتھ نہ گزر سکی تو تنہا گزرے گی۔
انور ایک تجارت پیشہ شخص کا بیٹا تھا لیکن اس کا رجحان فوج کی طرف تھا۔ باپ نے بھی اس کی خواہش نظر انداز نہیں کی۔ وہ فوج میں ہو گیا۔ اس نے زنوبیا کو اس بات سے آگاہ نہیں کیا۔ اسے اندیشہ تھا کہ زنوبیا اس کی مخالفت کرے گی تو وہ اس کے سامنے بے بس ہو جائے گا اور زنوبیا سے جھوٹ بولنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔
کئی سال گزر گئے۔ انور فوج میں کیپٹن بن چکا تھا۔ دونوں ملکوں کی کشیدگی اب اتنی بڑھ چکی تھی کہ شاید ہی کوئی دن جاتا ہو جب کنٹرول لائن پر دونوں طرف سے ایک شدید جھڑپ نہ ہو جاتی ہو۔
عام لوگوں کو تعجب تھا کہ اتنے عرصے کی کشیدگی اور بڑھتی ہوئی کشیدگی کے باوجود دونوں ملکوں میں جنگ نہیں ہوئی تھی، بس جھڑپوں میں شدت آتی چلی گئی تھی۔
اس کا سبب یہ تھا کہ دو بڑی طاقتیں تو ان کو باقاعدہ جنگ کے شعلوں میں دھکیلنا چاہتی تھیں لیکن دنیا کے دیگر بڑے ممالک اس کے خلاف تھے۔ ان کی سفارتی سرگرمیوں کے باعث باقاعدہ جنگ نہیں چھڑی تھی لیکن سرحد پر روزانہ ہی دونوں ملکوں کے کچھ فوجیوں کی ہلاکتیں ہونے لگی تھیں۔ کبھی کبھی سرحد کے قریب غریب لوگوں کی بستیاں بھی گولوں کی زد میں آ جاتیں۔ دونوں ہی ملک اس کا الزام ایک دوسرے پر لگاتے۔
ایک وقت آیا جب انور کو بھی سرحد پر جانا پڑا۔ وہ لیپ ٹاپ ساتھ لے گیا تاکہ زنوبیا سے رابطہ قائم رہ سکے لیکن اس کا امکان تھا کہ اگر وہ کسی بڑی جھڑپ میں انگیج ہو گیا تو لیپ ٹاپ کا استعمال نہیں کر سکے گا اس لیے اس نے ایک نہایت قیمتی اسمارٹ موبائل بھی اپنے ساتھ رکھا۔ اس پر بھی وہ دونوں ایک دوسرے سے بات کر سکتے تھے اور ایک

دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔
اسکاپ کے بجائے موبائل؟
اس بارے میں انور نے ایک بہانہ سوچ لیا تھا۔
جب اسے سرحد پر بھیجا گیا تو اس نے محسوس کیا کہ معاملہ کسی چوکی کی حفاظت کا نہیں تھا۔ کوئی زیادہ بڑی بات ہونے والی تھی ورنہ پورے ایک بریگیڈ کی سرحد پر تعیناتی کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سارا علاقہ پہاڑی تھا لیکن کہیں کہیں خودرو پودے بھی تھے۔

☆☆☆

ایک شام بریگیڈیئر شمس نے انور کو اپنے خیمے میں طلب کیا۔ تنہائی میں وہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ انور نے بریگیڈیئر کو خاصا متفکر پایا۔ انور کو بلانے کے بعد بھی وہ فوراً کچھ نہیں بولا۔ اس کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ کچھ لمحوں بعد انور کی طرف متوجہ ہوا۔

''میں نے تمہیں ایک ایسے کام کے لیے بلایا ہے جو بہت اہم ہے، بہت ضروری ہے اور چوبیس سے چھتیس گھنٹوں کے اندر ہو جانا چاہیے۔ کام بھی ایسا ہے جسے کوئی اکیلا آدمی ہی کر سکتا ہے۔''

''سر!''

''مجھے تمہارے بارے میں رپورٹ ملی تھی کہ تم غیر معمولی طور پر پھرتیلے، بہترین نشانے باز اور تیزی سے فیصلہ کر کے قدم اٹھانے کی صلاحیت رکھتے ہو۔ اسی لیے میں نے اس کام کے لیے تمہارا انتخاب کیا ہے۔''

''کسی اہم کام کے لیے میرا انتخاب میرے لیے اعزاز ہے سر!''

بریگیڈیئر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ اب تک ان میں جو باتیں ہوئی تھیں، وہ بھی کھڑے کھڑے ہوئی تھیں۔ انور خاموشی سے بریگیڈیئر کے مزید بولنے کا منتظر رہا۔ اس کی نگاہیں بریگیڈیئر کے ٹہلنے کے ساتھ متحرک تھیں۔

''آج کے دور میں جبکہ سائنس اتنی ترقی کر چکی ہے، یہ کام کسی آدمی سے لینا بہت عجیب سا ہے۔ کسی تک کوئی پیغام پہنچانے کے لیے بعض اوقات کچھ ایسی صورتِ حال بن جاتی ہے کہ وائرلیس یا موبائل فون کا استعمال مخدوش ہو جاتا ہے۔ تمہیں وہ پیغام ہی یہاں سے بیس میل دور کسی جگہ پہنچانا ہے۔''

''میں تیار ہوں سر! آپ مجھے بتایئے۔''

''تمہیں یہاں سے جنوب کی طرف لگ بھگ بیس میل دور جانا ہوگا۔ دو میل کے بعد تم دشمن کی سرحد میں داخل ہو چکے ہو گے۔ اس کے بعد تمہیں یہ احتیاط کرنی پڑے گی کہ تم کسی کی نظر میں نہ آسکو۔ اس راہ میں دو بستیاں بھی پڑیں گی۔ تمہیں ان سے بھی بچ کر نکلنا ہوگا۔ تمہیں تیسری بستی تک پہنچنا ہے۔ اس کی شناخت بہت آسان ہے۔ بہت بڑا گرجا ہے وہاں جو دور سے ہی نظر آجائے گا۔ باقی دونوں بستیوں میں تو کوئی گرجا سرے سے ہے ہی نہیں۔ پوری توجہ سے سن رہے ہو نا؟''

''سر!'' انور نے جواب دیا۔ ''آپ کا ایک ایک لفظ میرے دماغ پر نقش ہوتا جا رہا ہے۔ آپ چاہیں تو مجھ سے سن لیں۔ آپ کی ساری باتیں لفظ بہ لفظ دہرا دوں گا۔''

''لفظ بہ لفظ؟'' بریگیڈیئر شمس کو حیرت ہوئی تھی۔

''جی سر۔''

''سناؤ۔''

انور نے بولنا شروع کیا اور بریگیڈیئر کا منہ حیرت سے کھلتا چلا گیا اور جب انور چپ ہوا تو بریگیڈیئر کے چہرے سے پہلی مرتبہ تفکر کے آثار غائب ہوئے اور ان کی جگہ کسی حد تک مسرت نے لے لی۔

''حیرت انگیز یادداشت۔'' وہ بولا۔ ''مجھے خود یاد نہیں کہ میں نے کیا لفظ استعمال کیے تھے لیکن یہ جانتا ہوں کہ میں نے یہی سب کچھ کہا تھا۔ تمہاری یہ صلاحیت تو میرے لیے بہت ہی مفید ہے۔ جو پیغام مجھے تحریری طور پر بھیجنا تھا، وہ اب تم ذہن نشین کر لینا تاکہ اگر کسی خطرے میں پڑو اور دشمن کے ہاتھ لگ جاؤ تو وہ پیغام دشمن کے ہاتھ نہ لگ سکے۔''

''کتنا بڑا پیغام ہے سر؟''

''تم نے میری جتنی باتیں دہرائی ہیں، اس سے کچھ زیادہ ہے۔ وہ میں لکھ بھی چکا ہوں جواب تمہیں پڑھوا دوں گا۔''

''وہ پیغام مجھے گرجا والی بستی میں کسے پہنچانا ہے سر؟''

''گرجا کے پادری سیموئل کو۔'' بریگیڈیئر نے جواب دیا۔ ''دراصل وہ ہماری فوج کی ایک ایجنسی کا جاسوس ہے۔ کرسچیانٹی پر اسے عبور حاصل ہے اس لیے وہاں کا پادری بننا اس کے لیے بہت زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔''

''اس کا اصل نام کچھ اور ہوگا لیکن میں یہی پوچھوں گا سر کہ پادری سیموئل کیا گرجا ہی میں ملے گا؟''

''ہاں، وہیں ملے گا۔ اب تم یہ پیغام دیکھ لو۔'' اس نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر انور کی طرف بڑھایا۔

انور نے وہ سطریں دو بار پڑھیں اور کاغذ بریگیڈیئر کو واپس کر دیا۔

"یاد ہو گیا تمہیں؟" بریگیڈیئر نے پوچھا۔

"یس سر!"

"سناؤ۔"

انور نے بولنا شروع کیا۔ بریگیڈیئر کی نظریں اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذ پر جمی ہوئی تھیں۔ انور کے خاموش ہوتے ہی وہ مسکرایا۔

"شاندار" اس نے کہا۔ "اب مجھے یقین کرنا پڑے گا کہ تم نے میری جو باتیں دہرائی تھیں، وہ یقیناً لفظ بہ لفظ دہرائی ہوں گی۔ اب ایک بات اور سنو! ہو سکتا ہے تمہیں سیموئیل سے رابطہ کرنے میں دشواری ہو۔ ایسی صورت میں برگنوا سے مل لینا۔ اس کا گھر گرجا کے قریب ہی ہے۔ سرخ اینٹوں کا دو کمروں کا معمولی مکان۔ سرخ اینٹوں کا وہاں کوئی مکان نہیں ہے۔ برگنوا سے تمہیں صرف "آپریشن بلو" کہنا ہو گا۔ یہ کوڈ ورڈ ہے۔ وہ تمہاری ہر ہدایت پر عمل کرے گا۔"

"میں سمجھ گیا، اب اگر آپ پوچھنے کی اجازت دیں تو میں جاننا چاہوں گا کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ پیغام سے میں نے یہ تو سمجھ لیا ہے کہ بہت سنگین صورتِ حال ہے لیکن میں وضاحت سے سمجھنا چاہتا ہوں اگر آپ مناسب سمجھیں۔"

"میں بتاتا ہوں تمہیں۔" بریگیڈیئر نے قریب آ کر انور کا شانہ تھپکا۔ "دراصل گزشتہ دنوں دشمن نے ہماری تین چوکیوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس سلسلے میں بین الاقوامی سطح پر شور مچانے اور احتجاج کرنے سے بھی معاملہ بدستور ہے لہٰذا حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کا بڑا بھرپور جواب دیا جائے گا۔ ہمیں دشمن کی کسی چوکی پر نہیں بلکہ اس کے ایک چھوٹے سے شہر پر قبضہ کرنا ہے۔ اس کے لیے جو منصوبہ بنایا گیا ہے، اس کے مطابق ہمارے بریگیڈ کے علاوہ ایک اور بریگیڈ شمال میں اس بستی سے چند میل دور ہے۔ پادری سیموئیل وہ پیغام اس بریگیڈ تک پہنچا دے گا۔ اسے تم یہ پیغام لکھ کر دو گے۔ وہ تمہاری طرح اسے لفظ بہ لفظ یاد نہیں رکھ سکتا اور یہ ضروری ہے کہ پیغام لفظ بہ لفظ اس بریگیڈ تک پہنچے۔ یہ اشاراتی زبان ہے جس میں ایک لفظ کی غلطی بھی سارا معاملہ خراب کر سکتی ہے۔ وہ بریگیڈ اور ہمارا بریگیڈ مخصوص اوقات میں مخصوص سمتوں سے ایڈوانس کریں گے اور اس شہر پر قبضہ کرنے کے لیے ہمیں کچھ زیادہ قربانیاں بھی دینی پڑیں گی۔ ہمیں اپنی فتح کا مکمل یقین ہے۔"

"معاف کیجیے گا سر! کیا میں اس سلسلے میں اپنی کچھ تشفی کر لوں؟"

"ہاں، ہاں، پوچھو کیپٹن۔"

"چوکیوں پر قبضہ کرنا کوئی بہت بڑا معاملہ نہیں لیکن شہر پر قبضے کی صورت میں تو معاملہ بہت خراب ہو جائے گا۔ دونوں ملکوں میں باقاعدہ جنگ بھی چھڑ سکتی ہے۔ کیا یہ مناسب نہ ہوتا کہ ہم اپنی ان چوکیوں ہی کو دشمن سے واپس لینے کی منصوبہ بندی کرتے؟"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ہمیں تو وہ کرنا ہے جس کا ہمیں حکم ملا ہے۔ یہ فیصلہ سول ملٹری اجلاس میں ہوا تھا۔ اس کا کوئی سیاسی پہلو ہے تو وہ ہماری حکومت ہی جانتی ہو گی اور اگر اس کے نتیجے میں باقاعدہ جنگ چھڑ سکتی ہے یا نہیں، یا اس کے کیا نتائج مرتب ہو سکتے ہیں، اس کی ذمے داری بھی حکومت پر ہے۔ ہمیں تو بس وہ کرنا ہے جس کا ہمیں حکم ملا ہے۔ بس، اب مزید کوئی سوال نہیں کرنا۔"

"اب کوئی سوال میرے ذہن میں نہیں ہے سر! ہاں ایک سوال ہے تو سہی لیکن اس کا جواب بھی ہے۔ یقیناً جی ایچ کیو اس سارے معاملے میں آپ سے رابطے میں ہو گا۔"

بریگیڈیئر خفیف سا مسکرا دیا لیکن کچھ بولا نہیں۔

"غالباً مجھے ابھی روانہ ہو جانا چاہیے؟" انور بولا۔

"یقیناً۔" بریگیڈیئر نے جواب دیا۔ "میں نے تم سے کہا تھا نا کہ چوبیس سے چھتیس گھنٹوں میں یہ پیغام منزل تک پہنچ جانا چاہیے اور اس میں سے وہ وقت کم ہو چکا ہے جتنی دیر ہماری یہ باتیں ہوئی ہیں، اتنا اور کہوں گا کہ تمہیں اس سلسلے میں جو بھی تیاری کرنی ہے، خود ہی کرنی ہے۔ مجھے کوئی سروکار نہیں کہ تم کیا طریقہ اپناؤ گے، کس قسم کا لباس پہنو گے، کس قسم کے ہتھیار ساتھ لے جاؤ گے، وغیرہ وغیرہ۔"

انور اجازت لے کر اپنے خیمے میں آیا۔ سب سے پہلے اس نے زنوبیا سے موبائل فون پر رابطہ کیا حالانکہ دو گھنٹے پہلے وہ بات کر چکا تھا۔

"خیریت؟" زنوبیا کے لہجے میں تشویش تھی۔ "اتنی جلدی دوبارہ فون تم نے کبھی نہیں کیا۔"

"خیریت ہے زنوبیا!" انور نے کہا۔ "میں تمہیں یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ آئندہ چھتیس گھنٹے ایسے ہیں کہ مجھے مستقل ڈیڈی کے ساتھ رہنا ہے۔ ان کے سامنے میں تمہیں فون نہیں کر سکتا، نہ تم مجھے فون کرنا۔"

''اچھا ہوا تم نے مجھے بتا دیا۔ کوئی ایمرجنسی ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ لیکن چھتیس گھنٹے بعد فون ضرور کرنا۔ مجھ سے تو بارہ پندرہ گھنٹے کا انتظار بھی نہیں ہوتا۔''

اس گفتگو کے بعد انور نے اپنی وردی کے اوپر ہی دیہاتیوں جیسا سادہ لباس پہنا۔ سردیوں کا زمانہ تھا۔ اس لیے کمبل بھی اوڑھا۔ ایک نائٹ وژن دوربین لی جو لباس میں چھپائی جا سکتی تھی۔ ہتھیاروں میں اس نے بریٹا کا نائن ایم ایم پسٹل منتخب کیا جس کی بیرل تین اعشاریہ زیرو سات اور اوورال ہائٹ چار اعشاریہ سات جس میں چھ راؤنڈ ہوتے ہیں۔ انور نے پسٹل بھر کر چھ اضافی راؤنڈ بھی لیے۔ زیادہ اسلحہ وہ اس لیے نہیں لے جا سکتا تھا کہ ساتھ میں خورونوش کا سامان بھی تھا۔ ویسے بھی بڑا ہتھیار پوشیدہ نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ دیہاتی لباس کا انتخاب اسے اس لیے کرنا پڑا کہ راہ میں پڑنے والی بستیوں کے کسی شخص سے آمنا سامنا ہو جائے تو کوئی پریشانی نہ ہو۔

لباس کے لیے اسے قریب کی ایک دیہی بستی تک جانا پڑا تھا اس لیے ساری تیاری میں ڈھائی گھنٹے گزر گئے جب وہ اپنی مہم پر روانہ ہوا تو پیغام پہنچانے کے لیے اس کے پاس تینتیس گھنٹے تھے۔

اس کے قریبی ساتھیوں نے اس کی تیاریوں کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پوچھ بیٹھے کہ کیا بی ایس ایچ صاحب کسی خفیہ مہم پر بھیج رہے ہیں؟

سارے بریگیڈ میں بریگیڈیئر شمس کو ''بی ایس ایچ'' کہا جاتا تھا۔

انور نے انہیں کوئی واضح جواب دینے کے بجائے ''اشارتاً'' کہہ دیا تھا کہ ان کی قیاس آرائی غلط نہیں۔

جب وہ تاریک سنگلاخ راستوں پر روانہ ہوا تو اس کے دیہی لباس کے نیچے فوجی وردی تو تھی لیکن پیروں میں فوجی جوتوں کے بجائے چپلیں تھیں۔ دیہی لباس کے ساتھ بوٹ پہننا مضحکہ خیز بات ہوتی اور بھیس بدلنا بے معنی ہو جاتا۔

موسم زیادہ سرد تو نہیں تھا لیکن اتنی ٹھنڈک ضرور تھی کہ کمبل اوڑھنا بے جواز نہیں تھا۔ سر پر اس نے مفلر بھی لپیٹ لیا تھا جو خاصا پرانا تھا۔

دو میل کے بعد اسے سرحد عبور کرنے کے لیے کوئی کانٹوں دار باڑھ عبور نہیں کرنی پڑی۔ البتہ وہاں پہرے داروں کی نظروں سے بچنے کے لیے احتیاط تو کرنا ہی پڑی۔ رات کی تاریکی بھی اس کی مددگار تھی۔ آسمان پر بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے رواں دواں تھے۔ جب چاند کسی ٹکڑے کی آڑ میں چھپ جاتا تو وہ رینگتا ہوا آگے بڑھتا اور جب چاند بادلوں کی اوٹ سے نکل آتا تو وہ بے حس و حرکت ہو جاتا۔ تقریباً ایک میل تک وہ رینگتا ہوا ہی آگے بڑھا۔ اس مہم کے لیے اس نے لباس بھی ایسا منتخب کیا تھا جو مٹیالے رنگ کا ہلکی سیاہی مائل تھا۔

رینگنے کے بعد سیدھا کھڑا ہونے سے پہلے اس نے نائٹ وژن دوربین سے اطراف کا جائزہ لیا اور مطمئن ہونے کے بعد سیدھا کھڑا ہوا تھا۔

رات اپنے تیسرے پہر میں داخل ہو چکی تھی جب وہ ایک بستی کے قریب سے گزرا۔ اسے بریگیڈیئر شمس سے اس علاقے کا ہاتھ سے بنا ہوا ایک نقشہ بھی ملا تھا جس کے مطابق دوسری بستی تک وہ اس وقت پہنچتا جب دن کی روشنی پھیل چکی ہوتی۔ انور نے فیصلہ کیا تھا کہ سارا دن وہ کسی ٹیلے یا کسی بھی مناسب جگہ پر چھپا رہے گا۔ ویسے بھی رات بھر کے اس کٹھن سفر کے بعد اسے آرام کی ضرورت تھی۔

لیکن جب صبح ہوئی تو اسے کسی بستی کا نام و نشان تک نظر نہیں آیا۔ اس سے اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ رات بھر میں اس نے جو سفر کیا تھا، وہ اس کے اندازے سے کم ہو سکا تھا۔ گویا اب رات کو جب وہ دوبارہ آگے بڑھنا شروع کرتا، تبھی اس بستی کے قریب سے گزرتا۔ دن میں سفر کرنا اس کے لیے مخدوش بھی ثابت ہو سکتا تھا۔

پہاڑی علاقے کے اس حصے میں کہیں کہیں گھاس بھی تھی لیکن انور نے دن گزارنے کے لیے جس جگہ کا انتخاب کیا، وہ نہایت پتھریلی تھی اور ہموار بھی نہیں تھی۔ وہاں لیٹ کر جسم کو مکمل آرام نہیں دیا جا سکتا تھا لیکن انور کے خیال کے مطابق وہ بہت محفوظ جگہ تھی۔ آس پاس سے کسی دیہاتی کا گزر ہوتا بھی تو وہ اس کی نظر میں نہیں آتا۔

کچھ کھا پی کر انور وہیں لیٹ گیا۔ آرام دہ جگہ نہ ہونے کے باوجود اسے آدھے گھنٹے میں نیند آ گئی۔

پھر کسی قسم کی آوازیں تھیں یا کوئی اور بات کہ اس کی آنکھ کھلی۔ آنکھ کھلی اور چندھیا گئی کیونکہ سورج سر پر آ چکا تھا۔ تیز دھوپ نے ہی اس کی آنکھیں چندھیائی تھیں۔ اس نے بکریوں کے ممیانے کی آوازیں سنیں۔ وہ اٹھ بیٹھا اور آنکھیں ملنے لگا۔

''کدھر کا ہے بابے!'' بھاری بھرکم سی نسوانی آواز سنائی دی۔

انور نے چونک کر آنکھوں سے ہاتھ اٹھائے۔ وہ

قریب ہی کھڑی تھی جس نے غالباً اسی سے پوچھا تھا۔ وہاں کوئی اور تو تھا نہیں۔

اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔ جسم خاصا بھاری ہو گیا تھا۔ اسی بھاری پن نے چہرے پر بھی اثر ڈالا تھا۔ ورنہ شاید اسے قبول صورت کہا جا سکتا۔ کھلتی ہوئی سانولی رنگت تھی۔ جسم پر رنگین لہنگا اور چولی تھی جو خاصی تنگ تھی۔ ایک ہاتھ میں وہ چھڑی لیے ہوئے تھی۔

انور نے اس طرف دیکھا جدھر سے بکریوں کے ممیانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اسے بکریاں نظر آئیں جو گھاس چر رہی تھیں۔

”ادھر کیا دیکھ رہا ہے، جواب تو دے بابے! کدھر کا ہے؟ یہاں کیوں پڑا تھا؟“ وہ پھر بولی۔

”ادھر ہی کہیں کا ہوں۔“ انور نے جواب دیا۔ وہ تیزی سے سوچ بھی رہا تھا کہ اپنے بارے میں کیا کہانی گڑھے! یہ اندازہ اس نے لگا لیا تھا کہ وہ چرواہن تھی۔

”ادھر ہی کا ہے!“ بھاری ہنسی۔ ”ادھر کدھر کا؟“

”چھوٹا تھا جب سوتیلی ماں کی وجہ سے شہر بھاگ گیا تھا۔“ انور نے کہانی گڑھ لی۔ ”سولہ سال بعد گھر کی یاد آئی تو ادھر آیا، پر پتا نہیں میرا گاؤں کہاں ہے۔ ایک گاؤں تو پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ وہ تو پہچان میں نہیں آیا تو آگے بڑھ آیا۔ بہت تھک گیا تھا۔ یہیں لیٹ گیا، نیند آ گئی۔“

”تو میرے ساتھ چل...... میرا گاؤں بھی دیکھ لے۔ وہاں سے تو نہیں بھاگا تھا؟“

”تم کون ہو؟“

”میں بکریاں چراتی ہوں۔“

”گاؤں کتنی دور ہے؟“

”تھوڑی دیر تو بکریوں کو چرنے دوں گی۔ بہت دیر سے ہوں ادھر۔ تھوڑی دیر بعد چلیں گے گاؤں کی طرف...... دیکھ لینا کتنی دور ہے۔“

انور نے سمجھ لیا کہ یہ عورت جس گاؤں کی ہے، اسی کے بارے میں بریگیڈیئر حسن نے بھی بتایا تھا اور نقشے میں بھی اسی کی نشاندہی کی گئی تھی۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ اس کے ساتھ نہ گیا تو وہ جانے کیا سمجھے۔

”اچھا چلوں گا تیرے ساتھ۔“ اس نے کہا۔

”تو ہے تو گبرو۔“ وہ انور کو ایسی نظروں سے دیکھنے لگی جن میں پسندیدگی کے ساتھ ایک منفی جذبہ بھی تھا۔ انور کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ بولی۔ ”بھوکا تو ہو گا تو؟“

”ہاں۔“ انور نے کہا۔ ”گاؤں میں کچھ خرید کر کھاؤں گا۔“

”میرے ساتھ کھا لے۔ کھانا تو میں لے کر آتی ہوں اپنا۔ آدھا آدھا کھا لیں گے۔ ابھی آتی ہوں لے کر۔“ اس نے انور کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور ایک جانب بڑھ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ پہاڑی علاقہ ایسی ہی بھول بھلیوں جیسا تھا کہ انسان پل میں سامنے اور پل میں غائب۔

انور سوچنے لگا، کسی ایسے چکر میں نہ پھنس جائے کہ معینہ وقت تک اپنا فرض پورا نہ کر سکے لیکن اس نے چپکے سے بھاگ نکلنا بھی مناسب نہ سمجھا۔ اپنے گاؤں لوٹ کر وہ لوگوں سے اس کے بارے میں جانے کیا کہتی۔ گاؤں کا کوئی سمجھ دار آدمی سوچ سکتا تھا کہ ان کے علاقے میں پڑوسی ملک کا کوئی جاسوس تو نہیں گھس آیا ہے اور اس سوچ کے باعث وہ کسی پولیس چوکی کو بھی اس بارے میں اطلاع دے سکتا تھا۔

انور نے فیصلہ کیا کہ اسے اس عورت کے ساتھ جانا چاہیے لیکن اسے محتاط بھی رہنا ہو گا۔ اس عورت کا کردار اسے کچھ ٹھیک نہیں لگا تھا۔

نہ جانے کہاں سے وہ کھانے کی پوٹلی اور پانی کی ایک لٹیا سی لے کر آئی جو پیتل کی تھی۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی چادر بھی تھی جو اس نے بچھا دی۔

”چل آ، کھا لے۔“ وہ چادر پر بیٹھ کر کھانے کی پوٹلی کھولنے لگی۔

ناچار انور چادر پر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

”گاؤں کے لوگ تو کہتے ہیں کہ میں ساگ بہت اچھا پکاتی ہوں۔ آج وہی لائی ہوں۔ تو بھی کھا کے بتا، کیسا لگا۔“

ساگ کے ساتھ جو کی دو موٹی موٹی روٹیاں تھیں۔

کھانے کے پیکٹ انور کی واسکٹ کی جیبوں میں تھے لیکن اس عورت کے سامنے وہ نکالنا اس نے مناسب نہیں سمجھا۔

”تم بھوکی رہ جاؤ گی۔“ اس نے روٹی کا ایک نوالہ توڑا۔

”ارے تو گاؤں جا کے اور کھا لوں گی۔ ابھی تیری خاطر تھوڑی بھوکی رہ جاؤں گی تو مروں گی نہیں۔“ اس نے ایک بھدا سا قہقہہ لگایا، پھر بولی۔ ”تو مجھے بہت اچھا لگا ہے رے۔“ انور کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں پھر وہی کیفیت نظر آئی جس کی وجہ سے انور نے سمجھا تھا کہ وہ اچھے کردار کی عورت نہیں تھی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" انور نے پوچھا۔
"نام!" وہ پھر ہنسی۔ "نام کو تو چھوڑ، گاؤں میں سب مجھے مرد مارو کہتے ہیں۔"
"مرد مارو کیوں؟" انور نے نظریں جھکالیں۔ ویسے اس نام کی وجہ سے وہ سمجھ گیا تھا کہ گاؤں والے بھی اس کے کردار کو اچھی طرح جان چکے تھے۔ اسی لیے اس کی عزت بھی نہیں کرتے تھے اور اسے "مرد مارو" کہنے لگے تھے۔
"یہ تو گاؤں والوں سے ہی پوچھو۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "وہی بتائیں گے، میں مرد مارو کیوں ہوں۔ کوئی الٹی سیدھی بات کرے تو اسی چھڑی سے اس کی خبر بھی لے لیتی ہوں جس چھڑی سے بکریاں ہانکتی ہوں۔" اس نے چھڑی کی طرف اشارہ کیا جو اس نے اپنے قریب ہی رکھ لی تھی۔
"ساگ سچ مچ بہت اچھا ہے۔" انور نے موضوع بدلا۔
"میری بنائی تو ہر چیز اچھی ہے۔ جو ایک بار چکھ لے، وہ بھولتا نہیں ہے۔"
"ہوں...... ہوں۔" انور ہنکارا بھر کر رہ گیا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ ایک غلط عورت سے ٹکرا گیا ہے لیکن یہ بھی طے تھا کہ وہ اس کے کچھ نہ کچھ کام ضرور آسکتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ دن میں بھی سفر کر کے گاؤں تک پہنچ سکتا تھا۔ گاؤں کے لوگوں کے لیے وہ اجنبی ہوتا لیکن اسے یقین تھا کہ یہ عورت جسے "مرد مارو" کہا جاتا تھا، وہ انہیں یہی بتائی کہ وہ اس کا پرانا جاننے والا ہے۔
اس کا خیال درست بھی ثابت ہوا۔ وہ اس کے ساتھ ہی گاؤں میں داخل ہوا۔ اِدھر اُدھر آتے جاتے گاؤں والوں نے "مرد مارو" پر فقرے بازی بھی کی جس کے جواب میں انہیں گالیاں بھی سننی پڑیں۔
ایک فقرہ یہ بھی کسا گیا۔ "کوئی نیا شکار پھانس لائی ہے؟"
"ارے یہ میرا پرانا جاننے والا ہے۔" عورت نے جواب دیا۔ "مجھے ہی ڈھونڈتا ہوا آیا تھا اِدھر۔ ارے جو کبوتر میری اٹریا پر ایک بار آبیٹھے، دوبارہ آنے کو اس کا دل ضرور کرے ہے۔"
گاؤں کے کچے پکے مکانات کسی سسٹم کے تحت نہیں تھے مگر ان کے درمیان راستے کشادہ تھے۔ ایک مکان قدرے بڑا اور پکا بنا ہوا تھا۔
"یہ کا کا چودھری کا گھر ہے۔" مرد مارو نے ہنس کر بتایا۔ "مجھے ایک آنکھ نہ بھائے ہے لیکن میں اسے اچھی لگتی ہوں۔ جب وہ چاہتا ہے، میں انکار نہیں کرتی۔ اسی کی وجہ سے تو میں اس گاؤں میں ٹکی ہوئی ہوں۔ گاؤں کے بہت سے لوگ چاہتے ہیں، میں یہ گاؤں چھوڑ کر کہیں بھی چلی جاؤں۔" اس نے منہ بنایا۔ "بڑے شریف کے...... لگتے ہیں۔" اس نے ایک گندی سی گالی بھی دے ڈالی۔
اس کا گھر خاصا صاف ستھرا تھا۔
"میرا یہ بستر کا کا چودھری کا تحفہ ہے۔" وہ بولی۔ "اچھا تو ذرا آرام کر یہاں۔ میں بکریاں چھوڑ کر ابھی آتی ہوں۔ پھر تجھے گاؤں میں گھماؤں گی۔ پہچان لینا، کہاں سے گیا تھا۔ ابھی تک تو کوئی ملا نہیں جسے تو نے پہچانا ہو۔"
اس نے انور کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور چلی گئی۔
انور سوچ رہا تھا کہ اسے یہ گاؤں جلد از جلد چھوڑ دینا چاہیے۔ اسے کچھ خطرہ اسی وقت محسوس ہوا تھا جب راستے میں فوج کا ایک سپاہی بھی ملا تھا۔
"کہاں سے آیا ہے یارا؟" اس نے براہِ راست انور ہی سے پوچھا تھا۔
لیکن جواب اسے عورت نے دیا تھا۔ "تجھ سے مطلب؟" اس نے آنکھیں دکھائی تھیں۔ "میرے مہمانوں سے مت کیا کر کوئی سوال۔ چل اپنا راستہ لے۔" اس وقت انور جان بوجھ کر مسکرایا تھا۔ مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ مرد مارو کے ساتھ بہت مطمئن ہے۔
"ارے یہ بہت اکڑو ہے۔" عورت نے انور کو بتایا۔ "چھٹی پر آیا ہوا ہے لیکن گاؤں میں بھی فوج کی ڈانگری پہنے پھرتا ہے۔" اس نے فوجی وردی کو "ڈانگری" کہا تھا۔ "ہر ایک پر رعب جماتا ہے لیکن میں تو اسے کڑوی کڑوی سنا دیتی ہوں۔ شادی ہو چکی ہے اس کی، ایک بچہ بھی ہے، پھر بھی مجھے اشارے کرتا رہتا ہے۔ میں اسے گھاس نہیں ڈالتی۔ کالیا کتا۔"
وہ کالا نہیں تھا۔ دبی ہوئی سانولی رنگت تھی لیکن مرد مارو اسے کالیا کہتی تھی۔ انور نے اس کے ہاتھ میں بڑا سا موبائل بھی دیکھا تھا۔
اس بارے میں مرد مارو نے بتایا تھا کہ وہ اسے اپنے ہاتھ میں لیے پھرا کرتا تھا۔ مقصد گاؤں والوں پر اپنا رعب جمانا تھا۔ موبائل فون گاؤں کے بہت سے لوگوں کے پاس تھے لیکن وہ معمولی قسم کے تھے۔ جو فوجی کے ہاتھ میں تھا، وہ انور کے خیال کے مطابق اسمارٹ فون تھا۔
اس فون پر وہ فوجی جوان دنیا بھر کی خبریں سن سکتا تھا۔
"ارے یہ تو میرے پاس بھی آسکے ہے۔" مرد مارو

نے منہ بناتے ہوئے کہا تھا۔ ''کاکا چودھری سے کہہ دوں تو ایک دن میں منگا دے گا شہر سے لیکن مجھے تو یہ جناتی چیز لگتی ہے۔ جانے کیا کیا بھرا ہوتا ہے اس میں۔ کالیے نے مجھ پر رعب جمانے کے لیے دکھایا تھا ایک بار۔''

ان باتوں سے خطرے کا کوئی اشارہ نہیں مل رہا تھا لیکن انور کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کوئی گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ بس وہ یہ اندازہ نہیں لگا پا رہا تھا کہ وہ گڑبڑ کیا ہو سکتی ہے۔

ایک گھنٹے بعد وہ عورت انور کو گاؤں دکھانے کے لیے گھر سے نکلی۔ ہر جگہ اسے اور انور کو معنی خیز مسکراہٹوں کے ساتھ دیکھا گیا۔ گاؤں کی عورتیں کترا کر گزرتی رہیں۔ غالباً انہیں ان کے گھر والوں نے ہدایت کی ہو گی کہ وہ مرد مار د سے دور رہا کریں۔

انور نے ایک جگہ دیکھا کہ ایک ٹریلر پر بڑے بڑے ڈرم بار کیے جا رہے تھے۔ ان ڈرموں کی شکل کچھ بیضوی سی تھی۔ عورت نے بتایا کہ وہاں کچی شراب بنائی جا رہی تھی جو آس پاس کے دیہات میں بھی بھیجی جاتی تھی۔ وہ ڈرم اسی شراب کے تھے۔

پھر جب وہ دونوں گاؤں کے بڑے مکان کے پاس سے گزر رہے تھے تو ایک آدمی بڑی سنجیدگی سے قریب آ کر مرد مار د سے دھیمی آواز میں کچھ کہنے لگا۔ انور نہیں سن سکا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا لیکن عورت کا جواب سنائی دے گیا۔

''چل جا! آ رہی ہوں میں۔'' اس نے کہا۔

وہ آدمی فوراً واپس لوٹ گیا تو وہ انور سے بولی۔ ''یہیں رک! میں ابھی آتی ہوں۔''

''کہاں جا رہی ہو؟ کون تھا یہ؟ کیا کہہ رہا تھا؟'' انور نے بہ یک وقت کئی سوال کر ڈالے۔

''کاکا چودھری کا آدمی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''چودھری نے اپنی حویلی بلایا ہے مجھے، دو منٹ کے لیے۔ جانے کیا بات ہے..... کوئی خاص ہی ہو گی جو دو منٹ کے لیے بلایا ہے۔ زیادہ دیر میرے ساتھ رہنا ہو تو میرے ہی گھر آتا ہے۔ تو یہیں رک..... میں ابھی آتی ہوں۔''

اس نے جواب کا انتظار نہیں کیا اور تیزی سے اس مکان کی طرف بڑھ گئی جسے وہ حویلی کہتی تھی۔

انور متفکر ہو گیا۔ جی تو چاہا تھا کہ وہاں سے فوراً بھاگ نکلے لیکن اس طرح وہ یقینی طور پر مشکوک ہو جاتا۔

وہ پانچ منٹ بعد واپس آ گئی۔

''تیرے بارے میں پوچھ رہا تھا۔'' وہ آتے ہی بولی۔ ''گاؤں میں تو ہر خبر آگ کی طرح پھیلتی ہے۔ میں نے کہہ دیا اس سے کہ میں تجھے بہت پہلے سے جانتی ہوں۔ چنگی گاؤں کا ہے تو۔ بہت دن بعد آیا ہے مجھ سے ملنے۔''

''بس یہ بات پوچھنے کے لیے بلایا؟''

''اطمینان کرنا چاہتا تھا۔ اس کالیے نے لوگوں کو بتایا ہے کہ ہمارے علاقے میں کوئی اجنبی آ گھسا ہے جو شام کا جاسوس بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے اپنے موبل پر خبریں سنی تھیں۔''

''موبل نہیں، موبائل۔'' انور نے کہا۔ اس کے ذہن میں خطرے کا الارم بج چکا تھا لیکن اس نے عورت کی تصحیح کی۔

''ہاں وہی۔'' وہ بولی۔ ''میں تو اسے موبل ہی کہوں ہوں۔''

''بس اب واپس چلو۔'' انور بولا۔ ''اب اندھیرا ابھی پھیلنے والا ہے۔ گاؤں تو خاصا دیکھ لیا۔ کوئی چیز پہچان میں نہیں آئی۔ بیس سال میں بہت کچھ بدل جاتا ہے، پھر بھی کوئی چھوٹی موٹی نشانی تو ملنی چاہیے تھی۔ میں اس گاؤں کا نہیں ہوں۔''

''چل پھر واپس چل۔'' وہ انور کا ہاتھ پکڑ کر بولی اور واپسی کے لیے قدم بڑھائے۔

انور سوچ رہا تھا کہ وہ فوجی اپنی کمپنی یا پلاٹون کو یہ خبر دے سکتا تھا کہ اس کے گاؤں میں ایک اجنبی کو دیکھا گیا ہے۔ اس صورت میں فوج کی کوئی خفیہ ایجنسی حرکت میں آ سکتی تھی۔

''اب مجھے اپنے گاؤں کی تلاش میں آگے جانا ہو گا۔'' انور نے کہا۔

''ہاں ہاں، چلا جائیو! اب رات تو میرے گھر میں گزار لے، سویرے سویرے اٹھا دوں گی تجھے..... جگا دوں گی۔''

انور سمجھ رہا تھا کہ وہ اسے رات کے لیے کیوں روکنا چاہتی تھی لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ جلد از جلد اس گاؤں سے نکل جائے۔

''میری جان!'' انور نے اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر بے تکلفی کا مظاہرہ اس وقت کیا جب وہ گھر میں داخل ہو چکے تھے۔ ''میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ میں جلد از جلد اپنا گاؤں تلاش کرنا چاہتا ہوں، اور وہ میں کر بھی لوں گا۔ میں تمہیں بھولوں گا نہیں۔ تم بھی اچھی لگی ہو مجھے۔ میں اپنے گاؤں میں زیادہ دن رکوں گا بھی نہیں۔ واپس شہر تو جانا ہو گا مجھے۔ جب واپس جاؤں گا تو تمہارے پاس ہوتا ہوا جاؤں

گا۔ ایک رات تمہارا مہمان بھی رہ لوں گا۔ ابھی تو تم مجھے جانے ہی دو۔"

"اندھیرے میں کہاں ٹھوکریں کھاتا پھرے گا۔"

اس نے اپنے گلے میں پڑا ہوا انور کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بڑی محبت سے کہا۔ "میری بات مان، آج رات یہیں رک۔"

"بات سمجھ میری جان!" انور نے دوسرے ہاتھ سے اس کا شانہ تھپکا۔ "جب کسی کو برسوں بعد اپنے گھر کی، اپنے لوگوں کی تلاش ہو، اور وہ اسے نہ ملیں تو بہت گھبراہٹ ہوتی ہے۔ کسی ایک جگہ رکنا اس کے لیے بہت مشکل ہو جاتا ہے۔"

"اندھیرے ہی میں ٹھوکریں کھانی ہیں تب بھی کچھ دیر تو رک میرے ساتھ۔"

"ہاں کچھ دیر تو رکوں گا۔ بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ کھانا کھلا دے مجھے۔" انور نے اپنا ہاتھ اس کی گردن سے ہٹا لیا۔

"اچھا!" وہ کچھ مایوس ہوئی۔ "نکالتی ہوں تیرے لیے کھانا۔"

کھانے کے دوران میں وہ نوالے بنا بنا کر اپنے ہاتھ سے انور کو کھلاتی اور خود بھی کھاتی رہی۔ وہ انور پر شدت سے فدا ہو چکی تھی۔

کھانے کے بعد وہ انور کو رخصت کرتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔ "ایک بار ذرا سا......" اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر "عمل" آگے بڑھایا۔

انور کو مجبوراً وہ ناگوار اور کراہیت آمیز فریضہ انجام دینا ہی پڑا۔ اس کے بعد وہ گھر سے نکل آیا۔

گھر سے نکلتے وقت اس نے فضا میں گونج سنی اور ایک جانب ہیلی کاپٹر بھی دیکھ لیا جس کی روشنیاں جل بجھ رہی تھیں۔

"یہ تو آج کل ہوتا رہتا ہے۔" مردمار بولی۔ "جہاز بھی گزرنے لگے ہیں ادھر سے۔ سنا ہے جنگ چھڑ سکتی ہے۔" اس کے لہجے میں پریشانی یا تشویش بالکل نہیں تھی۔ اس کا مزاج کچھ ایسا ہی تھا۔

انور کو شبہ تھا کہ یہ ہیلی کاپٹر گاؤں میں اترے گا بھی! اس نے تیزی سے ایک طرف قدم بڑھانا شروع کر دیے تھے۔ اگرچہ گاؤں کے کچھ گھروں میں بجلی تھی لیکن زیادہ تر میں مٹی کے تیل سے جلنے والے لیمپ وغیرہ تھے اس لیے گاؤں میں بھی تقریباً اندھیرا ہی تھا۔ پندرہ منٹ تک بہت تیزی سے چلنے کے بعد وہ مکمل تاریک ویرانے میں پہنچ گیا۔ نقشے کی مدد سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اسے کس سمت میں آگے بڑھنا ہے۔

کافی سوچ بچار کے بعد وہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ اس نے اس عورت کے ساتھ گاؤں جا کر غلطی کی تھی یا وہ اس کے لیے مجبور تھا!

اونچے نیچے سنگلاخ پہاڑی علاقے میں آگے بڑھتے ہوئے اس نے ان تمام خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اب صرف اپنے مشن کے بارے میں سوچے۔ اسے مقررہ وقت تک پیغام ایک بستی کے گرجا کے پادری کو پہنچانا تھا۔ یہ بات یہاں کی حکومت کو معلوم ہو چکی تھی کہ ایک اجنبی سرحد پار کر کے اس علاقے میں داخل ہو چکا ہے جو جاسوس ہو سکتا ہے۔

انور کوئی جاسوس نہیں، محض ایک فوجی تھا لیکن اسے جو کام سونپا گیا تھا، وہ کسی خفیہ ایجنسی کے ایجنٹ ہی کا تھا۔ اس قسم کے کاموں کی تربیت دی جاتی ہے۔ وہ تو صرف اپنے بریگیڈیئر کی ہدایت پر اس کام کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا اور محسوس کر رہا تھا کہ وہ کسی لمحے بھی کسی خطرناک صورتِ حال میں پھنس سکتا ہے۔ اسے یقین تھا کہ گاؤں سے روانگی کے وقت اس نے جو ہیلی کاپٹر دیکھا تھا، اس میں ایسے ہی لوگ آئے ہوں گے جو اسے چیک کرتے۔ اگر وہ بروقت گاؤں سے نہ نکل گیا ہوتا تو اس وقت پھنس چکا ہوتا لیکن وہ یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ اس کے نہ ملنے کے باعث وہ اطمینان سے واپس نہیں لوٹ جائیں گے۔ انہیں تشویش ہو گی کہ وہ اس "اجنبی" کو چیک نہیں کر سکے۔

تین گھنٹے مسلسل چلنے کے بعد وہ تھک کر ایک جگہ بیٹھا ہی تھا کہ اس نے فضا میں گونج سنی۔ اس نے چونک کر فضا میں ہر طرف نظریں دوڑائیں اور اس کا جسم سنسنا گیا۔ فضا میں چار ہیلی کاپٹر متحرک تھے اور ان کی فلیش لائٹس کے اسپاٹس سنگلاخ زمین پر حرکت کر رہے تھے۔ اس کا صریح مطلب یہی تھا کہ اس کی تلاش شروع ہو چکی تھی۔

انور نے تیزی سے اپنے آس پاس کے علاقے پر نظر دوڑائی۔ وہ کوئی ایسی جگہ دیکھنا چاہتا تھا جہاں وہ روشنی کے ان دائروں کی زد پر آنے سے محفوظ رہ سکتا۔ اسے قریب میں ایسی کوئی جگہ دکھائی نہ دی تو وہ اٹھ کر تیزی سے ایک طرف چل پڑا۔ ایک بار تو وہ جست لگا کر ایک جانب لڑھکتا نہ چلا گیا ہوتا تو ایک روشن دائرے کی زد پر آ ہی جاتا۔ یہ لڑھکنا ہی اس کے کام آ گیا۔ اسے وہاں ایک ایسی

کھوہ دکھائی دے۔ بس میں دبک کر وہ روشنی کے ان دائروں سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ اس نے ذرا بھی تاخیر کیے بغیر خود کو اس کھوہ میں چھپالیا۔

خاصا وقت اسی طرح گزرا اور پھر اس نے ہیلی کاپٹرز کی آوازوں کو دور جاتے ہوئے سنا۔ وہ واپس چلے گئے تھے یا کچھ اور آگے جا کر تلاش کی مہم جاری رکھی تھی، انور یہ اسی وقت جان سکتا تھا جب کھوہ سے باہر نکل کر فضا کا جائزہ لیتا۔

بصد احتیاط وہ اس کھوہ سے آہستہ آہستہ نکلا۔ احتیاط کی ضرورت اس لیے تھی کہ بعض ہیلی کاپٹروں کی آواز ہی نہیں ہوتی۔ عین ممکن تھا کہ ایسا کوئی ہیلی کاپٹر ابھی اس کے سر پر ہی منڈلا رہا ہو۔

لیکن ایسا نہیں تھا۔ انور نے دیکھ لیا کہ وہ ہیلی کاپٹرز اب چند میل آگے کا علاقہ چھان رہے تھے۔ یہ انور نے اسپاٹ لائٹ کے متحرک ہونے کی وجہ سے سمجھا تھا۔

فوری طور پر اس نے فیصلہ کیا کہ اسے آگے ہی بڑھنا چاہیے۔ کسی اور طرف جانے سے تو اس کی منزل دور ہو جاتی۔ اسے چوبیس سے چھتیس گھنٹے میں اپنی منزل تک پہنچنا تھا۔ روانگی سے قبل اس کے تین گھنٹے تیاری کرنے میں لگ گئے تھے۔ وہ رات کو دس بجے روانہ ہوسکا تھا اور اب ایک رات ایک دن گزرنے کے بعد دوسری رات کے ساڑھے دس بج چکے تھے۔ اب اس کے پاس ساڑھے گیارہ گھنٹے تھے جو گزرنے سے قبل اسے اپنی منزل تک پہنچنا تھا۔ کئی میل آگے روشنی کے متحرک دھبوں کو دیکھتا ہوا وہ اسی سمت میں آگے بڑھتا رہا۔ اس طرح کوئی آدھا گھنٹا گزرا تھا کہ وہ یکا یک روشنی کے ایک دائرے کی زد پر آ گیا۔ اس کا یہ خیال ٹھیک ہی نکلا کہ ایک خاص قسم کے ہیلی کاپٹر کی آواز بالکل نہیں ہوتی۔ ایسا ہی کوئی ہیلی کاپٹر پیچھے آرہا تھا۔ اس سے غلطی یہ ہوئی تھی کہ آگے بڑھتے ہوئے مڑ مڑ کر اپنے عقب کا جائزہ نہیں لیا تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ اس نے کسی جاسوس کی طرح ہر لمحے اور ہر طرح سے چوکنا رہنے کی تربیت حاصل نہیں کی تھی۔

روشنی کے دائرے کی زد پر آتے ہی اس نے دوڑ کر اس دائرے سے باہر نکل جانا چاہا تھا لیکن اسی وقت ہیلی کاپٹر میں لگی ہوئی ہلکی مشین گن سے گولیاں برسنے لگیں لیکن اس طرح کہ وہ اس کے چاروں طرف سنگلاخ زمین سے ٹکرا کر چنگاریاں پیدا کر رہی تھیں۔ اسے براہِ راست کسی گولی کا نشانہ نہیں بنایا گیا تھا اور اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ اسے زندہ گرفتار کرنا چاہتے ہے۔

انور اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا۔ دوسری صورت میں وہ کسی گولی کا نشانہ بن سکتا تھا۔

ہیلی کاپٹر آہستہ آہستہ نیچے آنے لگا۔ گولیاں اب بھی اس کے چاروں طرف برس رہی تھیں اور ان کی آوازوں کی وجہ سے اس کے کانوں میں شائیں شائیں ہونے لگی تھی۔

ہیلی کاپٹر خاصا نیچے آچکا تھا جب ایک مردانہ آواز سنائی دی جس کے لیے یقینی طور پر میگافون کا استعمال کیا گیا تھا۔

''بھاگنے کی کوشش کرو گے تو مارے جاؤ گے۔ تم خود کو ہمارے حوالے کردو۔ اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لو، ہم اسے تمہارا یہ جواب سمجھیں گے کہ تم اب بھاگنے کی کوشش نہیں کرو گے۔ صرف اسی صورت میں گولیاں برسانا بند کردی جائیں گی۔''

انور نے فوراً اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے ورنہ اندیشہ تھا کہ کوئی بھٹکی ہوئی گولی اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیتی۔ اب گرفتار ہو جانے ہی میں عافیت تھی۔ زندہ رہنے کی صورت میں وہ ان لوگوں کی قید سے فرار بھی ہو سکتا تھا۔ اگرچہ اس کا امکان بہت کم تھا لیکن امید سے لو لگائے رکھنا انسانی فطرت ہے۔ اسی صورت میں وہ کسی طرح اپنی منزل تک پہنچ سکتا تھا ورنہ گولی کا نشانہ بننے کے بعد تو یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اس کے کام کی تکمیل ہو جاتی۔

ہیلی کاپٹر اور نیچے آنے لگا۔ اسی وقت کسی کیڑے نے اس کی پنڈلی میں کاٹا جو اس کے جوتوں پر چڑھ کر اوپر تک آگیا تھا۔ چبھن اتنی شدید ہوئی تھی کہ اس نے اپنی وہ ٹانگ بہت زور سے جھٹکی۔ اس صورت میں اس کا پیر بھی پھسلا۔ ہیلی کاپٹر والے جانے کیا سمجھے کہ اس پر گولیوں کا ہلکا سا برسٹ چلا دیا۔ چند گولیاں ادھر ادھر لگیں لیکن ایک گولی اس کی ران میں پیوست ہوئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی ران میں پگھلی ہوئی آگ پھیلتی چلی گئی ہو۔ وہ ڈگمگا کر گر پڑا۔

''تمہیں بتا دیا گیا تھا کہ بھاگنے کی کوشش کرو گے تو مارے جاؤ گے۔'' میگافون سے کہا گیا۔

انور جواب میں کیا کہہ سکتا تھا۔ وہ خاموش پڑا رہا۔ ران کی تکلیف کے باعث اس نے دانت پر دانت جما لیے تھے۔

سنگلاخ زمین اتنی اونچی نیچی تھی کہ ہیلی کاپٹر لینڈ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ آٹھ دس فٹ کی بلندی پر معلق ہو گیا اور اس

میں سے چار فوجی کود کر نیچے آ گئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں نہایت پاورفل ٹارچ تھی جس کی روشنی انور پر پڑ رہی تھی۔ ہیلی کاپٹر کا لائٹ اسپاٹ بند کیا جا چکا تھا۔ باقی تینوں فوجیوں میں سے دو کے ہاتھوں میں ریوالور اور ایک کے ہاتھ میں آٹومیٹک رائفل تھی۔

وہ انور کے قریب آ گئے۔

''تمہاری ران سے خون بہہ رہا ہے۔'' ریوالور والا ایک فوجی بولا۔ ''ہم نے تمہیں وارننگ دے دی تھی کہ بھاگنے کی کوشش کرو گے تو......''

''میں بھاگ نہیں رہا تھا۔'' تکلیف کی وجہ سے انور کی آواز کراہتی ہوئی سی تھی۔ ''میری ٹانگ میں کسی کیڑے نے......''

''تم شام کے جاسوس ہو؟'' انور کی بات کاٹتے ہوئے سخت لہجے میں سوال کیا گیا۔

''میں جاسوس نہیں ہوں۔ میں تو......''

''لے چلو اسے۔'' انور کی بات پھر کاٹ دی گئی۔ ''یہ آسانی سے تو کچھ نہیں بتائے گا۔''

''کھڑے ہو جاؤ۔'' دوسرے نے حکم دیا۔

انور کو کھڑے ہونے کے لیے خاصی کوشش کرنی پڑی۔ ران میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔

''چلو!'' ہیلی کاپٹر کی طرف اشارہ کیا گیا۔

انور کے لیے چلنے میں کھڑا ہونے سے بھی زیادہ دشواری تھی۔ تاہم وہ لنگڑاتا ہوا آگے بڑھا۔

''اس کتے کو سہارا دو۔'' ان میں سے ایک نے دانت پیستے ہوئے اپنے ایک ساتھی سے کہا۔

ایک ریوالور والا انور کے قریب آ گیا۔ اس نے انور کا ایک ہاتھ اپنے کندھے پر رکھا۔

''مجھ پر زور دے کر چلو۔'' وہ بولا۔

انور اس کے سہارے سے کسی نہ کسی طرح ہیلی کاپٹر تک پہنچا۔

وہ چاروں فوجی کود کر ہیلی کاپٹر سے اترے تھے لیکن جست لگا کر اوپر نہیں چڑھ سکتے تھے اس لیے ہیلی کاپٹر سے سیڑھی لگا دی گئی تھی۔

وہ چاروں انور کو لے کر سیڑھی کے ذریعے ہیلی کاپٹر میں پہنچے۔ سیڑھی کھینچ لی گئی اور ہیلی کاپٹر حرکت میں آ گیا۔

''تلاشی لو اس کی۔'' ایک نے کہا۔

انور کی تلاشی لی گئی۔

''ریوالور، گولیاں۔'' تلاشی کے بعد طنزیہ انداز میں کہا گیا۔ ''اور حلیہ ایسا جیسے دیہاتی ہو۔''

''سرحد پار سے آیا ہے۔ دشمن کا جاسوس ہے۔'' پھر ڈپٹ کر پوچھا گیا۔ ''کیوں بھیجا گیا ہے تمہیں؟''

''میں جاسوس نہیں ہوں۔'' انور اپنے ذہن میں ایک کہانی تیار کر چکا تھا۔ ''میں تمہارے شامی آرمی کا فوجی ہوں۔''

کیونکہ اب بھی انور کی تلاشی لی جا رہی تھی اس لیے اسے یقین تھا کہ دیہی لباس کے نیچے فوجی وردی دیکھ لی جائے گی۔

''فوجی!'' چونکی ہوئی آواز تھی۔

''ایسا تو ہوتا ہے۔'' دوسرا بولا۔ ''بعض اوقات فوجی بھی ریکی کرنے کے لیے آگے بھیجے جاتے ہیں۔''

''مجھے طبی امداد کی ضرورت ہے۔'' انور کی آواز اب بھی کراہتی ہوئی سی تھی۔ ''بہت سخت تکلیف میں ہوں۔ اس سے نجات پا کر سب بتا دوں گا تم لوگوں کو۔''

''ران میں گولی لگی ہے؟''

''ہاں۔''

''وہ کیمپ پہنچ کر ہی نکالی جا سکے گی۔''

انور نے کراہ کر آنکھیں بند کرتے ہوئے پشت گاہ سے ٹیک لگا لی۔

☆☆☆

بیس منٹ بعد ہیلی کاپٹر نے اس جگہ لینڈ کیا جہاں ان کی فوج پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی۔ اسے ایک خیمے کے بستر پر لٹا دیا گیا۔ اس وقت تک اس کی تلاشی لے کر اس کی فوجی وردی بھی دیکھ لی گئی تھی۔

''ڈاکٹر کو اطلاع دی جا چکی ہے۔'' کسی نے انور کو بتایا۔ ''جلد ہی تمہاری ران سے گولی نکال لی جائے گی اس وقت تک اپنے بارے میں بتاؤ۔''

''تکلیف کی وجہ سے...... بولا نہیں...... جا رہا ہے۔'' انور نے کچھ اداکاری شروع کر دی۔

''فوجی ہو یا زنخے۔'' طنزیہ انداز میں کہا گیا۔

انور خاموش رہا۔ اسے سوچنا تھا کہ اس نے جو کہانی سوچی ہے، اس میں کوئی جھول تو نہیں ہے۔

کیونکہ اس کی تلاشی لے کر اطمینان کیا جا چکا تھا اس لیے خیمے میں اس وقت صرف ایک لیفٹیننٹ تھا۔ وہ انور کو گھورتا ہوا ٹہلنے لگا۔

ڈاکٹر کی آمد بیس منٹ بعد ہوئی اور اسے دیکھ کر انور چونک گیا۔ وہ زنوبیا تھی۔ انور کو دیکھ کر اس کے چہرے پر کسی

تبسم کا تاثر نہیں ابھرا۔ اس کے ساتھ دو نرسیں تھیں جو آپریشن کا سامان اٹھائے ہوئے تھیں۔

''کہاں گولی لگی ہے اسے؟'' زنوبیا نے انور کی طرف بڑھتے ہوئے لیفٹیننٹ سے پوچھا۔

''بائیں ٹانگ کی ران میں کیپٹن۔'' لیفٹیننٹ نے جواب دیا۔

''پینٹ کا بایاں پائنچا کاٹو۔'' زنوبیا نے ایک نرس کو حکم دیا۔

انور کا دیہی لباس پہلے ہی اتارا جا چکا تھا۔

زنوبیا اور فوج میں ڈاکٹر! انور کے دماغ میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔ اس کا عہدہ کیپٹن کا تھا۔ یہ بات بھی اس کے لیے عجیب سی تھی کہ زنوبیا سے دوسری بار آمنا سامنا بھی حادثاتی طور پر ہوا تھا۔ اگر وہ فوج میں نہ ہوتا یا زنوبیا فوج میں نہ ہوتی تو یہاں ان کا آمنا سامنا نہیں ہوتا۔

نرس نے اس کی پینٹ کا پائنچا کاٹ دیا۔ دوسری نرس نے اس دوران میں آپریشن کا سامان قریب کی تپائی پر کسی ترتیب سے رکھ دیا تھا۔

''آپ کچھ دیر باہر رہیے لیفٹیننٹ۔'' زنوبیا نے کہا۔

لیفٹیننٹ کے جانے کے بعد زنوبیا، انور کے زخم کا جائزہ لینے لگی۔

''کافی خون نکل گیا ہے۔'' زنوبیا نے اچٹتی سی نظر کٹے ہوئے پائنچے پر ڈالتے ہوئے سرسری سے لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے پر اب بھی ایسا کوئی تاثر نہیں ابھرا تھا کہ وہ انور کو جانتی ہے اور یہ ممکن نہیں تھا کہ اس نے انور کو پہچانا ہی نہ ہو۔ وہ یقیناً نرسوں کے سامنے بھی محتاط رہنا چاہتی تھی۔

انور کی ران کا آپریشن ہوا۔ گولی نکالنے کے بعد ڈریسنگ بھی کر دی گئی۔

''اب تم آرام سے لیٹ سکتے ہو۔'' زنوبیا نے اس کا تکیہ ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ ''تم خود بھی اسے اپنے آرام کے مطابق ٹھیک کر سکتے ہو بلکہ کر ہی لو۔'' آخر میں اس نے اپنے لہجے پر زور دیا تھا اور انور کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خفیف سا مسکرائی تھی۔ اس وقت دونوں نرسیں آپریشن کا سامان ٹھیک کرنے میں مصروف تھیں۔ ان کی توجہ زنوبیا اور انور کی طرف نہیں تھی۔

انور کی سمجھ میں آیا کہ زنوبیا نے اسے کسی قسم کا اشارہ کیا تھا۔ اس نے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر اسے قدرے اوپر کھسکانا چاہا تو اس کا ہاتھ کسی کاغذ سے مس ہوا۔

اوہ! انور کا دل ایک بار تو زور سے دھڑک ہی گیا۔

بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ زنوبیا نے اس کے لیے کوئی پرچہ چھوڑا تھا۔

زنوبیا نے اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگا لیا اور آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''بس دیکھ لینا۔'' اس نے کہا، پھر اضافہ کیا۔ ''جس طرح چاہو، تکیہ ٹھیک کر لینا۔ اس حرکت سے تمہاری ران کے زخم پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔''

''بہت مہربان ڈاکٹر ہیں آپ۔'' انور نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں تو آپ کی فوج کا قیدی ہوں۔''

''ڈاکٹر کا فرض ہوتا ہے کہ وہ علاج کرے، اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ علاج کس کا کیا جا رہا ہے۔'' زنوبیا نے کہا اور پھر نرسوں کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''چلیں۔''

''یس ڈاکٹر۔''

''پہلے تم باہر جا کر لیفٹیننٹ سے کہہ دو کہ اب وہ اندر آ سکتا ہے۔'' زنوبیا نے ایک نرس سے کہا۔

نرس سر ہلا کر خیمے سے چلی گئی۔

اس مختصر دورانیے میں انور کا دماغ تیزی سے کام کرتا رہا تھا۔ اب اس کے پاس اپنا مشن مکمل کرنے کے لیے دس گھنٹے رہ گئے تھے۔ اسے یہ امید بھی ہو گئی تھی کہ زنوبیا اس کی مدد کرنا چاہتی ہے لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کی کیا مدد کر سکے گی اور کس طرح کر سکے گی۔ ایک اہم سوال یہ بھی تھا کہ کیا وہ اتنی جلدی اس کے لیے کچھ کر سکے گی کہ وہ مقررہ وقت تک پادری سیموئل کے پاس پہنچ جائے؟

لیفٹیننٹ کے ساتھ دو اور فوجی بھی خیمے میں آئے۔

جاتے جاتے زنوبیا نے انور سے کہا۔ ''امکان نہیں ہے کہ اب تم کوئی تکلیف محسوس کرو تاہم اگر کوئی بات ہو تو ان لوگوں کو بتا دینا۔ یہ مجھے اطلاع دے دیں گے۔ میں آ کر دیکھ لوں گی۔''

اس نے انور کے جواب کا انتظار نہیں کیا تھا اور دونوں نرسوں کے ساتھ خیمے سے چلی گئی تھی۔

نئے آنے والے فوجیوں میں ایک کرنل تھا۔ اس نے انور کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''اب شروع ہو جاؤ۔ کیا بتانا چاہتے ہو اپنے بارے میں؟''

''میں فوج سے بھاگ کر ادھر آیا ہوں۔'' انور نے کہا۔

ان تینوں کے چہروں کے تاثرات عجیب سے ہو گئے۔

انور نے اپنی کہانی آگے بڑھائی۔ ''حالات بتا

رہے ہیں کہ دونوں ملکوں میں جنگ ہو کر رہے گی اور میں تم لوگوں سے جنگ نہیں لڑنا چاہتا تھا۔ جس طرح یہ وطن تمہارا ہے، اسی طرح میرا بھی ہے۔ میری پیدائش یہیں کی ہے۔ میرے والد کسی وجہ سے آٹھ سال پہلے یہاں سے اسی ملک میں جا بسے تھے جس کے سامنے اس وقت آپ لوگ صف آراء ہیں۔ مجھے اپنے والد کے ساتھ جانا پڑا تھا۔ وہیں میں فوج میں ہو گیا۔ اس وقت مجھے یہ خیال نہیں آیا تھا کہ مجھے اپنے ہی وطن کی فوج کے خلاف ہتھیار اٹھانا پڑیں گے لیکن جب یہ نوبت آتی نظر آئی تو مجھے بھی فیصلہ کرنا پڑا کہ فوج سے بھاگ کر اپنے وطن پہنچ جاؤں۔ میں خود بھی آپ لوگوں سے رابطہ کرنا چاہتا تھا لیکن کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اندیشہ یہ تھا کہ آپ لوگ مجھے مشکوک نہ سمجھ لیں۔‘‘

یہ سب کچھ سن کر وہ تینوں بہت سنجیدہ نظر آنے لگے تھے۔ کرنل نے ایک مرتبہ اچٹتی سی نظریں ڈال کر اپنے ساتھیوں کے تاثرات دیکھے، پھر انور کو گھورتا ہوا بولا۔ ’’ہم اس بیان پر کیوں یقین کر لیں؟‘‘

’’یہی الجھن مجھے بھی تھی کہ میں آپ لوگوں کو یقین کس طرح دلاؤں گا۔ بس یہ سوچا تھا کہ اگر کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آسکی تو اپنے وطن میں کہیں روپوش ہونے کی کوشش کروں گا۔ مجھے کم از کم اپنے وطن کے خلاف تو نہیں لڑنا پڑے گا۔‘‘

’’کس پلٹن کے ہو؟‘‘

’’بریگیڈیئر شمس کا نام تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔ میں انہی کے بریگیڈ میں تھا۔‘‘

’’کوئی...... کسی قسم کی معلومات دے سکتے ہو اس بریگیڈ کے بارے میں؟‘‘

’’جو کچھ جانتا ہوں، وہ تو بتا ہی دوں گا۔ اسلحہ کتنا ہے، انفنٹری کتنی ہے اور اسی قسم کی باتیں۔‘‘

’’بتاؤ۔‘‘

انور کو یقین تھا کہ یہ لوگ اس بریگیڈ کے بارے میں خاصی معلومات حاصل کر چکے ہوں گے اس لیے اس نے کسی جھجک کے بغیر سب کچھ بیان کر دیا۔

کرنل نے پُرخیال انداز میں سر ہلایا، پھر بولا۔ ’’کوئی اہم بات بتاؤ۔ آخر یہ بریگیڈ سرحد پر کیوں بھیجا گیا ہے؟‘‘

’’اس بارے میں بس اندازہ ہی لگا سکتا ہوں کہ وہ کسی قسم کا آپریشن کرنے کے لیے کسی خاص موقع کی تلاش میں ہیں۔ یہ نہیں جانتا کہ وہ آپریشن کس قسم کا ہوگا۔ اس بارے میں میں قیاس ہی کر سکتا ہوں۔ آپ لوگوں نے ان کی تین چوکیوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ وہ چوکیاں بریگیڈ سے بہت دور ہیں۔ اس لیے یہ تو نہیں سوچا جا سکتا کہ وہ ان چوکیوں کو واپس لینے کی کوشش کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ ممکن ہے کہ وہ آپ کی اس سے زیادہ چوکیوں پر قبضہ کر کے حساب صاف کرنا چاہتے ہیں۔‘‘

’’تم فوج میں کیا ہو؟‘‘

’’کیپٹن۔‘‘

’’اس بات کا کوئی ثبوت کہ آٹھ سال پہلے تم ہمارے ہی ملک میں رہتے تھے جسے تم اپنا وطن کہہ رہے ہو؟‘‘

’’میں اپنے شہر کا اور اس گھر کا پتا بتا سکتا ہوں جہاں ہم رہتے تھے۔‘‘

’’بتاؤ!‘‘ کرنل نے کہا اور پھر لیفٹیننٹ سے بولا۔ ’’لکھو جو یہ بتائے۔‘‘

لیفٹیننٹ نے فوراً کاغذ قلم سنبھال لیا۔

انور نے بریگیڈ کے بارے میں وہ سب کچھ بتا دیا جو اس کے علم میں تھا۔ لیفٹیننٹ وہ سب نوٹ کرتا رہا۔

’’تمہاری یہ اطلاعات تو بالکل درست ہیں۔‘‘ کرنل نے کہا۔ ’’لیکن صرف اس کی بنا پر ہم کیسے یقین کر لیں کہ اس ملک کو تم اپنا وطن سمجھتے ہو؟‘‘

’’میں اس شہر کا اور اس گھر کا پتا بتا چکا ہوں جہاں ہم رہتے تھے۔‘‘

’’گڈ! اس سے تمہاری باتوں پر خاصا یقین کیا جا سکتا ہے۔ اگر تمہارا بتایا ہوا پتا درست ثابت ہوا۔ ہم کل صبح ایک گھنٹے کے اندر اندر معلوم کر لیں گے کہ تم نے صحیح پتا بتایا ہے یا نہیں۔‘‘

انور نے ایک شہر کا اور ایک مکان کا پتا بتا دیا جو اس حد تک درست تھا کہ ابتدا میں اس کے والد وہیں رہے تھے اور ایک سال بعد اس شہر میں منتقل ہو گئے تھے جہاں زنوبیا رہتی تھی۔ پہلا شہر ایک پُرفضا اور سرد شہر تھا جہاں اس کے والد گرمیوں کا زمانہ گزارا کرتے تھے۔ اپنے دونوں مکان انہوں نے اس وقت فروخت کیے تھے جب ملک چھوڑنے کا ارادہ کیا تھا۔ انور نے اس شہر اور اس گھر کا پتا نہیں بتایا جہاں اس کے پڑوس میں زنوبیا رہتی تھی۔ یہ احتیاط کرنا اس نے ضروری سمجھا تھا۔ اس طرح انہیں یہ خیال آسکتا تھا کہ وہ اور زنوبیا ایک دوسرے سے واقف ہوں گے۔

اس کا بتایا ہوا وہ پتا بھی نوٹ کر لیا گیا۔

کرنل بولا۔ ’’صبح دس بجے تک مجھے اس بارے میں

رپورٹ مل جائے گی۔ اس کے بعد ہی تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ تمہاری اب تک کی باتوں سے میں خاصی حد تک مطمئن ہوں۔''

''شکریہ کرنل۔''

''اب تم آرام کرو۔ تمہارا ہر طرح سے خیال رکھا جائے گا۔''

''ایک بار پھر شکریہ۔''

''بس صرف یہ بات کھٹک رہی ہے کہ جب ہمارے ہیلی کاپٹروں نے تمہیں تلاش کر لیا تھا تو تم نے بھاگنے کی کوشش کیوں کی تھی؟''

''مجھے یقین تھا کہ مجھے گرفتار کر لیا جائے گا اور ہوا بھی وہی۔ دراصل میں از خود آپ کے ہیڈ کوارٹر میں پیش ہونا چاہتا تھا۔''

کرنل نے سر ہلایا اور پھر اپنے دونوں ساتھیوں کو آنکھوں سے اشارہ کر کے خیمے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ لوگ صبح دس بجے تک اس کی طرف سے مطمئن ہو سکتے تھے لیکن انور کو اپنا مشن دس بجے سے پہلے مکمل کرنا تھا جس کے لیے ضروری تھا کہ وہ یہاں سے جتنی جلدی ممکن ہو، فرار ہو سکے۔

کیا زنوبیا اسے یہاں سے فرار کرا سکے گی؟ کیا وہ اپنے ملک کو، اپنی فوج کو دھوکا دے سکتی تھی جس میں وہ خود بھی تھی۔

انور نے تکیے کے نیچے سے پرچہ نکال کر دوسری طرف کروٹ لی تاکہ اگر کوئی اچانک اس کے خیمے میں آئے تو اسے پرچہ پڑھتے ہوئے نہ دیکھ سکے۔ کروٹ لینے سے اس کی ران میں تکلیف ہوئی تھی جسے اس نے برداشت کیا تھا۔

وہ زنوبیا کے ہاتھ کی تحریر تھی۔ لکھا تھا۔ ''میری زندگی! میری روح! کیا ستم ظریفی ہے قدرت کی کہ جب ہم ایک دوسرے کے سامنے ہوتے ہیں، حادثاتی طور پر ہی ہوتے ہیں۔ جب تمہیں یہاں لایا گیا تھا، اسی وقت میں نے تمہیں دیکھ لیا تھا۔ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ تمہاری زخمی ران سے گولی نکالنے کے لیے مجھے ہی بلایا جائے گا کیونکہ دوسری ڈاکٹر ایک مریض آفیسر کو دیکھنے گئی ہوئی ہے۔ اس کی واپسی دیر میں ہو گی۔ میں تم سے یہ شکایت نہیں کروں گی کہ تم نے فوج میں اپنی شمولیت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ شکایت کا حق مجھے اس لیے نہیں پہنچتا کہ میں نے بھی تم کو یہ بات نہیں بتائی تھی کہ میں فوج میں ہوتی ہوں۔ میرا خیال تھا کہ تم اس کی مخالفت کرو گے اور غالباً تم نے بھی یہی سوچا ہو گا۔ میں ایک آرٹسٹک ذہن کی مالک ہوں۔ فوج میں میری شمولیت غیر فطری ہے لیکن میں مجبور ہو گئی تھی۔ میں نے شاید تمہیں بتایا بھی تھا کہ میرے ایک قریبی عزیز فوج میں ہیں۔ انہوں نے میرے ڈیڈی سے کہا تھا کہ مجھے ڈاکٹر کی حیثیت سے فوج کی میڈیکل کور میں داخل کرا دیا جائے۔ انہوں نے اس بارے میں ڈیڈی سے کیا کہا تھا، مجھے علم نہیں۔ مختصر یہ کہ ڈیڈی کے دباؤ پر میں فوج میں آ گئی۔ شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ ہم دوسری بار بھی حادثاتی طور پر ملیں۔ تم غالباً اپنی فوج کی کسی خفیہ ایجنسی میں ہو۔ تمہیں کسی خاص کام سے یہاں بھیجا گیا ہو گا۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ تم فوجی وردی میں کیوں تھے۔ جاسوسوں کو یہ لوگ چھوڑتے نہیں ہیں۔ میری جان! میں شدید الجھن میں ہوں کہ تمہیں یہاں سے بچا کر کس طرح نکال سکتی ہوں۔ اگر تمہارے ذہن میں کوئی تدبیر ہو تو مجھے بتاؤ۔ لکھ کر رکھ لینا۔ میں تمہاری ڈریسنگ کرنے کے بعد تم سے یہی کہہ کر جاؤں گی کہ امکان یہی ہے کہ تم اب تکلیف محسوس نہیں کرو گے لیکن اگر تمہارے ذہن میں کوئی تدبیر ہو یا تم کچھ سوچ سکو تو لکھ کر رکھ لینا۔ اس کے بعد کراہنا شروع کر دینا، ظاہر کرنا کہ تم تکلیف محسوس کر رہے ہو۔ مجھے یقیناً بلایا جائے گا لیکن میں یہ بھی سوچ رہی ہوں کہ تم سے پوچھ گچھ تو کی جائے گی۔ ممکن ہے وہ تمہارے بیان سے مطمئن نہ ہوں اور تمہارے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کریں۔ کوشش کروں گی کہ تمہارے معاملات سے باخبر رہ سکوں مگر یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ کامیاب رہوں گی۔ اس پر تمہیں یقیناً حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ میں اس ملک کی فوج سے غداری کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے صرف تم عزیز ہو میری زندگی، میری روح۔ مجھے اس ملک اور اس کی فوج سے زیادہ تمہاری فکر ہے۔ میں تمہارے لیے اپنی جان کی بازی بھی لگا سکتی ہوں۔ میں اپنی حکومت کو اس لیے پسند نہیں کرتی کہ اس کی پالیسی تمہارے ملک کے خلاف جارحانہ ہے۔ دراصل موجودہ وزیراعظم امن پسند نہیں، جنگ جویانہ ذہنیت کا مالک ہے۔ اپنی تقریروں سے اس نے یہاں کے عوام کی اکثریت کو بھی اپنا ہمنوا بنا لیا ہے۔ میں محسوس کر سکتی ہوں کہ بدبختی کا نتیجہ اس ملک کے حق میں نہیں جائے گا۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔ میں انتظار کروں گی کہ مجھے دوبارہ بلایا جائے۔''

خط کے آخر میں زنوبیا نے اپنا نام نہیں لکھا تھا۔

انور سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ زنوبیا اس کی کیا مدد کرسکتی ہے اور کس طرح کرسکتی ہے۔ سوچنے کے لیے اس کے پاس زیادہ وقت بھی نہیں تھا۔ اب اس کے پاس صرف نو گھنٹے تھے۔ اگر کچھ کیا جاسکتا تھا تو ان نو گھنٹوں میں ہی کیا جاسکتا تھا اور نو گھنٹے بھی اس اعتبار سے نہیں تھے کہ فرار ممکن ہونے کے بعد پادری سیموئل تک پہنچنے میں بھی وقت لگتا اور کتنا وقت لگتا، اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔

اس نے جلدی جلدی چند سطریں لکھیں۔ ''زنوبی! میرے ذہن میں نہ تو کوئی تدبیر ہے اور میں سوچ بھی نہیں پارہا ہوں۔ سوچ بھی کیسے سکتا ہوں، مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ تم مجھے یہاں سے کس طرح فرار کراسکتی ہو۔ تمہیں ہی سوچنا ہوگا کہ کیا تدبیر ممکن ہے۔ یہ بھی بتادوں کہ آٹھ گھنٹے کے اندر اندر کسی جگہ پہنچنا میرے لیے بہت ضروری ہے۔''

عبارت کے آخر میں انور نے بھی اپنا نام نہیں لکھا اور پرچہ تکیے کے نیچے رکھ کر آہستہ آہستہ کراہنے لگا۔ کوشش کررہا تھا کہ چہرے پر تکلیف کا تاثر بھی لاسکے۔ دھیرے دھیرے اس نے کراہیں بلند کیں تو وہی لیفٹیننٹ اندر آیا۔

''کیوں شور کررہے ہو؟'' وہ ڈانٹنے والے انداز میں بولا۔ ''گولی لگی ہے، کوئی پھول نہیں لگا ہے کہ تکلیف نہ ہو۔''

''کچھ زیادہ ہی تکلیف ہے بھائی۔'' انور نے لجاجت سے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحبہ کہہ کر گئی تھیں کہ اگر زیادہ تکلیف ہو تو انہیں بلوالوں۔'' خاموش ہوکر وہ یکا یک اس طرح کراہا جیسے زخم میں اچانک زوردار ٹیس اٹھی ہو۔

لیفٹیننٹ کے چہرے پر ناگواری کا تاثر قائم رہا اور وہ انور کو خشمگیں نظروں سے دیکھتا ہوا چلا گیا۔

انور کو امید تھی کہ وہ جاکر زنوبیا کو اطلاع دے گا یا کسی سے اطلاع بھجوائے گا۔ وہ اپنے کرنل کی یہ بات نظر انداز نہیں کرسکتا تھا کہ انور کا خیال رکھا جائے۔

پندرہ منٹ بعد زنوبیا خیمے میں آئی۔ اس مرتبہ اس کے ساتھ ایک ہی نرس تھی۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔ ''کیا محسوس کررہے ہو؟''

''ذرا ذرا دیر بعد ٹیس سی اٹھتی ہے۔'' انور نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

''تمہیں شوگر تو نہیں ہے؟'' زنوبیا نے اپنے لہجے میں تشویش پیدا کی۔

''ہے تو لیکن کچھ زیادہ نہیں۔''

''کم یا زیادہ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تمہیں پہلے ہی بتادینا چاہیے تھا لیکن غلطی میری بھی ہے۔ ڈاکٹر کو ایسی باتیں خود پوچھنا چاہئیں۔ جو دوا میں نے لگائی ہے، وہ شوگر کے مریض کے زخم پر نہیں لگانی چاہیے۔'' پھر وہ نرس سے بولی۔ ''ڈریسنگ اتارو اور زخم صاف کرو۔''

لیفٹیننٹ اس وقت بھی خیمے میں موجود تھا اور اس مرتبہ اس کی نظر مسلسل انور پر تھی۔ ممکن نہیں تھا کہ انور، زنوبیا کو اشارہ کرتا کہ پرچہ تکیے کے نیچے ہے۔ وہ بے چینی محسوس کرنے لگا۔

نرس نے ڈریسنگ ختم کرکے زخم صاف کیا۔ پھر زنوبیا نے کوئی اور دوا یا شاید پہلے ہی والی دوا لگا کر ڈریسنگ کردی۔

''اب کیسا محسوس کررہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''یکا یک کچھ ٹھنڈک سی پڑ گئی ہے۔''

''مجھے یہی امید تھی۔'' زنوبیا نے کہا اور اس کا تکیہ ٹھیک کرنے لگی۔ وہ بہت ذہین تھی۔ اس نے خود ہی سمجھ لیا تھا کہ انور کا پرچہ تکیے کے نیچے ہوگا۔

''جب بھی کچھ محسوس کرو اور میری ضرورت ہو، لیفٹیننٹ کو بتادینا۔'' زنوبیا نے کہا اور نرس کے ساتھ خیمے سے چلی گئی۔

''کھانا تو کھا کے چلے ہوگے تم اس مردار عورت کے گھر سے؟'' لیفٹیننٹ نے چبھتے ہوئے سے لہجے میں کہا۔

انور کو یقین ہوگیا کہ اس نے ٹھیک سوچا تھا۔ گاؤں سے اس کے نکلتے وقت جو ہیلی کاپٹر دکھائی دیا تھا، وہ یقیناً اس گاؤں میں اترا تھا اور ان لوگوں کو معلوم ہوگیا تھا کہ انور کس کے گھر میں قیام کرنے کے بعد وہاں سے کہیں چلا گیا ہے۔

''ہاں۔'' انور نے کہا۔ ''لیکن چائے کی خواہش ہے۔''

''مل جائے گی۔'' لیفٹیننٹ نے کھردرے لہجے میں کہا اور خیمے سے چلا گیا۔

انور کو ابھی نیند تو نہیں آرہی تھی لیکن سوچ سوچ کر دماغ بری طرح تھک گیا تھا۔ اسے واقعی چائے کی ضرورت محسوس ہورہی تھی۔ چائے پینے کے بعد بھی اس کو وقتی دماغی سکون تو ملا لیکن سوچ کا دھارا تو مسلسل بہہ رہا تھا۔ اسے یہ فکر لاحق تھی کہ زنوبیا از خود اس کے لیے کچھ کرسکے گی یا نہیں؟ اور کرسکے گی تو کیا کرسکے گی۔

کچھ دیر بعد اس کے خیمے میں دوسرا لیفٹیننٹ آگیا۔

غالباً ہدایت یہی کی گئی کہ انور کو خیمے میں زیادہ دیر کے لیے اکیلا نہ چھوڑا جائے۔ اگرچہ ران کے زخم کی وجہ سے وہ دوڑ نہیں لگا سکتا تھا اور لنگڑا کر چلنے میں بھی دشواری اور تکلیف ہوتی لیکن ناممکن تھا کہ خیمے کے باہر بھی کسی کو پہرے پر نہ کھڑا کیا گیا ہو۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، ویسے ویسے انور کے اعصابی تناؤ میں بھی اضافہ ہوتا جارہا تھا کیونکہ اس کے مشن کی تکمیل کے وقت میں کمی ہوتی جارہی تھی۔

دو بج چکے تھے جب زنوبیا کچھ پریشان سی وہاں آئی۔

”میں یہاں اپنا موبائل تو نہیں بھول گئی۔“

”میں نے تو نہیں دیکھا ڈاکٹر صاحبہ۔“ انور نے جواب دیتے ہوئے سمجھ لیا تھا کہ زنوبیا نے وہاں آنے کا یہ جواز بنایا ہے کہ وہ اپنا موبائل بھول گئی ہے۔

”اور کہیں تو میں گئی نہیں ہوں۔“ زنوبیا نے انور کے بستر پر ادھر ادھر ڈھونڈنے کی اداکاری کی۔ ”میں سو چکی ہوتی ہوں اس وقت تک لیکن دو بجے میری ایک کال آنی تھی جو نہیں آئی تو میں نے اپنا پرس دیکھا، موبائل غائب تھا۔“ اس کا انداز بڑبڑانے کا سا تھا، جیسے اپنے آپ سے بات کررہی ہو۔ پھر وہ لیفٹیننٹ سے بولی۔ ”تم نے تو نہیں دیکھا؟“

”جب آپ آئی تھیں، میں یہاں نہیں تھا۔ دوسرے کی ڈیوٹی تھی، لیکن اگر اس نے بھی آپ کا موبائل دیکھا ہوتا تو آپ کو پہنچا دیتا۔“

”اپنا سر ذرا تکیے سے اٹھاؤ۔“ زنوبیا نے انور سے کہا۔ ”شاید وہاں......“

انور نے اپنا سر تھوڑا سا اٹھایا۔ زنوبیا نے تکیہ تھوڑا سا اٹھایا اور پھر رکھتی ہوئی بڑبڑائی۔ ”دماغ خراب ہوگیا ہے میرا۔ موبائل تکیے کے نیچے تو نہیں بھولا جاسکتا۔ میں ہی اپنے خیمے میں رکھ کر بھول گئی ہوں۔ تلاش کرتی ہوں جا کر۔“

وہ جتنی تیزی سے آئی تھی، اتنی ہی تیزی سے واپس چلی گئی۔

لیفٹیننٹ وہیں پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

انور کو یقین تھا کہ زنوبیا اس کے تکیے کے نیچے کوئی خط چھوڑ گئی ہوگی۔ اسی خط کے لیے اس نے موبائل گم ہونے کا بہانہ بنایا تھا۔

اب انور کو وہ خط تکیے کے نیچے سے نکالنے کے لیے ایک ایسے موقع کی تلاش تھی جب لیفٹیننٹ اس کی طرف متوجہ نہ ہو۔

ایسا موقع اسے پندرہ بیس منٹ بعد اس وقت ملا جب انور نے سمجھا کہ وہ خیمے سے جارہا ہے۔ انور نے جلدی سے پرچہ نکال لیا اور پھر جلدی سے اپنے جسم کے نیچے چھپا بھی لیا کیونکہ لیفٹیننٹ باہر جھانک کر واپس اپنی کرسی پر آ بیٹھا تھا۔ اس نے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ غالباً وہ سگریٹ سلگانے سے پہلے جھانک کر یہ دیکھ آیا تھا کہ آس پاس اس کا کوئی آفیسر تو نہیں۔

انور نے پرچہ پڑھنے کے لیے کروٹ لے لی۔

پرچے میں لکھا تھا۔ ”پہلے تو میں نے یہی لکھا تھا کہ تم اپنے فرار کے لیے کوئی تدبیر سوچ لو تو میں تمہاری مدد کروں گی لیکن جب میں اپنے خیمے میں جا لیٹی تو سوچتی رہی کہ تم اردگرد کے ماحول اور حالات سے بے خبر ہو اس لیے کوئی تدبیر نہیں سوچ سکو گے۔ اس بارے میں مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ میں نے کئی تدبیریں سوچیں اور کسی نہ کسی وجہ سے رد بھی کر دیں۔ آخر جب میں نے ایک تدبیر پر اکتفا کرلیا تو فیصلہ کیا کہ اب کسی طرح تمہارے پاس جا کر یہ پرچہ چھوڑ آؤں۔ تدبیر خطرناک ہے لیکن میں اس کے سوا کچھ نہیں سوچ سکی کہ تم مجھے یرغمال بنا کر ان لوگوں کو مجبور کرو کہ یہ تمہارے لیے ایک ہیلی کاپٹر کا بندوبست کریں۔ اس کے لیے تمہیں ریوالور کی ضرورت ہوگی۔ یہ کام تمہیں کسی طرح خود ہی کرنا ہوگا۔ لیفٹیننٹ کی کمر سے ریوالور لٹکا ہوا ہے۔ کسی طرح وہ حاصل کرنا ہوگا تمہیں۔ تم یہ کام کر سکے تو گلوخلاصی ہو جائے گی۔ میں کوئی اور تدبیر نہیں سوچ سکی۔ جب تم اس میں کامیاب ہو جاؤ تو کسی طرح مجھے بلوانا۔ مجھے احساس ہے کہ زخمی ٹانگ کی وجہ سے یہ کام تمہارے لیے آسان نہیں ہوگا لیکن کسی طرح ہمت کرنا۔ کسی بہانے سے اسے اپنے قریب بلانا۔ وہ قریب آجائے گا تو جھپٹ کر ریوالور نکالنا تمہارے لیے مشکل نہیں ہوگا۔ اس کے بعد مجھے بلوانے کے لیے تم اسی کو مجبور کر سکتے ہو۔ میں یہ خط تمہارے تکیے کے نیچے چھوڑنے کے بعد اپنے خیمے میں بے چینی سے تمہاری کامیابی کا انتظار کروں گی۔“

انور نے پرچہ توڑ مروڑ کر اپنے لباس میں چھپالیا۔ مناسب تو یہ ہوتا کہ وہ زنوبیا کے خطوط جلا کر ضائع کردیتا لیکن اس کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ اب وہ سیدھا ہو کر لیٹ گیا اور لیفٹیننٹ کی طرف دیکھنے لگا جو سگریٹ پی چکا تھا۔

چند منٹ کچھ سوچ کر اس نے لیفٹیننٹ کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ ”دوست! تم سگریٹ پیتے ہو۔ کیا

"مجھے ایک سگریٹ دو گے؟"

لیفٹیننٹ نے اثبات میں سر ہلایا اور جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوا اٹھ کر انور کی طرف بڑھا۔ وہ پہلے لیفٹیننٹ کی طرح خرانٹ اور کھردرے مزاج کا نہیں تھا۔ پہلا تو ایسا تھا کہ انور کی فرمائش پر اسے جھڑک دیتا۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم ایک گھٹیا ملک کی فوج سے بھاگ نکلے ہو اور ہمارے ساتھ شامل ہونا چاہتے ہو۔" لیفٹیننٹ نے قریب آتے ہوئے کہا اور ایک سگریٹ نکال کر انور کو دیا۔

انور نے سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر کہا۔ "اب اسے سلگا بھی دو دوست۔"

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی لیفٹیننٹ نے لائٹر نکال لیا تھا۔ وہ انور کے ہونٹوں میں دبا ہوا سگریٹ سلگانے کے لیے اس پر جھکا۔

اس وقت انور کے دل کی دھڑکنیں کچھ اور تیز ہو چکی تھیں۔ اس نے کروٹ بھی لے لی تھی تا کہ جھپٹ کر ریوالور اس کے ہولسٹر سے نکالنے میں دشواری نہ ہو۔ اس وقت اسے بہت تیزی دکھانے کی ضرورت تھی۔ اگر وہ ریوالور حاصل کرنے میں ناکام رہتا تو اب تک کے کیے کرائے پر پانی پھر جاتا۔ ایک فرضی کہانی سنا کر اس نے ان لوگوں کو بڑی حد تک مطمئن کر دیا تھا لیکن ریوالور جھپٹنے کی کوشش میں ناکامی کے بعد وہ لوگ اس کا بہت برا حشر کرتے لیکن اپنے بُرے حشر سے زیادہ اسے اپنے مشن کی کامیابی سے دلچسپی تھی۔

لیفٹیننٹ اس کے ہونٹوں میں دبا سگریٹ سلگانے کے لیے اس پر جھکا ہی تھا کہ انور نے اس کے ہولسٹر پر جھپٹا مارا اور ریوالور حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے لیفٹیننٹ کو دھکا بھی دیا تھا۔

دھکے سے وہ لڑکھڑایا اور گرتے گرتے بچا۔

خود انور کے زخم میں بھی جھٹکے کی وجہ سے بہت زور کی ٹیس اٹھی تھی جسے اس وقت نظر انداز کرنا ہی وقت کا تقاضا تھا۔

"خبردار!" انور نے ریوالور کا رخ لیفٹیننٹ کی طرف کرتے ہوئے تیز سرگوشی کی۔ "تمہاری کوئی بھی غلط حرکت تمہیں دوسری دنیا میں پہنچا دے گی۔ میں گھٹیا فوج کا بہت گھٹیا آدمی ہوں لیکن میرا نشانہ بہت سچا ہے۔ گولی تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کر دے گی۔"

لیفٹیننٹ ہکا بکا کھڑا رہ گیا تھا۔

اب انور نے ذرا سا رک کر کہا۔ "اب پھر میرے قریب آؤ۔ تمہیں اس طرح کھڑا ہونا ہے کہ ریوالور کی نال تمہارے پہلو سے لگی رہے گی لیکن کوئی اندر آئے گا تو اسے دکھائی نہیں دے گی۔ پھر تم چیخ چیخ کر اپنے کرنل صاحب کو آواز دو گے اور یہ بھی کہو گے کہ اس لیڈی ڈاکٹر کو بھی بلائیں۔ میں اس کا نام نہیں جانتا۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"زنوبیا، کیپٹن زنوبیا۔" لیفٹیننٹ نے اٹکتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میرے قریب آ جاؤ اور میری ہدایت پر عمل کرو۔"

لیفٹیننٹ خوف زدہ سا قریب آیا اور اسی طرح کھڑا ہو گیا جیسا انور نے کہا تھا۔ انور نے ریوالور کی نال اس کی کمر سے لگا دی۔ "میں آنے والوں سے جو کچھ کہوں، اس کی نفی ہرگز نہ کرنا ورنہ......" انور نے دھمکی آمیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا، پھر رک کر بولا۔ "شور مچاؤ۔"

لیفٹیننٹ کو اپنی موت سر پر کھڑی نظر آ رہی تھی۔ اس نے اسی طرح چیخنا شروع کر دیا جس طرح انور نے کہا۔

اس کی چیخ پکار سن کر کئی فوجی بے تحاشا اندر گھس آئے۔ ان میں ایک کیپٹن بھی تھا۔

"کیپٹن زنوبیا کو بلاؤ!" لیفٹیننٹ نے ان سے کہا۔ وہ کرنل کا نام لینا شاید بھول گیا تھا۔ انور کے لیے اس کی کوئی اہمیت بھی نہیں تھی۔ اسے یقین تھا کہ کرنل کو اطلاع ہو ہی جائے گی۔

"کیا بات ہے؟" کسی نے انور کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

انور نے پہلے ہی سے اپنے چہرے پر تکلیف کے آثار پیدا کر لیے تھے۔

"ڈاکٹر...... ڈاکٹر زنوبیا...... بہت تکلیف میں ہوں۔" وہ اس طرح بولا جیسے واقعی شدید تکلیف میں ہو۔

"اتنی زور سے چیخنے کی کیا ضرورت تھی؟" کیپٹن نے سخت لہجے میں لیفٹیننٹ سے کہا پھر جواب کا انتظار کیے بغیر ایک فوجی سے بولا۔ "ڈاکٹر کو بلاؤ۔"

ایک فوجی نے لیفٹیننٹ کی طرف داری میں دبی دبی زبان سے کہا۔ "کرنل صاحب کا حکم جو تھا کہ اس قیدی کا خیال رکھا جائے۔"

کیپٹن نے منہ بنایا لیکن کچھ بولا نہیں۔

اتفاق سے زنوبیا اور کرنل ساتھ ہی خیمے میں آ گئے۔

"آج سونا شاید میرے مقدر میں نہیں ہے۔" زنوبیا کے لہجے میں ناگواری تھی۔ وہ انور کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "اب کیا ہو گیا؟"

انور نے اپنے گلے پر انگلی رکھی اور پھر اسی ہاتھ سے نفی کا اشارہ کیا۔

"بولا نہیں جا رہا ہے؟" زنوبیا نے پوچھا۔

انور نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"یہ نرس کہاں مر گئی؟" زنوبیا نے فوجیوں کی طرف دیکھتے ہوئے جھنجلائی سی آواز میں کہا۔

زنوبیا بالکل قریب آ چکی تھی۔ یہ انور کے لیے بہترین موقع تھا۔ زنوبیا نے یقیناً جان بوجھ کر خود کو ایسی پوزیشن میں رکھا تھا کہ انور کو اپنے "کام" میں دشواری نہ ہو۔ اس نے لیفٹیننٹ کو اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ گرتے گرتے بچا اور پھر فوراً ہی زنوبیا کا ہاتھ پکڑ کر اسے ایسا جھٹکا دیا کہ اس کی پشت انور کی طرف اور چہرہ فوجیوں کی طرف ہو گیا۔ ساتھ ہی اس نے ریوالور کی نال زنوبیا کی کنپٹی پر رکھ دی۔

"کرنل!" انور نے ایسی آواز میں کہا جیسے غرایا ہو۔

کرنل کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ "دھوکا۔"

"جنگ میں یہ سب کچھ ہوتا ہے کرنل۔" انور نے کہا۔ "اور اب تم میری روانگی کے لیے ایک ہیلی کاپٹر کا بندوبست کرو۔ تمہاری یہ ڈاکٹر میرے ساتھ جائے گی۔ اس کام کے لیے میں تمہیں دس منٹ دے سکتا ہوں۔ اگر کسی چال بازی کی کوشش کی تو میں مرتے مرتے بھی تمہاری اس ڈاکٹر کو دوسری دنیا کی سیر کرا دوں گا۔ اور ہاں! ہیلی کاپٹر میں دو پیراشوٹ بھی ہونے چاہئیں۔"

فوجی بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ انور کو یقین تھا کہ زنوبیا نے اپنے چہرے پر خوف کے تاثرات پیدا کر لیے ہوں گے۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی۔

"منہ کیا تک رہے ہو؟" انور گرجا۔ "دس منٹ کے اندر ہیلی کاپٹر چاہیے مجھے...... اس میں پانی کا بندوبست بھی ہونا چاہیے۔"

کرنل نے کیپٹن کو اشارہ کیا اور کیپٹن تیزی سے چلتا ہوا خیمے سے نکل گیا۔

خیمے میں چند لمحے تک مکمل سکوت رہا۔ پھر زنوبیا نے اپنا سر تھوڑا سا گھما کر کن انکھیوں سے انور کی طرف دیکھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "کیا میں نے تمہارے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا تھا؟"

"مجبوری ہے ڈاکٹر!" انور نے کہا۔ "اپنے فرار کے لیے کوئی اور تدبیر میرے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ اگر میں تمہارے بجائے اس لیفٹیننٹ کو یرغمال بناتا تو وہ زیادہ مؤثر اقدام نہ ہوتا۔ مہرہ شطرنج کی بساط کا ہو یا فوج کی بساط کا، ہر مہرے کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ تم ڈاکٹر بھی ہو اور کیپٹن بھی۔ لیفٹیننٹ کی بہ نسبت تمہاری اہمیت زیادہ ہے۔"

زنوبیا خاموش رہی۔

اسے "بے بس" کرنے اور لیفٹیننٹ کو دھکا دینے کے باعث انور کے زخم کی تکلیف بڑھ گئی تھی لیکن جب زندگی اور موت کا کھیل ہو رہا ہو تو ایسی تکلیفوں کی حیثیت ثانوی ہو جاتی ہے۔

انور کو یہ اندازہ بھی تھا کہ چلنے میں بھی اسے دشواری ہو گی۔ اسے زنوبیا کا سہارا اس طرح لینا پڑتا کہ اس پر اس کی گرفت بھی مضبوط رہے۔ وہ زنوبیا کی کمر جکڑے ہوئے تھا اور بستر پر بیٹھ بھی چکا تھا۔

"مجھے ایک ریوالور اور چاہیے کرنل!" انور بولا۔

کرنل نے ایک لیفٹیننٹ کو اشارہ کیا۔ وہ ہولسٹر سے ریوالور نکال کر انور کی طرف بڑھا۔

"آگے نہیں آؤ۔" انور غرایا۔ "ریوالور زمین پر رکھ کر اس طرح ٹھوکر مارو کہ یہ میرے قریب آ جائے۔"

لیفٹیننٹ نے ایک مرتبہ کرنل کی طرف دیکھا اور پھر وہی کیا جو اس سے انور نے کہا تھا۔

ریوالور زنوبیا کے پیر کے قریب آ کر رکا۔

"اسے میرے قریب سرکا دو ڈاکٹر۔" انور نے حکم دینے والے انداز میں کہا۔

زنوبیا نے ایسا ہی کیا۔

ریوالور اٹھانے کے لیے انور کو تھوڑا سا جھکنا پڑا لیکن وہ براہِ راست ریوالور کی طرف دیکھنے کے بجائے کن انکھیوں سے فوجیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک لیفٹیننٹ نے اسے غافل سمجھ کر جلدی سے اپنا ریوالور نکالا لیکن ایک دھماکا ہوا اور ریوالور اس کے ہاتھ سے اچھل کر دور جا گرا۔ فائر انور ہی نے کیا تھا۔

"دیکھ لیا کرنل۔" انور بولا۔ "میرا نشانہ کتنا سچا ہے۔ میں گولی اس کے سینے میں بھی اتار سکتا تھا لیکن میں اس وقت ایسے موڈ میں نہیں ہوں۔"

حقیقت یہ تھی کہ انور ان لوگوں کو اپنی پکی نشانہ بازی سے مرعوب کرنا چاہتا تھا۔

لیفٹیننٹ کا وہ ہاتھ تھوڑا سا زخمی ہو گیا تھا جس سے

خون کے قطرے ٹپکنے لگے تھے۔
"تم جا کر کسی سے اپنی ڈریسنگ کرواؤ۔" انور نے اسی سے کہا۔
لیفٹیننٹ نے کرنل کی طرف دیکھا۔ متفکر کرنل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ لیفٹیننٹ خیمے سے چلا گیا۔
اب انور کے بائیں ہاتھ میں بھی ریوالور تھا۔ گولی اس نے دائیں ہاتھ کے ریوالور سے چلائی تھی۔
دفعتاً زنوبیا بڑے جذباتی سے انداز میں بولی۔ "مجھے مر جانے دیں کرنل! میری پروا نہ کریں۔ دشمن کو بچ کر نہیں نکلنا چاہیے۔"
"شٹ اپ!" انور نے کہتے ہوئے بائیں ہاتھ کے ریوالور کا دستہ زنوبیا کی کمر پر مارا۔ زنوبیا کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکل گئی۔ تکلیف انور کو بھی ہوئی تھی لیکن اس وقت کچھ ایسی ہی حرکت کرنے کی ضرورت تھی۔
اچانک زنوبیا نے مچل کر انور کی گرفت سے اس طرح نکلنا چاہا تھا کہ نکل نہ سکے۔
"گولی مار دوں گا میں تجھے ڈاکٹر!" انور نے دانت پیسے۔
"کیپٹن زنوبیا!" کرنل زور سے بولا۔ "ایسی حرکتیں مت کرو۔ میں دیکھتا ہوں کہ یہ چاہتا کیا ہے؟"
"یہ فرار ہونا چاہتا ہے کرنل۔" زنوبیا نے بناوٹی انداز میں ہانپتے ہوئے کہا۔ "اور کیا چاہے گا یہ۔ اس نے دو پیراشوٹ مانگے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ مجھے بھی ہیلی کاپٹر میں اپنے ساتھ کہیں لے جانا چاہتا ہے۔"
"سمجھ رہا ہوں میں۔" کرنل نے کہا۔ "لیکن ایسی کوئی حرکت نہ کرو کہ ہم تمہیں فوری طور پر کھو دیں۔ بعد میں دیکھیں گے کہ یہ کرے گا کیا؟"
"اچار ڈالوں گا تمہاری ڈاکٹر کا۔" انور اس انداز میں ہنسا جسے ہذیانی ہی کہا جا سکتا تھا۔
کرنل اسے گھور کر رہ گیا۔ انور نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ زنوبیا نے اپنے چہرے پر غصے کے تاثرات طاری کر لیے تھے۔ وہ اس وقت اداکاری کرنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ اگر اس کی اداکاری کچی بھی تھی تو اس کشیدہ ماحول میں کوئی اس پر توجہ نہیں دے سکا ہوگا۔
"دس منٹ ہو گئے کرنل۔" انور نے غرانے کے انداز میں کہا۔ "ہیلی کاپٹر......" وہ بات ادھوری چھوڑ کر کیپٹن کو دیکھنے لگا جو اسی وقت خیمے میں داخل ہوا تھا۔ کرنل نے اسی کو ہیلی کاپٹر کا بندوبست کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ اس نے کرنل کو بتایا کہ ہیلی کاپٹر تیار ہے۔
"کتنی دور ہے؟" انور نے اسی سے پوچھا۔
"چالیس گز کے قریب۔"
"ٹھیک ہے۔ تم لوگ باہر نکلو۔" انور نے کہا۔ "میں تمہاری ڈاکٹر کے ساتھ بعد میں نکلوں گا۔ صرف ایک آدمی ہیلی کاپٹر تک میری رہنمائی کرے۔ کوئی اور پیچھے نہ آئے۔ کوئی شرارت کی تو سمجھ لو۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں مرنے سے پہلے تمہاری ڈاکٹر کے علاوہ بھی دو ایک کو ٹھکانے لگا دوں گا۔"
کرنل خیمے سے جانے کے لیے مڑ گیا۔ اس کے پیچھے دوسروں کے قدم بھی اٹھے۔
"کرنل!" زنوبیا ایسے انداز میں بولی جیسے فریاد کر رہی ہو۔
"ہمت رکھو کیپٹن۔" کرنل نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا اور پھر باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے باقی بھی چلے گئے۔
"اب تک سب ٹھیک جا رہا ہے۔" زنوبیا نے سرگوشی میں انور سے کہا۔ "تمہیں چلنے میں دشواری ہوگی۔ میرا سہارا لے کر چلنا۔"
"یہی کروں گا۔ بولو مت۔ کسی وقت دیواریں بھی سن لیتی ہیں۔" انور نے بھی سرگوشی ہی کی تھی۔
ایک منٹ بعد ہی انور اور زنوبیا بھی خیمے سے نکلے۔ زنوبیا بائیں جانب تھی۔ انور نے بایاں ہاتھ اس کے بائیں کندھے پر جما رکھا تھا۔ اسی ہاتھ میں وہ ریوالور بھی تھا جو انور نے بعد میں ایک لیفٹیننٹ سے لیا تھا۔ دائیں ہاتھ میں وہ ریوالور تھا جو اس نے چھینا تھا۔
کیپٹن قریب ہی موجود تھا۔ باقی فوجی خاصے فاصلے پر کھڑے تھے۔
انور نے ان لوگوں کو گھورتے ہوئے چیخ کر کہا۔ "تم سب میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ میں نے کسی کو بھی دیکھا تو میرے ریوالور سے شعلے اُبل پڑیں گے۔"
اس دھمکی کے بعد وہ سب اِدھر اُدھر کہیں غائب ہو گئے۔
کیپٹن نے ان کی رہنمائی کے لیے ٹارچ روشن کر لی تھی۔
انور ٹانگ کی تکلیف برداشت کرتا ہوا، زنوبیا کے سہارے آگے بڑھتا رہا۔ چالیس گز کا فاصلہ اس کے لیے چار فرلانگ جیسا ثابت ہوا۔ اس دوران میں زنوبیا سر موڑ

موڑ کر پیچھے دیکھتی رہی، جیسے اسے امید ہو کہ اس کی مدد کے لیے کوئی آئے گا لیکن دراصل وہ عقب سے باخبر رہنا چاہتی تھی۔

ہیلی کاپٹر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

فوجیوں میں سے کسی نے اب تک کوئی شرارت نہیں کی تھی۔

زنوبیا کو جکڑے ہوئے ہیلی کاپٹر پر سوار ہونا آسان نہیں تھا لیکن کسی نہ کسی طرح یہ مرحلہ بھی طے ہوگیا۔

انور نے پائلٹ کی سیٹ سنبھالی تھی۔

''تم اڑانا جانتے ہو؟'' زنوبیا نے پوچھا۔

''میں بھی فوج میں ہوں زنوبی!'' انور نے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے انجن اسٹارٹ کیا۔ ''فون پر تم سے باتیں ہوتی تھیں تو میں نے اس لیے نہیں بتایا کہ شاید تم مخالفت کرتیں۔''

''اسی لیے میں نے بھی نہیں بتایا تھا۔'' زنوبیا پھیکے سے انداز میں مسکرائی، پھر چونکے ہوئے انداز میں بولی۔ ''فیول چیک کرلیا؟'' خود اس کی نظر بھی فیول بتانے والی سوئی کی طرف گئی تھی۔

''ہاں، فل ہے۔''

''تم آخر یہاں آئے کیوں تھے؟''

''کوئی پیغام ہے میرے پاس جو مجھے تو دس بجے تک کسی کو پہنچانا ہے۔''

''ابھی تو خاصا وقت ہے۔ تمہاری ران کی کیا حالت ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ بینڈیج متاثر ہوئی ہے۔ خون رس رہا ہے لیکن یہ سب تو برداشت کرنا ہی پڑے گا۔''

''میرے کوٹ کی جیبوں میں اس قسم کا کچھ سامان ہے کہ میں دوبارہ بینڈیج کرسکوں۔'' زنوبیا سفید کوٹ پہنے ہوئے تھی۔ ''مجھے خیال تھا کہ ایسا ہوگا۔''

ہیلی کاپٹر اب زمین سے بلند ہونے لگا تھا۔

''تم کامیابی سے بچ نکلے ہو لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ یہ سو فیصد کامیابی نہیں ہوگی۔ ہیلی کاپٹر ہمارا تعاقب ضرور کریں گے۔''

''ابھی تک کوئی دکھائی نہیں دے رہا ہے۔''

''وہ کسی اور ہیلی پیڈ سے اڑیں گے۔''

''دیکھا جائے گا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہم دوسری بار بھی حادثاتی طور پر ملے اور اس مرتبہ بھی میں تمہیں زخمی ہی ملا۔''

''تمہیں دو پیراشوٹس کا خیال کیوں آیا تھا؟''

''میں اب تمہیں کھونا نہیں چاہتا زنوبی!'' انور نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''تم اب اپنی فوج میں واپس نہیں جاؤ گی۔ جینا ہو یا مرنا ہو، اب ہم ساتھ ہی رہیں گے۔ خیر، یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہیلی کاپٹر صحیح سمت میں جارہا ہے یا نہیں۔ تم تو اس علاقے سے اچھی طرح واقف ہوگی۔ مجھے ایک ایسی بستی تک پہنچنا ہے جہاں ایک گرجا بنا ہوا ہے اور نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔''

''تب واقعی پرواز غلط سمت میں ہے۔'' زنوبیا نے کہا۔ ''پچھتر ڈگری کے زاویے سے دائیں جانب مڑو۔ میں نے دیکھی ہے وہ بستی۔ تمہیں وہاں کسی سے ملنا ہے؟ کوئی پیغام اس کو دینا ہے؟''

''ہاں، اوہ!''

''کیا ہوا؟''

''تمہارا خیال درست ثابت ہوا۔ دو ہیلی کاپٹر ہمارے تعاقب میں لگ چکے ہیں۔''

زنوبیا نے بے اختیار ایک طویل سانس لی۔

''پھر؟ اب کیا کرو گے؟''

''یہی سوچنا ہے۔''

''وہ ہم پر حملہ تو نہیں کریں گے، صرف نگرانی مقصد ہوگا ان کا۔ وہ جاننا چاہتے ہوں گے کہ تم مجھے کہاں لے جاتے ہو۔''

''یہی تو ان کو نہیں معلوم ہونا چاہیے۔''

''اوہ! تم رخ موڑ رہے ہو۔''

''ہاں۔'' انور نے کہا۔ ''ان کو یہ اشارہ بھی نہیں ملنا چاہیے کہ میں کہاں جانا چاہتا ہوں۔''

''اس طرح کیسے ہوگا؟''

''ہیلی کاپٹر کی تجویز تمہاری تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ تم بھی ہیلی کاپٹر اڑانا جانتی ہو۔''

''ظاہر ہے ورنہ میں یہ تجویز کیوں رکھتی۔''

''ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ......'' انور کچھ کہتے کہتے رکا، پھر اس نے پوچھا۔ ''تم ہیلی کاپٹر کو کم سے کم کتنی بلندی تک نیچے لاسکتی ہو؟''

''پائلٹ کی سیٹ تم مجھے دینا چاہتے ہو؟''

''ہاں، کیونکہ وہ ہمارا تعاقب کررہے ہیں۔ اس لیے پیراشوٹ تو استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ پہلے میں نے یہی سوچا تھا کہ ہم پیراشوٹ کے ذریعے کود جائیں گے اور ہیلی کاپٹر کسی چٹان سے ٹکرا کر تباہ ہو جائے گا لیکن اب ضروری یہ

ہے کہ تم ہیلی کاپٹر کو اتنا نیچے لے جاؤ کہ میں کود کر اُتر جاؤں۔ اسی طرح ان کی نظروں سے بچا جا سکتا ہے۔ تم ہیلی کاپٹر آگے نکال لے جانا لیکن.......''

''لیکن؟ لیکن کیا؟''

''واپسی کے لیے میں تم سے رابطہ تو نہیں کر سکتا۔ بس یہ ممکن ہے کہ میں تمہیں کچھ ٹائم بتاؤں۔ اس ٹائم پر تم ہیلی کاپٹر اسی جگہ لے آؤ جہاں میں کود چکا ہوں گا لیکن اس میں بھی مشکل یہ ہے کہ میں ٹائم نہیں بتا سکتا۔ میں یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ مجھے اپنا کام مکمل کرنے میں کتنا وقت لگے گا۔''

''میں نے سوچ لیا تھا کہ ایسی کوئی ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' زنوبیا نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک موبائل نکال کر انور کی طرف بڑھایا۔ ''اس کے ذریعے تم میرے موبائل سے رابطہ کر سکتے ہو۔''

''گڈ!'' انور نے کہا۔ ''یہ تو بڑا اچھا کام ہو گیا۔''

''بس تو اب اس کے مطابق اپنا لائحہ عمل بتاؤ۔''

''کودنے سے میری ٹانگ پر کیا اثر پڑے گا؟'' انور نے متفکر لہجے میں کہا۔ ''میں چل بھی سکوں گا یا نہیں۔''

''یہ تو واقعی تشویش کی بات ہے، لیکن تم کودو کیوں؟ جب تمہیں ہیلی کاپٹر میں واپس آنے کے لیے سیڑھی کی ضرورت پڑے گی تو اترنے کے لیے بھی سیڑھی استعمال کی جا سکتی ہے۔''

انور نے قدرے طویل سانس لے کر کہا۔ ''سیڑھی کا خیال ہی نہیں آیا تھا مجھے۔ شاید ران کی تکلیف کی وجہ سے میرا دماغ ٹھیک سے کام نہیں کر رہا ہے۔''

''اوہ!'' زنوبیا کے منہ سے اچانک نکلا۔ ''تم نے ہیلی کاپٹر کا رخ پھر بستی کی طرف کیا ہے۔''

''ہاں۔'' انور نے کہا۔ ''جانا تو مجھے وہیں ہے۔ اگر میں کہیں زیادہ دور ہیلی کاپٹر سے اترا تو اتنی دور تک چلنا ممکن نہیں ہو گا۔ بستی کے قریب ہی کسی جگہ اترنا ضروری ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس بستی کی طرف جاتے جاتے ہم نے اپنا رخ بدلا تھا اور اب پھر اسی طرف جا رہے ہیں۔ وہ لوگ سمجھ رہے ہوں گے کہ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں کہ کدھر جانا چاہیے۔''

''اس بارے میں بھی سوچ لیا ہے میں نے۔ تعاقب کرنے والے ہیلی کاپٹر اتنے فاصلے سے تعاقب کر رہے ہیں کہ اگر ہم کسی بڑے ٹیلے یا کسی چٹان کی آڑ میں جا کر ان کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں تو اس جگہ تک پہنچنے میں انہیں کچھ وقت تو لگے گا۔ بس اسی وقت سے فائدہ اٹھانا ہو گا۔ ہیلی کاپٹر کو بہت تیزی سے نیچے لے جا کر سیڑھی لٹکانا ہو گی۔ میرے اتر جانے کے بعد تم ہیلی کاپٹر کو پھر اوپر لے جانا۔ آڑ ہونے کی وجہ سے وہ دیکھ نہیں سکیں گے کہ میں ہیلی کاپٹر سے اُتر گیا ہوں۔''

''راہ میں چھوٹے موٹے پہاڑی سلسلے اور چٹانیں تو ہیں اور بستی بھی زیادہ دور نہیں ہے۔ اب ہیلی کاپٹر مجھے سنبھالنا چاہیے۔''

''یہی میں بھی کہنے والا تھا کہ اب تم میری سیٹ پر آ جاؤ۔''

انہوں نے سیٹ تبدیل کی اور زنوبیا نے بے اختیار کہا۔ ''سیٹ تو تمہارے خون سے بھیگی ہوئی ہے انور۔'' اس کے لہجے میں بے حد تشویش تھی۔

''ہاں مجھے بھی محسوس ہو چکا ہے کہ خون اب کچھ تیزی سے رس رہا ہے۔ تکلیف بھی خاصی بڑھ گئی ہے لیکن مجھ میں قوتِ برداشت بہت ہے۔ تم نے میری آواز اور لہجے میں تکلیف نہیں محسوس کی ہو گی۔''

''محسوس نہ کرنا اور بات ہے۔ تکلیف میں تو ہو تم! بستی تک کا فاصلہ کیسے طے کرو گے؟''

''میں اپنا کام مکمل کرنے کے لیے اپنی جان پر بھی کھیل سکتا ہوں۔ تم جب اندازہ لگا لو کہ پہاڑی سلسلہ ختم ہونے والا ہے اور بستی قریب آ گئی ہے تو تم ہیلی کاپٹر کو تیزی سے نیچے لے جانا۔ ایسی آڑ میں کہ وہ لوگ مجھے ہیلی کاپٹر سے اترتے نہ دیکھ سکیں۔''

''دو ڈھائی میل پیدل چلنا تمہارے لیے بہت مشکل ہو گا انور! تمہارا خون بہت رس رہا ہے۔ اس سے کمزوری بھی بڑھتی چلی جائے گی۔'' زنوبیا شدید تشویش میں مبتلا تھی۔

''بہت خون ہے میرے جسم میں، تم اس کی پروا نہ کرو۔''

اس جواب سے زنوبیا کی تشویش کم نہیں ہو سکی۔ اسی وقت اس نے ہیلی کاپٹر کو نیچے کرنا شروع کر دیا تھا۔

''کیا بستی قریب آ گئی؟'' انور نے تیزی سے پوچھا۔

''ہاں۔'' زنوبیا نے کہا۔ ''اور یقیناً تمہاری کمزوری بڑھی ہے جس کا اثر تمہاری بصارت پر بھی پڑا ہے۔ تم وہ جگنو سے چمکتے ہوئے نہیں دیکھ پا رہے ہو جو دراصل بستی کی روشنیاں ہیں۔''

انور نے اپنی آنکھوں پر زور دیا۔ اسے ''جگنو'' چمکتے

دکھائی دیے لیکن دوسرے ہی لمحے غائب بھی ہوگئے۔

"اوہ۔" انور کے منہ سے نکلا۔ "میں نے دیکھ لیا تھا لیکن......"

"اب وہ میری نظروں سے بھی اوجھل ہو چکے ہیں۔ ہم کافی نیچے آگئے ہیں۔" زنوبیا نے جواب دیا۔

"تو اب میں سیڑھی کے ذریعے اترنے کے لیے تیار ہو جاؤں؟"

زنوبیا نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ یقیناً متفکر تھی اور کچھ سوچنے لگی تھی۔

ہیلی کاپٹر خاصا نیچے جا کر معلق ہو گیا۔

"نہیں انور۔" زنوبیا بولی۔ "میں کچھ اور سوچ رہی ہوں۔ ہم پیراشوٹ ہی کے ذریعے ہیلی کاپٹر سے چھلانگ لگائیں گے۔ ہیلی کاپٹر کسی چٹان سے ٹکرا کر تباہ ہو جائے گا۔ نیچے اتر کر میں پہلے تمہاری ران کی ڈریسنگ کروں گی، اس کے بعد تمہارے ساتھ ہی چلوں گی۔ میں تمہیں اس حالت میں نہیں چھوڑ سکتی۔ دو ڈھائی میل سے کم فاصلہ نہیں ہو گا یہاں سے بستی کا۔ تم اس حالت میں وہاں نہیں پہنچ پاؤ گے۔" یہ سب کچھ اس نے بہت تیزی سے کہا تھا۔

ہیلی کاپٹر نے اوپر اٹھنا شروع کر دیا۔

"یہ کیا کر رہی ہو زنوبیا۔" انور جلدی سے بولا۔

"ہم کسی اور جگہ آڑ میں جائیں گے۔ ہمیں پیراشوٹ کے ذریعے چھلانگ لگانے کے لیے بلندی درکار ہو گی۔"

"لیکن......"

"اوہ!" زنوبیا کے منہ سے نکلا۔ "یہ تو شاید قدرت ہماری مدد کرنا چاہتی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

ہیلی کاپٹر اب اوپر اٹھنے کے ساتھ ہی ایک طرف بڑھنے بھی لگا تھا۔

"وقت بھی نہیں رہا تھا اترنے کا۔" زنوبیا بولی۔ "میں اب ان دونوں ہیلی کاپٹروں کو دیکھ رہی ہوں۔ اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے بھی ہمیں دیکھ لیا ہو گا۔"

انور جھنجلا سا گیا لیکن بولتے وقت اس نے اپنے لہجے پر قابو رکھا۔ "تم نے باتوں میں کچھ وقت ضائع کر دیا۔"

"تم ہیلی کاپٹر سے اترنے کے لیے بے تاب ہو اس لیے یہ محسوس کیا ہے تم نے۔ وقت بالکل ضائع نہیں کیا میں نے۔"

"قدرت ہماری کیا مدد کرنا چاہتی ہے؟"

"جس جگہ ہیلی کاپٹر معلق تھا، اس کے آگے کے پہاڑ میں ایک بہت بڑا غار ہے۔ اتنا بڑا کہ ہیلی کاپٹر اس میں لے جایا جا سکتا ہے۔ میں ہیلی کاپٹر اسی میں لے جاتی لیکن اس وقت تک وہ دونوں ہیلی کاپٹر مجھے دکھائی دے گئے تھے۔ وہ ہیلی کاپٹر کو غار میں جاتے دیکھ لیتے۔"

"تو ادھر ادھر چکر لگا کر پھر ادھر ہی چلو...... میں اس کے حق میں نہیں ہوں کہ ہم دونوں پیراشوٹس کے ذریعے اتریں اور ہیلی کاپٹر تباہ ہو جائے۔ واپسی کے لیے کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے ہمارے پاس۔"

"میں بھی ارادہ بدل چکی ہوں۔ ادھر ادھر چکر لگا کر ہم پھر اسی جگہ جائیں گے اور میں ہیلی کاپٹر کو تیزی سے اس غار میں لے جاؤں گی۔ وہاں مجھے تمہاری ران کی ڈریسنگ کا موقع بھی مل جائے گا۔ میں تمہیں اس حالت میں تو نہیں جانے دوں گی بستی کی طرف! تم باہمت ضرور ہو لیکن ہر جگہ ہمت کام نہیں آتی۔"

"ڈریسنگ میں اور وقت ضائع ہو گا۔"

"اپنے کام کے معاملے میں جذباتی ہو رہے ہو تم! میں ڈریسنگ بہت پھرتی سے کروں گی۔ پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔"

"اچھا!" انور نے طویل سانس لی۔ "اب ہم کدھر جا رہے ہیں؟"

"اس بستی کی طرف نہیں جہاں تمہیں جانا ہے۔" زنوبیا نے جواب دیا۔ "پانچ چھ منٹ بعد ہم اپنا رخ بدل لیں گے۔ مزید پانچ منٹ بعد پھر اسی مقام کی طرف بڑھیں گے جہاں میں نے وہ غار دیکھا ہے۔"

"کیا وہاں کی زمین اتنی مسطح ہو گی کہ ہیلی کاپٹر لینڈ کر سکے؟"

"اس بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ لینڈنگ کے وقت ہیلی کاپٹر معمولی سا ٹیڑھا ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ ہیلی کاپٹر لڑھک جانے کا خطرہ ہوا تو میں وہاں لینڈ نہیں کروں گی۔"

"ایسی صورت میں وہاں سے نکلیں گے کیسے؟ کیا غار اتنا کشادہ ہے کہ ہیلی کاپٹر چکر لگا کر واپسی کے لیے مڑ سکے؟"

"اتنا کشادہ تو نہیں ہے لیکن اسے غار کہنا میری غلطی تھی۔ وہ سرنگ ہے۔ جہاں وہ ختم ہوتی ہے، وہاں مجھے ہلکی سی روشنی بھی دکھائی دی تھی۔"

"چاندنی؟"

"ظاہر ہے۔ وہاں الیکٹرک پول تو نہیں ہوں گے۔

تمہارا دماغ واقعی صحیح طور پر کام نہیں کر رہا ہے۔ میں اب ہیلی کاپٹر کا رخ بدل رہی ہوں۔ سوچ سوچ کر ان لوگوں کا دماغ خراب ہو جائے گا کہ تم ہیلی کاپٹر کہاں لے جانا چاہتے ہو۔''

''ہاں اس طرح ادھر ادھر چکر لگانے سے وہ الجھ تو جائیں گے بُری طرح۔ اور یہی بات ہمارے حق میں جائے گی۔'' انور نے کہا۔ ''لیکن جب ہم اس غار میں جائیں گے تو غار انہیں بھی دکھائی دے جائے گا۔''

''اگر وہ اپنے ہیلی کاپٹر نیچے لائیں گے۔'' زلوبیا نے جواب دیا۔ ''میں یہ کام اتنی تیزی سے کروں گی کہ وہ ہمیں نیچے ہوتے ہوئے دیکھ ہی نہ سکیں اور جب ان کے ہیلی کاپٹر وہاں پہنچیں گے اور ہمارا ہیلی کاپٹر انہیں دکھائی نہیں دے گا تو وہ یہی سمجھیں گے کہ ہم کسی اور طرف جا کر کسی اور پہاڑ یا چٹان کی آڑ میں ہو گئے ہیں۔ وہ ادھر ادھر گھوم کر ہمیں تلاش کرنا چاہیں گے۔''

''بہت مناسب سوچ رہی ہو تم۔'' انور پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔ ''ایسا معلوم ہونے لگا ہے کہ اس مشن پر مجھے نہیں، تمہیں بھیجا گیا ہے۔''

وہ دونوں اس حد تک مطمئن تھے کہ جب تک وہ ہیلی کاپٹر میں ہیں، اس وقت تک تو ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

''تمہارا مشن میرا ہی مشن ہے۔'' زلوبیا نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''تمہاری خاطر میں کچھ بھی کر سکتی ہوں انور! فوج سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں فوج میں ڈیڈی کے دباؤ کی وجہ سے آئی تھی اور ڈیڈی پر اس کے لیے ہمارے ایک عزیز نے دباؤ ڈالا تھا۔ جب تم حادثاتی طور پر ہماری سرحد میں آگئے تھے اور مجھے ملے تھے، اسی وقت میں نے تمہیں اپنے ان عزیز کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ اس وقت میجر جنرل ہیں۔ ان کو میرے اور تمہارے بارے میں اطلاع یقیناً ابتدا ہی میں مل گئی ہو گی۔ انہوں نے ہی کرنل کو ہدایت کی ہو گی کہ تمہیں گرفتار کرنے کے لیے میری زندگی کسی صورت بھی داؤ پر نہ لگائی جائے۔''

''اس کی اطلاع تمہارے ڈیڈی کو بھی ہو چکی ہو گی۔''

''ڈیڈی۔'' زلوبیا نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''وہ کچھ دن ہوئے اس دنیا سے جا چکے ہیں۔''

''اوہ! اور تم نے مجھے اس بارے میں نہیں بتایا۔''

''اس خیال سے نہیں بتایا کہ تم میرے لیے پریشان ہو گے۔ سوچو گے کہ میں اکیلی رہ گئی ہوں۔''

''بیمار تھے وہ؟''

''نہیں، ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ اچھا اب میں ہیلی کاپٹر کو اسی جانب موڑ رہی ہوں جہاں وہ سُرنگ ہے۔''

''تمہارے والد کے بارے میں سُن کر افسوس ہوا زلوبیا۔''

''سبھی کو کسی نہ کسی دن دنیا سے جانا ہوتا ہے انور۔'' زلوبیا نے کہا، پھر بولی۔ ''ہیلی کاپٹر کی اس حرکت پر ان لوگوں کا دماغ اور الجھ گیا ہو گا کہ آخر تم کرنا کیا چاہتے ہو۔''

''ان کی یہ الجھن انہیں صحیح طور پر کچھ سمجھنے بھی نہیں دے گی۔''

''تمہارے زخم کی اب کیا حالت ہے؟''

''میں اب اس سیٹ پر بھی اپنے خون کی چپچپاہٹ محسوس کر رہا ہوں۔''

''مجھے بہت تشویش ہے اس کی بلکہ بڑھتی جا رہی ہے۔''

''تم صرف اس بات پر دھیان رکھو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ تعاقب میں آنے والے ہیلی کاپٹروں پر تو کڑی نظر رکھو۔''

''میں بے خبر نہیں ہوں۔''

''تمہارے پاس ریوالور ہے؟ شاید مجھے کسی وقت ضرورت پڑے۔''

''میں پوری تیاری کے ساتھ آئی ہوں انور! موبائل تو تمہیں دے ہی چکی ہوں۔ ریوالور بھی دو ہیں میرے پاس! لباس کے نیچے ہلکے قسم کا مردانہ لباس بھی ہے۔ ڈریسنگ کے بعد تمہیں اس کی ضرورت پڑے گی۔''

''تم نے تو کمال کر دیا زلوبی۔''

''اب دیکھنا یہ ہے کہ میں نے جو کچھ کیا ہے، اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔''

''میں نے مایوس ہونا نہیں سیکھا۔''

''کام مکمل ہونے کے بعد کیا کرنا ہے؟''

''واپس اپنے وطن، اور تم بھی میرے ساتھ ہو گی۔''

''اسی ہیلی کاپٹر میں؟''

''ابھی تو یہی ایک سبیل ہے۔'' انور نے کہا۔ ''اور اگر ضرورت پڑی تو ایک اور راستہ بھی نکالا جا سکتا ہے۔''

''وہ کیا؟''

انور نے اسے بتایا کہ اس کے دماغ میں کیا کیا خیالات چکرا رہے تھے۔ سب کچھ سُن کر زلوبیا نے بے

اختیار کہا۔ "یہ تو خطرناک ثابت ہو سکتا ہے انور۔"

"اس وقت بھی ہم ایک خطرے سے کھیل رہے ہیں۔ زیادہ خطرہ بھی مول لینا پڑے گا اگر ضرورت پڑی تو۔"

ان باتوں کے دوران میں ہیلی کاپٹر اس جگہ پہنچ گیا جہاں زنوبیا اسے لے جانا چاہتی تھی۔ اس نے ہیلی کاپٹر کو نیچے کرنا شروع کیا اور جب سطح زمین سے اس کی بلندی دس بارہ فٹ رہ گئی تو اسے تیزی سے آگے بڑھایا۔ اس سے پہلے کہ تعاقب کرنے والے ہیلی کاپٹر سر پر آ جاتے، ان کا ہیلی کاپٹر اس سرنگ میں داخل ہو گیا جو زنوبیا نے دیکھی تھی۔ کچھ ہی آگے نکلنے کے بعد اس نے ہیلی کاپٹر معلق کرتے ہوئے سطح زمین کا جائزہ لینے کے لیے اسپاٹ لائٹ نیچے ڈالی۔

"یہاں تو بہت اونچ نیچ ہے۔" زنوبیا بڑبڑائی اور ساتھ ہی معلق ہیلی کاپٹر کو کم سے کم رفتار سے آگے بڑھانے لگی۔

"بڑی لمبی سرنگ ہے۔" انور بولا۔ "اور کشادہ بھی اتنی ہے کہ ہیلی کاپٹر پندرہ بیس فٹ اوپر بھی اٹھ سکتا ہے۔"

"مل گئی۔" زنوبیا پر مسرت انداز میں بولی۔ "یہاں ہم لینڈ کر سکتے ہیں۔"

وہ نہایت سطح زمین تھی جہاں زنوبیا نے ہیلی کاپٹر کو دوبارہ معلق کیا تھا۔

"میں نے کہا تھا نا۔" زنوبیا پھر بولی۔ "قدرت ہماری مدد کر رہی ہے۔"

"جو اپنی سی کوشش کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے، قدرت ان کی مدد کرتی ہی ہے۔"

ہیلی کاپٹر اب آہستہ آہستہ نیچے ہو رہا تھا۔ جلد ہی زنوبیا نے اسے بڑی مہارت سے زمین پر اتار دیا۔

انجن بند کر کے زنوبیا نے ہیلی کاپٹر کی سامنے کی لائٹ جلا دی۔ وہ اس روشنی میں انور کے زخم کی ڈریسنگ کر سکتی تھی۔

زخم کی وجہ سے تکلیف اتنی تھی کہ ہیلی کاپٹر سے اترنے میں بھی انور کو دانتوں پسینا آ گیا، تاہم اس نے کوشش کی تھی کہ اس کے منہ سے "اف" بھی نہ نکلے۔ نیچے اترنے کے بعد وہ فوراً ہی بیٹھ بھی گیا۔

"ہیلی کاپٹر کے آگے آؤ انور۔" زنوبیا بولی۔ "میں روشنی ہی میں تمہارے زخم کی ڈریسنگ کر سکوں گی۔" اس نے انور کو سہارا دے کر کھڑا کیا اور سہارے ہی سے ہیلی کاپٹر کے سامنے لے گئی۔ اس وقت واضح طور پر دکھائی

دے گیا کہ اس کے لباس کا نچلا حصہ خون سے بڑی حد تک سرخ تھا۔

"یہاں لیٹ جاؤ۔" زنوبیا نے کہا۔ "تم کچھ مت کرنا، میں خود ہی سب کر لوں گی۔"

انور لیٹ گیا۔ زنوبیا نے اپنے کوٹ کی جیبوں سے وہ سب چیزیں نکالیں جو فوری طبی امداد کے لیے ضروری تھیں۔ 'عمرو عیار کی زنبیل ہیں اس کے کوٹ کی جیبیں۔' انور کو خیال آیا۔

زنوبیا نے خود ہی انور کی وہ ٹانگ عریاں کی جو زخمی تھی۔ انور نے جھینپ محسوس کی کہ ایک لڑکی نے اس کی ٹانگ عریاں کی تھی۔ اس کی یہی کیفیت اس وقت بھی ہوئی تھی جب وہ قیدی تھا اور زنوبیا نے ایک نرس کے ساتھ اس کی ران کا آپریشن کیا تھا۔

"دو ڈھائی میل کا فاصلہ تم اس حالت میں ہرگز طے نہیں کر پاتے۔" زنوبیا نے اس کی خون آلود بینڈیج کھولتے ہوئے کہا۔ "کہیں نہ کہیں گر پڑتے۔"

انور آنکھیں بند کیے خاموش لیٹا رہا۔

زنوبیا نے سارا کام بڑی پھرتی اور بہت کم وقت میں کیا، پھر بولی۔ "ابھی لیٹے رہو۔ میں تمہارے لیے لباس لاتی ہوں۔"

وہ ہیلی کاپٹر کے دوسری جانب چلی گئی۔ نیچے پہنا ہوا مردانہ لباس اتارنے کے لیے اسے پہلے تو اپنے ہی کپڑے اتارنے تھے۔ پھر انور کو اس کی مدد سے پہنانا بھی تھے۔ یہ کام بھی اس نے کم از کم وقت میں کیا۔

"تم اگر ڈریسنگ کروائے بغیر بستی تک چلے بھی جاتے تو جگہ جگہ خون کے دھبے چھوڑتے جاتے جو کسی وقت بھی فوجیوں کی نظر میں آ سکتے تھے۔"

"ہوں۔" انور نے بس اتنی ہی آواز نکالی۔

"ہم بارہ چودہ فٹ کی بلندی پر ہیں۔" زنوبیا نے طبی امداد کا سامان واپس اپنی جیبوں میں رکھتے ہوئے کہا۔ "تمہارے زخم کی حالت ایسی ہے کہ دوبارہ بھی اس سامان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

"بارہ چودہ فٹ نیچے کس طرح اترا جائے گا؟" انور نے پوچھا۔ "کیا پتھروں کے ایسے ابھار ہیں کہ ان کے سہارے اترا جا سکے۔"

"یہ میں اب جا کر دیکھتی ہوں۔" زنوبیا نے کہا۔ "تم لیٹے رہو۔ ابھی جتنا بھی آرام کر سکو وہ تمہارے لیے بہتر ہے۔"

انور سوچنے لگا کہ وہ اپنی ران کے زخم کی وجہ سے کٹھ پتلی بن کر رہ گیا ہے۔ سب کچھ زنوبیا کر رہی تھی۔ اگر وہ اسے دشمن کی فوج میں نہ ملتی تو شاید اسے اپنے مشن کی تکمیل کے بارے میں سوچنا بھی مشکل ہوتا۔

زنوبیا غالباً دوڑتی ہوئی سرنگ کے دہانے تک گئی تھی کیونکہ واپسی پر انور نے اسے ہانپتا ہوا دیکھا۔

”نہیں۔“ وہ بولی۔ ”ایسے ابھار نہیں ہیں چٹان میں جن کی مدد سے اترا جا سکے۔“

”اوہ۔“ انور نے فکرمندی سے کہا۔

زنوبیا بھی فکرمند نظر آنے لگی تھی۔ ”ہمیں ہیلی کاپٹر ہی میں یہاں سے نکلنا پڑے گا۔“

”ہیلی کاپٹرز ہماری تلاش میں ہوں گے، وہ ہمیں دیکھ لیں گے۔“

”کوئی اور صورت دکھائی بھی نہیں دے رہی ہے۔“ زنوبیا نے کہا۔ ”میں اگر اکیلی ہوتی تو بارہ تیرہ فٹ کی بلندی سے بھی نیچے کودنے کی ہمت کر لیتی لیکن تمہارے لیے یہ ناممکن ہے۔ اس جھٹکے سے تمہاری ران کا زخم پھر قابو سے باہر آجائے گا۔ ابھی جو ڈریسنگ کی ہے میں نے، وہ رائگاں جائے گی۔“

”ایک تدبیر ابھی میرے ذہن میں آئی ہے، اگر تم کر سکو۔“

”وہ کیا؟“

”پہلے یہ بتاؤ کہ سرنگ کے دہانے پر ایسا کوئی مضبوط ابھار ہے جس میں کوئی چیز پھنسا دی جائے اور ہم اس کے سہارے نیچے اتر سکیں؟“

”ہاں، ایسے تو کئی ابھار ہیں لیکن ہمارے پاس کوئی رسی نہیں ہے۔“

”کیا تم ہیلی کاپٹر کی سیڑھیاں ہیلی کاپٹر سے الگ کر سکتی ہو؟“

زنوبیا چونکی۔ ”تمہارے دماغ میں تدبیر تو اچھی آئی ہے لیکن ایسا کرنا آسان نہیں ہوگا۔“

”کیا ناممکن بھی ہوگا؟“

”ناممکن تو کچھ نہیں ہوتا، اگر انسان محنت کرے۔ ٹھیک ہے۔ میں کوشش کر کے دیکھتی ہوں۔ کچھ وقت تو لگے گا اس میں، اگر میں کامیاب بھی ہوئی۔“

”میں تمہاری مدد کرنے کی کوشش......“

”نہیں۔“ زنوبیا نے اس کی بات کاٹی۔ ”پہلے میں کوشش کر کے دیکھتی ہوں۔ دراصل مجھے اس کا علم نہیں کہ سیڑھی کس تکنیک سے ہیلی کاپٹر میں لگائی جاتی ہے۔ شاید بہت زیادہ محنت کر کے ہی کامیاب ہو سکوں۔ میں مجبوراً ہی تم سے مدد لوں گی۔“

وہ انور کے جواب کا انتظار کیے بغیر تیزی سے ہیلی کاپٹر کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ انور ایک ٹھنڈی سانس لے کر اسے ہیلی کاپٹر میں جاتے دیکھتا رہا۔ اپنی ران کے زخم کی وجہ سے وہ شدید بے بسی کا شکار ہو گیا تھا۔

کچھ دیر بعد زنوبیا واپس لوٹی۔ ”میں کامیاب ہو گئی۔ سیڑھی نیچے گرا دی ہے میں نے۔“ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

”میں نے کسی وزنی چیز کے گرنے کی آواز سنی تھی۔ خیال آیا تھا مجھے کہ تم کامیاب ہو گئی ہو۔“

”اب سیڑھی کھینچ کر سرنگ کے دہانے تک لے جانا ہے۔ پہلے میں اپنی سانس درست کر لوں۔“

”مجھے اپنی مدد کرنے سے نہ روکو زنوبی۔“

”جب کسی وقت مجبور ہو جاؤں گی تو مدد لینا ہی پڑے گی۔ سیڑھی کھینچ کر سرنگ کے دہانے تک لے جانا کچھ زیادہ محنت طلب کام نہیں ہے۔ بس ذرا سانس قابو میں آجائے میری۔“

”تم شاید مجھ سے کہیں زیادہ باہمت ہو۔“

”ایسی کوئی بات شاید نہ ہو۔ صرف ران کا زخم تمہاری مجبوری بن گیا ہے۔“

”اور تم ایک لنگڑے کی لاٹھی بن گئی ہو۔“ انور پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔

”فضول باتیں نہ کرو۔“

چند منٹ رک کر زنوبیا ہیلی کاپٹر کے دروازے کی طرف گئی۔ انور ہیلی کاپٹر کی روشنی میں تھا لیکن ہیلی کاپٹر کے دروازے پر روشنی نہیں تھی۔ وہ زنوبیا کو ہیولے کے مانند دیکھ سکتا تھا۔ زنوبیا جب سیڑھی گھسیٹ کر سرنگ کے دہانے کی طرف لے جانے لگی تو سنگلاخ زمین پر اس کی رگڑ انور کو صاف سنائی دے رہی تھی۔

تھوڑی دیر میں زنوبیا واپس لوٹ آئی۔ اس کی سانس پھر پھولی ہوئی تھی۔ ”کامیاب ہو گئی ہوں۔“ اس کے لہجے میں مسرت تھی۔ ”سیڑھی لٹکا بھی دی ہے۔“

”تو اٹھوں؟“

”نہیں۔“ زنوبیا نے کہا۔ ”مناسب ہوگا کہ میں پھر اپنی سانسوں پر قابو پا لوں۔ تمہیں سہارا بھی دینا ہے تاکہ آسانی سے چل سکو۔“

''آسانی سے نہ سہی لیکن چل تو سکوں گا۔''
''تمہیں میری بات ماننی چاہیے۔ ڈاکٹر بھی ہوں تمہاری۔''
''میں چاہتا ہوں کہ وقت بالکل ضائع نہ ہو۔''
''ابھی خاصا وقت ہے۔ سات ساڑھے سات تک ہم بستی میں داخل ہو رہے ہوں گے۔ اتنا وقت بھی اس لیے لگے گا کہ تم تیزی سے نہیں چل سکتے۔''
''اس وقت تک روشنی بھی ہو چکی ہو گی۔'' انور کے لہجے میں تشویش تھی۔
''اب یہ تو مجبوری ہے۔'' زلوبیا نے کہا اور اپنی جیب سے اضافی ریوالور نکال کر انور کو دے دیا۔
کچھ دیر بعد جب اس کی سانسیں قابو میں آئیں تو اس نے سہارا دے کر انور کو اٹھایا اور سہارے ہی سے اسے سرنگ کے دہانے کی طرف لے جانے لگی۔
''میری چھٹی حس کہہ رہی ہے زلوبیا کہ ہم کسی خطرے سے ضرور دوچار ہوں گے۔''
''قبل از مرگ واویلا مت کرو۔ جب ایسی کوئی بات ہوگی تو دیکھا جائے گا۔'' وہ ہنسی۔ ''یہ کیوں بھول رہے ہو کہ میں تمہاری یرغمال ہوں۔ وہ لوگ تمہارے خلاف کوئی ایکشن لینے سے پہلے دس بار سوچیں گے۔''
''ہاں یہ ایک کمزور پہلو تو ہے ان کا جو دراصل کمزور نہیں ہے۔''
''اس وقت وہ لوگ سخت بوکھلائے ہوئے ہوں گے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہوگا کہ ہیلی کاپٹر زمین کھا گئی یا آسمان۔''
زلوبیا نے اس قسم کی باتیں جاری رکھیں۔ وہ چاہتی تھی کہ زخم کی تکلیف سے انور کا دھیان بٹا رہے۔
آخر وہ سرنگ کے دہانے پر پہنچ گئے۔ انور نے دیکھا کہ زلوبیا نے سیڑھی بڑی مضبوطی سے ایک جگہ پھنسا کر نیچے لٹکائی تھی۔
''پہلے میں نیچے اُتروں گی تاکہ جب تم اترو اور اگر کہیں سلپ ہو جاؤ تو میں سنبھال سکوں تمہیں۔''
''اتنی طاقت ور تو نہیں ہو کہ مجھے سنبھال سکو۔''
''ہاں۔'' زلوبیا نے کہا۔ ''دونوں ہی گریں گے لیکن تمہارا زخم زیادہ جھٹکا کھانے سے بچ جائے گا۔''
''چلو اترو۔''
زلوبیا اتر گئی۔ ''اب آؤ تم، کوشش کرنا کہ زخم والی ٹانگ پر کم سے کم دباؤ پڑے۔''
انور نے اترنا شروع کیا۔
''تیرہ اسٹیپ ہیں۔'' زلوبیا نے کہا۔ ''کودنا نہیں پڑے گا۔ آسانی سے پیر زمین کو چھو لیں گے۔''
زخم کی تکلیف سے قطع نظر انور آسانی سے نیچے اتر گیا۔
''ایک کٹھن مرحلہ طے ہو گیا۔'' زلوبیا بولی۔ ''سیڑھی یوں ہی لٹکی رہے گی۔ ہمیں بہرحال واپس تو آنا ہے یہاں۔''
اس نے چلنے کے لیے انور کو سہارا دیا۔
''سمت کا صحیح اندازہ ہے نا؟ کہیں بھٹک نہ جائیں۔''
''بہت دھیان رکھا ہے میں نے، بھٹک نہیں پائیں گے۔''
باتیں کرتے یا اپنی اپنی جگہ خاموشی سے کچھ سوچتے ہوئے وہ اونچی نیچی سنگلاخ زمین پر آگے بڑھتے رہے۔ اپنے ماحول کی طرف سے بھی وہ پوری طرح ہوشیار تھے۔ زخم کی وجہ سے انور زیادہ تیز نہیں چل پا رہا تھا۔
سنگلاخ اونچی نیچی زمین سے گزر کر وہ اس پہاڑی علاقے کو عبور کر کے بڑی حد تک ہموار زمین تک پہنچ گئے۔ اب ہلکا ہلکا سا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ انور کو بستی کا بلند و بالا گرجا دکھائی دینے لگا اور اس نے سکون محسوس کیا۔ منزل قریب آ جائے تو تھکان بھی کم ہو جاتی ہے۔
''گرجا کے قریب سرخ اینٹوں کا ایک مکان ہے۔'' انور نے کہا۔ ''مجھے اسی مکان میں کسی سے ملنا ہے۔''
زلوبیا نے اب بھی اس سے اس کے ''مشن'' کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔
انور نے پادری سیموئل سے رابطہ کرنے سے پہلے برگنزا کا تعاون حاصل کرنا اس لیے ضروری سمجھا تھا کہ وہاں اسے اپنی زخمی ٹانگ کو آرام دینے کا موقع بھی مل جاتا۔ اگر اسے گولی نہ لگی ہوتی تو وہ براہِ راست پادری سیموئل ہی سے ملنے کی کوشش کرتا۔
پندرہ منٹ بعد وہ بستی میں داخل ہو رہے تھے۔ بستی میں دیہاتیوں کی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ وہ ان دونوں کو توجہ سے دیکھنے لگے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ زلوبیا کو سلام بھی کر رہے تھے۔ اگرچہ وہ سفید کوٹ پہنے ہوئے تھی لیکن اس کے نیچے وردی صاف نظر آ رہی تھی جو انجی کی فوج کی وردی تھی۔ سلام دراصل اس وردی ہی کو کیا جا رہا تھا۔ وہ کچھ متعجب اس بات پر تھے کہ وہ ایک لنگڑاتے ہوئے آدمی کو سہارا دیے ہوئے تھی۔
ان کے سلام کے جواب میں زلوبیا خفیف سا مسکرا

دیتی تھی۔ ان دونوں کے قدم گرجا ہی کی طرف بڑھ رہے تھے اور دیہاتیوں کا رخ بھی گرجا ہی کی طرف تھا جہاں وہ عبادت کرتے۔ اس بستی میں اکثریت دیسی عیسائیوں ہی کی تھی۔

گرجا کے قریب سرخ اینٹوں کا مکان مل گیا تو اس کے دروازے پر جا کر انور نے دستک دی۔ اندر سے کچھ بڑبڑانے کی آواز کے ساتھ ہی دروازے کی طرف آتے ہوئے قدموں کی آواز بھی سنائی دی۔

''کون ہے؟'' جھنجلائی ہوئی خرخراتی آواز تھی۔

''میں آج گرجا نہیں جاؤں گا۔ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

زنوبیا اور انور کچھ نہیں بولے۔ دروازہ کھولا گیا۔

''میں نے کہا نا کہ طبیعت......'' وہ ان دونوں کو دیکھ کر نہ صرف چپ ہوا بلکہ زنوبیا کی وردی نے اسے چونکایا بھی۔

''آپریشن بلو۔'' انور نے دھیمی آواز میں کہا۔

اس بات پر وہ پہلے سے زیادہ چونکا۔ وہ ستر سال کا بوڑھا خاصا کمزور بھی تھا۔ اس نے جلدی سے پورا دروازہ کھول دیا تاکہ وہ دونوں اندر داخل ہو سکیں۔

''تم نے آپریشن بلو سنتے ہی دروازہ کھول دیا۔'' اندر داخل ہوتے ہوئے انور نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تم برگھرا ہی ہو۔ اگر کوئی اور ہوتا تو اس کی سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ آپریشن بلو کیوں کہا گیا ہے۔''

بوڑھے برگھرا نے اثبات میں سر ہلایا اور دروازہ بند کر لیا۔ زنوبیا اور انور گھر میں داخل ہو چکے تھے۔

''بات بعد میں ہوگی۔'' زنوبیا نے اس سے کہا۔ ''پہلے تم میرے ساتھی کے لیٹنے کا کچھ بندوبست کرو۔''

اسی کمرے میں سال خوردہ سامان کے ساتھ ایک جانب بستر بھی لگا ہوا تھا۔

''بس یہی ہے۔'' اس نے بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

زنوبیا نے انور کو لے جا کر بستر پر لٹایا۔ بستر میں انتہائی ہی ناگوار بو کے ساتھ شراب کی بو بھی تھی لیکن بے حد تھکی ہوئی زخمی ٹانگ کی وجہ سے وہ بستر بھی انور کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہی تھا۔

''کچھ کھانے کا بندوبست ہے؟'' انور نے برگھرا سے پوچھا۔

''انڈے ہیں، ڈبل روٹی ہے۔ آملیٹ بنا دوں؟'' برگھرا نے پوچھا۔

''جو کچھ بھی ہے، لاؤ۔''

زنوبیا اور انور دونوں ہی بھوکے تھے۔ غلطی انور ہی سے ہوئی تھی۔ اس نے ہیلی کاپٹر میں پانی کی چھاگلیں تو رکھوائی تھیں لیکن کھانے کے لیے کچھ لینے کا خیال نہیں رہا تھا۔

برگھرا سر ہلاتا ہوا اندرونی کمرے میں چلا گیا۔ اس نے اپنے کچن وغیرہ کا بندوبست اندرونی کمرے ہی میں کر رکھا ہوگا۔

''ہم دونوں ہی بھوکے تھے۔'' زنوبیا نے کہا۔ ''لیکن دونوں ہی نے ایک دوسرے سے اس کا اظہار نہیں کیا۔''

''حالات ہی ایسے تھے۔'' انور نے کہا، پھر بولا۔ ''اب تک تم نے مجھ سے میرے مشن کے بارے میں نہیں پوچھا۔''

''ضرورت نہیں سمجھی۔ بس یہ خیال تھا کہ جب تم مناسب سمجھو گے، بتا ہی دو گے۔''

''مجھے گرجا کے پادری سیموئل کو ایک پیغام پہنچانا تھا لیکن ٹانگ کے زخم کی وجہ سے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ پادری سیموئل ہی کو یہاں بلوا لوں۔''

''کیسے؟''

''برگھرا کے ذریعے۔ یہ ہمارا ہی آدمی ہے۔''

''تمہارے ملک کے جاسوس یہاں کافی پھیلے ہوئے ہیں۔''

''یہ تو میں نہیں جانتا کہ ہمارے کتنے جاسوس یہاں پھیلے ہوئے ہیں لیکن برگھرا اور سیموئل ہمارے آدمی ہیں۔''

''گویا تمہارا مشن اب مکمل ہونے کو ہے۔''

''اگر کوئی پیچیدگی پیدا نہ ہوئی۔''

''ابھی تک تو معاملہ ٹھیک ہی جا رہا ہے۔''

''مجھے یہ اندیشہ ہے کہ میری تلاش میں وہ لوگ بستی بستی چھاننا شروع کر سکتے ہیں۔''

زنوبیا کچھ سوچنے لگی، پھر بولی۔ ''تمہارے زخم کی اب کیا حالت ہے؟''

''اتنا چلنا پڑا ہے۔ میرا خیال ہے کہ خون پھر رسنے لگا ہے۔ لیکن شاید زیادہ نہیں۔''

''اگر زیادہ نہیں تو دوسری ڈریسنگ کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اسی پر مزید ڈریسنگ اتنی کس کے کر دی جائے گی کہ خون مزید نہ رسے۔ ہم اس مکان میں کب تک رک سکتے ہیں۔''

''اگر کوئی خطرہ پیش نہ آئے تو جب تک ہم چاہیں۔''

"اگر ایسا ہو تو بہتر ہے۔ چند دن میں تمہارا زخم مندمل ہو جائے گا۔ واپسی کا سفر اسی وقت شروع کیا جائے گا۔ تم اس وقت بالکل ٹھیک ہو گے تو بہتر رہے گا۔"

اس وقت دوسرے کمرے سے آملیٹ بننے کی خوشبو آنے لگی تھی۔

☆☆☆

گرجا میں عبادت کا وقت ختم ہونے کے بعد سیموئل آ گیا۔ اسے برگنزا ہی بُلا کر لایا تھا۔ اس سے گفتگو کرنے سے پہلے انور نے برگنزا کو اندرونی کمرے میں بھیج دیا۔ اس کے سامنے بات کرنا اس نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔

"میں بریگیڈیئر شمس کا ایک پیغام لے کر آیا ہوں۔" انور نے سیموئل سے کہا۔ "وہ میں ابھی لکھ کر تمہیں دوں گا۔ وہ تم اس بریگیڈ تک پہنچاؤ گے جو شمال میں کسی جگہ ہے۔ کس جگہ ہے، یہ مجھے نہیں معلوم۔ بریگیڈیئر شمس نے مجھے اتنا ہی بتایا تھا کہ تم وہ پیغام اس بریگیڈ تک پہنچا سکتے ہو۔"

"یقیناً۔" سیموئل نے کہا۔ "میں پہنچا سکتا ہوں۔"

"وہ میں ابھی تمہیں لکھ کر دے دیتا ہوں۔ زبانی تو تم یاد نہیں رکھ سکو گے۔ یہ دس بجے سے پہلے پہنچ جانا چاہیے۔"

"پہنچ جائے گا۔"

ان باتوں کے دوران میں سیموئل بار بار کن انکھیوں سے زنوبیا کی طرف دیکھتا رہا تھا کیونکہ وہ اسی ملک کی فوجی وردی میں تھی۔

انور نے پیغام لکھ کر سیموئل کو دیا اور رخصت کر دیا۔ اس کا مشن مکمل ہو چکا تھا۔ اس نے بہت سکون اور تازگی محسوس کی۔

زنوبیا بولی۔ "اگر وہ پیغام یہاں کے لوگوں کے ہاتھ لگ جائے تو؟"

"تو وہ اسے سمجھ نہیں سکیں گے۔ کوڈ ورڈز میں ہے جن کا مطلب میں بھی نہیں جانتا۔ جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ وہ پیغام یہاں کے لوگوں کے ہاتھ لگ سکتا ہے، تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہو گا۔ جو کام میرے سپرد کیا تھا، وہ میں سرانجام دے چکا ہوں۔ بریگیڈیئر صاحب کو بھروسا اور یقین تو ہو گا سیموئل پر۔"

"میں تمہیں مبارک باد دیتی ہوں کہ تمہارا فرض ادا ہوا۔"

"اس میں پچاس فیصد کی شریک تم بھی ہو۔"

"ان دونوں ملکوں کے معاملات سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں نے جو کچھ کیا، تمہاری محبت میں کیا۔ اچھا اب میں تمہاری ڈریسنگ پر مزید پٹیاں کس دوں۔ برگنزا کو بلا کر اس سے کہہ دو کہ وہ اس وقت ادھر نہ آئے۔"

انور نے برگنزا کو آواز دے کر بُلایا۔

"تم نے کہا تھا کہ تم بیمار ہو۔ اب طبیعت کیسی ہے؟"

"جیسی تھی، ویسی ہی ہے۔ بدن ٹوٹ رہا ہے۔ ہلکا سا بخار بھی ہے شاید۔"

زنوبیا نے اس کی بیماری سے متعلق چند سوال کیے، پھر اسے چار ٹیبلیٹ دیں اور ہدایت کی کہ دو دو گھنٹے کے وقفے سے کھاتا رہے، ٹھیک ہو جائے گا۔

"میں نے تمہیں بتایا ہے کہ ہمیں چند دن یہاں رکنا ہو گا۔ کیا تم اپنے سونے کا بندوبست اندر کے کمرے میں کر لو گے؟" انور بولا۔

"وہ سب ہو جائے گا، اس کی فکر نہ کریں۔"

"لیکن جب اس کمرے میں آنا تو کھنکھنا کر آنا۔"

"اتنا تو میں خود بھی سمجھ سکتا ہوں۔" برگنزا نے جواب دیتے ہوئے ایک اچٹتی سی نظر زنوبیا پر ڈالی۔

"کیا یہاں ایک اور بستر کا بندوبست ہو سکتا ہے؟" زنوبیا نے پوچھا۔

"بازار سے لانا پڑے گا۔"

زنوبیا نے کچھ کرنسی نکال کر اسے دی اور کہا۔ "شام تک تمہاری طبیعت خاصی بہتر ہو جائے گی۔ اس وقت لے آنا۔"

"حالت اتنی زیادہ خراب نہیں ہے۔ فادر کو بلانے بھی تو گیا تھا۔ بستر میں ابھی خرید لاتا ہوں۔"

"کتنا وقت لگے گا؟"

"ایک گھنٹا تو لگ ہی جائے گا۔"

"بس تو لے آؤ۔"

برگنزا کے جانے کے بعد زنوبیا نے انور کی ڈریسنگ پر مزید پٹیاں کسیں۔

"یہ زخم کب تک ٹھیک ہو جائے گا زنوبی؟"

"روزانہ ڈریسنگ کرنا ہو گی۔ اتنا سامان میرے پاس نہیں ہے۔ برگنزا ہی کسی میڈیکل اسٹور سے لا سکتا ہے۔ اگر اس بستی میں نہ ملا تو اسے شہر جانا ہو گا۔ پرسوں کی ڈریسنگ کے بعد میں اندازہ لگا سکوں گی کہ زخم ٹھیک ہونے میں کتنے دن لگ سکتے ہیں۔"

برگنزا ایک گھنٹے سے کچھ زیادہ وقت میں گدا، چادر، تکیہ اور اوڑھنے کے لیے ایک کمبل لے آیا۔ اس طرح اسی کمرے میں زنوبیا کے آرام کرنے کا بندوبست بھی ہو گیا۔

ایک دن چھوڑ کر زنوبیا نے انور کی ڈریسنگ کرتے وقت کہا۔ "ہیلنگ تیزی سے ہو رہی ہے۔ بعض لوگوں کے ایسے زخم زیادہ دن میں ٹھیک ہوتے ہیں۔ تمہارا زخم پانچ چھ دن میں پوری طرح مندمل ہو جائے گا۔"

"یعنی ہم زیادہ سے زیادہ چھ دن میں واپسی کا سفر شروع کر سکتے ہیں؟"

"یقیناً۔" زنوبیا نے جواب دیا۔

پانچویں دن زنوبیا نے کہا۔ "کل کی ڈریسنگ کے بعد ضرورت نہیں رہے گی۔ میں سوچ رہی ہوں کہ آج ذرا سرنگ کی طرف ایک چکر لگا آؤں۔ اطمینان ہو جائے گا کہ وہ لوگ ہمارا ہیلی کاپٹر تلاش نہیں کر سکے ہیں۔"

"کیا اس کا امکان ہے؟"

"خدشہ تو ہے۔"

"میں بھی چلوں گا۔"

"فضول بات۔" زنوبیا نے محبت آمیز غصے سے کہا۔ "تم جتنا زیادہ آرام کرو، تمہارے لیے بہتر ہے۔"

"بہت اچھا ڈاکٹر صاحب۔" انور نے مسکرا کر کہا۔

"لیکن اندھیرا ہونے کے بعد جانا۔"

ان پانچ دنوں میں اسمارٹ فون کے ذریعے وہ چینلز کی خبریں بھی سنتے رہے تھے اور انہوں نے تین دن پہلے یہ خبر سنی تھی کہ انور کے ملک کی فوجوں نے اپنے دشمن کے ایک چھوٹے شہر پر قبضہ کر لیا تھا۔

پہلی بار خبر میں بتایا گیا تھا کہ شہر پر اچانک حملہ دو بریگیڈز نے مختلف سمتوں سے کیا تھا اور اس کے لیے بڑی غیر معمولی منصوبہ بندی کی گئی تھی۔

اس خبر کو سن کر زنوبیا نے کہا تھا۔ "اس کا مطلب شاید یہ ہے کہ تم نے جو پیغام پہنچایا تھا، وہ اسی کی منصوبہ بندی کے سلسلے میں ہوگا۔"

"شاید ایسا ہی ہو۔"

"بین الاقوامی سطح پر اس کے کیا اثرات پڑیں گے؟ میرا خیال ہے کہ دونوں ملکوں میں اب باقاعدہ جنگ کسی وقت بھی چھڑ سکتی ہے۔ اس کے کیا نتائج ہوں گے؟"

"میں ان دونوں ہی معاملوں پر کوئی تبصرہ نہیں کر سکتا۔ اگر میرے ملک پر کوئی منفی اثر پڑتا ہے تو اس کی ذمے داری مجھ پر یا میری فوج پر عائد نہیں ہوتی۔ تم جانتی ہو فوج کا کام حکومت کے حکم پر عمل کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا نتائج کی ذمے داری بھی حکومت پر ہوگی۔ فوج کو اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔"

بعد کی خبروں سے ظاہر ہوا تھا کہ بڑی طاقتوں میں خاصی ہلچل مچ گئی تھی۔ زنوبیا کے ملک نے انور کے ملک کو شہر چھوڑنے کے لیے چوبیس گھنٹے کا الٹی میٹم دے دیا تھا جسے بڑی طاقتوں نے دباؤ ڈال کر واپس کروایا۔ بڑی طاقتوں کو خوب اندازہ تھا کہ ان دونوں ملک کی جنگ سارے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ اسرائیل بھی زنوبیا کے ملک کا اتحادی بن سکتا ہے۔ اس کے نتائج بھی ہولناک نکل سکتے تھے اس لیے سپر پاورز چاہتی تھیں کہ اس معاملے کو مذاکرات کی میز پر حل کیا جائے۔

یو این او نے بھی سلامتی کونسل کا ہنگامی اجلاس طلب کر لیا تھا۔ اس میں ملوث ملکوں کے وزرائے خارجہ اور وزرائے دفاع بھی شریک ہوئے۔ نہایت گرما گرم بحثیں ہوئیں۔ انور کے ملک کا موقف یہ تھا کہ اس کی تین نہایت اہم فوجی چوکیوں پر جو قبضہ کیا گیا تھا، وہ واپس کر دی جائیں تو اس کا شہر بھی چھوڑ دیا جائے گا۔

دلائل زنوبیا کے ملک نے بھی جھوٹے لیکن مضبوط دیے۔ دیگر ممالک کے پاس کوئی جواز نہیں تھا کہ وہ ان دلائل کو جھوٹ قرار دے۔

اس اجلاس کا کوئی نتیجہ نکلتا نظر نہیں آرہا تھا۔ ان حالات میں ایک سپر پاور نے دباؤ ڈالا کہ دونوں ملکوں کے سربراہ اس کے دارالحکومت آکر ون اوون مذاکرات کریں اور اگر چاہیں تو سپر پاور بھی ان مذاکرات میں مبصر کی حیثیت سے شامل ہو جائے گی، یا ثالث کا کردار بھی ادا کر سکتی ہے۔

اس دن دونوں ملکوں کے سربراہوں کی ملاقات ہونی تھی جس رات زنوبیا ہیلی کاپٹر کا جائزہ لینے کے لیے سرنگ کی طرف گئی۔ جنگ چھڑ جانے کی صورت میں یہاں سے نکل کر اپنے ملک جانا تقریباً ناممکن سا ہو جائے گا، انور بستر پر لیٹا سوچتا رہا۔ فضاؤں میں دونوں ملکوں کے جنگی طیارے پرواز کر رہے ہوں گے جن سے ایک ہیلی کاپٹر کا بچ نکلنا ایک معجزہ ہی ہوتا۔ انور ہی کے ملک کا کوئی طیارہ ان کے ہیلی کاپٹر کو مار گراتا کیونکہ اس پر زنوبیا کے ملک کا نشان موجود تھا۔

اس کے علاوہ یہ بھی یقینی تھا کہ حالات کی کشیدگی کے باعث دونوں ہی ملکوں کے جنگی طیاروں نے سرحد پر پٹرولنگ تو شروع کر ہی دی ہوگی۔ ان حالات میں وہ جب ہیلی کاپٹر کو اپنے ملک کی طرف لے جانا چاہتا تو کچھ قیاس نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ردعمل کیا ہوتا۔ جنگی طیارے ہیلی کاپٹر کو اس طرف جانے سے روکنے کے لیے کچھ بھی کر سکتے تھے۔

اس وقت شاید یہ پروا بھی نہ کی جاتی کہ ابھی کی فوج کے ایک کیپٹن کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔

اس سوچ بچار میں نہ جانے کتنا وقت گزرا تھا کہ زور زور سے بیرونی دروازہ پیٹا گیا۔

انور چونک پڑا۔ یہ خدشہ بہرحال تھا کہ دشمن انہیں تلاش کرتا ہوا اس بستی میں بھی پہنچ سکتا تھا اور بستی کے لوگوں سے معلومات حاصل کر کے وہ برگنرا کے گھر کا رخ کر سکتے تھے۔

برگنرا دروازہ پیٹے جانے کی آواز سن کر اپنے کمرے سے نکلا۔

"اس طرح کون دروازہ پیٹ سکتا ہے؟" انور کی طرف دیکھتے ہوئے برگنرا کے چہرے سے اس کی تشویش صاف ظاہر تھی۔

ایک بار دروازہ پیٹے جانے کے بعد باہر خاموشی چھا گئی تھی۔ دروازہ کھلنے کا انتظار کیا جا رہا ہو گا۔ لیکن اگر دروازہ نہ کھولا جاتا تو وہ اندر آنے کے لیے دروازہ توڑ بھی سکتے تھے۔

"دروازہ کھول دو۔" انور نے برگنرا سے کہا۔

برگنرا دروازے کی طرف بڑھا۔ انور نے ریوالور نکال لیا۔ اس نے کسی بھی سمت سے فرار ہونے کے بارے میں ذرا بھی نہیں سوچا تھا۔ یہ بات اس کی دانست میں یقینی تھی کہ گھر کو چاروں طرف سے گھیرا بھی جا چکا ہو گا۔ اسی لیے اس نے فوری طور پر فیصلہ کیا تھا کہ گرفتاری کے بعد اذیتیں برداشت کرنے سے بہتر ہے کہ اسی وقت زندگی اور موت کا فیصلہ ہو جائے۔ وہ تیزی سے فائرنگ کر کے دو تین کو تو ہلاک کر ہی دیتا اور جوابی فائرنگ اس کا جسم بھی چھلنی کر دیتی۔ ریوالور نکالنے کے ساتھ ہی وہ بستر سے اٹھ بھی گیا تھا۔

برگنرا نے دروازہ کھولا اور انور نے جو کچھ دیکھا، اس کے نتیجے میں بستر پر گر سا پڑا۔ اندر آنے والی زنوبیا تھی۔

"اس طرح دروازہ پیٹنے کی کیا ضرورت تھی؟" اس کے منہ سے نکلا لیکن زنوبیا کی حالت دیکھ کر اسے جواب کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔

زنوبیا نہ صرف پریشان تھی بلکہ اس کے چہرے کا رنگ بھی اڑا اڑا سا تھا۔ سانس بھی اتنی پھولی ہوئی تھی جیسے وہ بہت دور سے دوڑتی ہوئی آئی ہو۔

"دروازہ میں نے اس لیے پیٹا کہ برگنرا دروازہ کھولنے میں دیر نہ لگائے۔" زنوبیا نے تیزی سے انور کے قریب آتے ہوئے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کہا، پھر برگنرا کی طرف دیکھا جو دروازہ بند کرنے کے بعد اسی کی طرف متوجہ تھا۔ زنوبیا نے اس سے کہا۔ "تم اندر اپنے کمرے میں جاؤ۔"

"آخر ہوا کیا ہے؟" انور بولا۔ "تم بہت گھبرائی ہوئی ہو اور سانس بھی اتنی پھولی ہوئی ہے جیسے......"

"گھبراہٹ ہی میں زور سے دروازہ پیٹ ڈالا تھا۔" زنوبیا نے جواب دیتے ہوئے برگنرا کی طرف دیکھا جو اندرونی کمرے کی طرف جا رہا تھا۔

انور سمجھ گیا کہ جو بات بھی تھی، وہ زنوبیا، برگنرا کے سامنے نہیں کہنا چاہتی تھی۔

پھر جیسے ہی برگنرا نے اندرونی کمرے میں جانے کے بعد دروازہ بند کیا، زنوبیا بول پڑی۔ "زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ بعد ہم خطرے میں ہوں گے انور! وہ لوگ سراغ رساں کتوں کے ساتھ بستی کی طرف آ رہے ہیں۔ انہیں ہمارا سراغ سرنگ سے ہی لگا ہو گا۔ ہماری تلاش میں وہ سرنگ تک پہنچ ہی گئے ہوں گے۔ اب اگر ہم یہاں سے کہیں بھاگیں گے بھی تو جائیں گے کہاں؟ نیلی کا پٹر تو ہمارے ہاتھ سے نکل ہی گیا۔" وہ تیزی سے بولتی ہی چلی گئی تھی۔

"ہوں۔" انور اس کا منہ تکتا رہ گیا لیکن اس کا دماغ تیزی سے مختلف پہلوؤں پر غور کر رہا تھا۔

"یہ ریوالور کیوں ہے تمہارے ہاتھ میں۔"

"میں سمجھا تھا کہ دشمن سراغ لگا کر یہاں پہنچ گیا ہے۔ گرفتار ہو کر ناقابلِ برداشت اذیت سہنے سے بہتر یہی تھا کہ میں دو ایک کو ٹھکانے لگا کر ان کی فائرنگ سے یہیں مارا جاؤں۔"

"ٹھیک فیصلہ کیا تھا تم نے مگر اب کیا کیا جائے؟ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے انور۔"

"نیلی کا پٹر تو ہمارے ہاتھ سے نکل ہی گیا۔"

"ہاں، وہ تو گیا۔"

"نہ جاتا تو بھی بیکار تھا۔"

"کیوں؟"

زنوبیا کے آنے سے پہلے انور نے جو کچھ سوچا تھا، اس نے اس کا اظہار کیا، پھر بولا۔ "اب ایک اور بات میرے دماغ میں آ رہی ہے۔"

"جلدی بتاؤ انور! جلدی۔" زنوبیا کی سانس اب قدرے قابو میں آ گئی تھی۔

"تم بدستور میری یرغمال بنی ہوئی ہو۔" انور خفیف سا مسکرایا۔

''میں تمہارا مطلب سمجھ گئی۔ اب ہم ان سے کیا مطالبہ کرو گے؟''

''کیا تم طیارہ اڑانا بھی جانتی ہو؟''

''نہیں۔ تو کیا طیارے کا مطالبہ کرو گے؟''

''پہلے میرے سوال کا جواب دو۔''

''نہیں۔ میں نہیں جانتی۔''

''لیکن میں جانتا ہوں۔ فوج میں آنے سے پہلے میں ایک فلائنگ کلب کا ممبر رہا ہوں۔ جہاز اڑانا سیکھ لیا تھا میں نے۔''

''تو اب طیارے کی ڈیمانڈ؟''

''ہاں، اور وہ بھی جیٹ طیارے کی، فائٹر طیارے کی۔''

زلوبیا حیرت سے بولی۔ ''کیا فلائنگ کلب میں فائٹر طیاروں کی ٹریننگ بھی دی جاتی ہے؟''

''نہیں۔ اس کی تربیت تو نہیں دی جاتی لیکن اس موقع پر ہمیں جیٹ فائٹر ہی کی ضرورت ہے۔''

''کیوں؟''

''میں ابھی ہیلی کاپٹر کے بارے میں جس خطرے کا ذکر کر چکا ہوں، وہی خطرہ طیارے کو بھی پیش آئے گا۔ ہمیں ان طیاروں سے لڑنا پڑ سکتا ہے۔''

''تم نے جیٹ طیارے کی بھی ٹریننگ نہیں لی اور طیاروں سے لڑنے کی بات بھی کر رہے ہو۔ کیا یہ ایک خواب نہیں؟''

''جب زندگی میں ایسا کوئی موقع آ جائے تو خواب ہی دیکھنا پڑتا ہے۔''

''لیکن......''

انور نے اس کی بات نہیں سنی اور برگنزا کو آواز دی۔ برگنزا فوراً ہی دروازہ کھول کر باہر آیا۔

''کوئی ڈوری مل جائے گی؟'' انور نے اس سے پوچھا۔ ''اگر ریشمی ہو تو اچھا ہے۔ بس چھ سات فٹ کی۔''

''ریشمی ڈوری تو ہے لیکن زیادہ لمبی ہے۔''

''قینچی ہو تو اسے کاٹا جا سکتا ہے۔''

برگنزا سر ہلا کر چلا گیا، پھر جلد ہی لوٹا۔ اس کے ہاتھ میں ریشمی ڈوری اور قینچی تھی۔ انور نے ڈوری کاٹتے ہوئے کہا۔ ''برگنزا! ہم اب خطرے میں ہیں۔ دشمن کسی وقت بھی یہاں پہنچ سکتا ہے۔ تمہیں یہاں سے فوراً کہیں چلا جانا چاہیے بلکہ بہتر ہے کہ فادر میوئل کے پاس جاؤ۔ اسے بھی خطرے سے آگاہ کر دو۔ بستی کے لوگوں نے اسے یہاں آتے اور نہیں تو جاتے دیکھ لیا ہوگا۔ وہ بتا دیں گے ہمارے دشمن کو۔ تم دونوں ہی کو اب اپنی جان بچانی چاہیے۔ فرار ہو جاؤ یہاں سے کہیں بھی۔''

برگنزا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ ''اور...... آپ لوگ؟''

''ہم بھی کچھ کریں گے۔ تم تو یہاں سے نکلو فوراً۔''

''اتنا وقت ہے کہ میں اپنا ضروری سامان لے لوں؟''

''میرا خیال ہے کہ زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ ہیں۔'' انور نے ضروری سمجھا کہ اسے کم وقت دے۔ زلوبیا کے اندازے کے مطابق تو ابھی دس بارہ منٹ باقی تھے۔

برگنزا تیزی سے اندرونی کمرے میں چلا گیا۔

''یہ ڈوری......'' زلوبیا کا ذہن الجھ رہا تھا۔

''اس سے تمہارے ہاتھ باندھوں گا۔'' انور نے جواب دیا۔ ''اب دشمن پر ظاہر کروں گا کہ تم میری باقاعدہ قیدی بن چکی ہو۔''

''جیٹ فائٹر کے بارے میں تم کیا سوچ رہے ہو؟''

انور اسے وضاحت سے بتانے لگا کہ وہ کیا سوچ چکا ہے۔ سب کچھ سننے کے بعد زلوبیا پریشان نظر آئی اور بولی۔ ''تمہاری یادداشت کتنی ہی اچھی سہی لیکن یہ معاملہ ایسا نہیں کہ یادداشت پر مکمل بھروسا کیا جا سکے۔ ذرا سی بھی بھول، ہم دونوں کی ہلاکت کا سبب بن سکتی ہے۔''

''کیا ہم ساتھ جینے اور مرنے کی بات نہیں کر چکے۔'' انور نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''ہاں اگر تمہارے دماغ میں کوئی اور تدبیر ہو تو بتاؤ۔''

''میرا دماغ تو اس وقت شل ہو گیا ہے۔''

اسی وقت برگنزا اپنے کمرے سے نکلا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی تھی۔ وہ ان دونوں کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے رخصت ہو گیا۔ انور کے کہنے پر زلوبیا نے بیرونی دروازہ بند کر لیا۔

''اب تمہارے ہاتھ باندھ دیتا ہوں۔'' انور نے کہا۔ ''اتنی سختی سے نہیں باندھوں گا کہ تمہیں تکلیف ہو۔''

زلوبیا خاموش رہی۔ وہ فکرمند دکھائی دے رہی تھی۔ انور نے منصوبہ بنایا تھا، وہ بے حد خطرناک تھا۔ انور نے اس کے ہاتھ اس کی گردن کی پشت پر رکھ کر ڈوری سے باندھ دیے۔

''تکلیف تو نہیں ہو رہی؟''

''نہیں۔'' زلوبیا کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"اب ہمیں ان کا انتظار کرنا ہے۔" انور نے کہا ہی تھا کہ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔

انور نے طویل سانس لی۔ "آگئے۔"

"کاش ایک دن اور مل جاتا۔" زنوبیا کی آواز اب بھی بھرائی ہوئی تھی۔ "تمہارا زخم بالکل ٹھیک ہو چکا ہوتا۔"

کتوں کی آواز اب بالکل قریب آچکی تھی۔

"میں نے چل کر دیکھا تھا۔ بہت معمولی سی تکلیف ہوئی۔ قابلِ برداشت ہے۔"

"زیادہ حرکت سے زخم کھل بھی سکتا ہے۔"

اس وقت کتوں کی آواز مکان کے دروازے پر آچکی تھی۔ پھر دروازہ پیٹا گیا، ساتھ ہی آواز آئی۔ "دروازہ کھولو! ہم نے تمہیں ڈھونڈ لیا ہے۔ تم اس طرح کب تک، کہاں تک بھاگو گے۔"

انور، زنوبیا کے ساتھ دروازے کے قریب گیا۔

"مت بھولو کہ تمہاری کیپٹن اب بھی میرے قبضے میں ہے۔" انور نے کہا۔ "میں خود چاہتا ہوں کہ تم سے بات کروں۔ دروازہ کھول رہا ہوں۔"

اس نے دروازہ اس طرح کھولا کہ زنوبیا کو خود سے قدرے آگے رکھا اور اس کی کمر اپنے بائیں ہاتھ سے جکڑے رکھی۔ جس ہاتھ سے دروازہ کھولا تھا، اسی ہاتھ میں ریوالور بھی تھا۔

جو چند افراد دکھائی دیے، وہ فوجی وردی میں ملبوس نہیں تھے۔ قیاس کیا جاسکتا تھا کہ وہ اس ملک کی کسی خفیہ ایجنسی کے ہوں گے۔

"دیکھ رہے ہو تم لوگ؟" انور بولا۔ "تمہاری کیپٹن اب بھی میرے قبضے میں ہے۔ تم میں سے کون بات کرے گا مجھ سے؟"

"کیپٹن کو چھوڑ دو۔ ہم تمہیں جانے دیں گے۔ میں میجر ہوں۔ یہ وعدہ پوری ذمے داری سے کر رہا ہوں۔"

"میں بے وقوف نہیں ہوں کہ تمہاری ذمے داری سمجھ نہ سکوں۔" انور نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "میں اس بستی کے مکان میں اس لیے آیا تھا کہ آرام کر کے اپنے زخم کو ٹھیک ہونے کا وقت دوں۔ اس کے بعد میں پھر ہیلی کاپٹر کی طرف جاتا لیکن تم لوگوں نے غالباً ہیلی کاپٹر ڈھونڈ لیا ہے۔"

کتے اب بھی بھونک رہے تھے، زنوبیا اور انور پر جھپٹ پڑنا چاہتے تھے لیکن ان کے گلے میں بندھے ہوئے پٹے سے منسلک زنجیر کھینچ کر انہیں قابو میں رکھا جارہا تھا۔ وہ پانچ افراد تھے جن میں سے ایک نے خود کو میجر بتایا تھا۔

"تم اِدھر اُدھر کیوں بھٹک رہے ہو؟" میجر بولا۔ "آخر چاہتے کیا ہو؟"

"میں فوری طور پر تم لوگوں سے مطالبہ کرتا کہ مجھے اپنے پرائم منسٹر سے ملاؤ لیکن زخم کی وجہ سے میرے لیے ضروری تھا کہ وہ ٹھیک ہو جائے۔ اب میں ٹھیک ہوں اور اپنا نیا مطالبہ تمہارے سامنے رکھ رہا ہوں۔"

"کیا تم پاگل ہو؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ پرائم منسٹر تم سے ملنے کے لیے آئیں۔"

"میں تو جاسکتا ہوں تمہارے دارالحکومت تک۔"

"کیا تم پھر ہیلی کاپٹر کا مطالبہ کرو گے؟"

"نہیں۔ اب مجھے جیٹ فائٹر کی ضرورت ہے۔" انور نے کہا۔ "وہاں تک پہنچنے میں جیٹ کو بھی پونے دو گھنٹے لگیں گے۔"

"تم جیٹ اڑا سکتے ہو؟"

"جیٹ کے ساتھ مجھے اس کے پائلٹ کی بھی ضرورت ہے۔ جیٹ میں میزائل، مشین گن، سب کچھ ہونا چاہیے۔ یہ میں اس لیے چاہتا ہوں کہ اگر مجھے گھیرے کی کوشش کی گئی تو میں ان سے لڑ مروں گا۔"

"ہمارا پائلٹ فائر کیسے کھول سکتا ہے؟"

"اسے وہ سب کچھ کرنا پڑے گا جو میں اس سے کہوں گا۔ دوسری صورت میں اس کی زندگی ختم کی جاسکتی ہے۔"

"طیارہ بھی تباہ ہو جائے گا۔ تم بھی مارے جاؤ گے اور ہماری کیپٹن بھی۔"

"تمہاری کیپٹن کی زندگی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اگر تم لوگ اسے زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو وہ کرو، جو میں چاہتا ہوں۔ رہی میرے مرجانے کی بات تو اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ جب میں تمہارے ملک میں آیا تھا، تبھی سوچ چکا تھا کہ زندہ واپس لوٹنا شاید مشکل ہو۔ بس ایک پیغام پہنچانا ہے تمہارے پرائم منسٹر کو۔ انہیں مجھ سے ملنے ائرپورٹ تک آنے کی زحمت تو کرنا ہی پڑے گی۔"

"بہتر ہوگا کہ تم اپنی بچت کا کوئی ایسا راستہ سوچو جو ہمارے لیے قابلِ قبول ہو۔"

"جو میں کہہ چکا ہوں، اس کے سوا کچھ نہیں۔" انور نے سخت لہجے میں کہا۔ "اپنے بڑوں سے مشورہ کرلو۔ اس کے لیے میں تمہیں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں دوں گا۔"

پھر انور نے اسے اپنا موبائل نمبر بتا کر جواب کا

انتظار کیے بغیر دروازہ بند کر لیا اور چٹخنی لگا لی۔ وہ زنوبیا کے ساتھ بستر تک لوٹا۔

"ان لوگوں کا جواب ملنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ اتنی دیر کے لیے میں تمہارے ہاتھ تو کھول دوں۔" انور نے اس کے ہاتھوں پر بندھی ڈوری کھولتے ہوئے کہا پھر بولا۔ "انہیں میرا مطالبہ تو ماننا ہی پڑے گا۔ پرائم منسٹر والی بات بھی فوری طور پر تو وہ مان لیں گے اس دوران میں منصوبہ بندی کرتے رہیں گے مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی۔"

"بہت غیر یقینی حالات ہیں انور۔" زنوبیا بہت پریشان نظر آ رہی تھی۔

"وہ تو مجھے بھی اندازہ ہے، مگر ان حالات سے گزرنا تو ہوگا۔" انور نے کہا۔ "اب ان کی کال کا انتظار کرنا ہے۔ نمبر تو دے دیا ہے انہیں۔"

بیس منٹ بعد کال آ گئی۔ "میجر بول رہا ہوں۔" آواز آئی۔ "تمہارا مطالبہ مان لیا گیا ہے۔ ائرپورٹ پر جیٹ تمہارے لیے تیار ہے اور اس کا پائلٹ بھی۔ جیٹ میں میزائل وغیرہ سب کچھ ہے۔"

"ائرپورٹ کتنی دور ہے؟"

"تمہارے لیے کار بھی تیار ہے جو تمہیں ائرپورٹ لے جائے گی۔"

انور نے موبائل کا اسپیکر آن کر دیا تھا تاکہ زنوبیا بھی وہ گفتگو سن سکے اور زنوبیا نے قلم کاغذ بھی سنبھال لیا تھا تاکہ اگر انور کو کسی قسم کا مشورہ دینے کی ضرورت پیش آئے تو وہ لکھ کر مشورہ دے سکے۔ اگر وہ بولتی تو اس کی آواز دوسری طرف سن لی جاتی۔

"کار تو یقیناً تیار کروائی ہوگی تم لوگوں نے۔ میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ ائرپورٹ کتنی دور ہے۔"

"ایک گھنٹے کا راستہ ہے۔"

"یعنی شہری ائرپورٹ؟"

"ہاں۔"

اس اثنا میں زنوبیا نے جلدی سے یہ جملہ لکھ لیا تھا۔ "یہاں سے چار پانچ فرلانگ دور بھی ایک ائرپورٹ ہے۔"

انور نے وہ تحریر پڑھ کر کہا۔ "طیارہ مجھے قریبی ائرپورٹ پر چاہیے۔ ایک گھنٹے کا سفر میں نہیں کروں گا۔"

زنوبیا نے مزید لکھا تھا۔ "فوج کا چھوٹا سا ائرپورٹ ہے۔"

"یہی ائرپورٹ قریب ہے۔" جواب آیا۔

"جھوٹ بول رہے ہو۔" انور نے زنوبیا کی تحریر پڑھ کر غصہ کرنے کے انداز میں کہا۔ "یہاں آنے سے پہلے مجھے اس علاقے کی ہر بات سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔ یہاں سے چار پانچ فرلانگ کے فاصلے پر بھی ایک چھوٹا سا ائرپورٹ بنایا گیا ہے تاکہ تمہاری فوج اسے ہنگامی حالات میں استعمال کر سکے۔"

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ یہ بھی محسوس ہوا کہ ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ لیا گیا تھا۔

"مشورہ ہو رہا ہوگا۔" انور نے بھی ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر زنوبیا سے کہا۔

زنوبیا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

قدرے رک کر دوسری طرف سے آواز آئی۔ "اس ائرپورٹ کی مرمت ہو رہی ہے۔"

"جھوٹ بول رہے ہو۔ تم مجھ سے طویل فاصلہ طے کروانا چاہتے ہو۔ کوئی منصوبہ بنایا ہوگا مجھ پر ہاتھ ڈالنے کے لیے۔ نہیں میجر! بے وقوف مت سمجھو مجھے۔ اگر اس ائرپورٹ کی مرمت بھی ہو رہی ہے تو اسے آدھے گھنٹے کے اندر مکمل کرواؤ اور اس طیارے کو یہاں لاؤ جو تم نے ایک گھنٹے کے فاصلے پر تیار کروایا ہے میرے لیے۔ صرف آدھا گھنٹا۔ میں اب تمہاری آواز سنوں گا تو صرف یہ کہ طیارہ یہاں آ گیا ہے۔"

انور نے دوسری طرف کی کوئی اور بات سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا اور زنوبیا کی طرف دیکھ کر بولا۔ "فی الحال تو ان کا باپ بھی میری بات مانے گا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے چہرے سے پریشانی کا تاثر ختم نہیں ہو رہا ہے۔"

"میں فوج میں سہی لیکن بہرحال، تم مرد ہو۔ اپنے ذہن پر دباؤ نہ لینا بہت مشکل ہوتا ہے عورتوں کے لیے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض عورتوں نے اپنی باجبروت حکمرانی کی تاریخ رقم کی ہے۔ میں بدقسمتی سے اس قسم کی نہیں ہوں۔ مجھے ڈر صرف یہ ہے کہ تمہیں کچھ ہو گیا تو میں کیسے سانس لے سکوں گی۔"

"زنوبی!" انور نے پیار سے کہا۔ "حالات ایسے ہیں کہ صرف مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ جو کچھ بھی ہوگا، دونوں کے ساتھ ہوگا۔ یہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں، ہم اب ساتھ جئیں گے، ساتھ مریں گے۔"

"میری شدید خواہش ہے کہ ایسا ہی ہو۔"

"ایسا ہی ہوگا۔"

آدھے گھنٹے بعد میجر کی کال آ گئی۔ "ائرپورٹ بھی

ٹھیک کر دیا گیا ہے اور طیارہ بھی آ گیا ہے۔ تمہارے لیے گاڑی گھر کے دروازے پر آ چکی ہے۔ ڈرائیور بھی ہے۔''

''مجھے ڈرائیور کی ضرورت نہیں۔''

''ائرپورٹ کا راستہ جانتے ہو؟''

''مجھے یقین تھا کہ تمہاری کیپٹن ڈاکٹر کو اس ائرپورٹ کا راستہ ضرور معلوم ہوگا۔ میں نے اس سے پوچھا تو اثبات میں جواب دینا ہی اس نے اپنے من میں بہتر سمجھا۔ وہ مجھے کوئی ایسا موقع نہیں دینا چاہتی کہ میں اس کے ساتھ زیادتی کروں۔ میں نے اسے اب تک اس کے علاوہ کوئی تکلیف نہیں دی ہے کہ تم لوگوں کا سامنا ہونے کے باعث اس کے ہاتھ باندھ دیے تھے جو تم سے بات کرنے کے بعد کھول بھی دیے۔ اب گاڑی وہی چلائے گی۔ میں اس کے ساتھ دو تین منٹ بعد باہر نکلوں گا۔ اس کے ہاتھ پھر باندھنا ہیں۔''

''بندھے ہاتھوں سے وہ ڈرائیو کیسے کر سکیں گی؟''

''یہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔'' انور نے جواب دیا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

''گردن پر ہاتھ بندھے ہوں گے تو ڈرائیو کیسے کروں گی؟'' زنوبیا بولی۔

''اب ہاتھ سامنے ہی سے باندھوں گا۔'' انور نے ڈوری سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''دیکھتی جاؤ، میں کس طرح باندھتا ہوں۔''

زنوبیا نے ہاتھ آگے بڑھا دیے۔

اس مرتبہ انور نے اس کے ہاتھ اس طرح باندھے کہ دونوں ہاتھوں کے درمیان اتنا فاصلہ تھا کہ وہ اسٹیئرنگ سنبھال سکتی تھی۔

''بروقت تدبیر آ جاتی ہے تمہارے دماغ میں۔'' زنوبیا نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''تمہاری اس صلاحیت کی وجہ سے میں امید رکھ سکتی ہوں کہ ہم کامیاب ہوں گے۔''

''یقیناً'' انور نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں ناکامی کا خیال اپنے ذہن میں بہت کم لاتا ہوں۔''

اس کے ساتھ زنوبیا بھی کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ دونوں دروازے کی طرف بڑھے۔ جب انہوں نے دروازہ کھول کر باہر قدم رکھا تو زنوبیا کی کمر انور کی گرفت میں تھی۔

سامنے ہی لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ میجر اور اس کے ساتھی بھی وہیں تھے۔ ان میں سے کوئی ایک کتوں کو لے جا چکا تھا۔

''گڈ!'' انور نے لینڈ کروزر پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''کس قدر ہو میجر!...... عام گاڑی تو اس پہاڑی علاقے میں چل بھی نہیں سکتی تھی۔ تمہیں واضح ہدایت کرنے کا خیال نہیں رہا تھا مجھے لیکن تم نے خود ہی صحیح فیصلہ کیا کہ لینڈ کروزر کا بندوبست کیا۔''

میجر خاموش رہا۔ نہ صرف اس کا بلکہ اس کے ساتھیوں کے چہرے بھی سپاٹ تھے۔

زنوبیا کے ساتھ انور لینڈ کروزر کی طرف بڑھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ریوالور اس وقت بھی تھا۔ اگر وہ کرنل بھی وہاں ہوتا جس نے انور کو قید کیا تھا، تو وہ یہ دیکھ کر چونک جاتا کہ انور کے پاس ریوالور کہاں سے آ گیا لیکن اگر ایسی کوئی صورت حال ہوتی تو انور یہی ظاہر کرتا کہ وہ ریوالور اپنے اس آدمی سے ملا تھا جس کے گھر میں اس نے قیام کیا تھا۔

پہلے انور لینڈ کروزر میں بیٹھا۔ بیٹھتے وقت ریوالور کی نال زنوبیا کی طرف رہی تھی۔

''اب تم بھی آ جاؤ کیپٹن۔'' وہ زنوبیا سے بولا۔

زنوبیا نے ایک مرتبہ میجر اور اس کے ساتھیوں کی طرف اس طرح دیکھا جیسے حد درجہ بے بسی محسوس کر رہی ہو۔ پھر وہ لینڈ کروزر کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ انور برابر کی سیٹ پر کھسک گیا تھا۔

وہاں انور نے ایک اور لینڈ کروزر بھی کھڑی دیکھی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ میجر بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان کے پیچھے آتا۔ وہ ان دونوں کی نگرانی تو لازمی کرتے۔ انور کو یہ بھی یقین تھا کہ طیارہ جب پرواز میں ہوگا تو دو تین طیارے اس کا تعاقب بھی کریں گے۔

یہ خیال درست بھی ثابت ہوا۔ جب طیارہ انہیں لے کر اڑا تو دو طیارے تعاقب میں بھی تھے۔

انور نے کو پائلٹ کی سیٹ سنبھالی تھی۔ زنوبیا کو بھی اپنے برابر میں بٹھا لیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اب بھی بندھے ہوئے تھے۔

پائلٹ کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ جب اس نے طیارہ اسٹارٹ کر کے ٹیکسی کرانا شروع کیا تھا تو انور کی ساری توجہ اس کی حرکات و سکنات پر مرکوز رہی تھی۔ وہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہتا تھا کہ عام طیارے اور جیٹ کی پرواز کے طریقۂ کار میں فرق ہے۔

طیارے کی ہر جنبش کے ساتھ وہ پائلٹ کی حرکات و سکنات پر گہری نظر رکھتا رہا۔ وہ سب کچھ اس کے دماغ میں اس طرح محفوظ ہوتی رہیں جیسے کوئی بات کمپیوٹر میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ یہ اس کی ایسی حیرت انگیز صلاحیت تھی جس پر

بریگیڈیئر شس بھی حیران رہ گیا تھا۔ ایسی یادداشت بہت کم، برائے نام انسانوں میں دیکھی گئی ہے۔

طیارہ جب ایک مخصوص بلندی پر پہنچ کر سیدھی پرواز کرنے لگا تو انور نے پائلٹ کو حکم دیا۔ ''واپس پہاڑی علاقے کی طرف موڑو۔''

''مجھ سے تو کہا گیا تھا کہ.....''

''تم سے جو کچھ کہا گیا تھا، وہ میں نے نہیں کہا تھا لیکن اب جو کہا گیا ہے، وہ میں نے کہا ہے۔'' انور نے ریوالور کی نال اس کے پہلو میں زیادہ زور سے گڑاتے ہوئے کہا۔

''مجھے مارو گے تو یہ طیارہ بھی تباہ ہو جائے گا۔'' پائلٹ نے کہا۔ ''تم بھی ختم ہو جاؤ گے اور ہماری کیپٹن زنوبیا بھی۔''

''اس ڈاکٹر کی زندگی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' انور نے کہا۔ ''رہی میری بات تو میں بہرحال ابھی زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ یہ خیال دل میں نہ لاؤ کہ میں نے تمہیں مار دیا تو یہ طیارہ تباہ ہو جائے گا۔ میں نے کسی مصلحت سے غلط بیانی کی تھی۔ میں طیارہ اڑانا جانتا ہوں۔ تم کو میں نے کسی اور سبب سے ساتھ لیا ہے۔ اگر تم میری بات نہیں مانو گے تو تمہاری زندگی میرے لیے بیکار ہو گی۔ ختم کر دوں گا میں تمہیں......! طیارہ خاصی بلندی پر ہے۔ تمہیں ختم کر کے مجھے اتنی مہلت آسانی سے مل جائے گی کہ طیارے کا کنٹرول سنبھال سکوں۔''

''تم مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کرو۔ تمہارا تعلق بری فوج سے ہے۔ تم طیارہ نہیں اڑا سکتے نہ ہی سنبھال سکتے ہو۔''

''کیا میں تمہیں بتاؤں کہ جیٹ کس طرح اڑایا جا سکتا ہے؟''

پائلٹ خاموش رہا۔

''مجھے امتحان دینے کی ضرورت تو نہیں لیکن کیونکہ میں تمہیں زندہ رکھنا چاہتا ہوں اس لیے تمہیں زبانی بتائے دیتا ہوں کہ جیٹ کس طرح اڑایا جا سکتا ہے۔''

پائلٹ اب بھی خاموش رہا تھا۔ انور نے بتانا شروع کیا کہ انجن کیسے اسٹارٹ کیا جاتا ہے۔ طیارے کو ٹیکسی کس طرح کرائی جاتی ہے...... رفتار میں بتدریج اضافہ کیسے کیا جاتا ہے اور کتنی رفتار حاصل کرنے کے بعد طیارہ فضا میں بلند ہونا شروع کرتا ہے پھر اس کو زیادہ بلندی تک لے جانے کے لیے کس اسٹک سے کام لیا جاتا ہے۔

پائلٹ کے ساتھ ہی زنوبیا بھی خاموشی سے وہ سب کچھ سنتی رہی تھی۔

''میں اس طیارے کے ہر کل پرزے سے واقف ہوں مسٹر پائلٹ!'' انور نے سب کچھ بیان کرنے کے بعد کہا۔ ''غالباً اب تمہیں یقین آ گیا ہو گا کہ تمہیں ختم کرنے کے بعد میں طیارہ سنبھال سکتا ہوں۔''

''میں رخ موڑ رہا ہوں۔'' پائلٹ کی آواز اس مرتبہ بھرائی ہوئی تھی۔

''شاباش! اچھے بچے ہو۔'' انور نے خوش مزاجی کا مظاہرہ کیا۔

زنوبیا نے اس وقت اپنا چہرہ سپاٹ کر رکھا تھا۔

طیارے کا رخ مڑتے ہی ٹرانسمیٹر پر سگنل موصول ہوا۔

پائلٹ سوالیہ نظروں سے انور کی طرف دیکھنے لگا۔

انور بولا۔ ''وہ جاننا چاہتے ہوں گے کہ طیارے کا رخ کیوں موڑا گیا ہے۔ بات کرو۔ انہیں بتاؤ کہ یہ میرے حکم سے کیا گیا ہے۔''

پائلٹ نے ٹرانسمیٹر آن کیا۔ ''واحق دس اینڈ، اوور۔''

''طیارہ واپس کیوں موڑا گیا ہے؟'' آواز آئی۔ ''اوور۔''

پائلٹ کے بجائے انور بول پڑا۔ ''میں نے حکم دیا ہے، اوور۔''

اس کی آواز سن کر دوسری طرف دو تین پل کے لیے سناٹا چھا گیا، پھر آواز آئی۔ ''مقصد؟ تم تو......''

''ہاں۔'' انور نے ہی جواب دیا۔ ''میری منزل وہی ہے جو میں نے بتائی تھی۔ بس ذرا دیر کے لیے پہاڑوں کے اوپر دو ایک چکر لگانے ہیں۔ اوور۔''

''مقصد؟'' پھر پوچھا گیا۔ ''اوور۔''

انور نے جواب دینے کے بجائے ٹرانسمیٹر بند کر دیا۔

''بس کافی ہے۔'' انور نے پائلٹ سے کہا۔ ''تم وہ کرتے رہو جو میں کہتا ہوں۔''

پائلٹ خاموش رہا۔

جلد ہی طیارہ پہاڑوں کے اوپر پرواز کر رہا تھا۔

''وہ پہاڑ دیکھ رہے ہو؟'' انور نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ''اس پر جگہ جگہ سبز دھبے ہیں۔''

''ہاں۔''

''بالکل اوپر ایک ہی دھبا ہے۔''

''ہاں۔''

"اس پر ایک میزائل فائر کرو۔"
"کیوں؟" پائلٹ چونکا۔
"میں اپنا اطمینان کرنا چاہتا ہوں۔" انور نے کہا۔
"میں نے کہا تھا کہ یہ طیارہ میزائل اور مشین گن وغیرہ سے خالی نہ ہو۔ اس کے میکنزم میں بھی کوئی ایسی خرابی نہیں ہونی چاہیے کہ نشانہ خطا جائے۔ مجھ سے سوالات مت کیا کرو۔ جو میں کہوں، وہ کرتے رہو۔" آخری جملے میں انور کا لہجہ بہت سخت ہو گیا۔
پائلٹ نے طویل سانس لی۔ "ہم آگے نکل آئے ہیں۔ واپس لوٹنا ہوگا۔"
"جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو۔"
پائلٹ نے طیارہ راؤنڈ میں گھما کر واپس لوٹایا۔ اسی وقت ٹرانسمیٹر پر پھر سگنل آیا۔
"کوئی ضرورت نہیں بات کرنے کی۔" انور بولا۔
"پائلٹ کو ٹرانسمیٹر کے سگنل نظرانداز کرنے پڑے۔ جلد ہی وہ پہاڑ اور خودرو گھاس کے دھبے دکھائی دینے لگے۔
"فائر کرو۔" انور نے حکم دیا۔
"ذرا سا رک کر۔ ابھی وہ نشانے پر نہیں آیا۔"
انور غور سے چیک کر رہا تھا کہ پائلٹ کی نظر کہاں ہے۔ پھر جب فائر کیا گیا تب بھی انور نے دیکھا کہ وہ عمل کس طرح ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی پائلٹ نے طیارے کو تیزی سے بلند کیا۔ اس کا مقصد انور کی سمجھ میں آ گیا۔ میزائل ٹکرانے سے جو چھوٹے بڑے پتھر ٹوٹ کر اڑیں، ان میں سے کوئی ٹکرا طیارے سے نہ ٹکرا سکے۔
"شاباش! پیارے پائلٹ وامق۔" انور بولا۔
"وامق نام ہے نا تمہارا؟"
پائلٹ نے سر ہلانے پر اکتفا کی تھی۔
ٹرانسمیٹر کے سگنل بند ہو گئے تھے جو اس وقت پھر آنے لگے۔ میزائل فائر کرنے کا یہ ردعمل ہونا ہی چاہیے تھا۔
اس مرتبہ پائلٹ کے بجائے انور ہی نے بات کی اور میزائل فائر کرنے کا وہی مقصد بتایا جو پائلٹ وامق کو بتا چکا تھا۔ اس نے آخر میں یہ بھی کہا۔ "ابھی ایک میزائل اور داغا جائے گا۔ اوور......"
"آخر......" دوسری طرف سے نہ جانے کیا کہنا چاہا گیا تھا۔
انور نے سننے کی ضرورت نہیں سمجھی اور ٹرانسمیٹر بند کر دیا۔ وہ اس وقت ماسٹر آف سچویشن بنا ہوا تھا۔
جلد ہی اس نے ایک اور جلد میزائل فائر کروایا اور دیکھا کہ وامق کی حرکات و سکنات وہی تھیں جو پہلا میزائل فائر کرنے پر تھیں۔
اس مرتبہ ٹرانسمیٹر پر سگنل نہیں آیا۔ انور پہلے ہی بتا چکا تھا کہ ابھی وہ ایک میزائل اور فائر کرائے گا۔
"پہاڑوں کے اوپر ہی چکر لگاتے رہو۔" انور نے وامق سے کہا۔
وامق اب خاموشی سے اس کے احکام کی تعمیل کر رہا تھا۔
ایک جگہ انور نے اشارے سے کہا۔ "ٹھیک اسی جگہ مشین گن سے فائرنگ کرو۔ زیادہ گولیاں چلانے کی ضرورت نہیں۔ بس ہلکا سا برسٹ۔"
وامق نے اس حکم کی بھی تعمیل کی۔
انور نے اس کے علاوہ بھی ایک جگہ فائرنگ کروائی اور سمجھ لیا کہ مشین گن کا استعمال کس طرح کیا جاتا ہے۔
"بس اب اپنی منزل کی طرف چلو۔" انور نے کہا۔
"طیارہ انتہائی بلندی تک لے جاؤ۔"
وامق نے یہ بھی کیا۔ پرواز جاری رہی۔ زنوبیا، انور کی ہدایت کے مطابق سب کچھ خاموشی سے دیکھتی اور سنتی رہی تھی۔
جب آدھے گھنٹے کا سفر باقی رہ گیا تو انور نے وامق سے کہا۔ "اب تم خود ٹرانسمیٹر پر اپنے لوگوں سے رابطہ کرو۔ مجھے کچھ بات کرنی ہے۔"
وامق نے اس کی بات بھی کروا دی۔
انور بولا۔ "میں نے کہا تھا کہ مجھے تمہارے پرائم منسٹر سے ملنا ہے۔ امید ہے کہ اسے بتا دیا گیا ہوگا...... اوور۔"
"وہ نہیں مل سکیں گے۔ تم وہاں وزیر داخلہ سے بات کر سکتے ہو، اوور۔"
"صرف پرائم منسٹر۔" انور نے غصے کا اظہار کیا۔ "کیا تمہیں کیپٹن زنوبیا کی زندگی عزیز نہیں؟...... اوور۔"
"مجبوری ہے۔" جواب آیا۔ "پرائم منسٹر اپنے طے شدہ شیڈول کے مطابق جنوبی سرحد پر اگلے مورچوں کا معائنہ کرنے کے لیے روانہ ہو چکے ہیں، اوور۔"
"چال چلی جا رہی ہے۔" انور غرایا۔ "کیا تم لوگ یہ سمجھ رہے ہو کہ میں تمہارے پرائم منسٹر کو گولی مار دوں گا......؟ اوور۔"
"تمہیں بتا دیا گیا ہے کہ پرائم منسٹر کا یہ دورہ شیڈول

سے مطابق تھا، اوور۔"

"چلو یوں بھی سہی۔" انور نے کہا۔ "میں وہاں مل لوں گا پرائم منسٹر سے۔ طیارے کا رخ اب اس طرف موڑنا ہوگا۔ پرائم منسٹر کی لینڈنگ کا ہوائی اڈا؟" انور نے سوالیہ انداز میں کہنے کے بعد "اوور" کہا۔

"وہاں تین ہوائی اڈے ہیں۔ سیکیورٹی کے پیشِ نظر یہ بات راز میں رکھی گئی ہے کہ وہ کس ہوائی اڈے پر اتریں گے۔ ہمیں بھی اس کا علم نہیں، اوور۔"

"ٹھیک ہے۔" انور نے کہا۔ "طیارہ انہی میں سے کسی ہوائی اڈے پر اتار لیا جائے گا۔ پرائم منسٹر کو اطلاع کر دی جائے کہ میں وہاں پہنچ رہا ہوں، اوور۔"

"ٹھیک ہے۔ اطلاع کر دی جائے گی، اوور۔"

انور نے ٹرانسمیٹر بند کیا اور بولا۔ "اس طرف چلو واثق۔"

"مجھے ان میں سے کسی ہوائی اڈے کا علم نہیں۔"

"ہوسکتا ہے تم جھوٹ بول رہے ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ سچ بول رہے ہو۔ جنوبی سرحد کی طرف چلو...... نیچی پرواز کریں گے تو کوئی ہوائی اڈا نظر آ ہی جائے گا۔"

واثق نے طیارے کا رخ موڑا۔

انور مطمئن تھا کہ سب کچھ اس کی توقع کے مطابق ہو رہا ہے۔ اس نے روانگی سے چند ہی منٹ پہلے خبریں سن لی تھیں جن میں پرائم منسٹر کے اس دورے کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ ٹرانسمیٹر پر جھوٹ بولا گیا تھا کہ سیکیورٹی کے پیشِ نظر پرائم منسٹر کے دورے کو خفیہ رکھا گیا ہے۔ انور کو پہلے ہی معلوم تھا کہ پرائم منسٹر سے ملاقات نہ ہونے کی کیا وجہ بتائی جائے گی۔ خبر سنتے ہی اس کے دماغ میں یہ بات آ گئی تھی کہ قدرت اس موقع پر بھی اس کی مددگار ہے۔

ایک گھنٹے بعد واثق نے بتایا کہ اب طیارہ جنوبی سرحد کے اگلے مورچوں کے اوپر چکر لگا رہا ہے۔

"ہوائی اڈا تلاش کرنے کے لیے نیچی پرواز کرنی ہو گی۔" انور نے کہا۔ اس کا اندیشہ تو نہیں ہے کہ نیچے سے کوئی طیارے پر فائر کھول دے گا۔ اس پر تمہارے ملک کا نشان موجود ہے اس کے علاوہ تمام فوجی ادارے اس صورتِ حال سے باخبر ہو چکے ہوں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میڈیا کو بھی خبر مل گئی ہو۔ اس وقت تمہارے سارے ملک میں اس بات سے ہیجان پھیلا ہوا ہو گا کہ فضا میں اس وقت کیا کھیل ہو رہا ہے۔"

واثق خاموش رہا۔ وہ طیارے کی بلندی کم کرتا جا رہا تھا جاتی بلندی پر آ کر [illegible] میدانی پرواز کرتے ہوئے ایک مخصوص علاقے میں چکر کاٹنا شروع کیے۔ جلد ہی انہیں ایک رن وے نظر آ گیا۔ اس کے قریب ہی فوجی کیمپ بھی تھا۔ کچھ فوجی دوربین لگائے طیارے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انہیں یقیناً علم ہو چکا تھا کہ اس طیارے میں کیا کھیل ہو رہا ہے۔

"کیا لینڈ کروں؟" واثق نے انور سے پوچھا۔

"نہیں۔" انور نے کہا۔ "رن وے پر ایک بھی طیارہ کھڑا نظر نہیں آیا۔ کم از کم پرائم منسٹر کا طیارہ تو نظر آتا، اگر وہ یہاں اترا ہوتا۔ ہمیں دوسرے ہوائی اڈے تلاش کرنے ہوں گے۔"

واثق نے طیارہ ایک جانب بڑھا دیا۔ جلد ہی انہوں نے دوسرا ہوائی اڈا بھی دیکھ لیا۔ وہاں بھی کچھ فوجی دوربینیں لگائے دکھائی دیے۔ خبر یقیناً آگ کی طرح ہر طرف پھیل چکی تھی۔

"چھوٹے موٹے تین طیارے کھڑے ہیں یہاں۔ پرائم منسٹر کا طیارہ نہیں ہے۔ میں نے اس کے بارے میں بہت کچھ پڑھا ہے۔ اس کی تصویریں بھی دیکھی ہیں۔ بہت شاندار طیارہ ہے وہ۔ تیسرا ہوائی اڈا تلاش کرو۔ تمہارا پرائم منسٹر وہیں اترا ہو گا۔"

جلد ہی تیسرا ہوائی اڈا بھی دیکھ لیا گیا۔ وہاں تین طیارے کھڑے دکھائی دیے۔ ایک طیارہ غیر فوجی اور شاندار تھا۔

"یہی ہے۔" انور بولا۔ "پہچان لیا میں نے اسے۔"

"تو یہاں لینڈ کروں؟"

"نہیں۔ بلندی پر لے جاؤ۔"

"کیا یہاں بھی لینڈ نہیں کرنا؟"

"یہیں لینڈ کرنا ہے لیکن پہلے میں بلندی تک جانا چاہتا ہوں۔ یہ مت پوچھنا کہ کیوں جانا چاہتا ہوں۔"

واثق خاموشی سے طیارے کو بلندی تک لے جانے لگا۔

"بلندی پر جب عمودی پرواز ہو تو طیارے کو آٹو پر کر دینا۔" انور نے مزید کہا۔

اب فیصلہ کن وقت قریب تھا۔ انور کے اعصاب میں کچھ تناؤ آ گیا۔

طیارہ جب بلندی کی طرف جا رہا تھا تو ٹرانسمیٹر پر سگنل آیا۔

انور نے خود ہی بات کی۔ "اب کیا پوچھنا ہے؟" اس

نے نہایت خشک لہجے میں کہا۔ اوور۔“

”تم نے تینوں ہوائی اڈے دیکھ لیے۔ وہ بھی جہاں پرائم منسٹر کا طیارہ کھڑا ہے۔ اب تم لینڈ کیوں نہیں کر رہے ہو؟ اوور۔“

”کوئی وجہ ہے جو ابھی نہیں بتائی جا سکتی۔ میں پندرہ منٹ بعد لینڈ کروں گا، اوور۔“

پھر اس نے مزید کچھ سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔

دو طیارے برابر ان کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔

”اب؟“ واثق نے بلندی تک آنے کے بعد پوچھا۔

”کچھ دور سیدھے چلو، پھر واپس لوٹنا ہے۔“

”اس طرف زیادہ آگے نہیں جایا جا سکتا۔ ہم تمہارے ملک کی سرحد میں داخل ہو جائیں گے۔“

”اوہ! تو دائیں جانب موڑ لو۔“

طیارہ ایک چھوٹا سا چکر لگاتا ہوا دائیں جانب بڑھا۔ شروع سے تقریباً بے حس و حرکت بیٹھی ہوئی زنوبیا نے اس طرح پہلو بدلا جیسے کچھ بے چین ہو گئی ہو۔ اس کے علم میں تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ انور اسے اپنا سارا منصوبہ بتا چکا تھا۔

اس منصوبے پر عمل اس طرح ہوا کہ انور نے اپنے ریوالور کا دستہ پوری طاقت سے واثق کے سر پر مارا۔ یہ تربیت اس نے فوج میں ہی حاصل کی تھی کہ کسی کی کنپٹی پر کس زاویے سے کوئی بھاری چیز ماری جائے تو وہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔

واثق ایک طرف ڈھلک گیا۔ اس کے ڈھلکتے ہی طیارہ تیزی سے نیچے جانے لگا۔ واثق نے انور کی ہدایت کے مطابق طیارے کو ”آٹو“ پر نہیں کیا تھا ورنہ یہ صورت نہ بنتی۔

انور نے تیزی سے واثق کو اپنی طرف گھسیٹتے ہوئے کہا۔ ”ہاتھ کھول لو زنوبی۔“

زنوبیا اس کی بات سننے سے پہلے ہی دانتوں سے ڈوری کی گرہ کھول چکی تھی۔ انور نے ڈیڑھ گرہ اسی لیے لگائی تھی کہ وقت آنے پر زنوبیا خود ہی اپنے ہاتھ آزاد کرا لے۔

انور نے پائلٹ کی سیٹ سنبھالی اور تھروٹل کے ذریعے، نیچے جاتے ہوئے طیارے کو پھر بلندی کی طرف لے جانے لگا۔

واثق کا بے حس و حرکت جسم زنوبیا پر لد سا گیا تھا۔ زنوبیا بمشکل اسے سیٹ کے پچھلے حصے میں دھکیل سکی۔

شاندار۔“ زنوبیا نے انور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے مشاہدہ کر کے ہی سب کچھ سیکھ لیا ہے۔“

”کم از کم اتنا تو سمجھ ہی لیا ہے کہ اس خطرناک صورتِ حال سے نکلا جا سکے۔“ انور نے جواب دیتے ہوئے طیارے کو بائیں جانب گھمایا۔ اسے اب طیارے کو سرحد پار اپنے ملک کی حدود میں لے جانا تھا۔ خود اسے بھی کچھ اندازہ تھا کہ سرحد کس طرف ہو گی لیکن واثق بھی یہ بات اس وقت بتا بیٹھا تھا جب بلندی پر آنے کے بعد انور نے اس سے سیدھا چلنے کے لیے کہا تھا۔

اس طرف جانے سے بچنے کے لیے واثق نے طیارہ دائیں جانب گھمایا تھا اس لیے اب انور کے لیے ضروری تھا کہ اسے بائیں جانب موڑے اس لیے اس نے ایسا ہی کیا بھی تھا۔

جب طیارے نے نیچے جانا شروع کیا تھا، اسی وقت ٹرانسمیٹر پر سگنل آنے لگے تھے۔ وہ لوگ جاننا چاہتے ہوں گے کہ ایسا کیوں ہوا لیکن انور نے سگنلز کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ اب اسے ان لوگوں سے بات کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔

اس کا منصوبہ یہی تھا کہ طیارہ حاصل کرنے کے بعد تیزی سے اپنے ملک کی طرف روانہ ہو جائے گا۔ پرائم منسٹر سے ملاقات کی بات اس نے ان لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے کی تھی۔ وہ طیارے کو اس ملک کے دارالحکومت کی طرف لے جا بھی رہا تھا لیکن اسے توقع تھی کہ ایئرپورٹ پہنچنے کے بعد اسے بتایا جاتا کہ پرائم منسٹر جنوبی سرحد کی طرف جا چکا ہے۔

اگر اسے وہاں پہنچنے کے بعد یہ بات بتائی جاتی تو اسے جنوبی سرحد تک پہنچنے میں ایک گھنٹے سے زیادہ لگ سکتا تھا لیکن اسے یہ بات پہلے ہی بتا دی گئی تھی۔

انور نے خبروں میں یہ بات سن بھی لی تھی اور اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ وہاں سے اپنے ملک کی سرحد تک پہنچنے میں اسے چند منٹ لگتے۔

مگر یہ چند منٹ گزارنا بھی اس کے لیے آسان ثابت نہیں ہوا۔

☆☆☆

اس وقت دونوں ہی ملکوں میں نہ صرف سرکاری سطح پر بلکہ عوامی سطح پر بھی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ کسی ایک ٹی وی چینل کو کسی طرح یہ خبر مل گئی تھی کہ پڑوسی ملک کے جس جاسوس کو پکڑا گیا تھا، اس نے کیپٹن زنوبیا کو یرغمال بنا کر طیارہ

حاصل کر لیا تھا۔

اس چینل کے ذریعے دوسرے چینلز بھی واقف ہو گئے۔ ان میں سے جن کے تعلقات کچھ فوجی افسروں سے تھے، انہوں نے فوجی افسروں سے اور جن کے تعلقات ائرفورس کے افسران سے تھے، انہوں نے ان افسران سے رابطہ قائم رکھا اور انہیں کچھ نہ کچھ اطلاعات ملتی رہیں جو وہ نشر بھی کرتے رہے۔ اسی لیے وہاں کے عوام کی اکثریت کو اس وقت صرف ٹی وی دیکھنے سے دلچسپی رہ گئی تھی۔

اس ملک کے چینلز کی وجہ سے انور کے ملک کے ٹی وی چینلز بھی باخبر ہو گئے اور وہی خبریں نشر کرنے لگے جو زنوبیا کے ملک کے چینلز سے نشر کی جا رہی تھیں اور جلد ہی یہ خبر بی بی سی سے اس وقت نشر ہو گئی تھی جب ان لوگوں کی دانست میں جاسوس، طیارے کو جنوبی سرحد کی طرف لے جا رہا تھا جہاں وہ اس ملک کے پرائم منسٹر سے کوئی بات کرنا چاہ رہا تھا۔

یہ بات ممکن ہی نہیں تھی کہ اتنی ہلچل مچ جانے کے باوجود بریگیڈیئر شمس اس صورتِ حال سے بے خبر ہوتا۔ اس نے فوراً اپنے کمانڈر انچیف سے رابطہ کر کے بتایا کہ وہ اس کے بریگیڈ کا کیپٹن انور گل زادہی ہوگا جو طیارے کو اپنے ہی ملک میں لانا چاہتا ہوگا۔ پرائم منسٹر سے ملنے کی بات صرف دھوکا دینے کے لیے کی گئی ہوگی۔

بریگیڈیئر شمس کو بہت وضاحت سے سب کچھ بتانا پڑا۔

''پرائم منسٹر سے ملاقات۔'' کمانڈر انچیف نے کہا۔ ''آخر اس میں کیا مصلحت ہوگی؟ دراصل وہ کیا سوچ رہا ہوگا؟''

اسی وقت ایک آفیسر نے قریب آ کر بریگیڈیئر شمس کو سرگوشی میں بتایا۔ ''وہاں کا پرائم منسٹر اپنی جنوبی سرحد کے اگلے مورچوں کا معائنہ کرنے گیا ہے اور کیپٹن گل زاد کی اس سے ملاقات وہیں ہو سکتی ہے۔ اب طیارے کا اور اس کا تعاقب کرنے والے طیاروں کا رخ اسی طرف ہے۔''

فون پر کمانڈر انچیف نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ چپ کیوں ہو گئے بریگیڈیئر؟''

''سوری سر!'' بریگیڈیئر نے کہا۔ ''ابھی ابھی ایک اطلاع آئی ہے۔ وہ سننے لگا تھا۔'' اور پھر اس نے کمانڈر انچیف کی کوئی بات سنے بغیر اسے بھی تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔

کمانڈر انچیف نے سب کچھ سن کر کہا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اس طرح ان لوگوں کو دھوکا دے کر اپنے ملک کی سرحد میں آنا چاہتا ہو۔ وہ جگہ سرحد سے کچھ زیادہ دور نہیں ہو گی۔''

''یہی ہو سکتا ہے سر! ہمیں کسی صورت اس کی مدد کرنی چاہیے۔ وہ اس وقت ہمارے ملک کا ہیرو بن چکا ہے۔ صرف اسی کی کامیابی سے ہم دشمن کے ایک شہر پر قابض ہو چکے ہیں۔''

''یقیناً اسے مدد کی ضرورت پڑے گی۔ جب وہ سرحد کا رخ کرے گا تو وہ لوگ سمجھ جائیں گے کہ انہیں دھوکا دیا گیا ہے۔ اس صورتِ حال میں وہ کسی قیمت پر بھی اسے روکنے کی کوشش کریں گے۔ اس وقت طیارے کے پائلٹ کے علاوہ کیپٹن زنوبیا کی زندگی کی اہمیت بھی ان کے لیے کم ہو جائے گی۔ وہ طیارے کو تباہ بھی کر سکتے ہیں۔''

''اسے بچانے کے لیے فضائیہ کی مدد لینا ہو گی۔''

''یہی بات میرے ذہن میں تھی۔''

''میں ابھی ائر مارشل سے بات کرتا ہوں۔''

بریگیڈیئر شمس کی کوئی بات سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

دوسری طرف زنوبیا کے ملک میں بھی عسکری سطح پر ہلچل بہت زیادہ ہو گئی جب انہیں یہ اطلاع ملی کہ طیارے کو جاسوس اپنے ملک کی طرف لے جا رہا ہے۔ فوراً ائرفورس کو ہدایت کی گئی کہ خواہ کچھ بھی ہو، وہ اپنے ملک میں جانے نہ پائے۔ یہ بھی کہا گیا کہ پائلٹ واثق اور کیپٹن زنوبیا کو بچانے کی کوشش ضرور کی جائے لیکن اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو طیارے کو تباہ کر دیا جائے۔ یہ بڑی ذلت کی بات ہو گی کہ ہمارا طیارہ ہمارے دو فوجیوں سمیت دشمن کے قبضے میں چلا جائے۔

یہ ہدایات ان دونوں طیاروں کو دے دی گئیں جو انور کے تعاقب میں لگے ہوئے تھے۔

''وہ ایف سولہ طیارے ہیں۔'' انور نے زنوبیا سے کہا۔ ''ان کی رفتار ہمارے طیارے سے کہیں زیادہ ہے۔ اب وہ یقیناً بڑی تیزی سے ہمارے قریب آئیں گے۔ انہوں نے سمجھ لیا ہوگا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ وہ ہمیں ہر قیمت پر روکنے کی کوشش کریں گے اور کوشش میں ناکامی کی صورت میں وہ ہم پر میزائل بھی فائر کر سکتے ہیں۔ موجودہ صورتِ حال میں ان کے لیے پائلٹ کی یا تمہاری زندگی کی پروا نہیں رہے گی۔''

''اسے ابھی ہوش نہیں آیا۔'' زنوبیا نے پائلٹ کی طرف اشارہ کیا۔

''اسے ابھی اور دس پندرہ منٹ تک ہوش نہیں آسکتا جبکہ میرے ملک کی سرحد میرے اندازے کے مطابق پانچ سات منٹ کے فاصلے پر ہے۔ اتنا وقت گزرنے سے پہلے ایف سولہ ہمارے سروں پر پہنچ چکے ہوں گے۔'' اس نے اسکرین پر دیکھا کہ ایف سولہ بڑی تیز رفتاری سے قریب آتے چلے جارہے تھے۔ ''یہ اس مہم کا آخری اور فیصلہ کن معرکہ ہوگا جو ہمیں سر کرنا ہے۔''

''ایف سولہ..... اور وہ بھی دو۔'' زنوبیا نے کہا۔ ''کیا ان کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے؟''

''مجھ سے جو کچھ ممکن ہے وہ تو میں کروں گا۔ یہ تو میں نے سمجھ لیا ہے کہ میزائل کس طرح فائر کیے جاتے ہیں اور مشین گن کس طرح چلائی جاتی ہے۔'' انور کے چہرے پر کھنچاؤ کا تاثر تھا۔ صورت حال ہی ایسی تھی کہ اعصاب میں تناؤ آنا قدرتی امر تھا۔

خود زنوبیا بھی اعصابی تناؤ کا شکار ہو چکی تھی۔ یہ زندگی اور موت کی جنگ کا فیصلہ کن معرکہ ہوتا۔

سرحد جب بہت قریب آچکی تھی، ایف سولہ طیارے سر پر آگئے۔ ان میں سے ایک آگے نکل کر ان کے طیارے کی سیدھ میں آیا اور اپنی رفتار کم کرنے لگا۔ مقصد یہی ہوگا کہ واتق طیارے کی رفتار کم کرے اور اترنے پر مجبور ہو۔ ان لوگوں کو یہ علم تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ اب پائلٹ کی سیٹ انور نے سنبھال رکھی تھی۔

انور نے طیارے کو غوطہ دے کر بچنے کی کوشش نہیں کی، پرواز سیدھی رکھی۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟'' زنوبیا چیخ پڑی۔ ''تصادم ہو جائے گا۔''

لیکن انور یہی چاہتا تھا کہ دونوں طیاروں کی قربت اتنی بڑھ جائے کہ اس کا نشانہ خطا نہ ہو چنانچہ اس نے پے در پے دو میزائل فائر کیے۔ ان میں سے ایک میزائل ایف سولہ کے فیول ٹینک میں یا نہ جانے کس جگہ لگا تھا کہ دھماکے کے ساتھ اس کے ٹکڑے اڑ گئے۔

انور نے بڑی تیزی سے اپنے طیارے کا تھروٹل دبایا۔ طیارہ تیزی سے مزید بلندی کی طرف جانے لگا۔ اگر انور ایسا نہ کرتا تو تباہ ہونے والے طیارے کے جلتے ہوئے ٹکڑے اس کے طیارے سے بھی ٹکرا سکتے تھے۔

''بریوو۔'' زنوبیا کی آواز خوشی سے کانپ گئی۔ ''بریوو انور.....! مگر اس نے زد پر آنے کی حماقت کیوں کی؟''

''سمجھا تو یہ جارہا ہوگا کہ واتق اپنے ملک کے طیارے کو میزائل کا نشانہ نہیں بنائے گا۔'' انور نے جواب دیا۔ ''اب دوسرا طیارہ ہمیں ہٹ ضرور کرنا چاہے گا۔ جلدی سے پیراشوٹ باندھ لو۔ شاید ہمیں طیارے سے چھلانگ لگانی ہی پڑے۔''

طیارہ تیز پرواز کر کے انتہائی بلندی پر آگیا تھا۔ جہاں سے اب اس کی ہموار پرواز شروع ہوئی۔

دوسرے ایف سولہ نے اپنے ساتھی طیارے کی تباہی دیکھ کر اس کے اڑتے ہوئے شعلہ نما ٹکڑوں سے بچنے کے لیے غوطہ لگایا تھا۔ رفتار بھی بہت تیز رکھی اور ان ٹکڑوں سے بچنے میں کامیاب رہا لیکن اس طرح وہ کافی آگے نکل گیا تھا۔ دوبارہ انور کے طیارے کے قریب پہنچنے کے لیے اس نے چکر لگاتے ہوئے واپس عمودی پرواز کی اور انور کے طیارے کے پیچھے آگیا۔

''اب ہم اس کی زد پر ہیں، وہ فائر ضرور کرے گا۔'' انور نے کہتے ہوئے غوطہ لگایا۔

جو میزائل فائر کیا گیا تھا، وہ سیدھا نکل گیا۔

''تم اس وقت ایک ماہر پائلٹ معلوم ہو رہے ہو۔''

ایف سولہ اپنی تیز رفتاری کے باعث آگے نکل گیا تھا۔

''ابھی وہ پھر پلٹے گا۔'' انور نے کہا۔

اس میں ایف سولہ کو جو وقت لگتا، اس سے انور نے یہ فائدہ اٹھایا کہ طیارے کو ''آٹو'' پر لا کر پیراشوٹ باندھنے لگا۔ ''ناتجربہ کاری کی وجہ سے غلطی ہو گئی تھی۔'' اس نے کہا۔ ''واتق کو بے ہوش کرنے کے بعد ہی ہمیں پیراشوٹ باندھ لینے چاہیے تھے۔''

''خیر! بروقت کام ہو گیا۔ تم اس وقت ایک ماہر پائلٹ نظر آرہے ہو انور۔'' اس نے دوبارہ کہا۔

''موت سر پر کھڑی نظر آجائے تو انسان وہ سب کچھ بھی کر گزرتا ہے جو وہ نہیں جانتا۔'' انور نے جواب دیا۔ ''دوسرا طیارہ اب پھر ہماری طرف آرہا ہے۔''

فضا میں ہونے والے اس معرکے کی خبر اس وقت تک دنیا کے تمام ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں پھیل چکی تھی۔ تمام ٹی وی چینلز سے خبر نشر ہو چکی تھی۔

اس وقت ایک سپر پاور کے دارالحکومت میں دونوں ملکوں کے وزرائے اعظم میں مذاکرات بھی جاری تھے جو اس واقعے کے بعد زنوبیا کے ملک کے وزیراعظم نے ختم کر دیے۔ وہ نہایت غصے میں مذاکرات کی میز سے اٹھ گیا تھا۔

انور ان حالات سے بے خبر تھا لیکن باخبر بھی ہوتا تو اسے اس کے نتائج کی پروا نہ ہوتی، یہ سب کچھ سوچنا اس کی

حکومت کے اکابرین کا کام تھا۔

ادھر اُدھر کا کوئی خیال ذہن میں لائے بغیر انور اپنی ساری توجہ طیارے پر مرکوز کیے ہوئے تھا۔

''اوہ'' انور کے منہ سے نکلا۔ ''سامنے سے کچھ طیارے آرہے ہیں۔ ہماری ہی ائرفورس کے ہوں گے۔ انہیں بھی کسی طرح علم ہوچکا ہوگا حالات کا۔ وہ یقیناً ہماری مدد کے لیے آرہے ہیں۔''

اس وقت ایف سولہ برابر میں آچکا تھا۔ اس مرتبہ اس نے آگے نکلنے کی کوشش کرنے کے بجائے پہلو ہی سے میزائل فائر کیا۔ انور کو اس کا یقین تھا اس نے فوراً طیارے کو غوطہ دیا۔ اس کے باوجود میزائل نے اس کے طیارے کی ٹیل (دم) کا ''روڈر'' اور ''ایلی ویٹر'' اڑا دیا تھا۔ طیارہ بہت تیزی سے ایک جانب جھکتا چلا گیا کیونکہ اس کا توازن بگڑ چکا تھا۔

''اب میں طیارہ نہیں سنبھال سکتا زنوبیا۔'' انور تیزی سے بولا۔ ''ہمیں کود جانا چاہیے۔''

اس وقت وہ اتنی بلندی پر تھے کہ طیارے کے باہر چھلانگ لگا دینا ان کے لیے خطرناک ثابت نہیں ہوسکتا تھا۔ اگر بلندی کم ہو تو پیراشوٹ کھلنے سے پہلے ہی کودنے والا زمین سے جاٹکراتا ہے۔

ان دونوں نے طیارے سے چھلانگیں لگا دیں۔ وہ دونوں تیزی سے نیچے جارہے تھے لیکن جب پیراشوٹ کھلے تو ان کی تیز رفتاری ختم ہوگئی۔ وہ فضا میں ہلکورے لیتے ہوئے آہستہ آہستہ نیچے ہونے لگے۔

انور نے دیکھا کہ ایف سولہ پھر ان کی طرف آرہا تھا۔ اب ان پر مشین گن کا فائر کھولتا لیکن اس وقت تک انور کے ملک کے طیاروں کا اسکواڈرن وہاں پہنچ چکا تھا۔ انہیں دیکھ کر ایف سولہ کے پائلٹ کو بھاگ نکلنے ہی میں اپنی عافیت نظر آئی لیکن وہ فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ اسکواڈرن کے دو طیارے اس کی طرف لپکے تھے اور اسے تباہ کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

آخر زنوبیا اور انور کے پیروں نے زمین چھولی۔ انہوں نے فوراً پیراشوٹس سے نجات حاصل کی اور ایک دوسرے کی طرف دوڑے۔ ہوا نے انہیں کافی دور کردیا تھا۔

''تم جیت گئے انور۔'' زنوبیا خوشی سے چلائی۔

اس وقت فضا میں کئی پیراشوٹس کھلتے نظر آئے۔ ائرفورس کے وہ لوگ اسکواڈرن کے طیاروں سے کودے تھے۔

زنوبیا اور انور ایک دوسرے کے قریب پہنچ گئے۔ وہ اتنے جذباتی ہوئے تھے کہ ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ دونوں جسمانی طور پر اتنے قریب ہوئے جیسے ایک جان دو قالب ہوگئے ہوں۔

''تمہیں اپنے ملک کا کوئی بہت بڑا اعزاز ملنا چاہیے۔'' زنوبیا نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔

''تم مجھے مل گئیں۔ میرے لیے اس سے بڑا اعزاز کوئی نہیں ہوسکتا۔''

وہ دونوں ان پیراشوٹس کی طرف دیکھنے لگے جو زمین پر آچکے تھے۔ جلد ہی ائرفورس کے پانچ جوان ان کے قریب تھے۔

''کیپٹن گل زادہ!'' ایک بولا۔

''یس۔'' انور نے کہا۔

''اور یہ کیپٹن زنوبیا'' ہاتھ کے اشارے سے کہا گیا۔ ''تعلق دشمن کی فوج سے، اور آپ کی یرغمال بھی لیکن آپ دونوں کا انداز ایسا ہے جیسے آپ ایک دوسرے کے دوست ہوں۔''

''یہ زنوبیا ہی کی تجویز تھی کہ میں اسے یرغمال بنا لوں۔ یعنی دشمن پر یہ ظاہر کیا جائے کہ اب ان کی کیپٹن میری یرغمال بن چکی ہے۔ اگر زنوبیا نے میرا ساتھ نہ دیا ہوتا تو میں اس وقت بھی دشمن کی قید میں ہوتا یا مارا جاچکا ہوتا۔''

''آپ کو کامیابی مبارک ہو۔''

''آپ لوگوں کو کیسے معلوم ہوا کہ میں.....''

اس کی بات کاٹ دی گئی۔ ''جب سے آپ ان کے طیارے میں سوار ہوئے ہیں، بین الاقوامی سطح پر ہلچل مچی ہوئی ہے۔ ہر جگہ سے خبریں نشر کی جارہی ہیں۔ دشمن ملک کے علاوہ ہمارے ٹی وی چینلز بھی لائیو نشریات کررہے ہیں۔ مختلف ذرائع سے انہیں ہر بات کی خبر مل رہی ہے تو ہم کیسے بے خبر رہ جاتے۔''

''اب یہاں سے ہم کس طرح روانہ ہوں گے؟'' انور نے پوچھا۔

''آپ کے لیے ایک ہیلی کاپٹر آرہا ہے۔''

بیس منٹ میں ہیلی کاپٹر آگیا۔ ان دونوں کو اس میں سوار کیا گیا۔

ہیلی کاپٹر پرواز کررہا تھا جب بریگیڈیئر شمس نے ٹرانسمیٹر پر انور سے بات کی اور اسے زبردست الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔ اس وقت زنوبیا کی آنکھیں خوشی سے چھلک رہی تھیں۔

معزز قارئین آپ سے التماس ہے کہ ہم www.urdusoftbooks.com پر آپ حضرات کے لیے مسلسل اچھی کُتب فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جس کے لیے وقت اور رقم دونوں صرف ہوتے ہیں جس کی غرض سے ہماری اِس ویب سائٹ کُچھ سپانسر اشتہارات لگائے گئے ہیں جب ویب سائٹ وزٹرز اُن اشتہارات میں سے کسی اشتہار پر کلک کرتے ہیں تو ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن حاصل ہوتی ہے، یہ آمدن ویب سائٹ کے اخراجات کو برداشت کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے اس لیے آپ حضرات سے گزارش ہے کے اپنے Google Chrome یا Mozilla Firefox کی Adblocker Extension کو Pause کر دیں یا صرف ہماری ویب سائٹ کے لیے Pause کر دیں۔ نیچے نظر آنے والی تصویر میں دکھایا گیا ہے کے Adblocker کے Pause ہونے یا انسٹال نہ ہونے کی صورت میں اشتہارات Green Box والی جگہ پر ظاہر ہوں گے۔

انسولین کا زہر

سلیم انور

حصولِ زر کی خواہش شدت اختیار کر لے تو پھر کسی کی جان لینا مشکل کام نہیں رہتا... لاٹری ٹکٹ کی کشش اور پھر انعام نکل آنے کی خوشخبری میں چھپی لالچ کہانی...

وقت سے پہلے بولنے کی

عادت سے مجبوروں کا المیہ

''لیلما ڈیوس!'' سراغ رساں برگس بڑبڑایا۔ ''میں نے یہ نام پہلے کہاں سنا ہے؟''

''وہ لاٹری ٹکٹ کے اس مقدمے میں ملوث رہی ہے۔'' سارجنٹ ڈین اوریل نے کہا۔ ''وہ مقدمہ یاد نہیں جس میں چار خواتین نے چندہ کر کے مشترکہ طور پر ایک لاٹری ٹکٹ خریدا تھا؟ جب ان کا نمبر نکل آیا اور پچاس لاکھ ڈالر انعام ملا گیا تو لیلما ڈیوس نے دعویٰ کیا کہ وہ لاٹری ٹکٹ اس نے اپنے تئیں خریدا تھا اور انعام کی پوری رقم اس کی ہے۔''

''اوہ، ہاں۔'' سراغ رساں برگس کو یاد آ گیا۔ ''اور باقی تینوں خواتین نے اس کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا تھا۔''

''چونکہ ان خواتین کے پاس اس بارے میں کوئی تحریر موجود نہیں ہے اس لیے لیلما ڈیوس کے دعوے کے خلاف وہ زبانی طور پر شراکت کا مطالبہ کر رہی ہیں۔'' سارجنٹ ڈین اوریل نے کہا۔ ''اور اب اچانک انسولین کے زہر سے لیلما ڈیوس کی موت واقع ہو چکی ہے۔ کیا یہ ایک اتفاق ہو سکتا ہے؟ میرے خیال سے تو نہیں۔''

''اور میں اس کی ہزار ہا وجوہات سوچ سکتا ہوں کہ ان میں سے کوئی ایک اسے مردہ دیکھنا چاہتی ہو گی۔'' سراغ رساں برگس نے کہا۔ ''ان تینوں خواتین کو کل یہاں حاضر کرو۔ میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

اگلے روز تینوں خواتین سراغ رساں برگس کے دفتر میں موجود تھیں۔

''تو تم تینوں وہ خواتین ہو جن کا دعویٰ ہے کہ لاٹری کے انعام میں لیلما ڈیوس نے تم لوگوں سے چیٹنگ کی ہے؟'' سراغ رساں برگس نے پوچھا۔

''دعویٰ؟'' لینا پوٹر نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ ''اس نے یقینی طور پر ہمارے ساتھ چیٹنگ کی ہے۔''

''ہاں۔'' جوائس رچرڈ نے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ اس کا آئیڈیا تھا کہ ہم سب چندہ کر کے لاٹری کا ٹکٹ خریدیں۔ اور اسی لیے ٹکٹ اس نے خریدا تھا اور اپنے پاس رکھ لیا تھا۔''

''لیکن نمبروں کا چناؤ ہم نے کیا تھا۔'' ہیریٹ فوربس نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے اپنے اپنے پیدائش کے سال اور مہینوں کے چناؤ کا فیصلہ کیا تھا۔ چونکہ ہم میں سے کئی ایک کی پیدائش کا سال ایک ہی تھا تو ہمارا حتمی چناؤ صرف چھ نمبروں پر ہو گیا۔ بالکل لاٹری کے

لگتے ہے مطابق۔

"اور جب ان نمبروں پر انعام نکل آیا......" سراغ رساں برگس نے جملہ مکمل نہیں کیا تھا کہ ہیریٹ فوربس نے اس کی بات کاٹ دی۔

"لیما نے دعویٰ کر دیا کہ ان نمبروں کا چناؤ اس نے خود کیا تھا اور لاٹری ٹکٹ کی قیمت بھی اسی نے ادا کی تھی۔" ہیریٹ فوربس نے کہا۔

"کیا تم خواتین نے کسی قسم کا تحریری معاہدہ نہیں کیا تھا؟" سراغ رساں نے پوچھا۔

"نہیں۔" لینا پورٹر نے بتایا۔ "ہم برسوں سے ایک دوسرے سے واقف تھے۔ ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ لیما ہمارے ساتھ بے ایمانی کر سکتی ہے۔"

"لیکن اب جبکہ اس کو زہر دے دیا گیا ہے تو......" سراغ رساں برگس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"تو پھر ہمیں حقیقت میں کچھ نہیں ملے گا۔" جوائس رچرڈ نے کہا۔ "یہ ٹکٹ اس کے شوہر کی ملکیت بن جائے گا تا آنکہ ہم یہ ثابت کر دیں کہ ٹکٹ ہم سب نے مشترکہ طور پر خریدا تھا۔"

"جو کہ ہم ثابت نہیں کر سکتے۔" لینا پورٹر نے کہا۔

"ہاں۔" ہیریٹ فوربس نے کہا۔ "سو اگر تم کسی ایسے کی تلاش میں ہو کہ جس کے پاس لیما کو قتل کرنے کا کوئی جواز ہو تو پھر اس کے شوہر کو چیک کرو۔ مجھے کوئی شبہ نہیں کہ اس کی کوئی خفیہ گرل فرینڈ ہو۔ اب وہ انعام کی تمام رقم حاصل کرنے کے ساتھ اپنی اس گرل فرینڈ کو بھی حاصل کر سکتا ہے۔"

"اور وہ ذیابیطس کا مریض ہے۔" جوائس رچرڈ نے بتایا۔ "وہ سوئی کے پین جیسی چیز استعمال کرتا ہے...... اور اس کی انسولین تک رسائی بھی ہے۔"

"ہاں۔" لینا پورٹر نے کہا۔ "تمہیں اس سے پوچھ گچھ کرنی چاہیے۔ ہم سے نہیں۔"

"میں نے اس سے ملاقات کے لیے آج شام کا وقت طے کیا ہوا ہے۔" سراغ رساں برگس نے بتایا۔ "لیکن پچاس لاکھ ڈالرز ہاتھ سے نکل جانا کسی کو قتل کرنے کے لیے اتنا ہی پختہ جواز ہے جتنا کہ پچاس لاکھ ڈالرز کا ہاتھ میں آنا۔"

☆☆☆

اس شام چک ڈیوس سراغ رساں برگس کے دفتر میں موجود تھا۔

"مسٹر ڈیوس، تمہاری بیوی کی موت انسولین کے زہر سے واقع ہوئی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ تم ذیابیطس کے مریض ہو۔"

"ہاں، میرے اس مرض کی تشخیص کئی سال پہلے ہوئی تھی۔ کیا تمہارے خیال میں، میں نے اپنی بیوی کو قتل کرنے کے لیے اپنی انسولین استعمال کی ہے؟" چک ڈیوس نے کہا۔

"انسولین اس کے لیے مہلک ثابت ہو سکتی ہے جسے اس کی ضرورت نہ ہو۔" سراغ رساں برگس نے بتایا۔

"لیکن اگر مجھے لیما کو زہر دینا ہوتا تو کیا میں یہ حماقت کرتا کہ اس کے لیے اپنی ہی انسولین استعمال میں لاتا؟"

"انسولین تک اور کس کس کی رسائی تھی؟"

"کیا تم مذاق کر رہے ہو؟ وہ عورتیں جو دعویٰ کر رہی ہیں کہ لاٹری ٹکٹ کا ایک حصہ ان کی ملکیت تھا، وہ اتنی مرتبہ میرے گھر میں آچکی ہیں کہ بخوبی جانتی ہیں کہ میرے باتھ روم کی دواؤں کی الماری میں ایک اضافی انسولین پین ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ ان عورتوں میں سے کسی ایک نے وہ انسولین لے لی ہوگی۔"

"لیکن وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ اگر تمہاری بیوی مر گئی تو ان میں سے کسی کے ہاتھ کچھ بھی رقم نہیں آئے گی۔"

"کون کہتا ہے؟" چک ڈیوس نے کہا۔ "چونکہ لیما مر چکی ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا مقدمہ ختم ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لیما اپنی طرف کی کہانی بیان کرنے کے لیے موجود نہیں رہی۔ اگر عدالت نے مناسب سمجھا تو انہیں اب بھی اپنا حصہ مل سکتا ہے۔"

سراغ رساں برگس نے چک ڈیوس کو رخصت کر دیا اور سارجنٹ ڈین اور ویل کو طلب کیا۔

"ہمارے سامنے ایک دلچسپ پرابلم آگئی ہے۔" سراغ رساں نے کہا۔ "اگر ڈیوس نے اپنی بیوی کو قتل کیا ہے تو قانون کی رو سے اس کی موت کے عوض اسے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ لہٰذا اس لاٹری ٹکٹ کی ملکیت کو ثابت کرنا ضروری ہوگا۔"

"اور اگر ان تینوں عورتوں میں سے کسی ایک نے جو لاٹری ٹکٹ کی جزوی ملکیت کی دعویدار ہیں، لیما کو قتل کیا ہے تو وہ اپنا حصہ گنوا بیٹھے گی، اگر عدالت یہ فیصلہ کرتی ہے کہ وہ تینوں خواتین انعامی رقم کی حق دار ہیں۔"

"میرے خیال سے میری سمجھ میں آگیا ہے کہ مسز لیما ڈیوس کو کس نے قتل کیا ہے۔" سراغ رساں برگس نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"وہ کون ہے؟" سارجنٹ ڈین اور ویل نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے ان تینوں خواتین کو صرف یہ بتایا تھا کہ لیما کی موت زہر دینے سے واقع ہوئی ہے۔ لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ اسے کون سا زہر دیا گیا ہے۔" سراغ رساں برگس نے کہا۔ "لیکن جوائس رچرڈ نے انسولین تک رسائی کی بات کی تھی۔ صرف وہی جانتی تھی کہ لیما کی موت کا سبب انسولین تھی۔ سو وہی لیما کی قاتل ہے۔ جاؤ، اسے لیما ڈیوس کے قتل کے الزام میں حراست میں لے لو۔"

حادثہ

تنویر ریاض

سرکش رویے اور عیش کوش فطرت بڑے طوفان کا موجب بن جاتی ہے... کروڑوں لوگوں کے دلوں پر راج کرنے والے عموماً اپنی ذاتی زندگی میں تشنہ اور تہی داماں ہی رہتے ہیں... ہر تتلی کے حسن سے سیراب ہونے والے فنکار کی جادو بھری من مانیاں... اس کی دردناک موت نے شک و شبے کی نئی راہ کھول دی تھی۔

وصال کی ساعتوں میں رونما ہونے والے حادثے کی حقیقت

میری تعطیلات شروع ہو رہی تھیں اور میں نے ایک ہفتے کے لیے مارٹل بیچ جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ میں دفتر سے نکلنے ہی والا تھا کہ عین اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ پہلے میں نے سوچا کہ اسے نظرانداز کر دوں۔ ماضی کے واقعات کے پیشِ نظر مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا لیکن میری حد سے بڑھی ہوئی فرض شناسی نے مجھے جواب دینے پر مجبور کر دیا۔

''ہوائے، میں ٹام میکبری بول رہا ہوں۔''

[illegible] نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ ایم اے [illegible] کا مخفف ہے جبکہ میرا پورا نام ایم بوائے بوٹ رائٹ ہے اور میں مورگن پولیس ڈپارٹمنٹ میں فرسٹ کلاس سراغ رساں ہوں۔ ٹام میکھری میرا باس تھا۔

''میں تعطیلات گزارنے جا رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میری ڈیوٹی کا وقت ختم ہو چکا ہے۔''

''معاف کرنا۔ مجھے تمہاری تعطیلات ملتوی کرنا ہوں گی۔ یہاں ایک قتل ہو گیا ہے۔''

میں نے اپنا بیگ اور مچھلی پکڑنے کا سامان دیکھا جو دروازے کے ساتھ ہی رکھا ہوا تھا اور دل پکڑ کر بیٹھ گیا۔ میں نے گزشتہ ایک سال سے کوئی چھٹی نہیں کی تھی اور اب یہ موقع بھی ہاتھ سے نکل رہا تھا۔

''میں نے ٹیچ پر ریزرویشن کروا رکھی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور اب اسے کینسل کروانے کا وقت بھی نہیں رہا۔''

''ہم اس سے بعد میں نمٹ لیں گے لیکن یہ معاملہ بہت اہم ہے۔ کسی نے ریٹی برائنڈ کو قتل کر دیا ہے۔''

یہ نام سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ ایک معروف شخصیت تھی اور ہر کوئی اسے انجیل سے متعلق الفا اومیگا کرسچین ریزورٹ اور تھیم پارک کے حوالے سے جانتا تھا۔ اس کا اپنا ٹیلی وژن نیٹ ورک تھا جس پر چوبیس گھنٹے دعائیہ اجتماعات اور مروجہ اشیا دکھائی جاتی تھیں۔ آپ کسی وقت بھی الفا اومیگا چینل کھولیں۔ آپ کو برائنڈ اور اس کی بیوی اسٹیلا باری باری سادہ لوح گروہوں اور خانہ بدوشوں کو دائمی نجات کے نسخے اور چین کی بنی ہوئی پرانی اشیا فروخت کرتے نظر آئیں گے۔ ریٹی اور اسٹیلا نے ایک ناکام چینل حاصل کر لیا تھا اور سادہ لوح لوگوں کو اس کی جانب راغب کر کے منافع بخش کاروبار میں بدل دیا۔ اس لامحدود منافع سے انہوں نے ایک ریزورٹ اور تفریحی پارک بنایا اور اب کسی نے ریٹی برائنڈ کو قتل کر دیا تھا۔

''کہاں؟'' میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

''ہوٹل میں۔ جہاں برائنڈ کا سوئٹ ہے۔''

''مجھے ایک گھنٹا دو۔'' میں نے کہا۔ ''لباس تبدیل کرنے کے علاوہ اپنی ریزرویشن بھی تبدیل کروانی ہے۔''

جب میں برائنڈ کے پینٹ ہاؤس پہنچا تو وہاں اسکوٹی ہیگس نامی ایک جونیئر افسر پہلے سے موجود تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں کئی شاندار جگہیں دیکھی ہیں لیکن برائنڈ کا سوئٹ

[illegible] کی ایک [illegible] فرش پر بچھا ہوا قالین انتہائی آرام دہ اور دبیز تھا۔ چوبی فرش بنانے میں قیمتی لکڑی استعمال کی گئی تھی اور فرنیچر پر عمدہ اطالوی چمڑا چڑھا ہوا تھا۔ ہر دیوار پر نامور مصوروں کی بنائی ہوئی اصلی تصاویر آویزاں تھیں۔ اسکوٹی مجھے ایک دفتر میں لے گیا جو میرے اپارٹمنٹ کے برابر تھا۔

''لاش یہاں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''وہ کیل زول میں پیوست ہو گئی ہے۔''

''یہ کیا ہے؟''

''خود چل کر دیکھ لو۔'' اسکوٹی نے کہا۔ میں اس کے پیچھے چلتا ہوا دفتر میں داخل ہوا۔ جہاں میں نے ریٹی کو شیشے کے بنے ہوئے ایک بہت بڑے مجسمے پر جھکا ہوا دیکھا۔ وہ مجسمہ آکٹوپس سے مشابہ تھا جس کی شاخیں مختلف سمتوں میں پھیلی ہوئی تھیں اور ریٹی کی لاش ان میں پیوست ہو گئی تھی۔ خون اس کے سوئٹ کے اگلے اور پچھلے حصے سے بہتا ہوا فرش پر جمع ہو گیا تھا۔

''دیکھو۔'' اسکوٹی نے کہا۔ ''یہ ایک مجسمہ ہے۔ برنارڈ کال زول ایک آرٹسٹ ہے اور وہ کرسٹل کے مجسمے بناتا ہے۔ برائنڈ کے گھر میں اس کے بنے ہوئے کئی مجسمے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی نے برائنڈ کو پیچھے سے دھکا دیا ہے تاکہ اس کا سینہ اس مجسمے کے نکیلے حصوں پر جا کر لگے۔ اس طرح چند سیکنڈ میں اس کا سارا خون بہہ گیا۔''

''تم نے کیسے اندازہ لگایا کہ اسے دھکا دیا گیا ہے؟''

''اس نے خودکشی نہیں کی کیونکہ کوئی خط نہیں ملا اور نہ ہی کوئی ایسی علامت نظر آئی جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ اس نے خودکشی کی ہے۔ اس لیے یہی کہا جا سکتا ہے کہ اسے کسی نے دھکا دیا ہے۔''

''ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کہ خودکشی کرنے والا کوئی خط چھوڑ کر جائے۔ دو سال پہلے میرے پاس ایسا ہی ایک کیس آیا تھا جس میں ایک شخص نے اپنے سر میں گولی ماری تھی اور کوئی خط بھی نہیں چھوڑا۔ اس کے اہل خانہ کا کہنا تھا کہ پستول صاف کرتے ہوئے یہ حادثہ پیش آیا لیکن چیمبر میں گولی ہو تو پستول صاف نہیں کیا جا سکتا۔ بظاہر یہ خودکشی کا ہی کیس تھا لیکن اہل خانہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔''

''گویا تم سمجھتے ہو کہ برائنڈ نے خودکشی کی ہے؟''

میں نے ایک بار پھر جائے وقوعہ کا جائزہ لینے کے بعد کہا۔ ''نہیں، ہمیں یہاں سے ہٹ جانا چاہیے تاکہ کرائم سین انوسٹی گیشن والے اپنا کام کر سکیں۔ کیا مسز برائنڈ موجود

''وہ اپنے بیڈ روم میں ہے۔ اس سے پہلے کہ تم اس سے انٹرویو کرنے جاؤ۔ میں یہ بتا دوں کہ اس کے پاس ایک ملاقاتی آیا ہوا ہے۔''

''اس کا کوئی دوست؟''

''نہیں، لگتا ہے کہ وہ بیمہ کمپنی کا آدمی ہے۔''

''وہ کون ہو سکتا ہے؟'' میں نے کہا اور پھر مجھے اسکوٹی کی بات کا مطلب سمجھ میں آ گیا۔ ''تمہارا اشارہ کرینپٹر کی جانب ہے؟''

اسکوٹی کے چہرے کے تاثرات نے مجھے وہ سب بتا دیا جو میں جاننا چاہ رہا تھا۔

''کیا مصیبت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''پہلے میری چھٹیاں منسوخ ہوئیں اور اب یہ کرینپٹر بیچ میں آ گیا۔ اس سے کہو کہ دفع ہو جائے۔ میں اس کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔''

''یہ اتنا آسان نہیں ہے بوائے۔ لگتا ہے کہ اسے یہاں آنے کی اجازت دی گئی ہے۔''

''کس نے دی ہے اجازت؟''

اسکوٹی نے رینی برائنڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس نے۔''

☆☆☆

میں نے بووی کرینپٹر کو اسٹیلا برائنڈ کے برابر میں کرسی پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ ویسی ہی انوکھی لگ رہی تھی جیسا کہ ٹیلی وژن پر نظر آتی تھی۔ اس کا قد پانچ فٹ اور وزن ایک سو پونڈ تھا۔ اس نے مصنوعی پلکیں لگا رکھی تھیں جن کی لمبائی ایک انچ سے کم نہ ہو گی اور چہرے پر بے تحاشا میک اپ کیا ہوا تھا۔ کرینپٹر نے اس کا ایک ہاتھ اپنے دونوں پنجوں سے پکڑا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بولا۔

''یوٹ رائٹ، تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اسٹیلا یہ وہی پولیس سراغ رساں ہے جس کے بارے میں تمہیں بتایا تھا۔ صرف یہی شخص معلوم کر سکتا ہے کہ تمہارے رینی کے ساتھ کیا ہوا؟''

''ٹھیک ہے کرینپٹر۔'' میں نے کہا۔ ''اب تم جا سکتے ہو۔ یہ پولیس کیس ہے اور مجھے کسی کی ضرورت نہیں۔''

''میں سمجھتا ہوں۔'' کرینپٹر نے کہا۔

''میں نہیں سمجھتی۔'' اسٹیلا نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم بووی کی مدد لینا کیوں نہیں چاہتے جبکہ رینی نے خود اس سے درخواست کی تھی۔''

''تمہیں اس کی وضاحت کرنا ہو گی۔'' میں نے کہا۔

کہہ سکتا ہے؟''

بووی نے کھڑے ہو کر اپنی جیکٹ کی جیب سے ایک لفافہ نکالا اور مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ''دو ماہ قبل یہ مجھے موصول ہوا تھا۔ تم لفافے پر ڈاک کی مہر دیکھ سکتے ہو۔ اس خط میں رینی نے لکھا ہے کہ اگر اسے کوئی نقصان پہنچے تو میں پولیس کی مدد کے لیے موجود رہوں۔''

''تمہارا برائنڈ سے کیا رشتہ ہے؟''

''ہم صرف دوست تھے۔ میں رینی اور اسٹیلا کو کئی سالوں سے جانتا ہوں بلکہ میں نے اس کے چند پروگراموں میں معاونت بھی کی ہے جو خیراتی کاموں کے لیے چندہ جمع کرنے کی غرض سے کیے گئے تھے۔''

''رینی کو ایک جعلی روحانی ماہر سے کیا فائدہ ہو سکتا تھا؟''

''تمہاری اتنی ہمت کیسے ہوئی؟'' اسٹیلا نے کہا۔ ''بووی کو غیب دانی کا علم عطیہ میں ملا ہے جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

''یہ ایک خوانچہ فروش اور نیم حکیم ہے۔ یہ انسانی نفسیات کا مشاہدہ کر کے اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔''

''تم زیادتی کر رہے ہو۔'' کرینپٹر نے کہا۔ ''میں نے گزشتہ سالوں میں تمہاری کئی مرتبہ مدد کی ہے۔''

''تمہاری ضرورت وہاں ہوتی ہے جب مجرم تعاون پر آمادہ نہ ہو۔''

میں اس سے بحث تو کر رہا تھا لیکن مجھے اعتراف ہے کہ کئی ایسے کیس بھی تھے جنہیں میں کرینپٹر کی مدد کے بغیر حل نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لیے میں نے چاپلوسی سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔

''کیونکہ مرنے والے نے درخواست کی تھی کہ تم اس کیس میں مدد کرو۔ اس لیے میں تمہیں گواہ کے طور پر شامل کر لیتا ہوں۔ برائے کرم تم دوسرے کمرے میں انتظار کرو تاکہ میں مسز برائنڈ سے کچھ باتیں کر لوں۔''

''کیوں نہیں۔'' کرینپٹر نے کہا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں نے اسٹیلا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''کیا تم بتا سکتی ہو کہ آخری بار اپنے شوہر کو کب دیکھا تھا؟''

''گزشتہ شب تقریباً ایک بجے۔ جب میں سونے کے لیے جا رہی تھی۔ ہم گزشتہ کئی سالوں سے ایک بستر پر

”کیوں؟“

”کیا یہ ذاتی نوعیت کا سوال نہیں ہے؟“

”قتل کی تحقیقات میں کچھ ذاتی نہیں ہوتا۔ تمہیں یقین کرلینا چاہیے کہ تمہارے شوہر کا قتل ہوا ہے۔“

”بالکل مجھے یقین ہے ورنہ ایک ہومی سائڈ سراغ رساں یہاں کیوں آتا؟“

”تمام باتوں کا تعلق اسی معاملے سے ہے۔ تم اپنے شوہر کے ساتھ کیوں نہیں سوتی تھیں؟“

”وہ خراٹے لیتا تھا۔“ اس نے روکھے پن سے کہا۔

”کیا صرف یہی وجہ تھی؟“

اس کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو بہنے لگے۔ اس نے ٹشو سے اپنے گال صاف کیے اور بولی۔ ”یہ بتانا بہت مشکل ہے۔ وہ ایک بھوکا شخص تھا۔ کیا یہ گفتگو خفیہ رہے گی؟“

”نہیں۔“

”ایسی صورت میں نہیں جانتی کہ کس حد تک بتا سکتی ہوں۔“

”قتل کے کیس میں کسی ثبوت کو ظاہر نہ کرنا بذاتِ خود ایک جرم ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس لیے میں زور دے کر کہوں گا کہ تم ان سوالات کا جواب دو۔“

اس نے ایک بار پھر اپنی آنکھیں صاف کیں۔ چند سیکنڈ گزرنے کے بعد میں نے یہ تاثر لیا کہ وہ میرے جانے کا انتظار کر رہی ہے اور سمجھتی ہے کہ اگر اس نے خاموشی اختیار کیے رکھی تو میں مزید بات چیت کیے بغیر چلا جاؤں گا لیکن وہ غلطی پر تھی بالآخر اس نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔

”میں کئی سالوں سے جانتی تھی کہ وہ بے وفائی کر رہا ہے اور یہ سلسلہ تواتر سے جاری تھا۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ اس کے دوسری عورتوں سے تعلقات تھے؟“

”اور کیا ہوسکتا ہے؟“

”تم اپنے شوہر کی محبوباؤں کے نام جانتی ہو؟“

”کیا یہ جاننا ضروری ہے؟“

”کیونکہ کسی نے تمہارے شوہر کو ایک قیمتی شیشے کے ڈھانچے میں پیوست کردیا۔ اس لیے کسی ناجائز محبوبہ پر بھی شک کیا جاسکتا ہے۔“

”اب میں سمجھی۔“

”کیا تم بتا سکتی ہو کہ گزشتہ شب آخری بار شوہر کو دیکھنے کے بعد تم کہاں تھیں؟“

”بس اتنا کافی ہے۔“ دروازے سے ایک آواز آئی۔ میں نے دیکھا کہ وہاں ایک شخص اسپورٹس شرٹ اور گبرڈین کی پتلون میں ملبوس کھڑا ہوا تھا۔ اس کے برابر میں یووی کرینچر بھی تھا۔

”یہ کارل اپٹن ہے۔“ یووی نے کہا۔ ”اور ریٖپی کے ٹیلی وژن شو میں اناؤنسر کے طور پر کام کرتا ہے۔“

”کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ دوسرے کمرے میں انتظار کرو؟“ میں نے کہا تو کرینچر کے چہرے پر خوف کے آثار نمودار ہوئے اور وہ دروازے سے ہی باہر چلا گیا۔

”اندر آجاؤ مسٹر اپٹن۔“ میں نے کہا۔ ”میرا نام سراغ رساں ایم یوائے بوٹ رائٹ ہے اور میرا تعلق مورگن پولیس ڈپارٹمنٹ سے ہے۔ یہ قتل کا معاملہ ہے اور اس میں جب سوالات کیے جائیں تو کچھ بھی کافی نہیں ہوتا۔“

”کیا تمہیں بے چاری اسٹیلا کی حالت نظر نہیں آرہی۔ وہ اپنے شوہر سے محروم ہوچکی ہے۔ خدا کے واسطے کچھ تو خیال کرو۔“

”ایسا لگتا ہے کہ وہ اسے بہت عرصہ پہلے کھوچکی تھی۔ برائے کرم دوسرے کمرے میں بیٹھو۔ میں تم سے بعد میں بات کروں گا جب تک یہ نہ بتا سکو کہ گزشتہ شب مسز برائنڈ کہاں تھی؟“

”اسٹیلا اور میں گزشتہ شب پولر میں واقع کوستا ڈیل اورو میں ڈنر کے لیے گئے تھے۔“

وہ جگہ مورگن سے بیس میل کے فاصلے پر تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”تم وہاں کتنی دیر رہے؟“

”ہم وہاں نو بجے پہنچے اور گیارہ بجے کے قریب بل ادا کیا۔ میرے پاس اس کی رسید ہے۔“

”اگر تم نے گیارہ بجے ڈنر ختم کرلیا تھا تو تمہیں نصف شب کے قریب واپس آجانا چاہیے تھا۔“

”ایسا ہی ہے۔“

”کیا تم نے واپس آنے کے بعد مسٹر برائنڈ کو دیکھا تھا؟“

اپٹن نے کھنکھارتے ہوئے اسٹیلا کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک بار پھر ٹشو سے آنکھیں صاف کیں اور بولی۔ ”جب ہم واپس آئے تو رینی لیونگ روم میں تھا۔ جیسا کہ تم نے کہا کہ آدھی رات ہوچکی تھی لیکن وہ اکیلا نہیں تھا۔“

”اس کے ساتھ کون تھا؟“

”اس کی نئی محبوبہ۔“ اپٹن نے کہا۔ ”بیورلی روز۔“

درست ہے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"میں اس سے کہاں مل سکتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"شاید وہ نیچے اسٹوڈیو میں ہو۔" اپٹن نے کہا۔ "وہ الفا اومیگا طائفہ کی مرکزی گلوکارہ ہونے کے علاوہ موسیقار بھی ہے۔"

اسکوٹی بیگز بیڈ روم کے دروازے پر آن کر بولا۔ "ایک منٹ بوائے۔"

"معافی چاہتا ہوں۔" میں نے کہا اور اس کے پاس جا کر پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"میڈیکل ایگزامنر نے لاش کا معائنہ کر لیا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ برائنڈ کی موت رات بارہ اور تین بجے کے درمیان کسی وقت ہوئی۔"

"اس سے ہمیں کوئی خاص مدد نہیں ملے گی۔ یہ میں پہلے سے جانتا ہوں کہ برائنڈ نصف شب تک زندہ تھا اور اب تک جن لوگوں پر مجھے شک ہے۔ وہ سب اس وقت یہاں موجود تھے۔ تم نیچے اسٹوڈیو میں جا کر بیورلی روز کو تلاش کرو۔ وہ یہاں کے طائفہ کی گلوکارہ اور موسیقار ہے۔ اگر مل جائے تو اسے اوپر لے آؤ۔"

یہ کہہ کر میں واپس بیڈ روم میں آ گیا۔ اپٹن، اسٹیلا کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا اور اس نے اپنا ایک بازو اس کے کندھے پر رکھا ہوا تھا۔ اسٹیلا اب قدرے پُرسکون نظر آ رہی تھی۔

"تمہارا کہنا ہے کہ تم کوسٹا ڈیل اورو سے نصف شب کے قریب واپس آئے اور بیورلی روز کو مسٹر برائنڈ کے پاس سوئٹ میں دیکھا۔ یہ بتاؤ کہ تم نے انہیں آخری بار کب زندہ دیکھا؟"

اپٹن نے جواب دینے میں پہل کی اور بولا۔ "تقریباً ساڑھے بارہ بجے کا وقت تھا۔ اسٹیلا اور میں نے ایک ایک ڈرنک لی اور میں یہاں سے چلا گیا......"

"ایک منٹ۔" میں نے کہا اور اسٹیلا کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ "کیا تمہارے لیے یہ عام بات تھی کہ اپنے شوہر اور اس کی محبوبہ کے ساتھ ڈرنک کرو؟"

"بالکل نہیں۔ کئی سالوں سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ریکی شادی کے موقع پر کیے گئے عہد و پیمان سے پھر چکا تھا۔ لہٰذا میرے لیے یہ زیادہ مہذب طریقہ تھا کہ میں

"لہٰذا تم نے بھی اپنے لیے محبوب تلاش کر لیے؟"

وہ شرمندہ ہو گئی لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا البتہ اپٹن جارحانہ انداز میں بولا۔ "میں جانتا ہوں کہ تمہیں اپنا کام کرنا ہے لیکن کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ تم اسٹیلا جیسی نفیس خاتون کی کردار کشی کرو۔"

میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "مسٹر اپٹن، ایف بی آئی نے یہ تعین کیا ہے کہ اس ملک میں تہائی قتل کرنے والے میاں بیوی ہوتے ہیں اور ان کے درمیان جھگڑے کی وجہ پیسا یا بدگمانی ہوتی ہے۔ زیادہ تر دل پھینک شوہر یہ برداشت نہیں کرتے کہ ان کی بیوی کسی غیر مرد سے پینگیں بڑھائے۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ کسی نے برائنڈ کو دھکا دیا اور وہ شیشے کے مجسمے پر جا کر گرا۔ جس کے نکیلے حصے اس کے جسم میں پیوست ہو گئے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حملہ آور مسٹر برائنڈ سے ناراض تھا کیونکہ گزشتہ شب تم اسٹیلا کے ساتھ ڈنر پر گئے تھے۔ اس لیے میں پوچھنا چاہوں گا کہ تم دونوں کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہے؟"

"شاید میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکوں۔" کرسٹر نے راہداری میں سے آواز لگائی۔

"تمہارے پاس ایسی معلومات ہیں جن سے بات واضح ہو سکے؟"

کرسٹر کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے اپٹن کے سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔ "غور سے سنو۔ میں تم سے ایک سوال کر رہا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تم اس کا درست جواب دو گے ورنہ میں خود معلوم کر لوں گا۔"

"پوچھو۔" اپٹن نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"کیا تم اور اسٹیلا ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو؟"

"یقیناً نہیں۔" اس نے فوراً جواب دیا۔

کرسٹر میری طرف مڑتے ہوئے بولا۔ "یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ یہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔"

اپٹن اونچی آواز سے بولا۔ "تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو جبکہ میں جھوٹ نہیں بول رہا۔"

"جانے دو کارل۔" اسٹیلا نے کہا۔ "یہ ماہرِ نفسیات دان ہے۔ تم اسے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔"

میں نے کہا۔ "کارل، تم باہر جاؤ۔ میں تم سے بعد میں بات کروں گا۔ پہلے مسز برائنڈ سے کچھ سوالات کر

لوں۔‘‘

اپٹن باہر چلا گیا لیکن میں نے کرسچر کو روک لیا کیونکہ اس نے مجھے ایک اہم اشارہ دیا تھا۔

’’مجھے اس بارے میں بتاؤ۔‘‘ میں نے اسٹیلا سے کہا۔

لمحہ بھر کے لیے یوں لگا جیسے وہ ایک بار پھر رونا شروع کر دے گی۔ اس نے ٹشو پیپر کو مضبوطی سے پکڑا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ’’میں کارل کو برسوں سے جانتی ہوں۔ وہ ہمارے اسٹاف میں شامل تھا۔ گزشتہ ایک سال کے دوران وہ متعدد مواقع پر میرے ساتھ رہا جب رینی بہت مصروف یا کسی اور کے ساتھ ہوتا۔ یہ واحد شخص ہے جس پر میں بھروسا کر سکتی تھی۔ کیا تمہیں اندازہ ہے کہ اگر لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ میں اور رینی علیحدہ سوتے ہیں تو اس کے کتنے بُرے اثرات مرتب ہوتے۔‘‘

’’یقیناً۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’وہ تمام سادہ لوح لوگ جو تمہیں چندہ دیتے ہیں۔ شاید ایک دو قسطیں روک لیتے اور تمہیں خرچ چلانے کے لیے کوئی قیمتی چیز فروخت کرنا پڑتی۔‘‘

’’طنز کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’ممکن ہے کہ ہمارا طرزِ زندگی نمائشی ہو لیکن اصل نکتہ یہ نہیں ہے۔ کیا تم نے ہمارے ٹیلی وژن شوز نہیں دیکھے۔ ہم لوگوں کو یہی نصیحت کرتے ہیں کہ نیکی کا صلہ صرف آخرت میں نہیں بلکہ اس دنیا میں بھی ملتا ہے۔‘‘

’’لیکن تمہارا عمل اس کے برعکس ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’ہم پر خدا کی رحمت ہے۔ تم چاہو تو ہمارے خلوص پر شک کر سکتے ہو لیکن ہمارے پیروکار ہم پر یقین رکھتے ہیں۔‘‘

’’لوگ تو لاٹری کا ٹکٹ بھی خریدتے ہیں۔‘‘ میں نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔ ’’تم مجھے اپنے اور کارل کے درمیان تعلق کے بارے میں بتاؤ۔‘‘

’’کیا یہ ضروری ہے؟‘‘

’’بالکل۔‘‘

اس نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔ ’’یہ سلسلہ ایک سال پہلے شروع ہوا۔ ہمارے ادارے نے ایک ہفتے کے لیے کروز جہاز چارٹرڈ کیا۔ اس میں بھی میرے اور رینی کے علیحدہ سوئٹ تھے۔ رینی اپنے کمرے میں بند ہو گیا لیکن سمندری سفر کی وجہ سے میری طبیعت بوجھل ہو رہی تھی۔ اس موقع پر کارل نے میرا بہت خیال رکھا۔ وہ میرے لیے جہاز کی ڈسپنسری سے دوائیں لے کر آیا۔ میرے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھیں۔ اس طرح ہمارے درمیان قربت بڑھتی گئی۔‘‘

’’تم اپنے شوہر کے ہرجائی پن سے واقف ہو۔ کیا وہ بھی تمہارے بارے میں جانتا تھا؟‘‘

’’گزشتہ شب تک اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ اسی لیے میں اور کارل ڈنر پر گئے۔ ہم اسی موضوع پر بات کرنا چاہ رہے تھے کہ کس طرح رینی کو اس صورتِ حال کے بارے میں بتایا جائے۔ ہم نصف شب کے قریب واپس آئے اور میں نے رینی کو کارل کے ساتھ اپنے تعلق کے بارے میں بتا دیا۔‘‘

’’اس کا کیا ردِعمل تھا؟‘‘

’’وہ غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس نے مجھ پر ادارے کی سالمیت کو نقصان پہنچانے کا الزام لگایا اور حکم دیا کہ میں کارل سے ملنا چھوڑ دوں۔‘‘

’’اور تم نے انکار کر دیا ہوگا؟‘‘

’’بالکل۔ اس پر رینی نے کارل کو ملازمت سے برطرف کر دیا۔‘‘

میں نے کرسچر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’کیا تم اس بارے میں جانتے ہو؟‘‘

’’میرے لیے یہ ایک خبر ہے۔‘‘

’’مسز برائٹ، تم یہیں ٹھہرو۔ مجھے تم سے کچھ مزید سوالات کرنے ہیں۔‘‘ یہ کہہ کر میں نے کرسچر کو بازو سے پکڑا اور اسے لے کر کمرے سے باہر آ گیا۔

’’مجھے اپٹن سے کچھ سوالات کرنے ہیں۔ تم بھی موجود رہنا۔ شاید تم اس کے چہرے سے کچھ پڑھ سکو۔‘‘

’’میرا خیال تھا کہ تمہیں میری روحانی صلاحیتوں پر شک ہے۔‘‘

’’تمہاری نام نہاد مافوق الفطرت طاقت کا مسئلہ بہت پہلے حل ہو چکا ہے۔ تاہم میں یہ جاننا چاہوں گا کہ تمہیں کس طرح معلوم ہوا کہ اپٹن جھوٹ بول رہا تھا۔ تمہارے جادو منتر سے وہ پریشان نہیں ہوا۔ البتہ وہ یہ ضرور سوچ رہا ہوگا کہ تم اس پر ٹیلی پیتھی کا عمل کر رہے ہو۔‘‘

’’یہ بھی سچ اگلوانے کا ایک طریقہ ہے۔ تم بھی کسی مشتبہ شخص سے تفتیش کرتے وقت کمرے میں ایک فائل رکھ دیتے ہو جس کے بیشتر صفحات خالی ہوتے ہیں۔ یہ تم اس لیے کرتے ہو تاکہ اس مشتبہ شخص کو یقین ہو جائے کہ اس فائل

میں اس کا سارا کچا چٹھا موجود ہے۔ اس لیے جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اسی طرح میرے مؤکل کو بھی غلط فہمی ہوئی ہے کہ میں ان کا ذہن پڑھ سکتا ہوں حالانکہ ہم دونوں اچھی طرح جانتے ہیں کہ مجھ میں ایسی کوئی صلاحیت نہیں ہے۔ البتہ میں ان کی بدن کی جلد، نبض اور آنکھوں کے تاثرات پڑھ لیتا ہوں۔ ان کی جلد کی بدلتی ہوئی رنگت سانسوں کے مدوجزر کا پتا دیتی ہے۔''

''تم نے اپٹن کے ساتھ بھی یہی کیا تھا؟''

''میں نے اس کے سر کو پکڑ کر آنکھوں میں جھانکا۔ اگر وہ سمجھتا تھا کہ مجھ میں اس کا ذہن پڑھنے کی صلاحیت ہے تو وہ سچ اگل دیتا۔ دوسری صورت میں میرے پاس یہ موقع تھا کہ میں اپنی انگلیوں سے اس کی جلد پر رونما ہونے والے تغیر کو محسوس کرسکوں۔''

''گویا تمہارے خیال میں وہ جھوٹ بول رہا تھا؟''

''اس کا امکان ففٹی ففٹی تھا۔ پھر میں نے ایک جوا کھیلا اور اس پر جھوٹ بولنے کا الزام عائد کردیا اور تم نے دیکھ لیا کہ نتیجہ میرے حق میں آیا۔ اسٹیلا اس کے ساتھ اپنے تعلق کا اعتراف کرچکی ہے۔''

اپٹن ہمیں اسٹڈی میں مل گیا جو رینی کے دفتر کے سامنے راہداری کے آخری سرے پر تھی۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھا کوئی میگزین پڑھ رہا تھا۔ جیسے ہی ہم کمرے میں داخل ہوئے، وہ ہمیں دیکھ کر کھڑا ہوگیا۔

''اسٹیلا کیسی ہے؟ مجھے امید ہے کہ تم نے اسے پریشان نہیں کیا ہوگا۔''

''وہ زندہ رہے گی۔'' میں نے کہا۔ ''اس نے بتایا ہے کہ جب اس نے رینی کو تم دونوں کے تعلق کے بارے میں بتایا تو اس نے تمہیں ملازمت سے برطرف کردیا۔''

''ہاں۔''

''اور اس کے تھوڑی دیر بعد رینی کا قتل ہوگیا۔''

''اوہ۔'' اس نے کہا اور دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''تمہارا خیال ہے کہ شاید میں نے اپنی نوکری بچانے کے لیے رینی کو قتل کیا ہے۔ یقین کرو یہاں میری پوزیشن بالکل محفوظ تھی۔ رینی اس سے پہلے بھی مجھے کئی مرتبہ ملازمت سے فارغ کرچکا ہے۔ اس کے باوجود میں یہاں موجود ہوں۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ مسٹر کرینچر نے تمہیں بتایا ہے کہ میں یہاں ٹیلی وژن شو کا اناؤنسر تھا۔ اس کا کہنا صحیح ہے لیکن میں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوں۔ تم مجھے رینی کا معاون کہہ سکتے ہو جیسے کہ میں اس کے انتہائی نازک معاملات کا نگراں تھا۔''

''مثلاً اس کے لیے پرکشش نوجوان عورتوں کا بندوبست کرنا؟''

''ایسا کبھی کبھی ہوتا تھا۔ الفا اومیگا منسٹری ایک بہت بڑا ادارہ ہے۔ ہماری سالانہ آمدنی سو کروڑ ڈالر سے بھی زیادہ ہے۔ جس میں عطیات کے علاوہ تفریحی پارک اور ہوٹل سے ہونے والی آمدنی بھی شامل ہے۔ ایسا ہمیشہ سے نہیں ہے۔ کوئی بھی کاروباری شخص راتوں رات بلندی پر نہیں پہنچ جاتا۔ اس میں نشیب وفراز آتے رہتے ہیں اور بعض اوقات مخالفین کو راستے سے ہٹانا پڑتا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

''یقین جانو اس میں تشدد کا عنصر شامل نہیں ہے۔ پہلے تو حریف مبلغ کو راستے سے ہٹانے کے لیے ایک شرمناک ثبوت ہی کافی ہوتا تھا۔''

''تم انہیں بلیک میل کرتے تھے؟''

''کھلم کھلا نہیں۔ ان کے لیے صرف یہ مشورہ ہی کافی ہوتا تھا کہ وہ ہمارے ادارے میں ضم ہوجائیں اور انہیں یہ اجازت ہوتی تھی کہ وہ کسی اور جگہ جاکر تبلیغ کا کام کریں۔ بعد میں، ہم اتنے دولت مند ہوگئے کہ حریف اداروں کو خرید سکیں۔ رینی خود اس کام میں اپنے ہاتھ گندے نہیں کرسکتا تھا لہٰذا اس نے یہ ذمے داری مجھے سونپ دی۔ یہ ایک ناپسندیدہ عمل تھا اور اکثر مجھے اس پر افسوس ہوتا تھا لیکن میں اسے کاروبار سمجھ کر کرتا رہا۔ یہ کوئی اتفاق نہیں کہ ہمارے پاس ملک کا سب سے بڑا تبلیغی نشریات کا نیٹ ورک ہے۔''

''یہ نہیں، تھا۔'' کرینچر نے کہا۔

ہم دونوں نے اسے دیکھا تو وہ بولا۔ ''رینی کے مرنے کے بعد کون اتنے بڑے گروپ کی سربراہی کرے گا؟ کیا تمہارے اندر اتنی صلاحیت ہے کہ اس کی جگہ لے سکو۔ کیا تم اپنے معتقدین کو متاثر کرسکو گے؟''

''بالکل نہیں۔'' اپٹن نے کہا۔ ''اور یہ بھی ایک وجہ ہے کہ میں اسے قتل نہ کرتا۔ ٹھیک ہے کہ اس نے مجھے ملازمت سے نکال دیا تھا لیکن ایسا وہ پہلے بھی کئی مرتبہ کرچکا تھا۔ اسے میری اتنی ہی ضرورت تھی جیسا کہ مجھے اس کی۔ ہم ایک ٹیم کی طرح کام کرتے تھے۔ اسے مارنے کا مطلب سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو مارنا ہے۔ ممکن ہے کہ اس طرح وقتی طور پر مسئلہ حل ہوجاتا لیکن آگے چل کر اس کا انجام تباہی تھا۔''

''یہی تو مسئلہ ہے۔'' کرسٹفر نے کہا۔ ''ایسی حالت میں ہم اپنے فائدے کے بارے میں نہیں سوچتے۔''

''خاص طور پر ایسی صورت میں جب رقابت کا عنصر بھی شامل ہو۔'' میں نے کہا۔ ''وہ ایک الگ بات تھی جب برائنڈ نے تمہیں کاروباری معاملات کی وجہ سے نکالا لیکن گزشتہ رات اسے معلوم ہوا کہ تم اس کی عزیز ہستی کو لینا چاہ رہے ہو۔ دوسرے لفظوں میں تم نے اس کی بیوی سے چکر چلا کر اسے دھوکا دیا۔''

''یہ چکر نہیں ہے۔'' اپٹن نے کہا۔ ''ہم ایک دوسرے سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں۔''

''یہ تو اور بھی بری بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس طرح کا تعلق کبھی نہیں چھپ سکتا۔ مسز برائنڈ کے کہنے کے مطابق وہ اور تم نصف شب کے قریب واپس آئے۔ اس وقت ربی اپنی میوزک ڈائریکٹر کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ تمہارے درمیان کچھ ناخوشگوار جملوں کا تبادلہ ہوا۔ اس سے پہلے تم بتا چکے ہو کہ ساڑھے بارہ بجے وہاں سے چلے گئے تھے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس کے بعد تم کہاں گئے تھے؟''

''دو منزل نیچے میرا سوئٹ ہے۔ پہلے میں وہاں گیا پھر مجھے یاد آیا کہ کچھ کاغذات اسٹوڈیو میں رہ گئے ہیں۔ میں دس منٹ کے لیے نیچے اسٹوڈیو میں گیا۔ باقی رات میں نے سوئٹ میں ہی گزاری۔''

''تنہا؟''

''بالکل، یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''کیونکہ بارہ اور تین بجے کے درمیان کسی نے ربی برائنڈ کو قتل کر دیا اور تم یہ اعتراف کر چکے ہو کہ ربی سے لڑائی ہونے کے بعد بھی اس عمارت میں موجود تھے۔''

''بالکل، میں یہیں رہتا ہوں۔ کیا تم یہ کہہ رہے ہو کہ میں نے اس کا قتل کیا ہے؟''

''مسٹر اپٹن۔'' میں نے کہا۔ ''فی الحال میں صرف تفتیش کر رہا ہوں۔''

☆☆☆

بیورلی روز واقعی بہت خوب صورت تھی۔ لانبا قد، شانوں تک بکھرے ہوئے سنہری بال اور گہری نیلی آنکھیں جن میں نمی تیر رہی تھی۔ وہ ربی برائنڈ کی اسٹڈی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اور کرسٹفر بھی اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ گزشتہ شب مسٹر برائنڈ کا قتل ہو گیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تمہارا اس سے معاشقہ چل رہا تھا اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ تم اس وقت بھی اس کے پاس تھیں جب اس کی بیوی اور کارل نصف شب کے قریب پینٹ ہاؤس واپس آئے۔''

''تم تو بہت کچھ جانتے ہو۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔

''تم ہماری مدد کر سکتی ہو اگر یہ بتا سکو کہ گزشتہ شب کیا ہوا تھا؟''

''بالکل، اسٹیلا اور کارل جب واپس آئے تو اسٹیلا نے حسبِ معمول میرے ساتھ سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔ اس کے باوجود ربی نے انہیں ڈرنک کی پیشکش کی۔ اسی دوران اسٹیلا نے ربی کو بتایا کہ وہ کارل سے محبت کرتی ہے۔''

''تم اس وقت بھی وہاں موجود تھیں؟''

''ہاں، مجھے ربی نے روک لیا تھا حالانکہ اسٹیلا چاہ رہی تھی کہ میں چلی جاؤں لیکن ربی نے کہا کہ جو بات وہ تنہائی میں کرنا چاہتی ہے، وہ میرے سامنے بھی کہہ سکتی ہے۔''

''جب اسٹیلا نے ربی کو اپنے معاشقے کے بارے میں بتایا تو اس نے کیا کیا؟''

''وہ آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے فوراً ہی اپٹن کو ملازمت سے برطرف کر دیا۔''

میں نے اپنی نوٹ بک پر کچھ لکھا اور بولا۔ ''اپٹن کا ردِعمل کیا تھا؟''

''لگتا ہے کہ وہ بالکل پریشان نہیں ہوا۔ وہ اس ادارے کا ایک اہم رکن رہا ہے۔ وہ اتنا پُرسکون تھا جیسے اس نے کوئی مقابلہ جیت لیا ہو۔''

''شاید ایسا ہی ہوا تھا۔'' کرسٹفر نے کہا۔

''معاف کرنا میں سمجھی نہیں۔''

''میری دادی کہا کرتی تھیں کہ جو شخص اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکے، وہ سب کچھ کھو دیتا ہے۔ پُرسکون رہ کر مسٹر اپٹن نے اپنی بڑائی ظاہر کر دی۔''

''جبکہ ربی بہت غصے میں تھا۔'' بیورلی نے کہا۔ ''اس نے نہ صرف اپٹن کو ملازمت سے فارغ کر دیا بلکہ اسے تباہ کرنے کی دھمکی بھی دی۔ ان کے جانے کے بعد میں کافی دیر تک اسے پُرسکون رکھنے کی کوشش کرتی رہی۔''

''تمہیں کتنی دیر لگی؟'' میں نے پوچھا۔

''تقریباً ایک گھنٹا۔ میں اس کے لیے دعائیں مانگتی رہی تب کہیں جا کر وہ کچھ نرم پڑا۔''

"تم پورے ایک گھنٹے تک دعائیں مانگتی رہیں؟"

"نہیں، پورا گھنٹا تو نہیں لیکن زیادہ وقت اسی میں گزر گیا۔"

"تم کس وقت ربی کے سوئٹ سے روانہ ہوئیں؟"

"تقریباً پونے دو بجے۔ میں مزید ٹھہر جاتی لیکن ہمیں صبح ایک شو ریکارڈ کرانا تھا۔ اس لیے سونے چلی گئی۔"

"میرا خیال ہے کہ تم بھی اسی ہوٹل میں رہتی ہو؟"

"میرا سوئٹ تین منزل نیچے ہے۔ میں گزشتہ ماہ ہی یہاں منتقل ہوئی ہوں۔"

"اگر تم برا نہ مناؤ۔" کرسٹفر نے کہا۔ "تمہارا بروچ بہت خوب صورت ہے۔"

وہ اس تعریف پر شرما گئی اور بولی۔ "یہ میں نے دس سال پہلے لیا تھا۔"

"کیا تم اسے اکثر و بیشتر لگاتی ہو؟"

"ہر وقت...... یہ مجھے بہت پسند ہے۔"

"گزشتہ شب بھی تم نے اسے لگایا ہوا تھا؟"

"بالکل۔"

"کیا میں اسے قریب سے دیکھ سکتا ہوں؟"

اس نے وہ بروچ بلاؤز سے علیحدہ کیا اور کرسٹفر کو دے دیا۔ جیسے ہی اس کے ہاتھ پر بروچ رکھا۔ اس نے جھولنا اور کراہنا شروع کر دیا۔

"اوہ میرے خدا۔" وہ چلائی۔ "اسے کیا ہوا؟"

"یہ روحانی ماہر ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے اکثر و بیشتر یہ دورہ پڑتا ہے۔ یہ ارتعاش یا ایسی ہی کوئی دوسری کیفیت ہو سکتی ہے۔ بہتر ہے کہ اس کے ختم ہونے کا انتظار کیا جائے۔"

کرسٹفر نے وہ بروچ سینے سے لگایا اور صوفے پر گر پڑا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں اور وہ بے معنی گفتگو کر رہا تھا۔ بیورلی روز خوف زدہ دکھائی دے رہی تھی لیکن میں ایسے تماشے پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ جلد ہی اس کیفیت سے باہر آ گیا۔

"معاف کرنا۔ میرا مقصد کسی کو خوف زدہ کرنا نہیں تھا۔ اس بروچ سے نکلنے والی لہریں بہت طاقت ور ہیں اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مس روز متحرک شخصیت کی مالک ہے۔"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "اس میں کوئی شک نہیں۔"

"کیا یہ سچ ہے کہ تم ربی سے محبت نہیں کرتی تھیں؟"

روز نے ٹالنے کے انداز میں کہا۔ "براہ مہربانی میرا بروچ واپس کر دو۔"

"میں چاہوں گا کہ تم اس سوال کا جواب دو۔" میں نے کہا۔ "کیا تم اور ربی ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے یا نہیں؟"

"تمہارا خیال ہے کہ شاید میں نے ربی کو قتل کیا ہے۔"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"میں جیولیرڈ اسکول سے فارغ التحصیل ہوں اور تقریباً دس سال سے میوزیشن کے طور پر کام کر رہی ہوں۔" اس نے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ میں یہاں میوزک ڈائریکٹر ہوں۔ ربی نے میرے آنے کے ایک ہفتے بعد ہی مجھے ورغلانا شروع کر دیا تھا لیکن میں نظرانداز کرتی رہی۔ چھ ماہ پہلے اس نے مجھے پیغام بھیجا کہ وہ میری مدد کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اس کی پیشکش قبول کر لی اور صرف ایک ماہ قبل اس نے مجھے میوزک ڈائریکٹر بنا دیا۔"

"تمہاری تنخواہ بھی بڑھ گئی ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، پہلے سے دگنی ہو گئی۔ وہ میرے لیے سونے کی کان تھا۔ اسے خوش رکھنے میں ہی میرا فائدہ تھا پھر میں اپنے آپ کو کیوں خطرے میں ڈالتی؟"

میں نے بیورلی روز سے کہا کہ وہ یہیں ٹھہرے۔ ممکن ہے کہ بعد میں اس سے مزید سوالات کروں۔ وہ لفٹ کی طرف چلی گئی تو میں نے اسکوئی بیگز سے کہا۔ "بیورلی اور کارل کے سوئٹ اسی ہوٹل میں ہیں اور ان کے دروازے کی کارڈ سے کھلتے ہیں۔ مجھے ان کے کی کارڈ کا ریکارڈ چاہیے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ دونوں گزشتہ شب کس وقت اپنے اپنے سوئٹ سے باہر آئے۔"

"مسز برائنڈ کے بارے میں کیا کہتے ہو؟" اس نے کہا۔

"اچھا پوائنٹ ہے۔ اس کا اور ربی کا ریکارڈ بھی حاصل کر لو۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے کرسٹفر سے کہا۔ "تم نے بروچ والا ڈراما خوب کھیلا۔ شاید تم نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ بیورلی اس سے محبت نہیں کرتی تھی۔"

"ہاں، مجھے شبہ تھا۔"

"اس کی بنیاد کیا تھی؟"

"انسانی فطرت۔ جب وہ کمرے میں آئی تو پریشان لگ رہی تھی جیسے گھنٹوں سے روتی رہی ہو لیکن جیسے ہی تم نے اس پر توجہ دی وہ ادائیں دکھانے لگی۔ تم نے بھی

اس پر غور کیا ہوگا۔‘‘
’’میں کبھی عورتوں کی توجہ سے متاثر نہیں ہوتا۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’بہرحال میں نے یہ بات نوٹ کی تھی۔‘‘
’’میں نے اس کے جواب سے اندازہ لگایا کہ وہ مواقع سے فائدہ اٹھانا جانتی ہے۔ اس نے ربی کو سونے کی کان کہا تھا۔ اب وہ دنیا میں نہیں رہا اور وہ جانتی ہے کہ اس پر شبہ کیا جا رہا ہے اور تم اس قتل کی تحقیقات کر رہے ہو تو اس نے اپنی اداؤں سے تمہیں لبھانے کی کوشش کی۔‘‘
’’تمہارا خیال ہے کہ وہ ربی کو استعمال کر رہی تھی؟‘‘
’’بالکل۔ اگر میں یا تم اس سے براہِ راست ربی سے تعلق کے بارے میں پوچھتے تو وہ انکار کر دیتی اس لیے ضروری تھا کہ وہ میرے اس نتیجے پر یقین کرے جو میں نے روحانیت کی مدد سے اخذ کیا تھا۔ کیا تم اگلے ایک گھنٹے میں مزید لوگوں سے تفتیش کرنا چاہتے ہو؟‘‘
’’فی الحال میرے پاس کوئی گواہ نہیں ہے۔‘‘
’’پھر کیا خیال ہے۔ لنچ کر لیا جائے۔ نیچے بہت اچھا ڈائننگ روم ہے۔‘‘
کھانے کے دوران بھی میرا دماغ اسی کیس میں الجھا رہا۔ اچانک ہی کریچٹر نے کہا۔ ’’آج صبح تم مجھے اسٹیلا کے ساتھ دیکھ کر خوش نہیں ہوئے حالانکہ میرا ارادہ تمہارے کام میں مداخلت کرنے کا نہیں تھا۔‘‘
’’ہاں مجھے معلوم ہے کہ تم ربی کے کہنے پر آئے تھے۔ کیا اسے پہلے سے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھ کچھ برا ہونے والا ہے۔ اس نے تم سے یہ بات کب کہی تھی؟‘‘
’’مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں۔ کئی مہینے ہو گئے۔‘‘
’’جبکہ اس نے صرف ایک ماہ قبل ہی بیورلی روز کے ساتھ تعلق استوار کیا تھا۔‘‘
’’اس کا مطلب ہے کہ اس پر شک نہیں کیا جا سکتا۔‘‘
’’ہم فوری طور پر یہ فیصلہ نہیں کر سکتے۔ البتہ یہ بات اس کے حق میں جاتی ہے۔ ربی کو یہ توقع تھی کہ کوئی اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ ہمیں اسی کا کھوج لگانا ہے۔‘‘
’’ممکن ہے کہ تمہیں اس ریکارڈ سے کچھ مدد مل جائے۔‘‘ اسکوٹی نے کریچٹر کے برابر والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس نے مجھے ایک کاغذ دیا اور بولا۔ ’’یہ گزشتہ شب اسٹیلا، ربی، کارل اور بیورلی کے کی کارڈ کے استعمال کا پرنٹ آؤٹ ہے۔‘‘
’’اس سے کوئی خاص بات معلوم ہوئی؟‘‘ میں نے پوچھا۔
’’تم خود ہی دیکھ لو۔‘‘
میں نے ایک نظر اس کاغذ پر ڈالی۔ یہ میں پہلے سے جانتا تھا کہ کارل نے دفتر جانے کے لیے دس منٹ پہلے سوئٹ چھوڑ دیا تھا اور اس نے واپس آنے سے پہلے تقریباً بیس منٹ اپنے دفتر میں گزارے۔ اس دوران ربی نے اس کے سوئٹ میں داخل ہونے کے لیے اپنا کی کارڈ استعمال کیا۔ کیونکہ اس کے پاس ماسٹر کی تھی جس کے ذریعے وہ ہوٹل کے کسی بھی کمرے تک رسائی حاصل کر سکتا تھا۔ بظاہر وہ وہاں صرف دو منٹ ہی رکا تھا کیونکہ وہ پانچ منٹ بعد پینٹ ہاؤس واپس آ گیا تھا۔
کارل نے سچ ہی کہا تھا کہ وہ ڈیڑھ بجے اپنے سوئٹ میں واپس آیا لیکن زیادہ دیر نہیں رکا۔ میں نے اس کاغذ پر نظر ڈالی اور ہلکے سے سیٹی بجائی۔
’’کیا ہوا؟‘‘ کریچٹر نے پوچھا۔
’’کارل دوبارہ یہاں آیا تھا۔ اپنے سوئٹ میں واپس آنے کے دس منٹ بعد۔ اس ریکارڈ کے مطابق اس نے اپنے سوئٹ میں داخل ہونے کے لیے دو مرتبہ یہ کارڈ استعمال کیا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ دفتر کا چکر لگانے کے بعد اپنے کمرے میں واپس آیا اور پھر دوبارہ اوپر چلا گیا اور دوبارہ اپنے کمرے میں واپس آنے سے پہلے اس نے ربی کو قتل کر دیا۔‘‘
’’او میرے خدا۔‘‘
’’صرف یہی نہیں۔ جب وہ نیچے دفتر میں گیا تو ربی ماسٹر کی کے ذریعے اس کے سوئٹ میں داخل ہوا۔ اس نے یقیناً وہاں کوئی ایسی چیز رکھی ہوگی جسے دیکھ کر اپٹن مشتعل ہو گیا۔‘‘
’’اور اس نے ربی کو اس شیشے کے ڈھانچے پر دھکا دے دیا۔‘‘
’’بہت ممکن ہے۔ اب ہمیں ایک بار پھر اپٹن سے بات کرنا ہوگی۔‘‘
میں نے اسکوٹی کو اسے بلانے کے لیے بھیجا اور خود کریچٹر کے ساتھ پینٹ ہاؤس واپس آ گیا۔ میں اپٹن کا سامنا کرنے سے پہلے اسٹیلا سے کچھ باتیں کرنا چاہ رہا تھا۔ وہ ہمیں اسٹڈی میں مل گئی۔ وہ اس وقت چند کاغذات دیکھ رہی تھی۔ ہم پر نظر پڑتے ہی بولی۔
’’کوئی خبر؟‘‘

"شاید۔" میں نے کہا۔ "تمہارا کہنا ہے کہ تم نے رات سونے سے پہلے اپنے شوہر کو ایک بجے کے قریب دیکھا تھا۔"

"ہاں۔"

"تمہارا کمرا پینٹ ہاؤس کے مرکزی دروازے سے بیس فٹ کے فاصلے پر ہے۔ تم یقیناً اس کے کھلنے اور بند ہونے کی آواز سن سکتی ہو۔"

"ہاں، لیکن گزشتہ شب میں نے نیند کی گولی لی تھی۔ اس سے پہلے ڈنر میں شراب بھی پی تھی۔ اس لیے گھر آنے کے بعد مجھے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔"

"کیا میں وہ گولیاں دیکھ سکتا ہوں۔"

وہ تھوڑا سا گڑبڑاتے ہوئے بولی۔ "وہ آخری گولی تھی پھر میں نے بوتل پھینک دی۔"

"کہاں؟"

"اپنے باتھ روم کے کوڑے دان میں۔ ٹھہرو، میں لے کر آتی ہوں۔"

وہ ایک منٹ بعد واپس آکر بولی۔ "ملازمہ نے کوڑے دان صاف کر دیا ہے۔ وہ بالکل خالی ہے۔"

"آج صبح تم نے کس وقت اپنے شوہر کی لاش دیکھی؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے نہیں بلکہ ہاؤس کیپر نے صبح آٹھ بجے اس کی لاش دیکھی۔ اس وقت میں اسٹوڈیو جانے کی تیاری کر رہی تھی جب میں نے اس کی چیخ سنی۔ میں نے فوراً ہی دفتر کی طرف دوڑ لگائی۔ وہ بہت ہی خوفناک منظر تھا۔"

"میں تصور کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "گویا تم گزشتہ شب رینی اور اپٹن کے جھگڑے کے بعد پینٹ ہاؤس سے باہر نہیں گئیں۔"

"نہیں۔ جیسا کہ بتا چکی ہوں کہ میں سونے کے لیے چلی گئی تھی۔"

کریچر اس کی طرف بڑھا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے چھڑانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکی۔ اس کے بجائے کریچر نے اس کی آنکھوں میں جھانکنا شروع کر دیا۔ وہ اس کی طرف جھکا اور اس کے کان میں کچھ سرگوشی کی جسے میں نہ سمجھ سکا لیکن اسٹیلا پر اس کا فوری اثر ہوا۔ اس کا چہرہ زرد ہو گیا اور وہ پیچھے کی طرف ہٹی۔ کریچر نے اسے کرسی پر بیٹھنے میں مدد دی اور میری طرف مڑتے ہوئے بولا۔

"اسٹیلا اپنا بیان تبدیل کرنا چاہتی ہے۔"

"کیا واقعی؟" میں نے پوچھا۔

"تم اسے بتاؤ۔" اس نے کریچر سے کہا۔ "لگتا ہے کہ تم سب کچھ جانتے ہو۔"

"میں تمہاری زبان سے سننا چاہوں گا مسز برانڈٹ۔" میں نے کہا۔

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو گئے۔ وہ انہیں ٹشو سے صاف کرتے ہوئے بولی۔ "کارل گزشتہ شب دوبارہ پینٹ ہاؤس آیا تھا۔"

"تمہارے شوہر کو قتل کرنے کے لیے؟"

"یقیناً نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ کارل نے تمہیں بتا دیا ہوگا کہ اس سے پہلے بھی رینی کئی مرتبہ اسے ملازمت سے برطرف کر چکا تھا۔"

"لیکن کبھی معاملہ اتنا سنگین نہیں ہوا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس مرتبہ کارل نے تمہارے ساتھ تعلق کا اعتراف کر لیا تھا۔ اس کے بعد رینی اسے کس طرح ملازمت پر واپس لیتا۔"

"کیونکہ اس میں رینی کا فائدہ تھا اور وہ اس کی خاطر اس سے کئی زیادہ بڑے گناہ کو معاف کر سکتا تھا۔ کارل صرف اس لیے یہاں آیا کہ وہ میرے لیے پریشان تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ رینی کتنا غصے میں ہے اور وہ اطمینان کر لینا چاہتا تھا کہ میں محفوظ ہوں۔ وہ کئی منٹ بعد یہاں سے گیا۔"

"یہی میرا مسئلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "تم اور تمہارے شوہر دونوں کے پاس ماسٹر کی ہے۔ تم دونوں اس عمارت کے کسی بھی کمرے میں داخل ہو سکتے ہو جبکہ اپٹن کے پاس ایسی کوئی چابی نہیں ہے۔ اگر وہ واپس پینٹ ہاؤس آنا چاہتا تو کسی کی مدد کے بغیر دروازے میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ کیا تم نے اسے اندر آنے دیا؟"

اسٹیلا نے دوبارہ سر ہلا دیا۔

"کیا تم جانتی ہو کہ رینی اس وقت اپٹن کے کمرے میں گیا جب وہ وہاں موجود نہیں تھا؟"

اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا اور بولی۔ "نہیں۔"

"اپٹن نے بھی تمہیں یہ بات نہیں بتائی؟"

"نہیں، میں تمہارے منہ سے پہلی بار سن رہی ہوں۔"

اسی وقت اسکوئی، اپنے ہمراہ اپٹن کو لے کر آ گیا۔

"تم مجھے یہاں لے کر کیوں آئے ہو؟" اپٹن نے کہا۔ "کیا کوئی اہم بات معلوم ہوئی ہے؟"

"ہمارا یہی خیال ہے۔" میں نے کہا۔ "مسز برانڈٹ کا کہنا ہے کہ تم گزشتہ شب دوبارہ پینٹ ہاؤس واپس آئے

ہے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ جس وقت تم دفتر سے گئے تو اس دوران رینی تمہارے کمرے میں گیا تھا۔ کیا اس نے وہاں تمہارے لیے کوئی چیز چھوڑی؟“

”ہاں۔“ اپٹن نے کہا۔ ”وہ ایک خط رکھ کر چلا گیا جس میں میری برطرفی کی شرائط درج تھیں۔“

”اور تم اس سے لڑنے دوبارہ چلے آئے۔“

”نہیں۔ میں ایسے خطوط کی پروا نہیں کرتا۔ اس طرح کے خط مجھے پہلے بھی ملتے رہے ہیں۔ میں صرف اسٹیلا کو دیکھنے آیا تھا کیونکہ رینی غصے میں تھا اور مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ اسٹیلا کو نقصان نہ پہنچائے۔“

”کیا وہ اس کا عادی تھا؟“

”نہیں، لیکن اس نے برطرفی کے خط میں جو زبان استعمال کی، اس سے یہی لگ رہا تھا کہ اس کا انتقام میری برطرفی تک ہی محدود نہیں ہوگا۔“

”وہ خط کہاں ہے؟“

اس نے جیکٹ کی جیب سے ایک لفافہ نکالتے ہوئے کہا۔ ”میں اس کی اہمیت کے پیش نظر ساتھ لے آیا۔ تم دیکھ سکتے ہو۔ اس نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ کسی اور جگہ اچھی ملازمت حاصل کرلوں کیونکہ مجھے اسٹیلا کے اخراجات کے لیے پیسوں کی ضرورت ہوگی۔“

اس نے وہ خط مجھے پکڑا دیا۔ میں نے اس پر ایک نظر ڈالی۔ وہ لعن طعن اور پوشیدہ دھمکیوں سے بھرا ہوا تھا لیکن اس میں کسی کو نقصان پہنچانے کا ارادہ ظاہر نہیں کیا گیا تھا۔ میں نے وہ خط اسکوٹی کو دے دیا تاکہ وہ اسے ثبوت کے طور پر محفوظ کرلے پھر اپٹن اور اسٹیلا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”تم دونوں میں سے کوئی بھی اس عمارت سے باہر نہیں جائے گا جب تک کہ میں اپنی تفتیش مکمل نہ کرلوں۔“

”ہم اپنے سوئٹ میں ہی ہیں۔“ اپٹن نے کہا اور اسٹیلا کا بازو پکڑ کر وہاں سے چلا گیا۔

ان کے جانے کے بعد اسکوٹی نے پوچھا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے؟“

”میں سمجھتا ہوں کہ ان دونوں میں سے کسی ایک نے رینی کو قتل کیا ہے۔ ممکن ہے کہ دونوں نے مل کر یہ کام کیا ہو۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ دونوں کے پاس قتل کا موقع اور جواز موجود تھا۔“

”شاید میں تمہاری مدد کرسکوں۔“ کریچر نے کہا۔ ”کیا میں اس دفتر کا معائنہ کرسکتا ہوں جہاں رینی کی موت واقع ہوئی؟“

چکی تھی۔ تم وہاں کی چیز کو ہاتھ نہیں لگاؤ گے۔“

میں اسے لے کر رینی کے دفتر کی طرف چل دیا۔ میں نے راستے میں اس سے پوچھا کہ اس نے اسٹیلا کے کان میں کیا کہا تھا کہ اس کا چہرہ زرد ہوگیا۔

”میں نے صرف اسے یہ یاد دلایا تھا کہ کسی روحانی ماہر سے کچھ چھپانا سراسر حماقت ہے اور اسے یقین آگیا کہ میں سب جانتا ہوں۔ اس لیے وہ سچ بولنے پر مجبور ہوگئی۔“

میں نے دفتر کا دروازہ کھولا اور دونوں کو ساتھ لے کر اندر چلا گیا۔ رینی کی لاش وہاں سے ہٹائی جا چکی تھی لیکن وہ مجسمہ وہیں موجود تھا۔ کریچر نے کمرے میں داخل ہوکر آنکھیں بند کرلیں اور اپنے دونوں بازو پھیلا کر آہستہ آہستہ گھومنے لگا۔ میں یہ تماشا پہلے بھی کئی مرتبہ دیکھ چکا تھا۔

”غصہ۔“ اس نے سرگوشی کی۔ ”ناراضگی، حسد، عیاشی۔ مجھے اس کمرے میں منفی جذبات کی لہریں محسوس ہورہی ہیں۔ اس تمام تر کامیابی کے باوجود رینی ایک غیر مطمئن اور ناخوش شخص تھا۔ اسے مزید کی خواہش تھی۔“

”میرا خیال ہے کہ یہی اس کے ٹیلی وژن شو کا بھی موضوع تھا۔“ میں نے کہا۔

”اس حد تک تو یہ سچ ہے لیکن اس کی نیت کبھی بھی خیر ہونے کی نہیں تھی۔ میں اسے برسوں سے جانتا تھا لیکن کبھی اس کے لالچ کی گہرائی کو نہیں سمجھ سکا۔ بہرحال اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ جس کسی نے بھی رینی کو اس مجسمے پر دھکیلا تھا اس نے کوئی نشان نہیں چھوڑا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ممکن ہے کہ اندھیرے کی وجہ سے کچھ چیزیں ہمیں نظر نہ آرہی ہوں۔ اسکوٹی پردے ہٹا دو تاکہ کمرے میں کچھ روشنی آئے۔“

اسکوٹی کھڑکی کی طرف بڑھا۔ اس سے پہلے کہ میں کریچر سے مزید کچھ پوچھتا۔ اسکوٹی چلایا اور تیزی سے مڑا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ پکڑا ہوا تھا۔ وہ کھڑکی کے ساتھ رکھی ہوئی کرسی سے ٹکرایا اور اس سے پہلے کہ وہ مجسمے پر گرتا، میں نے اسے سنبھال لیا۔

”کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”چھپکلی۔“ اس نے اپنے گال پونچھتے ہوئے کہا۔ ”وہ اسی طرف جارہی تھی۔ مجھے چھپکلیوں سے نفرت ہے۔“

”ایک منٹ۔“ کریچر نے کہا۔ ”یہ بات ہے۔“

"کیا؟" میں نے کہا۔
"دیکھو، تم نے جس جگہ سراغ رساں اسکوٹی کو پکڑا۔ اگر تم اسے نہ روکتے تو وہ بھی مجسمے پر گر جاتا بالکل اسی طرح جیسے ریجی گرا تھا۔"
میں نے غور سے اس جگہ کو دیکھا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ "ہمیں اسٹیلا سے مزید چند سوالات کرنے کی ضرورت ہے۔" کرپیٹر نے کہا۔
"ہم نے اسٹیلا کو دوبارہ اسٹڈی میں بلایا۔ جب وہ کرسی پر بیٹھ گئی تو کرپیٹر نے پوچھا۔" اسٹیلا! کیا تم بتا سکتی ہو کہ ریجی کو کوئی فوبیا تھا؟"
"ہاں، وہ چھپکلیوں اور سانپوں سے بہت ڈرتا تھا۔"
"شکریہ اسٹیلا۔" میں نے کہا۔ "تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ ضرورت ہوئی تو تمہیں بلا لیں گے۔"
اس کے جانے کے بعد میں نے کہا۔ "کارل اپٹن اور اسٹیلا میں سے کسی ایک پر قتل کا الزام عائد کیا جا سکتا ہے لیکن پہلا شک اپٹن پر ہے۔"
"کیوں؟" کرپیٹر نے پوچھا۔
"میں نہیں سمجھتا کہ اسٹیلا کسی مرد کو اتنی قوت سے دھکا دے سکتی ہے کہ اس کا جسم مجسمے کے نکیلے حصوں میں پیوست ہو جائے۔"
"اس کے برعکس میرے پاس ریجی کی موت کے حوالے سے ایسی وضاحت موجود ہے جو ان دونوں کو بے گناہ ثابت کر سکتی ہے۔" کرپیٹر نے کہا۔
"یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ ریجی کھڑکی کی طرف گیا، اس کی نظر چھپکلی پر گئی، وہ خوف کے مارے اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور شیشے کے مجسمے پر جا گرا۔ اس کے تیز نکیلے حصے کیل کی طرح اس کے جسم میں گڑ گئے۔"
"ہم نے ابھی اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔" اسکوٹی نے کہا۔ "اگر تم مجھے نہ پکڑتے تو اس وقت میری بھی قبر تیار ہو رہی ہوتی۔"
"لیکن اس جھگڑے کے بارے میں کیا کہو گے؟" میں نے اعتراض کیا۔ "زوجین کے درمیان بے وفائی۔ وہ دھمکیاں جو ریجی نے اپٹن کو دیں۔ کیا تم یہ کہہ رہے ہو کہ وہ سب محض ایک اتفاق تھا؟"
"میری گواہی یہی ہوگی۔" کرپیٹر نے کہا۔
"گواہی؟"
"بالکل اگر تم نے کارل اپٹن پر قتل کا الزام عائد کیا تو میں اس کے حق میں گواہی دینے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ اسے کبھی بھی سزا نہیں ہو سکے گی۔"
"کیا تمہیں واقعی یقین ہے کہ ریجی کی موت ایک حادثہ تھی؟" میں نے پوچھا۔
"تمہیں معلوم ہے کہ میں محبت پر یقین رکھتا ہوں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ اپٹن اور اسٹیلا ایک دوسرے سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں۔ اپٹن ایک اچھا شخص ہے جو ریجی کے لیے خطرناک کام کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ایک ناشائستہ شخص مر گیا ہے لیکن یہ مناسب نہیں کہ اس کے نتیجے میں دو اچھے انسانوں کی زندگی برباد ہو جائے۔"
"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے بوائے۔" اسکوٹی نے کہا۔
"سب سے سادہ وضاحت ہی عام طور پر درست ہوتی ہے۔ یہ سازش سے زیادہ ایک حادثہ معلوم ہو رہا ہے۔"
"اس کے علاوہ میرا موقف اتنا مدلل ہے کہ اسے کوئی بھی غلط نہیں کہہ سکتا۔" کرپیٹر نے کہا۔
"یقیناً تم اسے غلط نہیں کہو گے۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن تمہاری بات میں وزن ہے۔ ابھی تک میرے پاس ایسی کوئی ٹھوس شہادت نہیں جس کی بنیاد پر ڈسٹرکٹ اٹارنی اس کیس کی پیروی کر سکے بلکہ وہ میرا مذاق اڑائے گی۔ ٹھیک ہے۔ ہم اسے حادثاتی موت قرار دیتے ہیں۔ سراغ رساں بیگز، تم کاغذی کارروائی مکمل کر لو۔"
"ٹھیک ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم خود یہ کام کیوں نہیں کر لیتے؟"
"کیونکہ میں نے مارٹل بیچ پر ریزرویشن کروا رکھی ہے۔ مچھلیاں پکڑنے کا پروگرام ہے۔ اگر اگلے ایک گھنٹے میں روانہ ہو گیا تو اندھیرا ہونے سے پہلے وہاں پہنچ جاؤں گا۔"
"میں بھی اختتام ہفتہ وہاں آ رہا ہوں۔" کرپیٹر نے کہا۔ "کیا خیال ہے اگر ہم دونوں اکٹھے ڈنر کریں۔ ایک ساتھ وقت گزارنا کتنا اچھا لگے گا جب ہم کسی بزدلانہ جرم کی تفتیش نہ کر رہے ہوں۔"
"میرا ذہن پڑھ لو۔" میں نے کہا۔ "اور مجھے بتاؤ کہ کیا ایسا ہونے والا ہے۔"
وہ ناقابل فہم انداز میں مسکرا دیا لیکن اس کی آنکھوں کی چمک نے مجھے بتا دیا کہ وہ میرا ذہن پڑھ چکا ہے۔ بہرحال وہ ایک روحانی ماہر تھا۔

ثبوت

تنویر واسطی

قیامت کی سردی پڑ رہی ہو... سرد ہوا کے جھونکے لباس کو چھید کر بدن میں تیر کی طرح چبھ رہے ہوں... اس اذیت کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو دل کے ٹوٹنے... توقعات کے بکھر جانے سے ہوتی ہے... بچھڑنے والے جوڑنے کی حقیقت اور خود فریبی کے درمیان حائل تعلقات کی کشمکش... وقت مسافتیں طے کر چکا تھا مگر وعدوں کی امانتیں قرض تھیں جو اسے اتارنا تھیں...

مغربی ماحول کی پروردہ آزاد خیال کہانی کے موڑ
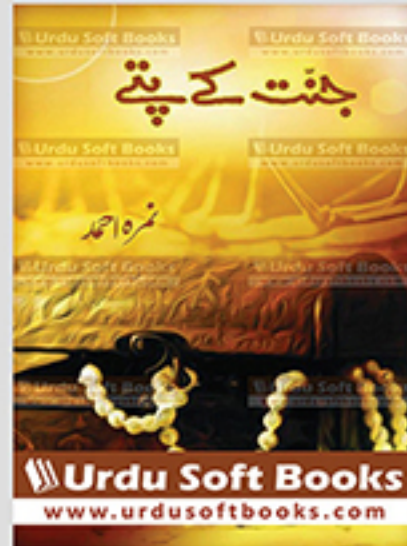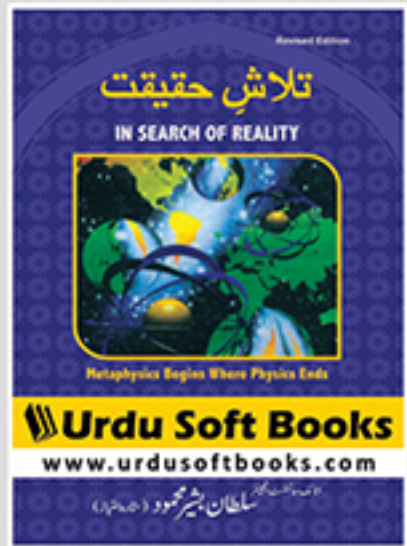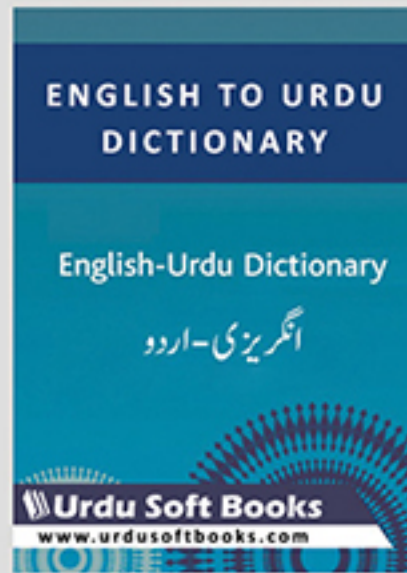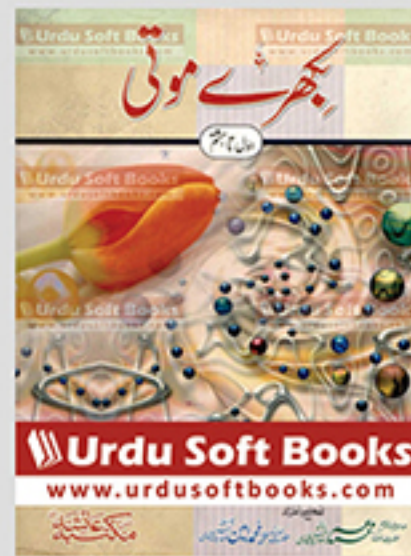
ایڈم نے نظریں اٹھا کر ویٹرس کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک پیغام تھا جسے اس نے فوراً ہی پڑھ لیا۔ تاہم اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی سائرہ نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ بدستور باتیں کر رہی تھی۔ ویٹرس نے ان کے سامنے مشروب رکھے اور معنی خیز انداز میں ایڈم کو دیکھتی ہوئی چلی گئی۔

"کینٹ اسٹیٹ میں لوگوں نے جائے وقوعہ کی تصویریں لے لیں۔ اس طرح پولیس کے لیے اپنے کیے

ہوئے کی تردید کرنا مشکل ہو گیا لیکن جیکسن اسٹیٹ میں کسی نے ایسا نہیں کیا۔ لہٰذا پولیس والے کہہ سکتے ہیں کہ وہ محض لوگوں کو منتشر کرنے کے لیے ہوائی فائرنگ کر رہے تھے کہ دو آدمیوں کو گولی لگ گئی اور کوئی بھی ثابت نہیں کر سکتا کہ یہ جھوٹ ہے لیکن میں کچھ لوگوں کو جانتی ہوں جو وہاں موجود تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ کسی نے پولیس پر گولی نہیں چلائی۔ ان میں سے ایک شخص جسے گولی لگی وہ ہنگامے میں شامل ہی نہیں تھا بلکہ وہ تو ہائی اسکول کا طالب علم ہے جو گروسری اسٹور سے اپنے گھر جا رہا تھا۔ اس کی عمر صرف سترہ سال تھی۔"

ایڈم نے اپنے سامنے رکھی ہوئی بیئر کی بوتل اٹھائی تو اس کے نیچے رکھے ہوئے نیپکن کی تہ میں اسے ایک کارڈ رکھا ہوا نظر آیا۔ اس نے تہ ہٹا کر دیکھا۔ وہ تاش کا پتا تھا۔ حکم کا اِکا۔ اس نے فوراً ہی اپنی نظریں اس پر سے ہٹالیں لیکن ساندرہ نے اس کا نوٹس لیا اور بولی۔

"یہ کیا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے ٹالنے کی غرض سے کہا۔

"کیا یہ ویٹریس نے رکھا ہے؟ وہ ایسا کیوں کرے گی؟"

"یہ ویٹریس نے نہیں رکھا۔ میرا کوئی دوست یہاں موجود ہے، یہ مذاق اس نے کیا ہے۔"

"میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی۔" ساندرہ مطمئن نہیں ہوئی۔

ایڈم نے ہال کا جائزہ لیا۔ اتوار کی سہ پہر ہونے کی وجہ سے وہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تقریباً تمام میزیں اور زیادہ تر اسٹولوں پر لوگ بیٹھے ہوئے اپنے پسندیدہ مشروب سے دل بہلا رہے تھے۔

ساندرہ نے پوچھا۔ "وہ کہاں ہے؟"

"میں نے اسے نہیں دیکھا۔"

ساندرہ نے اس پر ٹٹولتی ہوئی نگاہ ڈالی اور بولی۔ "پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ کوئی مذاق ہے۔"

ایڈم نے پُرسکون ہونے کی کوشش کی اور بولا۔ "وہ احمق ہے۔ اسے بھول جاؤ۔ ہاں تو تم کیا کہہ رہی تھیں؟"

"میں کہہ رہی تھی کہ جیکسن اسٹیٹ میں جو کچھ ہوا۔ حکومت اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہی ہے اور چاہتی ہے کہ لوگ پولیس کی کارروائی کے بجائے مظاہرین کے احتجاج پر توجہ مرکوز کریں۔"

وہ بول رہی تھی اور ایڈم اس کی باتوں پر توجہ دینے کی کوشش کر رہا تھا لیکن جیسے ہی اسے معلوم ہوا کہ گلوریا ہال میں موجود ہے۔ اس کے لیے ساندرہ کو سننا مشکل ہو گیا۔ وہ بے دھیانی میں اپنا سر ہلاتا رہا جبکہ وہ چوری چوری گلوریا کو دیکھ رہا تھا۔ وہ تنہا بیٹھی ہوئی تھی اور ابھی تک ان دونوں کی نظریں چار نہیں ہوئی تھیں۔

ساندرہ نے کہا۔ "تم جا کر اس سے بات کیوں نہیں کر لیتے؟"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"میرا مطلب ہے وہ لڑکی۔" اس نے ناراضگی سے کہا۔ "تم اس سے بات کیوں نہیں کر لیتے۔ لگتا یہی ہے کہ تم میرے بجائے اس میں زیادہ دلچسپی لے رہے ہو؟"

"نہیں، میں......"

ساندرہ کے چہرے پر سختی تھی۔ اس نے کڑی نظروں سے اسے دیکھا۔ ایڈم کے لیے مزید جھوٹ بولنا ممکن نہ تھا۔ وہ معذرت کر کے اپنی جگہ سے اٹھا اور گلوریا کی میز کی جانب بڑھ گیا۔ وہ اب بھی پُرکشش نظر آرہی تھی۔ انہیں ایک دوسرے سے الگ ہوئے آٹھ مہینے ہو گئے تھے لیکن اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اسے یہاں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ورنہ وہ تنہا نہ ہوتی۔

گو کہ ابھی تک انہوں نے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا لیکن ایڈم نے اس کے سامنے بیٹھنے سے پہلے اس سے اجازت نہیں مانگی۔ جب گلوریا نے ایڈم کو دیکھا تو اسے کوئی حیرانی نہیں ہوئی۔ ایڈم کو وہ وقت بھی یاد تھا کہ جب وہ اسے دیکھتی تو اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی لیکن اب اس کی جگہ نفرت نے لے لی تھی۔

گلوریا کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے کہا۔ "ہائے۔"

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"میں تم سے ملنے آئی ہوں۔"

"کیوں؟"

"مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ اسی لیے میں نے تمہیں کارڈ بھیجا تھا۔"

اسے یاد آیا کہ یہ مضحکہ خیز خیال انہیں اچانک ہی آیا تھا کہ اگر دونوں میں سے کوئی ایک کسی مشکل میں ہو تو وہ تاش کا پتا کسی ایسی جگہ پر چھوڑ دے جہاں سے وہ دوسرے ساتھی کو مل جائے۔ یہ گویا ایک طرح کا اشارہ ہوگا۔ اس بارے میں انہوں نے تفصیل سے گفتگو کی تھی۔ وہ یہ بھی طے کرنا چاہ رہے تھے کہ مسئلے کی نوعیت ظاہر کرنے کے لیے مختلف کارڈز استعمال کیے جائیں لیکن گلوریا تمام مواقع کے لیے حکم کا اِکا استعمال

کرنے کے حق میں ہی۔

اب وقت بدل گیا تھا۔ اس نے تلخی سے پوچھا۔ ”مجھے تمہاری مدد کیوں کرنا چاہیے؟“

”کیونکہ تم ہی وہ واحد شخص ہو جو میری مدد کر سکتے ہو۔“

”مجھے تمہاری بات پر یقین نہیں آرہا۔ تم جو چاہتی ہو وہ کوئی اور بھی کر سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ تمہارے چاہنے والے ایک سے زیادہ ہوں۔“

”مجھے کینسر ہو گیا ہے۔“

ایڈم کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ وہ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دماغ ماؤف ہو گیا جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

”تم تو ابھی پچیس کی بھی نہیں ہو۔“

”میں جانتی ہوں۔“

”یہ کینسر کس قسم کا ہے؟“

”میرے گائناکولوجسٹ کو معلوم ہے۔ اسی نے بتایا ہے۔“

ایڈم کے پورے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔

گلوریا نے کہا۔ ”اس کا علاج صرف آپریشن سے ہی ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اس میں بچنے کا امکان ہے لیکن اس کے لیے بہت پیسوں کی ضرورت ہے۔“

”میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔“

”ہم دونوں جانتے ہیں کہ پیسوں کا انتظام کون کر سکتا ہے۔“

ایڈم نے ایک گہری سانس لی اور سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ کس جانب ہے۔

گلوریا نے کہا۔ ”تمہیں صرف ایک کام کرنا ہے۔ اس بار ایک بڑی شخصیت اس کے نشانے پر ہے۔ تم ہی وہ واحد شخص ہو جو یہ کام کر سکتے ہو۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر میں نے تمہیں اس کام کے لیے راضی کر لیا تو وہ آپریشن کے اخراجات برداشت کرے گا۔ خواہ وہ کتنے ہی کیوں نہ ہوں۔“

ایڈم کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ”میں کس طرح تمہاری بات پر یقین کر لوں۔“

”یہ سچ ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے ملنا نہیں چاہتے۔ اب بھی نہیں حالانکہ میں اسی جگہ رہتی ہوں لہٰذا جب تم نے مجھے فون نہیں کیا تو میں سمجھ گئی کہ تم اپنی کہی ہوئی بات پر قائم ہو یعنی یہ کہ مجھ سے کبھی نہیں ملو گے۔“

یہ کہہ کر اس نے نظریں جھکا لیں اور بولی۔ ”مجھے واقعی امید تھی کہ تم فون کرو گے۔“

”میں یہ سب کچھ نہیں سننا چاہتا۔“ یہ کہہ کر وہ کرسی سے اٹھنے لگا۔ وہ تیزی سے اس کے قریب آگئی اور اس کا بازو پکڑتے ہوئے بولی۔

”تم میری آخری امید ہو۔ میں ہر کوشش کر کے دیکھ چکی ہوں۔ اگر تم اب بھی مجھ سے نفرت کرتے ہو تو کوئی بات نہیں لیکن میں نے سوچا کہ شاید تم میری مدد کرو کیونکہ تم نے ہمیشہ مجھ سے نفرت نہیں کی۔ کبھی تم مجھ سے محبت بھی کرتے تھے۔“

ایڈم نے اپنا بازو اس کی گرفت سے آزاد کراتے ہوئے کہا۔ ”میں یہ سب نہیں کر سکتا۔“

یہ کہہ کر وہ پیچھے دیکھے بغیر بار سے باہر چلا گیا۔

اس نے پورا ہفتہ گلوریا کے بارے میں سوچتے ہوئے گزارا۔ جو گلوریا نے بتایا۔ اس بارے میں نہیں بلکہ اس کے ساتھ گزارے ہوئے لمحے اسے یاد آتے رہے جو اس کی ایک سالہ رفاقت کا سرمایہ تھے۔ اسے یہ بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ آٹھ ماہ گزر جانے کے باوجود وہ اسے بھول نہیں پایا۔ بار میں اس کی ایک جھلک دیکھنے کے بعد وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو بہت کمزور محسوس کر رہا تھا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ ایسا کیوں ہوا۔

گلوریا نے بار میں اسے جو کچھ بتایا، اس کے بارے میں اس نے بہت سوچا اور ہر بار جھوٹ سمجھ کر اس کہانی کو مسترد کرتا رہا لیکن اچانک ہی اسے گلوریا کی باتوں پر یقین آنے لگا اور اس کے ساتھ ہی اسے یہ احساس ہونے لگا کہ اسے بار سے باہر آنے سے پہلے یہ تو پوچھ لینا چاہیے تھا کہ اسے یہ مرض کب لاحق ہوا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا اس وقت بھی اسے کینسر تھا جب وہ دونوں اکٹھے تھے۔

اسے اس وقت اور زیادہ حیرت ہوئی کہ ایک ہفتہ گزر جانے کے بعد گلوریا کا فون آیا اور نہ ہی وہ اس کے اپارٹمنٹ پر آئی۔ اتوار کی شام وہ گھر واپس آرہا تھا کہ اس نے بوشر کو اپنے اپارٹمنٹ کی سڑک کے پار ایک کھڑی ہوئی کار میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ گزشتہ آٹھ ماہ سے اس سے نہیں ملا تھا لیکن اس نے اسے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی۔ اس نے یہ ظاہر کیا جیسے اس نے بوشر کو دیکھا ہی نہیں۔ اسے یہ ڈر نہیں تھا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہو گا بلکہ وہ اسے نظر انداز کرنا چاہ رہا تھا لیکن وہ اپنی عمارت کی سیڑھیوں سے آدھے فاصلے پر رک گیا۔ اس نے سوچا کہ بہتر ہے اس سے نمٹ لیا جائے۔

اس نے مڑ کر دیکھا۔ بوشر گاڑی چلاتا ہوا اس کی طرف آرہا تھا۔ وہ اس کا انتظار کرنے لگا۔ جب بوشر نے اس کے

برابر میں کار کی گردن کو وہ ٹیڑھی کر کے اس میں سوار ہو گیا۔ کار کی آگے بڑھاتے ہی ایڈم نے کسی تمہید کے بغیر کہنا شروع کیا۔

''اس نے تمہیں کیا بتایا؟ وہ ایسا کیوں سمجھتی ہے کہ مجھے اس کام کے لیے آمادہ کر لے گی؟''

بوشر نے اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ''اسے کینسر ہے۔'' پھر اس نے غور سے ایڈم کو دیکھا جیسے اس کے تاثرات جاننا چاہ رہا ہو۔ ''تم اس پر یقین کر سکتے ہو۔ میں اس کے ڈاکٹر سے بات کر چکا ہوں۔''

ایڈم باہر دیکھنے لگا۔ اس نے ایک منٹ تک کوئی بات نہیں کی۔ بوشر نے پوچھا۔ ''اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

ایڈم نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے اس سے کوئی وعدہ نہیں کیا۔''

بوشر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ اس کے لیے ایک مشکل وقت ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ اس سے نکل آئے گی۔''

''اسے کس قسم کا کینسر ہے؟''

''میں اس کا مخصوص نام بھول گیا۔ اس کے رحم میں کوئی مسئلہ ہے۔ کیا اس نے تمہیں نہیں بتایا؟''

''نہیں، اس نے کچھ زیادہ تفصیل نہیں بتائی۔'' ایڈم نے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر کہا۔ ''اس کا آپریشن کب ہوگا؟''

''جتنا جلدی ہو جائے بہتر ہے۔'' کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بوشر بولا۔ ''میرا خیال تھا کہ تم مجھے فون کرو گے۔''

''کام کیا ہے؟''

''ایک دفتری عمارت اور ایک سیف۔ ہمارے پاس ان میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی مکمل معلومات نہیں ہیں جس کی وجہ سے ہمیں کارروائی کرنے میں مشکل پیش آ رہی ہے۔ اس کے لیے ہمیں ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو پہلے وہاں کا جائزہ لے اور اگلی رات تیاری کر کے جائے۔''

''ٹارگٹ کون ہے؟''

''اگر تم کام کرنے پر آمادہ ہو جاؤ تو گلوریا تمہیں اس بارے میں بتا دے گی۔''

ایڈم کو اسی جواب کی توقع تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''تم مجھے کیا بتانا چاہ رہے ہو؟''

''تمہیں اپنی فیس ملے گی۔ اس کے علاوہ گلوریا کے علاج کے تمام اخراجات ہم برداشت کریں گے۔''

ایڈم نے اپنی بھویں اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ واقعی تمہارے لیے بہت اہم ہے۔''

بوشر نے کوئی جواب نہیں دیا تو ایڈم نے کہا۔ ''اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اپنی گردن پھنسا لوں۔ میں گزشتہ برس تمہارے لیے ایسے کئی کام کر چکا ہوں۔''

''میں تمہیں قائل کرنے کی کوشش نہیں کر رہا اگر تم یہ کام نہیں کرنا چاہتے تو ہم بھی اصرار نہیں کریں گے۔''

''نہیں، تم ہمیشہ دوسرے لوگوں کو استعمال کرتے ہو۔''

''اگر چاہو تو میں تمہیں یہاں اتار دوں۔'' بوشر نے کہا۔

''ہاں، کیوں نہیں۔''

بوشر نے گاڑی روک دی۔ ایڈم دروازہ کھولنے لگا تو اس نے کہا۔ ''گویا تم انکار کر رہے ہو؟''

''میں فی الحال کچھ نہیں کہہ رہا۔''

''سوچنے میں زیادہ وقت مت لگانا۔ جب فیصلہ کر لو تو گلوریا کو فون کر دینا۔ اس کا نمبر وہی ہے۔''

ایڈم کار سے باہر نکل آیا۔ کاش وہ کہہ سکتا کہ اسے وہ نمبر یاد نہیں رہا۔

جیسے ہی بوشر نے گاڑی آگے بڑھائی، وہ مخالف سمت میں چلنے لگا۔ اس نے یہ احتیاط برتی کہ اپنے اردگرد چلنے والوں کو نہ دیکھے۔ اسے ان لوگوں کی طرف سے پریشانی تھی جو اس کے بجائے بوشر کو دیکھ رہے تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو کسی کی توجہ کا مرکز بن سکیں۔

''اسی لیے تم ایک اچھے نقب زن ہو۔'' بوشر نے ایک دفعہ کہا تھا۔ ''نہ صرف یہ کہ تم ہر جگہ جا سکتے ہو بلکہ دیکھنے میں بھی وہیں کے لگتے ہو۔''

ایف بی آئی کے لیے کام کرنا ایک غلطی تھی، اس کا احساس ایڈم کو اب ہو رہا تھا۔ شروع میں اسے یہ کام بہت اچھا لگتا تھا۔ اسے ٹھیک طرح سے یاد نہیں تھا کہ اس نے یہ فیصلہ کب کیا لیکن وہ اپنے آپ کو غلط نہیں سمجھ رہا تھا۔ کوئی ایف بی آئی ایجنٹ کام ختم ہونے کے دو گھنٹے بعد دروازے پر دستک دے اور وہ سب کچھ دہرا دے جو آپ نے کیا یا جو چیزیں چرائیں تو یہ کسی بھی شخص کو گھبرانے کے لیے کافی ہیں۔ جب بوشر نے اپنی بات ختم کی تو ایڈم کو محسوس ہوا کہ کمرے کی دیواریں اسے جکڑ رہی ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا الزام وہ اپنے سوا کسی اور کو نہیں دے سکتا۔ شاید وہ نہیں جانتا تھا کہ ایف بی آئی نے اس کے مکان میں جاسوسی کے آلات نصب کر رکھے ہیں اور گھر کے باہر ایک شخص کیمرا سمیت موجود ہے۔ لیکن اسے گھر سے باہر نکلتے وقت محتاط رہنا چاہیے تھا اور احتیاطی تدبیر کے ذریعے اس بات کو یقینی بنانا چاہیے تھا کہ کوئی

اس کا پیچھا تو نہیں کر رہا۔ کیونکہ بوشر نے اس کے دروازے سے ہی تعاقب کا انتظام کر رکھا تھا۔

بوشر نے ہی اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ ایف بی آئی کے لیے مختلف مقامات پر نقب زنی کر کے ملک کی خدمت کر سکتا ہے۔ اس نے یہ بات کچھ ایسے انداز میں کی جسے چھپی ہوئی دھمکی نہیں کہا جا سکتا۔ بہر حال یہ واضح طور پر بلیک میلنگ تھی، اس کے بعد وہ بوشر کی شرائط پر کام کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

کچھ عرصے تک وہ حب الوطنی کے جذبے کے تحت ایف بی آئی کے لیے کام کرتا رہا۔ بوشر نے اسے ان لوگوں کے بارے میں کافی معلومات دیں جن کے یہاں اسے نقب لگانا تھی۔ یہ بدکردار لوگ تھے۔ ان میں انارکسٹ، سیاہ فام جنگجو اور کالعدم تنظیم کے اراکین شامل تھے۔ ایڈم نے ابتدائی چند مواقع پر محسوس کیا کہ وہ واقعی اپنے ملک کا دفاع کر رہا ہے جب اس نے کسی گھر یا دفتر کی نقب زنی کے دوران کچھ تنظیموں کے اراکین کی فہرست اور ان کے بینک گوشواروں کی تصویریں اتاریں لیکن جب اس سے کہا گیا کہ وہ ویت نام کی جنگ کے خلاف احتجاج کرنے والوں اور انسانی حقوق کے لیے سرگرم افراد کے ساتھ بھی یہی کارروائی کرے تو وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ بوشر کا کہنا تھا کہ یہ لوگ ریاست کے دشمن ہیں اور اتنے ہی خطرناک ہیں جتنا کہ لوگوں کو مارنے یا حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کرنے والے ہو سکتے ہیں۔ بالآخر اس نے یہ کام چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا لیکن پھر گلوریا بیچ میں آ گئی۔

☆☆☆

دروازے پر دستک ہوئی تو وہ ایک بار پھر ماضی سے حال میں آ گیا۔ اس نے پن ہول سے جھانک کر دیکھا۔ وہاں گلوریا کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور کچھ کہے بغیر ہاتھ ہلا دیا پھر وہ چلتا ہوا کمرے کے وسط میں آیا اور مڑ کر اسے دیکھنے لگا لیکن کچھ بولا نہیں۔

وہ پُرامید لہجے میں بولی۔ ”بوشر جاننا چاہتا ہے کہ تم نے کیا فیصلہ کیا؟“

”میں نے ابھی تک اپنا ذہن تیار نہیں کیا۔“

”ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ یہ کام ہفتے سے پہلے ہو جانا چاہیے اور تم جانتے ہو کہ میرے پاس بھی زیادہ وقت نہیں ہے۔“

”تمہیں کس قسم کا سرطان ہے؟“

”رحم کی اندرونی جھلی کا سرطان۔“

”کیا تمہیں یقین ہے؟ کیا تمہاری گائناکالوجسٹ اتنی قابل ہے؟“

”اس نے مجھے ایک اسپیشلسٹ کے پاس بھیجا تھا۔ اس نے بھی ڈاکٹر ایڈنگر کی تصدیق کر دی اور تمام ٹیسٹ بھی مثبت آئے ہیں۔“

”اور اس آپریشن کے بعد تم تندرست ہو جاؤ گی؟“

”کسی نے مجھ سے یہ وعدہ نہیں کیا اور نہ ہی کوئی تندرستی کا لفظ استعمال کر رہا ہے۔ ان کا صرف یہ کہنا ہے کہ اس طرح کے آپریشن زیادہ تر کامیاب ہوتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے گلوریا کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ ”اگر یہ کامیاب ہو گیا تب بھی میرے ساتھ مسائل رہیں گے۔ میں کبھی ماں نہیں بن سکوں گی۔“

ایڈم کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔

”جانتی ہوں کہ میں نے تمہیں تکلیف پہنچائی ہے۔“ وہ بولی۔ ”لیکن کیا تم مجھ سے اتنی زیادہ نفرت کرتے ہو۔ تم چاہتے ہو کہ میں مر جاؤں۔“

ایڈم نے منہ بنایا اور کوئی جواب دینے کے بجائے کچن کے کاؤنٹر کے پیچھے چلا گیا جو کچن اور لیونگ روم کے درمیان بنا ہوا تھا۔ گلوریا بھی اس کے پیچھے آئی اور کاؤنٹر کے دوسری جانب کھڑے ہو کر بولی۔ ”کیا تم چاہتے ہو کہ میں جھک کر تم سے معافی مانگوں۔ میں یہ بھی کر لوں گی۔“

”نہیں۔“

”میں وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں جس سے میرے کیے کی تلافی ہو سکے۔ مجھے یہ کام اس بیماری سے پہلے ہی کر لینا چاہیے تھا لیکن میرا اندازہ ہے کہ تم بھی میری بات کا یقین نہ کرتے۔“

ایڈم خاموشی سے سنتا رہا۔ اسے ماضی میں کی گئی گلوریا سے گفتگو یاد آ رہی تھی۔

وہ بولی۔ ”میں تمہیں قائل کرنے کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟“

”ٹارگٹ کون ہے؟“

”رابرٹ ٹی لینڈرز۔ وہ کانگریس مین ہے۔“

”اوہ میرے خدا۔“

”میں تم سے مخلص ہوں حالانکہ مجھے اس کا نام نہیں بتانا چاہیے تھا جب تک تم یہ کام کرنے پر تیار نہ ہو جاتے لیکن مجھے اس کی پروا نہیں۔ میں تمہیں وہ سب بتاؤں گی جو تم جاننا چاہو گے تاکہ تمہیں یقین ہو جائے کہ میں کچھ نہیں چھپا رہی۔“

ایڈم نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔ ”یہ شخص بوشر کی فہرست میں کیسے آ گیا۔ کیا اس نے چندہ دینا کم کر دیا؟“

”میں نہیں جانتی۔ بہر حال وہ اس کے لیے مسائل پیدا

کررہا ہے۔ جب سے تم نے بوشر کا ساتھ چھوڑا ہے، وہ سیاست دانوں کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ آدھا وقت وہ ان کی کمزوریاں تلاش کرنے میں گزار دیتا ہے تاکہ بعد میں ان کے خلاف استعمال کرسکے۔"

ایڈم نے بیزاری سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "وہ حد سے بڑھتا جارہا ہے بلکہ پوری حکومت کا یہی حال ہے۔ اسی لیے میں دو سال پہلے یہ کام چھوڑنا چاہ رہا تھا۔ یہ لوگ جنون کی حد تک شکی ہوچکے ہیں اور اب تو کالج کے لڑکوں پر بھی احتجاج کرنے کے جرم میں گولی چلا دیتے ہیں۔"

"میں جانتی ہوں۔"

وہ خاموش ہوگیا جب اس نے گلوریا کی آواز کو محسوس کیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہورہا تھا کہ وہ اس کی کہی ہوئی ہر بات سے متفق ہے۔ گلوریا نے بھی اس کے تاثرات میں تبدیلی دیکھی اور جلدی سے بولی۔ "وہ چاہتا ہے کہ سیف میں جو کچھ بھی ہے، تم اس کی تصویریں اتار لو اور پھر یہ لفافہ وہاں رکھ دو۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے پرس سے ایک لفافہ نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ اس نے جس طرح لفافے کو دستانے پہنے بغیر پکڑا۔ اس سے ظاہر ہورہا تھا کہ اس کے اندر ایک اور لفافہ بھی ہے۔ ایڈم سوچ رہا تھا کہ اس لفافے میں ایسی کیا دستاویزات یا تصاویر ہوسکتی ہیں جن سے کسی کو پھنسایا جا سکے۔

گلوریا بولی۔ "میں جانتی ہوں کہ تم یہ کام مزید نہیں کرنا چاہتے لیکن تم کسی کو نقصان نہیں پہنچا رہے۔ سوائے ایک احمق سیاست داں کے جو بقیہ سیاست دانوں کی طرح گندہ ہے اور تم میری مدد بھی کررہے ہو۔ اس طرح میری زندگی بچ جائے گی۔"

ایڈم نے لفافے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔

"اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم مجھے معاف کردو۔ یہ کام کرنے کے باوجود تم مجھ سے نفرت کرسکتے ہو اور تم مجھے دوبارہ کبھی نہیں دیکھو گے۔"

ایڈم نے آگے بڑھ کر لفافہ اٹھایا اور بولا۔ "ٹھیک ہے۔"

گلوریا کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ رونے لگی۔ ایڈم اپنی جگہ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اسے وہ وقت یاد آگیا جب اس نے اسے آخری بار روتے ہوئے دیکھا تھا۔

☆☆☆

یہ گزشتہ ستمبر کی بات ہے جب بوشر نے اسے ایک کام کے سلسلے میں میامی بھیجا تھا۔ وہ اس کے لیے پیغام رساں کا کام کرتی تھی۔ وہ زیادہ تر ایسی معلومات اور ہدایات لے کر جاتی تھی جو بہت زیادہ حساس نوعیت کی ہوں اور جنہیں ٹیلی فون یا ای میل کے ذریعے بھیجنا ممکن نہ ہو۔ گلوریا کے میامی جانے کا فیصلہ بالکل آخری لمحات میں ہوا۔ پہلے تو ایڈم بہت ناراض ہوا کیونکہ گلوریا زیادہ تر اسی کے ساتھ سفر کیا کرتی تھی اور بہت کم ایسا ہوا کہ وہ اس کے بغیر شکاگو سے باہر گئی ہو۔ خاص طور پر اس وقت اسے گلوریا کا جانا بہت ناگوار گزر رہا تھا۔ وہ چودہ تاریخ کو میامی میں ہوتی اور وہ سوچ رہا تھا کہ دونوں کس طرح اپنی پہلی ملاقات کی سالگرہ منائیں گے۔ کیوں نہ میامی پہنچ کر اسے حیران کیا جائے۔ وہیں وہ دونوں پہلی بار ملے تھے۔

چنانچہ اس نے وہاں جانے کا پروگرام بنانا شروع کر دیا۔ وہ جہاز کا کرایہ اور ہوٹل کے اخراجات بہ آسانی برداشت کرسکتا تھا۔ حال ہی میں اس نے بوشر کے لیے ایک دو کام کیے تھے جن سے اسے معقول آمدنی ہوئی تھی۔ باتوں باتوں میں اس نے گلوریا سے اس ہوٹل کا نام معلوم کرلیا جہاں وہ ٹھہرتی۔ وہ حیران تو ضرور ہوئی لیکن اس نے یہ کہہ کر اسے مطمئن کردیا کہ کہیں یہ وہی ہوٹل تو نہیں جہاں وہ پچھلی بار ٹھہرے تھے لیکن اس مرتبہ گلوریا کا قیام کسی دوسرے ہوٹل میں تھا۔

راستے بھر وہ یہی سوچ کر لطف اندوز ہوتا رہا کہ جب گلوریا اسے اچانک اپنے سامنے دیکھے گی تو اس کے چہرے کے کیا تاثرات ہوں گے۔ ان کی پہلی ملاقات میں اس کے برعکس ہوا تھا اور وہ اس کے کمرے میں اس عمارت کے بارے میں اہم معلومات لے کر آئی تھی جہاں اسے نقب لگانا تھی۔ ایڈم نے اپنے دل میں اس کے لیے فوری کشش محسوس کی۔ بعد میں گلوریا نے اعتراف کیا کہ اس نے بھی کچھ ایسا ہی محسوس کیا تھا۔

وہ سہ پہر کے وقت میامی پہنچا اور اسے ماضی میں گلوریا کے ساتھ ہوٹل میں گزارے ہوئے لمحات یاد آگئے۔ وہ تین منزلہ ہوٹل نسبتاً چھوٹا تھا۔ اس نے کمرے میں پہنچ کر ڈیسک کلرک کو فون کیا کہ وہ گلوریا سے اس کی بات کروادے۔ اس نے دوسری گھنٹی پر فون اٹھایا اور اجنبی لہجے میں بولی۔ "ہیلو۔"

"یہ میں ہوں۔" ایڈم نے پرجوش انداز میں کہا۔

"اوہ، ہائے۔" اس کی آواز بدلی ہوئی تھی جیسے وہ گھبرائی ہوئی ہو۔ یقیناً اس کا مخبر اس کے لیے مشکلات پیدا کررہا تھا۔

"تمہارا سفر کیسا رہا؟" ایڈم نے پوچھا۔
"بہت اچھا۔"
"کیا تمہیں معلوم ہے کہ آج کون سا دن ہے؟"
"کیا مطلب؟"
"آج چودہ ستمبر ہے۔ ہماری پہلی ملاقات آج کے دن ہی ہوئی تھی۔"
"اوہ، یہی بات ہے۔"
وہ اس کی آواز سے اندازہ لگا سکتا تھا کہ اسے اس کا کوئی خیال نہیں تھا۔ لیکن اس نے پروا نہیں کی اور بولا۔ "میں کچھ بھیجنا چاہتا ہوں۔ تمہارے کمرے کا نمبر کیا ہے؟"
"دو سو چار۔"
"جب ڈیلیوری بوائے تمہارے دروازے پر دستک دے تو اسے گولی مت مار دینا۔"
اس کی کمزوری ہنسی سنائی دی۔ ان کے درمیان اسی طرح کا مذاق چلتا تھا اور وہ کبھی کبھی اس بات پر بحث کیا کرتے کہ کیا وہ واقعی جاسوس ہیں جبکہ دونوں میں سے کسی کے پاس بھی ہتھیار نہیں ہوتا تھا۔
گلوریا سے بات کرنے کے بعد اس نے روم سروس کو فون کر کے دو افراد کے لیے شیمپین منگوائی اور جب وہ سامان آ گیا تو وہ گلوریا کے کمرے کی طرف چل دیا۔ دستک دینے پر کوئی جواب نہیں آیا۔ اس نے چند لمحے انتظار کرنے کے بعد دوبارہ دستک دی پھر بھی کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ پریشان ہو گیا اور سوچنے لگا کہ اسے تحفے کا تو انتظار کرنا چاہیے تھا کیونکہ اس نے خود بھی یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ تحفہ اسے کب ملے گا۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا اسے کمرے میں واپس جا کر دوبارہ گلوریا کو فون کرنا چاہیے یا یہیں لابی میں رک کر اس کا انتظار کیا جائے۔ آخر میں جو اس کی سمجھ میں آیا۔ وہی کیا اور تالا کھول کر کمرے میں داخل ہو گیا۔
باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ گویا وہ غسل کر رہی تھی۔ یہ جان کر اسے کچھ سکون ملا۔ باتھ روم کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اس نے اس کی جانب بڑھنا شروع کیا۔ اچانک ہی اسے دروازے کے باہر ایک آواز سنائی دی۔ وہ کوئی مرد تھا۔ وہ اپنی جگہ جم کر رہ گیا پھر ایک عورت کی آواز بھی اس میں شامل ہو گئی جسے اس نے فوراً پہچان لیا، وہ گلوریا تھی۔
وہ چند لمحے بے حس و حرکت کھڑا رہا پھر آہستہ قدموں سے چلتا ہوا کمرے سے باہر آ گیا۔ اس کا رخ ہال کی جانب تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنے آپ کو لابی میں پایا۔
وہ ایک کاؤچ پر بیٹھ کر سامنے والی دیوار کو دیکھنے لگا۔ سچائی اس کے سامنے آہستہ آہستہ آ رہی تھی۔ گلوریا صرف پیغام رساں نہیں تھی بلکہ اس کا اصل مقصد کچھ اور تھا۔ وہ لوگوں کی ضرورت پوری کرتی اور اس کے عوض وہ بوشر کی خواہش کے مطابق کام کرتے تھے۔ بوشر جان گیا تھا کہ ایڈم بھی سیاست دانوں اور بے ضرر فعال لوگوں کی تلاش لینے یا انہیں پھنسانے میں خطرہ محسوس کرتا ہے۔ اس کا اظہار وہ بوشر سے کر چکا تھا لہٰذا اس نے ایڈم کا دھیان بٹانے کے لیے گلوریا کو آگے کر دیا جس کا کام اسے خوش رکھنا تھا اور وہ اس میں ماہر تھی اور اب ایڈم سوچ رہا تھا کہ اس نے گزشتہ برس کتنے لوگوں کو خوش کیا ہوگا۔
وہ شام ہونے تک وہیں بیٹھا گلوریا کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے یوں لگا جیسے گلوریا سے اس کا تعلق جھوٹا تھا اور اس میں کوئی حقیقت نہیں تھی لیکن وہ یہ بھی نہیں بھول سکتا تھا کہ گزرا ہوا سال اس کی زندگی کا خوشگوار دور تھا۔ اگر وہ فریب تھا تو پھر حقیقت کیا تھی؟
بالآخر وہ ایک شخص کے ساتھ چلتی ہوئی لابی میں نمودار ہوئی۔ اس نے ایڈم کو دیکھا اور اپنی جگہ پر رک گئی۔ اس نے اپنے ساتھ آنے والے شخص سے کچھ کہا۔ اس آدمی نے ایڈم کو دیکھا اور وہاں سے چلا گیا۔ ایڈم نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اس کی آنکھیں مسلسل گلوریا پر جمی ہوئی تھیں۔ گلوریا اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ ایڈم نے اس سے کوئی بات نہیں کی لیکن اس کے چہرے کو دیکھ کر سمجھ سکتا تھا کہ اس پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ ایڈم سے جھوٹ نہیں بول سکی تھی۔ کم از کم وہ ایڈم کی اتنی عزت ضرور کرتی تھی۔ اس نے رونا شروع کر دیا۔ ایڈم نے پہلے کبھی اسے اس طرح روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

☆☆☆

اس نے سڑک پر گاڑی کھڑی کر کے عمارت کو دیکھا۔ وہ ایک چار منزلہ عام سی دفتری عمارت تھی جس کی کھڑکیاں اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ وہ جمعے کا دن تھا اور رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی اس لیے سڑک پر گاڑیوں کی آمدورفت برائے نام تھی۔ گلوریا نے کہا تھا کہ یہ کام ہفتے سے پہلے ہو جانا چاہیے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس نے اس کام میں اتنی دیر کیوں لگائی لیکن اس کے خیال میں یہی مناسب تھا۔ اس نے گاڑی سے باہر آ کر سڑک پار کی اور محتاط انداز میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ یہ خطرہ بہرحال اپنی جگہ موجود تھا کہ کسی خفیہ کیمرے کی مدد سے اس کی نگرانی نہ

کی جارہی ہو۔

وہ کسی وقت کے بغیر عمارت کے عقبی دروازے تک گیا اور اسے تالا کھولنے میں بمشکل پندرہ سیکنڈ لگے۔ اس دوران کسی الارم کے بجنے کی آواز نہیں آئی۔ راہداری کی مدھم روشنی میں اسے کوئی سیکیورٹی گارڈ نظر نہیں آیا۔ وہ جانتا تھا کہ کم از کم ایک محافظ وہاں ضرور رہتا ہے لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس وقت چکر لگائے گا۔ اس نے اندر قدم رکھا اور چوکے بغیر راہداری سے ہوتا ہوا مطلوبہ دروازے تک پہنچ گیا۔ وہ ایک دن پہلے ڈیلیوری مین کے روپ میں اس عمارت کا جائزہ لے چکا تھا۔ اس نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا اور تالا کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ چوتھی چابی کے ذریعے اسے کامیابی ہوئی۔ دفتر میں داخل ہو کر اس نے دروازہ بند کیا اور ٹارچ کی مدد سے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

وہ استقبالیہ کمرا تھا جبکہ عقبی دیوار میں دو دروازے نظر آرہے تھے اور ایک جانب دیوار میں فائل کیبنٹ کی قطار تھی، وہ مقفل تھے۔ اس نے ایک ایک کر کے کیبنٹ کھولنا شروع کیے۔ ان میں حروف تہجی کے اعتبار سے کئی فائلیں رکھی ہوئی تھیں جن میں ایک گلوریا کی بھی تھی۔

اس نے فائل کھول کر پہلا صفحہ پڑھا اور اس کے پورے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ اس نے دوسرا صفحہ پلٹا ہی تھا کہ اسے دروازے پر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اسے گھبراہٹ ہونے لگی لیکن اس نے فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پالیا۔ اسے اس طرح کی صورت حال سے نمٹنے کا خوب تجربہ تھا پھر اسے ایک آواز سنائی دی۔ ”ہیلو۔“

”کریگ؟“ اس نے جواب دیا۔

باہر سے کسی نے روشنی ڈالی۔ اس نے دیکھا کہ سوئچ کے پاس ایک سیکیورٹی گارڈ کھڑا ہوا ہے۔ اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اوہ مجھے سوئچ نظر نہیں آیا۔“

”تم کون ہو؟“ گارڈ نے پوچھا۔

”کریگ کا ساتھی...... میرا مطلب ہے ڈاکٹر ایڈنگر۔ میرا نام ولیم والٹرز ہے۔“

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”اس نے مجھے ایک فائل لینے کے لیے بھیجا ہے۔“

”کیا تم اپنی شناخت کروا سکتے ہو؟“

”ہاں، کیوں نہیں۔“

ایڈم اس کی جانب بڑھا۔ گلوریا کی فائل اس کی بغل میں دبی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے والٹ سے ایک جعلی لائسنس نکالا اور گارڈ کے حوالے کر دیا۔ اس نے لائسنس کا بغور معائنہ کیا۔ ایڈم سمجھ گیا کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو اپنا کام بڑی سنجیدگی سے سرانجام دیتے ہیں۔ گارڈ نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم اندر کیسے داخل ہوئے؟“

”اس نے مجھے کمرے کی چابی دی تھی۔“ ایڈم نے اپنی جیب پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”تم سامنے والے دروازے سے کیوں نہیں آئے؟“

”ہاں، مجھے وہیں سے آنا چاہیے تھا لیکن میں جلدی میں تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے اسپتال پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔ اس کا ایک مریض ایمرجنسی میں ہے۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ میں یہ فائل لے کر فوراً اسپتال پہنچوں۔“

ایڈم نے اسے گلوریا کی فائل دور سے ہی دکھائی لیکن اس کے ہاتھ میں نہیں دی۔ گارڈ اسے مسلسل گھور رہا تھا۔ اس کا شک ابھی تک دور نہیں ہوا تھا۔

ایڈم نے کہا۔ ”اگر تم چاہو تو دیکھ سکتے ہو کہ میں نے اس فائل کے علاوہ کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ لیکن پلیز ذرا جلدی کرو اور میرا لائسنس واپس کردو۔“

گارڈ نے لائسنس واپس کرنے کے بجائے کہا۔ ”مجھے تصدیق کرنا ہوگی۔“

”ٹھیک ہے تم ویسلے میموریل اسپتال فون کر کے ایمرجنسی روم سے رابطہ کرو۔ وہ شاید وہیں ہوگا۔“

گارڈ نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا جیسے جاننا چاہ رہا ہو کہ وہ سچ بول رہا ہے یا نہیں۔ جب ایڈم نے دیکھا کہ اس نے ابھی تک فون کو ہاتھ نہیں لگایا تو وہ بولا۔ ”کیا تمہیں اسپتال کا نمبر چاہیے؟“

”نہیں۔“ گارڈ نے کہا اور اس کا جعلی لائسنس واپس کرتے ہوئے بولا۔ ”کوئی بات نہیں لیکن میں یہ فائل لے جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔“

”ڈاکٹر کو اس کی ضرورت ہے۔“

گارڈ نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا تو ایڈم کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”کیا میں اس کے ایک صفحے کی نقل لے جا سکتا ہوں۔“

”کون سا صفحہ؟“

”معاف کرنا۔ میں اسے پڑھنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ یہ خفیہ ہے۔ لیکن یہ سب سے اوپر والا صفحہ ہی ہے۔ کیا کریگ کے پاس فوٹو اسٹیٹ مشین ہے؟“

”نہیں، البتہ نیچے ہال میں ہے۔“

”کیا ہم اسے استعمال کر سکتے ہیں؟“

”میرے ساتھ آؤ۔“

کارڈ مڑا اور اسے اپنے ہمراہ نیچے ہال میں لے لیا۔

ایڈم نے کہا۔ ''تمہارا بہت بہت شکریہ، مجھے صرف اسی صفحے کی ضرورت تھی۔''

اس نے سچ ہی کہا تھا۔ یہی وہ صفحہ تھا جس سے اسے معلوم ہوا کہ گلوریا دو ماہ قبل اپنے معمول کے طبی معائنے کے لیے آئی تھی جس میں سرطان کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوئی۔

اگلے روز ایڈم نے بوشر کو ایک پبلک فون سے کال کی اور کہا کہ وہ اس سے ملنا چاہتا ہے۔

''ایک گھنٹے بعد۔ ویسٹ مونرو اسٹریٹ کے بلاک ایک سو گیارہ پر۔ ڈرگ اسٹور کے پیچھے پارکنگ لاٹ میں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔''

ایڈم نے فون رکھا اور واپس اپنی میز پر چلا گیا۔ وہ پہلے سے وہاں موجود تھا۔ اس کے ساتھ والی کھڑکی سے پارکنگ لاٹ کا نظارہ بالکل صاف نظر آرہا تھا۔ اس نے اپنے سامنے ایک اخبار رکھ لیا۔ بظاہر اس کی نظریں اخبار پر تھیں لیکن وہ کن انکھیوں سے پارکنگ لاٹ میں آنے والی ہر کار کو دیکھ رہا تھا۔

بوشر مقررہ وقت پر آگیا۔ ایڈم نے مزید ایک منٹ رک کر پارکنگ لاٹ اور قریبی عمارت کی کھڑکیوں کا جائزہ لیا پھر اخبار کو تہ کر کے بوشر کی کار کی جانب چل پڑا۔ جیسے ہی وہ کار میں بیٹھا بوشر نے کہا۔ ''تم نے اس کام میں کافی وقت لگا دیا۔''

ایڈم نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ بولا۔ ''ہم تمہاری نگرانی کر رہے تھے۔ تم نے اتنا انتظار کیوں کیا؟''

ایڈم نے کچھ کہے بغیر اخبار کی تہ سے ایک لفافہ نکالا اور دونوں نشستوں کے درمیان رکھ دیا۔ اس کے ابھرے ہوئے حصوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس میں کئی فلمیں اور گلوریا کا دیا ہوا سولہ ملی میٹر کا مائیکرو کیمرا موجود ہے۔

بوشر نے پوچھا۔ ''سیف میں کیا تھا؟''

''کنٹریکٹ کے کاغذات، چیک بک رجسٹر اور کچھ خطوط۔ تمہارا دیا ہوا لفافہ انہی کے درمیان رکھ دیا۔''

بوشر نے سیٹوں کے درمیان رکھا ہوا لفافہ اٹھایا۔ ایڈم جانتا تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ بوشر یہی کہے گا کہ وہ کیمرا اپنے پاس رکھے۔ اسے اگلے کام کے لیے اس کی ضرورت ہو گی۔ اس سے پہلے ہی ایڈم بول پڑا۔ ''میرا معاوضہ۔''

بوشر نے جیب سے ایک چھوٹا لفافہ نکال کر اسے دیا۔

ایڈم نے اس میں جھانک کر نوٹ گنے پھر اسے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ پھر اس نے اخبار میں سے ایک فوٹو کاپی نکالی اور بولا۔

''یہ بھی رکھ لو۔''

''یہ کیا ہے؟''

''اس بات کا ثبوت کہ گلوریا کو سرطان نہیں ہے۔''

ایڈم اسے کاغذ کا معائنہ کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ خود اس کے دل کی دھڑکن بھی تیز ہو گئی تھی۔ بوشر کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر اسے طمانیت کا احساس ہو رہا تھا۔ اب وہ اسے دوبارہ کسی کام کے لیے مجبور نہیں کر سکے گا اور گلوریا بھی یہ نہیں کہہ سکے گی کہ اسے آپریشن یا کسی مہنگے علاج کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے۔

وہ بوشر کے ردعمل کا انتظار کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ وہ کیا ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ یہ محسوس کرے کہ اب اس کا یہاں سے جانا خطرناک ہو سکتا ہے۔ وہ کانگریس مین کے دفتر میں داخل ہونے کو جواز بنا کر اسے گرفتار بھی کر سکتا ہے۔ اسی لیے ایڈم نے ملاقات کے لیے اس جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ تاکہ اگر وہاں کوئی ایف بی آئی کا ایجنٹ موجود ہو تو وہ اس پر نظر رکھ سکے۔ وہ جانتا تھا کہ اسے اپنے اردگرد نگاہ رکھنی چاہیے لیکن وہ بوشر پر سے اپنی نظریں نہ ہٹا سکا۔

بوشر کی نظریں ابھی تک کاغذ پر تھیں۔ ایڈم نے کہا۔ ''کیا تم نے گلوریا کو اداکاری کا سبق پڑھایا تھا؟''

بوشر نے کہا۔ ''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

ایڈم نے کہا۔ ''میں تم سے دوبارہ ملنا نہیں چاہتا۔ دونوں میں سے کسی ایک سے بھی نہیں۔''

''کیا تمہیں یقین ہے۔ تمہیں پیسوں کی ضرورت ہو گی؟''

''کوئی بات نہیں لیکن میں تم سے دوبارہ نہیں ملنا چاہتا۔''

''کیا تم واقعی ایسا چاہتے ہو؟''

''ہاں، میں یہی چاہتا ہوں۔''

ایڈم کار سے باہر آ گیا جیسے ہی اس نے چلنا شروع کیا۔ بوشر نے کھڑکی میں سے سر نکال کر کہا۔ ''اگر تمہارا ارادہ بدل جائے تو میرے پاس تمہارے لیے کام موجود ہے۔''

ایڈم اپنے راستے پر چلتا رہا۔ وہ کیسے بتاتا کہ اس نے یہ کام پیسوں کی خاطر نہیں کیا تھا بلکہ اسے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت تھی۔ بوشر یہ بھی نہیں جان سکے گا کہ اس نے کانگریس مین کے بجائے ڈاکٹر ایڈگر کے دفتر میں نقب لگائی تھی۔ اتفاق سے دونوں دفتر ایک ہی عمارت میں تھے۔

انگارے

طاہر جاوید مغل

تئیسویں قسط

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کررہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثرورسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ڈنمارک سے پاکستان کسی کی تلاش میں آیا تھا مگر یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہوگیا جس نے میری زندگی کو تہ و بالا کردیا۔ میں نے سرِراہ ایک زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا۔ مقامی پولیس نے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے مجھے شکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کردیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرغنہ تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کررہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھیانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کرسکا اور شکیل داراب کے دستِ راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہوگیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کر دیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پاکر جیل پہنچ گیا۔ انسپکٹر قیصر اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں MMA کا یورپی چیمپئن تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی تھی۔ میں یہاں سے بیزار ہوکے واپس ڈنمارک جارہا تھا کہ ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آگئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاندگڑھی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں اس کے گاؤں جا پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہوگیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ تاجور کا غنڈا صفت منگیتر اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کے گرد گھیرا تنگ کررہا تھا۔ مقامی مسجد کے امام مولوی فدا کی موت میں بھی اسی زمیں دار کا ہاتھ تھا۔ مولوی جی کی بیٹی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار تھی۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی لیکن جب اسے وہاں سے لایا جاتا تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاحب کو مجبور کیا جارہا ہے کہ وہ اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ میں نے مولوی صاحب کو اس بلیک میلنگ سے نکالنے کا عہد کیا مگر اگلی رات مولوی صاحب کو قتل کردیا گیا۔ ایک گمنام درگاہ کے خاتمے کے بعد ہم گھروں کی جانب گامزن تھے کہ میں اور تاجور سجاول ڈاکو کے ڈیرے پر جاپہنچے۔ یہاں سجاول کی ماں (ماؤجی) مجھے اپنا ہونے والا جوائی سمجھی۔ جس کی پوتی مہناز عرف مائی سے میری بات طے تھی۔ یوں سجاول سے ہماری جان بچ گئی۔ یہاں سجاول نے میرا مقابلہ باقرے سے کرادیا۔ سخت مقابلے کے بعد میں نے باقرے کو چت کردیا تو میں نے سجاول کو مقابلے کا چیلنج کردیا۔ میرے چیلنج نے سجاول سمیت سب کو پریشان کردیا تھا۔ اسی دوران ایک خط میرے ہاتھ لگ گیا جسے پڑھ کر چاندگڑھی کے عالمگیر کا مکروہ چہرہ سامنے آگیا۔ اس خط کے ذریعے میں سجاول اور عالمگیر میں دراڑ ڈالنے میں کامیاب ہوگیا۔ متوقع مقابلے کے بارے میں سوچتے سوچتے میرا ذہن ایک بار پھر ماضی کے اوراق پلٹنے لگا۔ جب میں ڈنمارک میں تھا اور ایک کمزور پاکستانی کو گورے اور انڈین غنڈوں سے بچاتے ہوئے خود ایک طوفان کی لپیٹ میں آگیا۔ وہ غنڈے ٹیکساری گینگ کے لوگ تھے جس کا سرغنہ جان ڈیرک تھا۔ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے انہوں نے میری یونیورسٹی دوست ڈیزی کے ساتھ اجتماعی کھیل کھیلا، پھر ڈیزی غائب ہوگئی۔ اس واقعے کے بعد میری زندگی میں ایک انقلاب آگیا۔ مجھے چھ ماہ جیل ہوئی۔ پھر میرا رجحان مارشل آرٹ کی طرف ہوگیا اور ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے MMA کی فائٹس میں تہلکہ مچاتا رہا اور دوسری طرف اسکائی ماسک کی اوٹ میں ٹیکساری گینگ کے غنڈوں سے برسرِپیکار رہا۔ اسی مارشل آرٹ کی بدولت میں نے سجاول سے مقابلہ کیا اور سخت مقابلے کے بعد برابری کی بنیاد پر ہار مان کے سجاول کا دل جیت لیا۔ سجاول سے کہہ کر میں نے انیق کو بلوالیا۔ سجاول ایک حسین دوشیزہ سنبل کو نوبیاہتا دلہن کی طرح سجا سنوار کر ریان فردوس (وڈے صاحب) کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں، انیق اور جاناں ساتھ تھے۔ ہم ریان فردوس کے محل نما بنگلے پاراہاؤس پہنچے۔ وڈا صاحب اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ برونائی سے پاکستان شفٹ ہوا تھا۔ برونائی میں اس کی خاندانی دشمنی چل رہی تھی۔ سجاول کو پاراہاؤس میں کلیدی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ پاراہاؤس میں کوئی بڑا چکر چل رہا تھا۔ کھوج لگانے پر پتا چلا کہ بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں میں زہریلا عنصر پایا جاتا ہے۔ زینب والا معاملہ بھی اسی طرف اشارہ کررہا تھا۔ اسی وجہ سے زینب کو بھی اغوا کرلیا گیا۔ ابراہیم اور کمال احمد کے لیے جو لڑکیاں تیار کی گئی تھیں، وہ پاراہاؤس پہنچ چکی تھیں۔ ایک تقریب میں دونوں لڑکیوں کی رونمائی کی گئی تو ان میں ایک زینب تھی۔ ابراہیم نے مجھ پر اور سجاول پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ ابراہیم نے بتایا کہ دونوں بھائیوں میں زہریلا پن موجود ہے اسی لیے ان کے لیے ایسی لڑکیاں ڈھونڈی گئی ہیں۔ میں نے ابراہیم کو آگاہ کیا کہ زینب پوری طرح محفوظ نہیں ہے اور شادی کی صورت میں اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یہ سن کر ابراہیم پریشان ہوگیا۔ ادھر آقا جان جو پاراہاؤس کا کرتا دھرتا تھا۔ اس نے سرغنہ ثاقب کے فرار کا ڈراما رچایا۔ ایک بار پھر پاراہاؤس میں دھماکے گونج اٹھے۔ تابڑ توڑ گولیاں چلیں اور مقابلے میں سرغنہ ثاقب اور اس کا ساتھی عبرت ناک موت مارے گئے۔ میرے کہنے پر ابراہیم نے زینب کا خون ٹیسٹ کرایا تو حقیقت کھل کر سامنے آگئی۔ اس تمام قتل و غارت میں آقا جان ملوث تھا مگر کوئی اس پر شک کرنے کو تیار نہ تھا۔ ثاقب کی موت کے بعد برونائی میں مخالفین نے بڑی کارروائی کرکے وڈے صاحب کے برادرِ نسبتی کو مار ڈالا تھا۔

بڑی بیگم صاحبہ کا رو رو کر برا حال تھا۔ ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے میں اور سجاول وڈے صاحب کے ساتھ برونائی جانے کے لیے تیار تھے۔ برونائی جانے سے پہلے میں ایک نظر تاجور کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک طویل فاصلہ طے کر کے میں تاجور کی ایک جھلک ہی دیکھ پایا تھا کہ گاؤں کے چند لڑکوں نے مجھے گھیر لیا۔ میرے سامنے وہ بچے تھے۔ اپنی ہار کے بعد ایک دلیر لڑکا میرے گلے کا ہار بن گیا اور میرا پیچھا کرتا ہوا پار اہاؤس تک آ گیا۔ سیف عرف سیفی کی بیگی نکالنے کے لیے ہم اسے اپنے ساتھ برونائی لے آئے تھے یہاں حالات بہت خراب تھے۔ آقا جان کا بیٹا مخالف پارٹی بن چکا تھا اور امریکن ایجنسی کے ساتھ مل کے پورے علاقے پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ آقا جان کی بھتیجی قسطینا کمانڈر اور جی دار آفیسر تھی۔ وہ ایسٹرن ٹنگ کی حیثیت سے جان گئی تھی۔ میں کئی مہم میں اس کے ہمراہ رہا۔ ریان فردوس کی پہلی بیوی اور اس کے بیٹے کی شورشیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ زینب محل سے غائب تھی اور انیق کی وجہ سے ہماری گرفت میں تھی۔ ابراہیم کا زینب کے بغیر برا حال تھا۔ آگے دشمن کے علاقے میں جگہ جگہ ناکا بندی تھی۔ قسطینا سے غیر محسوس طور پر تعلقات بڑھتے جا رہے تھے...... جو کئی سرکردہ عہدے داروں کو قبول نہیں تھے اور کمانڈر افغانی نے مجھے طلب کرلیا تھا۔ افغانی نے مجھ سے انتہائی ترشی اور دھمکی آمیز انداز میں بات کی اور باور کرایا کہ میں قسطینا سے دور رہوں۔ مگر زینب کی بات بتا کر میں بازی پلٹ چکا تھا اب افغانی کو میرے بارے میں اپنی رائے بدلنا پڑی۔ ابراہیم کا برا حال تھا۔ مجھے اس کی جان بچانے کے لیے اسے زینب کے بارے میں بتانا پڑا۔ مجھے شروع سے آقا جان پر شک تھا۔ وہ مجھے اغوا کر کے اپنے ٹارچ سیل لے گیا۔ میرے ساتھ جاناں بھی اس کی لپیٹ میں آ گئی۔ جاناں کسی نہ کسی طرح مجھ تک پہنچ گئی وہ زخموں سے چور تھی۔ آقا جان اور حطمی نے خوفناک منصوبہ بندی کی تھی۔ بالآخر میرے جو خدشات تھے وہ حرف بہ حرف درست ثابت ہوئے۔ رائے زل اور امریکن ایجنسی کی قوت نے محل پر دھاوا بول دیا تھا۔ افراتفری اور قتل و غارت گری نے اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ اس حملے میں ریان فردوس اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اب ریاست پر کلی طور پر رائے زل کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ہم سب بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ اس ہنگامے میں ہمیں سجاول مل گیا مگر اس کی حالت دیدنی تھی۔ وہ میری اور انیق کی جان کا دشمن بن چکا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

اس سے پہلے کہ میجر وارث دوسرا فائر کرتا، فارس جان نے اس کا پستول والا ہاتھ دبوچ لیا۔ کلائی مروڑی گئی تو نائن ایم ایم کا پستول میجر وارث کے ہاتھ سے گر گیا جسے کمانڈر فارس جان نے ٹھوکر مار کر دور پھینک دیا۔ فارس جان کے ایک بھرپور گھونسے نے میجر وارث کا رہا سہا دم خم بھی ختم کر دیا اور وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بُری طرح خون تھوکنے لگا۔ اس کا نچلا ہونٹ کٹ کر رہ گیا تھا۔ میں نے میجر کا فون فوراً آف کر دیا۔

فارس جان نے اپنی رائفل میجر کی طرف سیدھی کر لی تھی، وہ پھنکارا۔ ”تم سے یہ توقع نہیں تھی میجر! ام تمہارے بارے میں اس طرح کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔“

میجر وارث عجب دہشت زدہ لہجے میں بولا۔ ”تم کو کچھ پتا نہیں یہاں کیا ہو رہا ہے۔ تم لوگ بے وقوفوں کی جنت میں رہ رہے ہو۔ سمجھ رہے ہو کہ تم یہاں گھس کر بیٹھے رہو گے اور بچے رہو گے اور پھر یہاں سے نکل کر دوبارہ گرین فورس کی کمان سنبھال لو گے۔ اب کچھ نہیں ہو گا...... کچھ نہیں ہو سکے گا۔“

”تمہارے منہ میں خاک، کیوں نہیں ہو گا اس طرح۔“ ابراہیم طیش سے بولا۔

”اس لیے کہ وہاں شہر میں بہت کچھ بدل چکا ہے۔ ہر ہائی نس قسطینا بہت اچھی طرح جانتی ہیں۔ کل انہوں نے بھی میرے ساتھ ٹی وی پر وہ سین دیکھے ہیں، ہم اس سے پہلے صرف کمانڈر راوان کو رو رہے تھے کہ وہ رائے زل کے ساتھ جا ملا ہے، اب ہمارے آدھے کمانڈر ان کے ساتھ ہیں۔ ان میں سے بہت سوں کے نام بھی تم لوگوں کو معلوم نہیں لیکن میں جانتا ہوں۔ کمانڈر نجیب، کمانڈر ہادی، کمانڈر بن لوئی...... اور اس طرح کے درجنوں اور...... اب کچھ نہیں ہو سکتا۔“

”اور اسی لیے تم ہم سب کو پکڑوانے کے لیے کال ملا رہے تھے۔“ میں نے زہرخند لہجے میں کہا۔

”نہیں...... میں میجر بن لوئی سے رابطہ کرنا چاہ رہا تھا۔ اس سے مشورہ کرنا چاہ رہا تھا۔ خود گرفتاری دینے کی صورت میں ہم عام معافی والوں کی صف میں شامل ہو سکتے ہیں۔“

”یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔“ فارس جان نے دانت پیس کر کہا۔ ”اگر تمہارے فون آن کرنے کی وجہ سے وہ لوگ یہاں تک پہنچ گئے تو پھر؟“

”وہ ویسے بھی یہاں پہنچ جائیں گے، انہیں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ میرا مشورہ تو یہی ہے کہ......“

فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کمانڈر فارس جان کی پٹھانی چپل کی زبردست ٹھوکر میجر وارث کی پسلیوں میں لگی اور وہ تکلیف کی شدت سے دہرا ہو گیا۔

میں نے اسے مزید ضربات لگانے سے روک دیا۔ قسطینا کے ہاتھ میں میجر وارث کا فون تھا، وہ بولی۔ ”مجھے لگتا

ہے یہ گولی اسی طرف آن ہی ہوا تھا۔ اس کی کم ایشو میں ہوئی تھی۔“

”اور ہو سکتا ہے کہ پوری طرح آن بھی نہ ہوا ہو۔“ میں نے کہا۔

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ فارس جان کی آنکھوں میں میجر وارث کے لیے سرخی تھی۔

میں تو میجر وارث کو زیادہ عرصے سے نہیں جانتا تھا مگر اس کو قریب سے جاننے والے یعنی ابراہیم، قسطینا، فارس جان وغیرہ ششدر رہ گئے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ وارث جیسا مضبوط آدمی اس طرح ٹوٹ سکتا ہے۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں، شدید اور مسلسل تناؤ کی کیفیت بندے کو اندر سے مسمار کر دیتی ہے۔

کہنے کو تو میجر وارث یہ کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے کسی ساتھی فوجی افسر سے مشورہ کر رہا تھا کہ ہم سب کے لیے بہتری کی صورت نکل سکے۔ لیکن حقیقت شاید یہ نہیں تھی۔ وہ خود کو اور اپنے اہل وعیال کو مصیبت سے نکالنا چاہ رہا تھا۔ اچانک وہ ہوا جس کی توقع نہیں تھی۔ کمانڈر فارس جان ایک نہایت چوکس شخص کا نام تھا لیکن اس سے ذرا سی غفلت ہوئی۔ وہ میجر وارث کا نائن ایم ایم پستول فرش سے اٹھانے کے لیے جھکا اور چند ساعتوں کے لیے میجر وارث کو فراموش کر گیا۔ میجر وارث بجلی کی طرح اپنی جگہ سے حرکت میں آیا، اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی اپنا ردعمل ظاہر کر پاتا، فارس جان کی آٹومیٹک رائفل میجر وارث کے ہاتھوں میں آ چکی تھی۔ یہ نہایت خطرناک کام ہوا تھا۔ میجر نے وحشت کے عالم میں رائفل کا رخ ہماری طرف کیا۔ سب سے پہلے نوجوان کمانڈر فارس جان ہی اس کے نشانے پر آنے والا تھا۔ آٹومیٹک رائفل کی لرزہ خیز ”تڑتڑ“ سے پناہ گاہ گونج اٹھی لیکن یہ برسٹ میجر وارث نے نہیں انیق نے چلایا تھا۔ یہ ایک نہایت بروقت کارروائی تھی۔ آدھے سیکنڈ کی تاخیر بھی ہو جاتی تو قسطینا اور ابراہیم سمیت ہم گولیوں کی زد میں ہوتے۔ میجر وارث اچھل کر پتھریلی دیوار سے ٹکرایا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اس کے براؤن کوٹ پر سرخ رنگ کے کم وبیش ایک درجن نقطے نمودار ہو چکے تھے۔

چند سیکنڈ تک سکتے کی سی کیفیت میں رہنے کے بعد قسطینا نے انیق کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”ویل ڈن...... ویری ویل ڈن۔“ اس کی آواز لرز رہی تھی۔

فارس جان نے بھی آگے بڑھ کر انیق کا کندھا تھپکا۔ انیق ہمارے عقب میں کھڑا تھا اور ساری صورت حال کو بغور دیکھ رہا تھا۔ لہٰذا جب میجر وارث ایک دم پینترا بدل کر فارس جان پر جھپٹا تو اس نے اپنا کردار ادا کیا۔ وہ ہر قدم پر ایک بہترین ساتھی ثابت ہو رہا تھا۔

☆☆☆

میجر وارث کی لاش کو پناہ گاہ کے پاس ہی دفنا دیا گیا۔ زمین بہت پتھریلی تھی۔ بمشکل اتنا گڑھا ہی کھودا جا سکا کہ اس کی لاش اچھی طرح ڈھک جائے۔ ایک سوگواری کیفیت تھی، کہتے ہیں کہ چڑھتے سورج کی پوجا کی جاتی ہے۔ یوں لگتا تھا کہ رائے زل کی حیثیت بھی چڑھتے سورج کی ہو گئی ہے اور قسطینا کی صفوں میں جو کمزور لوگ تھے وہ ہمت ہار کر رائے زل اور اس کی ماں کی طرف رجوع کر رہے تھے۔ ایجنسی کی پوری پوری آشیرباد بھی ماں بیٹے کے ساتھ تھی۔

سہ پہر کو ڈی پیلس کے عقبی قبرستان میں ریان فردوس کی تدفین بھی ہو گئی۔ عزت مآب ریان فردوس جو کچھ دن پہلے تک یہاں سیاہ وسفید کا مالک تھا اور جس کے ایک اشارے پر سیکڑوں خدام سر جھکا کر حاضر ہو جاتے تھے، بے چارگی کا نمونہ تھا۔ اس کے جنازے کے جو مختصر مناظر ٹی وی اسکرین پر دکھائے گئے، ان میں چالیس پچاس افراد سے زیادہ دکھائی نہیں دیتے تھے۔ ان میں سے بھی زیادہ تعداد ڈی پیلس کے ملازمین کی تھی۔ تدفین کی جگہ کے ارد گرد کڑا پہرا تھا۔ ریان فردوس کے مذہب کے بارے میں پورے یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا مگر زخمی بیگم نورل کی درخواست پر اس کی تدفین مسلمانوں کے طریقے سے ہی ہوئی تھی۔

نیوز کاسٹر نے جاماجی شہر کے مناظر دکھاتے ہوئے کہا۔ ”شہر میں اکا دکا معمولی واقعات کے سوا امن وامان ہے۔ آج صبح دو گھنٹے کے لیے کرفیو میں نرمی کی گئی، لوگوں نے ضروریات زندگی خریدیں......“

کیمرا گلی کوچوں کے مناظر دکھا رہا تھا۔ وہاں بظاہر سکون تھا لیکن کون کہہ سکتا تھا کہ ان بند دروازوں اور کھڑکیوں کے پیچھے کتنا اضطراب ہے، کتنا غم وغصہ ہے جو کچھ بھی تھا ریان فردوس ان کا حاکم تھا۔ بے شمار لوگ ایسے تھے جو تین پشتوں سے اس خاندان کو یہاں کا مالک ومختار سمجھتے تھے۔ انہوں نے ٹی وی پر ریان فردوس کی خون میں لتھڑی ہوئی لاش دیکھی تھی، زخمی بیگم نورل کو بین کرتے ہوئے دیکھا اور سنا تھا۔ وہ ان کے دونوں بچوں کے بارے میں فکرمند تھے۔ بے شک دیواروں اور بند دروازوں کے پیچھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا مگر شدید اضطراب اور غم وغصہ تو اپنی جگہ موجود تھا۔

سفید رومال سے بار بار سر کا پسینا پونچھ رہا تھا اور غمناک لہجے میں رپورٹر کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ رپورٹر نے کہا۔ ”آپ اس نہایت اہم واقعے کے بارے میں کیا کہتے ہیں جناب؟“

آقا جان بولا۔ ”میں اپنی بات دہراؤں گا۔ یہ ایک چھوٹا سا گروہ تھا جو زبردستی عزت مآب کے رہائشی حصے تک پہنچا اور حملہ آور ہوا۔ آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ ساٹھ کے لگ بھگ گرے فوجی تھے اور یہ جو کچھ ہوا ہے ان کے ذاتی فعل کے زمرے میں آتا ہے۔“

”جناب، لوگ پوچھ رہے ہیں کہ وہ لوگ اب کہاں ہیں اور ان کو کیسے کی سزا کیسے ملے گی؟“

”میں میڈیا کے ذریعے لوگوں کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ کل رات ان فوجیوں میں سے قریباً ایک درجن تو پل کے دوسری جانب جنگل میں مارے گئے ہیں۔ وہاں تقریباً دو گھنٹے تک فائرنگ کا تبادلہ ہوا۔ باقی لوگوں کے بارے میں اطلاع ہے کہ وہ افراتفری کا فائدہ اٹھا کر جزیرے سے نکل چکے ہیں لیکن ایسی بات نہیں کہ ہم ان کی طرف سے غافل ہو جائیں گے۔ انہیں ڈھونڈنے اور کیفرِ کردار تک پہنچانے کی پوری کوشش کی جائے گی۔ ان لوگوں نے باہمی محبت اور مفاہمت کی فضا کو بری طرح برباد کیا ہے اور یہ کوئی چھوٹا جرم نہیں۔“

رپورٹر نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا۔ ”جناب! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ان لوگوں کو ڈھونڈنے کے لیے کیا کارروائی ہو رہی ہے...... اور وہ فوجی جو جنگل میں مارے گئے ہیں، ان کی لاشیں کہاں ہیں؟“

آقا جان کی ناک کا بل موٹا ہو گیا۔ ”آپ لوگ ایسے سوالات مت کریں جن سے شک و شبے کی فضا پیدا ہو۔ یہ بہت نازک وقت ہے ہم سب کے لیے۔“

رپورٹر نے کہا۔ ”جناب! بہت سے لوگ ریان فردوس کے دونوں بچوں کے بارے میں پریشان ہیں۔ انہیں ڈھونڈنے کے لیے کیا اقدام کیے گئے ہیں؟“

”ہمارے پاس جو اطلاعات ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ کمال احمد اور ابراہیم دونوں سلامت ہیں لیکن ابراہیم کے حوالے سے اس شبے کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ وہ قسطینا اور شاہ زیب کے قبضے میں ہے۔ ہم ان لوگوں کا کھوج لگانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔“

”کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں جناب کہ...... ان لوگوں نے ہز ہائی نس ابراہیم کو یرغمال بنا رکھا ہے؟“

صورتِ حال کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔“

آقا جان ”بہت شکریہ“ کہہ کر جان چھڑانا چاہ رہا تھا مگر رپورٹر نے پھر اسے گھیر لیا۔ ”صرف ایک سوال جناب! ابھی تھوڑی دیر پہلے خبر آئی ہے کہ نہایت مطلوب شخص عبدالکریم کو نجف کالونی کی طرف ایک عمارت میں گھیر لیا گیا ہے اور وہاں فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا ہے۔ کیا یہ اطلاع درست ہے؟“

”مجھے بھی ابھی ابھی یہ نیوز ملی ہے جیسے ہی تصدیق ہوتی ہے آپ کو مطلع کیا جائے گا۔ بہت شکریہ۔“ آقا جان نے بیزار لہجے میں کہا اور مشیروں کے ساتھ ایک دروازے میں داخل ہو گیا۔

تین چار منٹ بعد ہی دوسرے ٹی وی چینل نے اس

مقام کی "لائیو کوریج" شروع کر دی جہاں مبینہ طور پر عبدالکریم اور اس کے دو ساتھیوں کو گھیر لیا گیا تھا۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ ایجنسی کے امریکن گارڈز اور رائے زل کے گرے سپاہیوں نے ایک تین منزلہ رہائشی عمارت کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ چھت کی منڈیر کے عقب میں دو ہیولے متحرک دکھائی دیتے تھے اور کبھی کبھی چھت پر سے سنگل فائر بھی کیا جا رہا تھا۔ نیوز کاسٹر چلا رہا تھا۔ "یہ دیکھیے ناظرین! ایک بندہ مارا جا چکا ہے لیکن دو مسلسل مزاحمت کر رہے ہیں۔ انہوں نے قریباً ایک گھنٹے سے دو سو کے لگ بھگ مسلح سپاہیوں کو خود سے دور رکھا ہوا ہے۔ ہماری اطلاعات کے مطابق ایک امریکن گارڈ اور چار گرے سپاہی اس کاؤنٹر فائر میں جان کی بازی ہار چکے ہیں۔"

اس دوران میں صاف دکھائی دیا۔ چھت پر موجود دو ہیولوں میں سے ایک نے چار پانچ فٹ اونچی منڈیر کے اوپر سے سر نکال کر ایک طویل برسٹ چلایا۔ ایک للکارا مارا۔ چند سنگل شاٹ فائر کیے اور پھر بھاگتا ہوا ایک اوٹ میں چلا گیا۔ بھاگتے ہوئے وہ واضح طور پر لنگڑا رہا تھا یقیناً یہ کریم ہی تھا۔ اس کی جرأت دیدنی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ آخری دم تک مقابلہ کرنے کی ٹھانے ہوئے ہے۔

نیوز کاسٹر بلند آواز میں بول رہا تھا۔ "آپ ایمبولینسوں کی آوازیں سُن رہے ہوں گے۔ لگتا ہے کچھ اور لوگ زخمی ہوئے ہیں۔ انہیں پیچھے لایا جا رہا ہے۔ ناظرین! یہ "ایکسکلیوسو" مناظر آپ ہماری اسکرین پر دیکھ رہے ہیں، ایجنسی کے دو مزید امریکن گارڈز شدید زخمی ہوئے ہیں۔ ایک کی حالت بہت نازک لگ رہی ہے۔"

اسی دوران میں تابڑ توڑ فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔

قسطینا نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "اب یہ کُتے اندر گھس جائیں گے۔"

"یہ کون سی بہادری ہے۔" فارس جان بولا۔ "بلٹ پروف جیکٹس، ہیلمٹ سب کچھ تو پہن رکھا ہے انہوں نے۔ سر سے پیر تک لوہے میں ڈوبے ہوئے ہیں باسٹرڈز۔"

دو تین منٹ مزید گزرے۔ پھر قسطینا کا یہ اندازہ درست ثابت ہوا کہ ایجنسی اور گرے فورس والے اب چارج کریں گے۔ وہ لوگ بھرا مار کر اندر گھس گئے۔ دو تین منٹ تک فائرنگ کی آوازیں آتی رہیں۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ جی دار بڑی "جی داری" سے مقابلہ کر رہا ہے۔ آخر میں یہ نیوز آئی کہ کریم کا ساتھی مارا گیا ہے اور کریم کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔

قسطینا زخمی شیرنی کی طرح بے چین تھی۔ پناہ گاہ میں چکرا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اس کے ساتھی چن چن کر مارے جا رہے تھے یا پھر کچھ ہمت ہار کر رائے زل کے سامنے سر جھکا رہے تھے۔

☆☆☆

اس پناہ گاہ میں آج ہمیں چھٹا دن تھا۔ یہاں خشک خوراک اور پانی کا وافر ذخیرہ موجود تھا۔ بجلی سمیت ہر سہولت یہاں موجود تھی۔ شروع میں میرا خیال تھا کہ شاید اس ویران سرنگ میں جنریٹرز کے ذریعے بجلی فراہم کی جاتی ہے لیکن جنریٹرز کی آواز کا دور دور پتا نہیں تھا۔ بعد ازاں قسطینا نے بتایا تھا کہ یہاں الیکٹریسٹی کی خفیہ پاور لائن موجود ہے۔ نکاسیٔ آب کا بہترین انتظام بھی یہاں موجود تھا۔

سجاول کی حالت میں معمولی سا فرق آیا تھا۔ ہم نے مشورہ کر کے اس کے ہاتھ پاؤں کھول دیے تھے اور اسے پناہ گاہ کے گیلری نما چھوٹے کمرے میں بند کر دیا تھا۔ یہاں تمام سہولیات موجود تھیں۔ دروازہ مضبوط لوہے کا تھا۔ دو دن سے انیق اسے انجکشن کے ذریعے ہلکے ٹرنکولائزر دے رہا تھا۔ وہ سستی اور غنودگی میں رہتا تھا۔ کل دوپہر دوا کا اثر کم ہوا تو اس نے خوب غل غپاڑا کیا تھا۔ نام لے لے کر مجھے اور انیق کو گالیاں دی تھیں۔ کچھ چیزیں بھی توڑی پھوڑی تھیں مگر پھر بے دم سا ہو کر گر گیا تھا۔ رات کو میں نے کھڑکی کی جھری میں سے دیکھا تھا، وہ بھوک سے بے تاب ہو کر بسکٹس کے ایک ڈبے میں سے بسکٹ کا پیکٹ نکال رہا تھا۔

زینب بدستور سہمی ہوئی تھی۔ اسے ریان فردوس کی موت کا بہت دکھ تھا۔ وہ اپنی ساس یعنی بیگم نورل کو بھی بہت یاد کرتی تھی۔ ہم کوشش کرتے تھے کہ وہ ٹی وی نہ دیکھے۔ ابراہیم نے وہ نیوز سنی تھی جس میں آقا جان نے خیال ظاہر کیا تھا کہ ابراہیم کو قسطینا اور میں نے یرغمال بنا رکھا ہے۔ اسے بہت طیش آیا تھا لیکن ہماری طرح وہ بھی کیا کر سکتا تھا۔ ابراہیم نے ایک بہت بڑی عقل مندی کی تھی۔ ڈی پیلس سے فرار ہوتے وقت ہم بہت جلدی میں تھے، اس کے باوجود ابراہیم اپنے ساتھ اپنا "تریاق" لانا نہیں بھولا تھا۔ یعنی وہی خاص زہر جو روزانہ ایک خاص مقدار میں اس کی خوراک میں ملایا جانا ضروری تھا۔ اگر وہ یہ عقل مندی نہ کرتا تو شاید اب تک اس کی حالت بہت نازک ہو گئی ہوتی۔

سیف یوں تو ٹھیک تھا تاہم کسی وقت چپ سا ہو جاتا

تھا۔ [illegible] کی وجہ [illegible] بھر رہا تھا۔ وہ اپنا رنگ رنگیلا موبائل فون آن نہیں کرسکتا تھا۔ اس فون میں اس کے لیے بہت کچھ ''کھٹا میٹھا'' موجود تھا۔ میں انیق اور سیف سے باتیں کررہا تھا جب دوسرے کمرے سے قسطینا کی آواز آئی۔ ''ادھر آؤ شاہ زائب! یہ دیکھو، یہ خنزیر کا بچہ کیا بکواس کررہا ہے۔''

میں دوسرے کمرے میں پہنچا۔ قسطینا نے حسبِ معمول دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی اور ایل سی ڈی پر نیوز دیکھ رہی تھی۔ اسکرین پر رائے زل کا منحوس چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ریان فردوس کی زرنگار نشست پر براجمان تھا۔ اس کے عقب میں اس کے کئی مشیر اور ماتحت مؤدب کھڑے تھے۔ رائے زل ٹی وی کے نمائندے کو بریفنگ دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''جن بیس لوگوں کے سر کی قیمت مقرر کی گئی ہے، وہ جنگی جرائم اور دہشت گردی کے مرتکب ہیں...... اور ان کی حیثیت انتہائی مطلوب افراد کی ہے۔ یہ عبدالکریم بھی ان میں شامل ہے۔ ہم ایسے لوگوں کو عبرت کا نشان بنانا چاہتے ہیں۔ عبدالکریم اور تین دیگر افراد کو سرعام سزائے موت کا فیصلہ کسی صورت تبدیل نہیں ہوگا۔ یہ مٹھی بھر لوگ ہیں جو احتجاج کررہے ہیں۔ ان کی کوئی حیثیت نہیں۔''

ٹی وی کے نمائندے نے کہا۔ ''عزت مآب! بڑے ادب سے یہ سوال پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا موجودہ حالات میں کریم کی سرعام پھانسی سے ایک طبقے کی بے چینی میں اضافہ نہیں ہوگا؟''

رائے زل کی بھالو جیسی چھوٹی چھوٹی آنکھیں طیش کی یلغار سے دہک گئیں۔ خود پر بمشکل ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ''بے چینی ناانصافی سے بڑھتی ہے۔ جنگی جرائم میں شریک افراد کو کڑی سزائیں دینے سے بے چینی کم ہوگی۔ ہم ان بیس افراد کی فہرست میں سے ہر شخص کو اسی طرح انصاف کے کٹہرے میں لائیں گے۔ آپ لوگ سوال کرنے سے پہلے اس کا وزن تولا کریں۔''

رائے زل کا لہجہ اتنا زہریلا تھا کہ کسی ''میڈیا پرسن'' کو مزید سوال کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ میں نے ٹی وی اسکرین پر رائے زل کے عقب میں کھڑے خواتین و حضرات کو دیکھا، ان میں دلکش خدوخال والی دراز قد ڈاکٹر ماریہ بھی موجود تھی۔ ان سب افراد نے ایک ہی طرح کی یونیفارم پہن رکھی تھی۔ ایک گہری گرے پینٹ اور ہلکے گرے رنگ کا چمکیلا کوٹ۔ یہ بند گلے کا کوٹ تھا اور کالر پر سرخ دھاری سی تھی۔

رائے زل کا ایک [مشیر] آگے بڑھا اور اپنے سفید بالوں میں انگلیاں پھیر کر شستہ انگلش میں بولا۔ ''عزت مآب جناب رائے زل نے اپنے لیے جو ٹیم منتخب کی ہے، میں اس کا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ وہ ایک ایک نام لیتا گیا اور بتاتا گیا۔ یہ سیکریٹری ہیں...... یہ پرسنل سیکریٹری...... یہ سیکیورٹی انچارج...... یہ مشیر برائے فوجی امور...... یہ مالی امور کے مشیر...... ڈاکٹر ماریہ کا تعارف کراتے ہوئے اس نے بتایا، ڈاکٹر ماریہ، عزت مآب کی ذاتی معالج......''

مجھے اپنی آنکھوں میں جلن محسوس ہوئی۔ ہم سب جانتے تھے کہ رائے زل نے ڈاکٹر ماریہ کو کس قسم کے ''علاج'' کے لیے بالجبر اپنے پاس بلایا ہے۔ ماریہ کا سرخ دھاری والا کالر مجھے ایسے پٹے کی طرح لگا جو کسی پالتو جانور کے گلے میں ڈالا جاتا ہے۔

چوبیس گھنٹے کے اندر اندر کریم پر مقدمہ چلا کر اسے موت کی سزا سنادی گئی اور سزا پر عمل درآمد کا اعلان بھی کردیا گیا۔ اسے اگلے روز سہ پہر تین بجے ڈی پیلس کے عین سامنے تین دیگر افراد سمیت پھانسی پر لٹکایا جانا تھا۔

قسطینا کی حالت دیدنی تھی۔ کریم ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے آزادی اور دفاع کی اس جدوجہد میں بہت زخم کھائے تھے اور ثابت قدم رہے تھے۔ اب اسے عبرت کی مثال بنایا جارہا تھا۔ قسطینا کسی بھی صورت اسے بچانا چاہتی تھی۔ کوئی بات چیت، کوئی سودے بازی...... یا پھر کوئی کمانڈو ایکشن۔ لیکن کچھ بھی قابلِ عمل نظر نہیں آرہا تھا۔ قسطینا رنج والم کے گھیرے میں تھی۔ ریان فردوس کی موت اور ڈاکٹر ماریہ کے اچانک چلے جانے کے بعد یہ تیسرا شدید دھچکا تھا جو اسے پہنچ رہا تھا۔

اسی سوچ بچار میں رات ہوگئی۔ وقت آگے کو سرکتا رہا اور پھر وہ براوقت آن پہنچا جس کو بالآخر پہنچنا تھا۔ رائے زل کے حکم کے مطابق کریم کی پھانسی کو خصوصی اہمیت دی گئی تھی اور دیگر پھانسیوں کے برعکس اسے ٹی وی پر براہِ راست دکھایا جارہا تھا۔ یہ ہفتہ وار تعطیل کا دن تھا۔ ڈی پیلس کے سامنے پام کے بلند درختوں اور پرشکوہ عمارات پر سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ہاں جزیرے کی انہی خوشگوار چمکیلی دوپہروں میں سے ایک دوپہر جن کا ذکر ایک دن قسطینا نے کیا تھا۔ بے شک یہ ویسی ہی دوپہر تھی، دھوپ اور ہوا کا بہاؤ بھی ویسا ہی تھا مگر اس سارے منظر کو موت کی بے رحم سرخی نے ڈھانپ لیا تھا۔ مناظر کی اصل روح تو حالات سے

سرزد ہوئی ہے۔
عارضی پھانسی گھاٹ کے گرد عوام الناس کا جم غفیر تھا۔ وہ خوف، غصے اور دلچسپی کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ یقیناً بے شمار لوگ اپنے گھروں میں ایسے بھی بیٹھے ہوئے تھے جن کے سینے غم کی شدت سے پھٹے جا رہے تھے۔ وہ اپنے ایک ہیرو کو اپنے سامنے موت کے منہ میں جاتا دیکھ رہے تھے...... اور شاید اس کی زندگی کے حوالے سے اب بھی کسی معجزے کے منتظر تھے۔

پھر ہم نے ٹی وی اسکرین پر پھانسی کے مجرموں کو دیکھا۔ کیمرے نے زوم کر کے کریم کو قریب سے دکھایا۔ وہ ایک زخمی سپاہی کی طرح لنگڑاتا ہوا آرہا تھا، مگر سینہ تان کر اور سر کو بلند کر کے...... پھانسی گھاٹ کی چوبی سیڑھیوں کے پاس پہنچ کر اس نے پُرجوش انداز میں نعرہ بلند کیا۔ اسے رائفل کے بٹ رسید کیے گئے لیکن وہ مسلسل نعرے بلند کرتا رہا۔ اسے گھسیٹ کر سیڑھیوں سے اوپر لے جایا گیا۔ ہجوم میں ایک لہر سی پیدا ہوئی۔ بالکل جیسے پانی تھوڑا سا آگے بڑھتا ہے پھر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

جب تک کریم کے چہرے پر سیاہ نقاب نہیں چڑھا دیا گیا، وہ اور اس کے تین ساتھی مسلسل نعرے لگاتے رہے۔

آگے دیکھنے کی ہمت ہم میں نہیں تھی۔ فارس جان نے ٹی وی آف کر دیا۔ تین چار منٹ بعد جب اسے دوبارہ آن کیا تو کریم کو پھانسی ہو چکی تھی۔ کریم کے ساتھ اس کے تین ساتھیوں کی لاشیں بھی رسوں سے جھول رہی تھیں۔ حسب دستور ان کے جسموں پر جان کنی کے عالم میں گولیاں بھی برسائی گئی تھیں۔ خون کے قطرے ابھی تک ٹپک رہے تھے۔ ہجوم عجب بے کسی کے عالم میں منتشر ہونا شروع ہو گیا تھا مگر کچھ ٹولیاں ایسی بھی تھیں جو خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔

میری نگاہوں میں وہ منظر گھوم گیا جب چند منٹ قبل عبدالکریم لنگڑاتا اور نعرے لگاتا ہوا پھانسی گھاٹ کی طرف آرہا تھا۔ سچ ہی کہتے ہیں۔ جس دھج سے کوئی مقتل کو گیا وہ شان سلامت رہتی ہے۔

اس سارے منظر میں سے مجھے جو چیز سب سے زیادہ تکلیف دہ محسوس ہوئی تھی کہ وہ آخری وقت میں بھی کریم کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ دنیا سے جانے والے شخص کو بالکل آخری وقت میں تھوڑا بہت احترام تو دیا جاتا ہے مگر کریم کو اس وقت بھی زدوکوب کیا گیا تھا۔ اس نے اپنے جذبے اور اپنی سوچ کے تحت نعرہ ہی لگایا تھا۔ کسی کو گالی تو نہیں دی تھی۔ برا بھلا تو نہیں کہا تھا...... اور پھر پھانسی کے وقت، جان کنی میں مبتلا جسم کو گولیاں مارنا...... یہ سب کیا تھا؟ یہ ”خوب صورت“ رسم کس کی ایجاد کردہ تھی۔ شاید رائے زل کی یا اس کی ماں کی...... یا پھر شاید یہ رسم اس نفرت کی مرہونِ منت تھی جو ان لوگوں کے سینوں میں مدتوں سے ایک آتشیں سمندر کی طرح ہلکورے لے رہی تھی۔

وہ بہت دکھ اور کرب والی رات تھی، میں دیر تک جاگتا رہا۔ میرے اندر ان جابر حالات کا باغی سر اٹھا رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل کچھ کر گزرنے کو چاہ رہا تھا۔ میں تصور کی نگاہ سے ڈاکٹر ماریہ کو رائے زل کے بستر پر بے بس دیکھتا تھا اور میرا خون میرے سر کی طرف یلغار کرتا تھا۔ میں اب تک کے سارے حالات کو ٹی وی اسکرین پر بغور دیکھتا رہا تھا اور نجانے کیوں میرا دل کہہ رہا تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح رائے زل کو شدید نقصان پہنچا سکتا ہوں۔ ڈنمارک اور لندن وغیرہ میں جو گینگ فائٹس ہوتی تھیں، ان میں بھی کبھی مجھ پر ایسی ہی آگاہی والی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور میں بلاجھجک کسی خطرناک سچویشن میں کود پڑتا تھا۔

میرے ذہن میں کوئی پلان نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ مجھے یہاں کے اسٹور روم میں ایک ایسا لباس نظر آیا تھا جو غوطہ خوری میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک چھوٹا سا آکسیجن سلنڈر اور ہیلمٹ وغیرہ بھی یہاں موجود تھا۔ میں نے اس جگہ کا نقشہ بہت اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ ساحل یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اگر میں کسی طرح کنارے پر پہنچ جاتا تو پانی کے نیچے تیر کر اپنی منزل کی طرف جا سکتا تھا۔ میری منزل ہیجڑے خیام کا گھر تھی، جو میرے اندازے کے مطابق یہاں سے بہت دور نہیں تھا۔ یہ گھر بالکل سمندر پر واقع تھا۔ خیام کو ڈی پیلس کے خواجہ سراؤں کا انچارج کہا جاتا تھا۔ خیام میری گرفت میں آجاتا تو عین ممکن تھا کہ رائے زل یا پھر مادام باتا دالی تک پہنچنے کا کوئی راستہ نکل آتا۔ اندیشے تھے، بہت سے تھے لیکن پھر بھی میں نے پلاننگ کر لی۔ رات کو جب انیق اور سیف سو گئے تو میں نے انیق کے نام ایک چھوٹا سا خط لکھا جس میں اسے ضروری ہدایات دیں۔ زینب کے حوالے سے خاص تاکید کی اور پھر ”ایڈونچر“ کے لیے تیار ہو گیا۔

یہ رات تو میرا ایڈونچر تھا۔ یوں کہا جائے کہ [illegible] سے پہلے کا آغاز ہی ہوا تھا۔ غوطہ خوری کے لوازمات والا بیگ میرے دائیں ہاتھ میں تھا۔ اپنے اس اکلوتے صحت مند

ہاتھ کے ساتھ میں ایک مشکل کام کے لیے نکل رہا تھا۔

پناہ گاہ سے نکل کر ابھی میں تیس چالیس میٹر ہی آگے آیا تھا کہ ایک آواز نے میرے قدم تھام لیے۔ ''رکو...... کہاں جا رہے ہو؟'' یہ قسطینا کی آواز تھی۔

میں طویل ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ وہ میرے قریب چلی آئی۔ ''تم نے یہ کیسے سمجھ لیا شاہ زائب کہ میں تمہیں اس طرح جانے دوں گی۔ اگر خودکشی وغیرہ کا ارادہ ہے تو اس کے کئی اور بھی آسان طریقے ہیں۔''

''آپ مجھے ہرگز طعنہ نہیں دے سکتیں۔ آپ کچھ روز پہلے خود بھی تو اس طرح کی مہم جوئی کر چکی ہیں۔ وہ بھی تو خودکشی جیسا ہی کام تھا۔''

''میں سمجھ گئی ہوں۔ تمہارا اشارہ برج کلب والے جشنے کی طرف ہے۔ لیکن اس کام میں ایک پلاننگ تھی۔ بن مشبد وغیرہ ساری منصوبہ بندی کا حصہ تھے۔ ہم یہاں کے ایک ایک چپے سے واقف ہیں۔ تم ابھی یہاں کے بارے میں کیا جانتے ہو؟ کیا پلاننگ ہے تمہاری۔'' اس نے میرے ہاتھ کے بیگ کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے بوائے کٹ بال پچھلے پہر کی ساحلی ہوا میں لہرا رہے تھے۔

میں نے وہیں پتھروں پر بیٹھ کر اسے بتایا کہ میرے ذہن میں کیا ہے اور میں کس طرح خیام تک پہنچنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

وہ میری ساری روداد سننے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''شاہ زائب! میں تمہارے اس جذبے اور اس سوچ کی قدر کرتی ہوں کہ تم اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر جزیرے کے اس تیئے جابر حاکم تک پہنچنا چاہتے ہو لیکن جو طریقہ تم اختیار کر رہے ہو اس میں بہت سی خامیاں ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر تم کو... واقعی جانا ہے تو پھر اکیلے نہیں جاؤ گے۔''

''کیا مطلب قسطینا؟''

وہ ہولے سے مسکرائی۔ تاروں کی چھاؤں میں اس کی پھیکی سی مسکراہٹ مجھے صاف نظر آئی۔ ''تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔'' وہ بولی۔ ''جب میں مالن کے بھیس میں نیوشی جا رہی تھی، تم نے مجھے روکا تھا اور ساتھ جانے پر اصرار کیا تھا۔ آج میں کر رہی ہوں۔''

''آ...... آپ ساتھ جانا چاہ رہی ہیں؟''

''جانا چاہ نہیں رہی...... میں جاؤں گی...... اور تمہیں وہ راستہ بھی بتاؤں گی جس پر چل کر کامیابی کی امید کی جا سکتی ہے۔''

''لیکن قسطینا! میں نہیں چاہتا کہ آپ اپنے آپ کو کسی خطرے میں ڈالیں۔ خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو گیا تو جامانی کے لوگ بالکل بے آسرا ہو جائیں گے۔ وہ بہت زیادہ انحصار کرتے ہیں آپ پر۔''

''اب تو وہ تم پر بھی کافی انحصار کرنے لگے ہیں۔ تمہاری حیثیت یہاں بہت اہم ہو رہی ہے۔ بلکہ دیکھو...... میرے سر کی کوئی قیمت مقرر نہیں جبکہ تمہارے سر کی ہے۔''

''قسطینا! مجھے بتائیں، آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟''

''سب سے پہلے تو اپنا یہ غوطہ خوری کا سامان واپس اسٹور میں رکھو۔ میرا خیال ہے کہ وہاں ساحل کے چپے چپے کی نگرانی ہو رہی ہے۔ تمہارا پانی تک پہنچنا ہی ناممکن ہے۔ اس کے بعد اپنے اس اکلوتے ہاتھ سے اتنا لمبا فاصلہ طے کر کے خیام کے گھر تک پہنچنا اور اندر داخل ہونا...... نہیں نہیں۔'' اس نے فیصلہ کن انداز میں نفی میں سر ہلایا۔

''تو پھر؟''

''ہم ایک اور طرح سے قسمت آزمائیں گے۔'' وہ پُرسوچ لہجے میں بولی۔ اس کی آنکھوں میں خاص چمک تھی۔

وہ مجھے لے کر واپس پناہ گاہ میں آ گئی۔ سلائیڈنگ پتھر کو بے آواز حرکت دے کر ہم اندر داخل ہوئے۔ سب سو رہے تھے۔ صرف اس کمرے سے آوازیں آ رہی تھیں جہاں سجاول بند تھا۔ وہ نشہ آور انجکشن کے زیر اثر تھا اور خود کو شاید اپنے آزاد کشمیر والے ڈیرے پر محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنے قائم مقام فیض محمد کو پکار رہا تھا اور ساتھ ساتھ اپنے کسی ڈکیت ساتھی کو گالیاں دے رہا تھا۔ پھر وہ اپنی بیٹی، آفت کی پرکالہ ''مانی'' سے ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد میں دوبارہ پناہ گاہ سے نکل رہا تھا۔ اس مرتبہ میرے ساتھ قسطینا بھی تھی۔ جزیرے کی کچھ مسلمان خواتین مکمل پردہ بھی کرتی تھیں اور ایک برقع نما لبادے میں نظر آتی تھیں۔ اس وقت قسطینا بھی ایک ایسے ہی سیاہ بوسیدہ لبادے میں تھی۔ اس کے سر پر ایک ٹوپی تھی اور اس ٹوپی کے سامنے سیاہ رنگ کے باریک کپڑے کا نقاب جھول رہا تھا جس کے آر پار وہ دیکھ سکتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں روزمرہ استعمال کی ایک ٹوکری تھی جس میں ڈرائی فروٹ اور بسکٹ وغیرہ تھے۔ میں بھی مقامی طرز کے لباس میں تھا۔ قسطینا نے فارس جان کی مدد سے میرے سر پر ایک سفید بینڈیج اس طرح سے کر دی تھی کہ میری ایک آنکھ اور ایک رخسار بھی اس میں چھپ گئے تھے۔ ایک چھوٹی بینڈیج ٹیپ کے ذریعے میری ٹھوڑی پر بھی چپکائی گئی تھی۔ یوں چہرہ

ناقابلِ شناخت ہوکر رہ گیا تھا۔ بائیں بازو پر پہلے سے پٹیاں موجود تھیں۔ میں جنگ سے متاثرہ ایک مقامی زخمی کے روپ میں بالکل ''فٹ'' نظر آرہا تھا۔ میرا پستول قسطینا نے ایک لچکیلے بینڈ کے ذریعے اپنی ٹانگ سے باندھ لیا تھا۔ نکلنے سے پہلے قسطینا نے فارس جان کو ضروری ہدایات دے دی تھیں۔ اب رات کا آخری پہر شروع ہو چکا تھا۔ ساحل کی طرف سے سرد ہوا کی آمد تھی۔ کسی بدھ مندر کی گھنٹیاں بجنا شروع ہو گئی تھیں۔ شہر کی جانب عمارتوں کی روشنیاں اونگھ رہی تھیں اور مکمل خاموشی تھی۔ ہم باتیں کرتے جارہے تھے۔

میں نے کہا۔ ''کچھ تو بتاؤ قسطینا! ہم جا کہاں رہے ہیں؟''

''سمجھو، ایک بہت بڑا شارٹ کٹ لگا رہے ہیں رائے زل تک پہنچنے کے لیے۔ اگر ایک بندے تک پہنچ گئے تو......رائے زل کے آس پاس بھی پہنچ گئے۔''

''کون بندہ ہے؟''

''آقا جان کا ذاتی باڈی گارڈ...... ہمایوں آسیاں۔ یہ شخص یہاں مضافات میں اپنے فارم میں رہتا ہے۔ آقا جان آج کل ہر وقت رائے زل کے دائیں بائیں نظر آتا ہے۔ مطلب یہ کہ آسیاں بھی رائے زل کے آس پاس ہی ہو گا۔'' (یہ پہلی بار تھی کہ قسطینا نے انکل آقا جان کے بجائے صرف آقا جان کہا تھا) قسطینا کی بات سمجھ میں آرہی تھی۔ اس میں اہم نکتہ یہی تھا کہ یہ آسیاں نامی باڈی گارڈ شہر میں نہیں بلکہ یہاں مضافات میں کہیں رہتا تھا۔ جہاں تک ہم بہ آسانی پہنچ سکتے تھے۔

میں نے قسطینا سے پوچھا۔ ''کتنی دور جانا ہوگا؟''

''مشکل سے دو ڈھائی کلومیٹر۔'' وہ بولی۔

ہم پام کے پیڑوں اور کیلے کے گھنے درختوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ ایک پنسل ٹارچ قسطینا کے ہاتھ میں تھی، جہاں شدید ضرورت ہوتی تھی وہ ایک سیکنڈ کے لیے ٹارچ کو روشن کر لیتی تھی۔ ایک مثبت تبدیلی یہ تھی کہ میرے بازو کا درد اب بہت کم ہو گیا تھا۔ سوجن بھی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ غالباً ڈاکٹر ماریہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ انفیکشن ختم ہو رہا تھا اور ہڈی نے جڑنا شروع کر دیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ غلط طریقے سے جڑ رہی تھی اور میں بازو کو ایک حد سے زیادہ حرکت نہیں دے سکتا تھا۔

ایک جگہ ہمیں سپاہیوں کی نقل و حرکت کا شبہ ہوا۔ ہم نے راستہ بدل لیا اور زیادہ گھنے درختوں میں سفر کرتے آگے بڑھتے رہے۔ آخر ایک جگہ مدھم روشنیاں دکھائی دیں اور رکھوالی کے کتوں کی آوازیں آئیں۔ یہاں ایک فارم ہاؤس کی چار دیواری تھی۔ فارم ہاؤس زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس کے اندر ''رہائشی عمارت'' سامنے ہی دکھائی دے رہی تھی۔ لکڑی کے پھاٹک کے ساتھ ایک کال بیل موجود تھی۔ تاہم قسطینا نے کال بیل کے بجائے پھاٹک پر دستک دی۔ میں دیوار کی اوٹ میں ہو چکا تھا۔ دو سیکنڈ بعد پھاٹک کے اوپر سے ایک سر نظر آیا۔ ''کون ہے؟'' ملائی زبان میں پوچھا گیا۔

قسطینا نے مصیبت زدہ آواز میں کچھ کہا۔ گیٹ کیپر نے چھوٹا دروازہ کھولا اور باہر نکلا۔ رائفل اس کے کندھے سے جھول رہی تھی۔ قسطینا نے برقع نما لبادے کے اندر سے پستول نکال کر گیٹ کیپر کے سر سے لگا دیا۔ ''خبردار! جان سے مار ڈالوں گی۔'' وہ سفاک لہجے میں بولی۔

اسی دوران میں، میں نے عقب سے نمودار ہو کر اس کے سر کے بال مٹھی میں جکڑ لیے اور رائفل اس کے کندھے سے اتار لی۔

گیٹ کیپر سکتہ زدہ تھا۔ وہ قسطینا کی طرف دیکھے چلا جا رہا تھا۔ شاید اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اسے گھسیٹ کر ایک طرف خودرو پودوں میں لے گیا۔ اس کی نگاہیں ابھی تک قسطینا پر جمی ہوئی تھیں جس نے اب چہرے سے نقاب اٹھا دیا تھا۔

میں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''ہاں، یہ وہی ہیں جن کا شبہ تمہیں ہو رہا ہے۔ بہت بڑی مصیبت سے بچنا چاہتے ہو تو جو کچھ کہنے والے ہیں اس پر عمل کرو۔''

یہی بات قسطینا نے ملائی زبان میں بھی گیٹ کیپر تک پہنچا دی۔ وہ اب تھر تھر کانپ رہا تھا۔ جاماجی کی سپریم کمانڈر اس کے سامنے تھی۔ دو چار منٹ کے اندر ہم اس شخص کو اپنے ڈھب پر لے آئے۔ قسطینا نے اس سے کہا کہ اگر وہ فارم ہاؤس کی رہائشی عمارت کے بارے میں درست اطلاعات دے گا اور تعاون کرے گا تو اس کی جان بخشی ہو جائے گی۔

گیٹ کیپر بے حد دہشت زدہ تھا۔ اس نے تعاون کا یقین دلایا اور بتایا کہ گھر میں فی الوقت صرف تین افراد ہیں۔ مالک آسیاں...... ایک لڑکی اور ایک باورچی۔

قسطینا نے پوچھا۔ ''آسیاں کی بیوی کہاں ہے؟''

گیٹ کیپر نے بتایا کہ وہ جھگڑ کر اپنے میکے گئی ہوئی ہے۔ مالک آسیاں نے اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے ڈی

تھیں کی ایک ملازمہ کو عارضی طور پر اپنے پاس رکھا ہوا ہے

ہمیں گھر کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہو گئیں تو ہم پھاٹک کے چھوٹے دروازے کے ذریعے اندر داخل ہوئے۔ پھاٹک کے قریب ہی دو سرونٹ کوارٹر موجود تھے۔ ان میں سے ایک کے اندر ملاکیشین باورچی سو رہا تھا۔ قسطینا نے تصدیق کر لی تھی کہ باورچی کے پاس کوئی موبائل فون وغیرہ نہیں ہے۔ باورچی کو سرونٹ کوارٹر کے اندر ہی مقفل کر دیا گیا۔ اس کے بعد گیٹ کیپر مراد نے اپنے موبائل فون کے ذریعے آسیاں کو جگایا اور اسے یہ پریشان کن اطلاع دی کہ پھاٹک سے باہر ایک لاش پڑی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایسی اطلاع نہیں تھی جو آسیاں کو اس کے بیڈ روم سے نہ نکالتی۔

ہماری موجودگی کے سبب رکھوالی کے کتے مسلسل شور مچا رہے تھے اور یقیناً یہ آوازیں آسیاں کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ عین ممکن تھا کہ وہ کتوں کی اس بے چینی کو بھی لاش کی موجودگی سے جوڑ رہا ہو۔ کچھ ہی دیر بعد لمبا تڑنگا آسیاں ہمیں برآمدے سے نکل کر پھاٹک کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کی حرکات و سکنات میں بلا کی چستی تھی۔ میں، قسطینا اور گیٹ کیپر مراد ایک بار پھر پھاٹک سے باہر کھڑے تھے۔ گیٹ کیپر مراد والی ٹرپل ٹو رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔

جونہی آسیاں باہر نکلا، میں نے رائفل کی نال اس کی کنپٹی سے لگا دی۔ ”خبردار۔“ میں نے دہاڑ کر کہا۔

اس نے پھرتی سے پلٹنا چاہا۔ اس وقت دو کام ایک ساتھ ہوئے۔ قسطینا نے اس کے ہولسٹر میں سے پستول کھینچا اور میں نے اس کی کمر پر ٹانگ رسید کر کے اسے کئی قدم دور پھینک دیا۔ وہ اوندھے منہ گرا تھا۔ قسطینا نے اپنا پاؤں اس کی گدی پر رکھ دیا۔ اس نے بھی اب قسطینا کو دیکھ لیا تھا۔ جو کچھ بھی تھا، وہ جاماجی کی سپریم کمانڈر تھی۔ اس کا رعب مدمقابل کو متاثر کرتا تھا۔

آسیاں اگر آقا جان کا ذاتی باڈی گارڈ تھا تو یونہی نہیں ہو گا، وہ کسی بھی وقت خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کی باڈی لینگویج بھی یہی بتاتی تھی۔ میں اس کے حوالے سے کوئی رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔ سرونٹ کوارٹر میں سے ایک رسی میں پہلے ہی ڈھونڈ چکا تھا۔ میں نے گیٹ کیپر مراد کو گن پوائنٹ پر حکم دیا کہ وہ اوندھے پڑے آسیاں کے ہاتھ اس کی پشت پر باندھ دے۔ مراد کو ایسا کرنا پڑا۔ اب میں نے اپنے چہرے کی پٹیاں اتار دی تھیں۔

قسطینا نے آسیاں کی جامہ تلاشی لی اور اس کے موبائل فون کے علاوہ پستول کا ایک بھرا ہوا میگزین نکال لیا۔ اس دوران میں آسیاں کسی علاقائی زبان میں مسلسل بڑبڑا رہا تھا (بعدازاں قسطینا نے مجھے بتایا کہ وہ گیٹ کیپر مراد کو گندی گالیاں دے رہا تھا اور اسے کوس رہا تھا کہ وہ گیٹ کی حفاظت نہیں کر سکا)

آسیاں کے ہاتھ باندھنے کے بعد ہم اسے اور مراد کو اندر لے آئے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ مراد اور آسیاں نے مجھے شناخت نہیں کیا۔ اندر ایک کمرے میں ڈبل بیڈ کے ایک کنارے پر ایک لڑکی دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے گیٹ کیپر مراد نے بتایا تھا کہ وہ ڈی پیلس کی کوئی ملازمہ ہے جو آسیاں کی تنہائی دور کرنے کے لیے یہاں موجود ہے۔ لیکن میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ میرے سامنے جولڑکی آقا جان کے ذاتی محافظ آسیاں کے بستر پر سو رہی تھی...... وہ سنبل تھی۔ عزت مآب ریان فردوس کی نہایت چہیتی خواص...... لیہ کے پارا ہاؤس میں وہ کھلنے اور بند ہونے والے ایک مشینی پھول میں بیٹھ کر بطور تحفہ ریان فردوس کی خدمت میں پیش ہونے گئی تھی (اس پھول میں ایک دوسری لڑکی آقا جان نے ریان فردوس کے پاس بھجوا دی تھی مگر سنبل کو پھر بھی اپنی خوب صورتی کا خراج مل گیا تھا اور ریان فردوس نے اسے سرراہ دیکھ کر اپنے پاس طلب کر لیا تھا) آج وہی سنبل دو ٹکے کے ایک گارڈ کے پاس موجود تھی۔ کہاں جاماجی کا ارب پتی فرمانروا اور کہاں ایک ملازم۔ شاید یہ بھی رائے زل اور آقا جان کی نفرت اور حقارت کا ایک اظہار تھا۔ مقتول فرمانروا کی منظورِ نظر کو نچلے درجے کے ماتحتوں کے حوالے کر دیا گیا تھا۔

میں نے سنبل کو جگایا۔ اس کے بال منتشر تھے۔ وہ کچھ دیر خالی خالی نظروں سے ہماری طرف دیکھتی رہی تب اس نے یکا یک مجھے پہچان لیا۔ اس کے گورے چٹے چہرے پر حیرت کی یلغار ہوئی۔ وہ ایک دم بستر سے اتر آئی۔ ”تم یہاں......؟“

”ہاں...... لیکن تم یہاں کیسے؟“

اس نے ڈری ڈری نظروں سے اردگرد دیکھا۔ تب اس کی نگاہ آسیاں پر پڑی۔ اس کے چہرے کی خراشیں اور اس کے بندھے ہوئے ہاتھ دیکھ کر اس کی حیرت دوچند ہو گئی۔ تاہم اس کے ساتھ ہی اس کا اعتماد بھی کچھ بحال ہوا۔ وہ میرے پہلو میں آن کھڑی ہوئی۔ ”میں یہاں رہنا نہیں

چلا اٹھی۔ تم نے یہاں سے لے چلو۔ سجاول صاحب کہاں ہیں؟ مجھے ان کے پاس لے چلو۔ یہ سب بدمعاش لوگ ہیں۔ انہوں نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا ہے۔ کچھ بھی میرے پاس نہیں رہنے دیا۔" وہ اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے اشک بار لہجے میں بولی۔ یہ وہی ہاتھ تھے جن پر جڑاؤ چوڑیوں اور انگوٹھیوں کی بہار نظر آتی تھی۔

"تمہیں یہاں لایا کون تھا؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے کچھ پتا نہیں۔" وہ سسکی۔ "عزت مآب کو مارنے کے بعد انہوں نے لوٹ مار مچادی۔ کئی عورتوں کو پکڑ لیا۔ ان میں، میں بھی تھی۔ مجھ سے میرا سارا سامان چھین لیا۔ وہ سارے تحفے بھی جو وہ (ریان فردوس) مجھے دیتے رہے تھے۔ پورا صندوق بھرا ہوا تھا۔" وہ جیسے کراہ اٹھی۔

"ڈی پیلس سے باہر کیسے نکلیں تم؟"

"پہلے مجھے آقا جان کا ایک بھانجا اپنے ساتھ لے گیا۔ پھر مجھے اپنے ایک عیسائی ملازم کے حوالے کردیا۔ اس نے میری انگوٹھیاں، چوڑیاں اور کانوں کی بالیاں تک اتروا لیں۔ یہ دیکھو میرے کان۔" اس نے اپنا ایک زخمی کان دکھایا اور آنسو ٹپ ٹپ اس کے رخساروں سے پھسلنے لگے۔

کچھ دیر چپ رہ کر وہ بولی۔ "وہاں سے مجھے یہ کمینہ لے آیا۔ میں دو دن سے اس کے پاس ہوں۔ کل یہ اپنے دو دوستوں کو بھی یہاں لے کر آیا ہوا تھا۔" وہ ایک بار پھر رو پڑی۔

جنگ کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ یہ منہ زور پانی کی طرح اپنے راستے خود بناتی ہے۔ سارے معاشرتی اور اخلاقی معیار بدل جاتے ہیں۔ فرش پر رینگنے والے آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگتے ہیں اور آسمان پر پرواز کرنے والے گندی نالیوں میں دیکھے جاتے ہیں۔ یہ سنبل کچھ دن پہلے تک ریان فردوس کی اہم ترین خواص تھی مگر آج گلی گلی میں رل رہی تھی۔ وہ عالی شان بیڈ روم، وہ زرق برق لباس، وہ ہر وقت سینے سے لگا ہوا مینا، وہ خادماؤں کے جھرمٹ...... وہ سب کچھ ناپید تھا۔ چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات...... شاید اس کی اس خواری میں آقا جان کی کینہ پروری کا بھی دخل رہا ہو۔ اسے عرصے سے اس بات کا قلق تھا کہ اس کی منظورِ نظر لڑکی کی جگہ سنبل کو ریان فردوس کے حرم میں اہمیت دی گئی ہے۔

قسطینا نے سنبل کو تسلی دی اور اس کے آنسو پونچھے۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ ہم نے گیٹ کیپر مراد کی

اسی طرح تلاشی لینے کے بعد اسے ایک واش روم میں مقفل کردیا اور آسیاں کو گھر کے بیسمنٹ میں لے جا کر اس سے پوچھ گچھ شروع کردی۔ وہ بہت سخت ہڈی کا تھا۔ آسانی سے کچھ اگلنے والا نہیں تھا۔ مگر ہمارے پاس بھی رحم کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ دس منٹ کے کلاسیکل تشدد نے آسیاں کی ساری تن فن ختم کردی۔ اس کی ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ کلائی کی دونوں ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں اور میں اس کے ہاتھ کو ذرا سی حرکت دیتا تو وہ بلبلا اٹھتا تھا۔

اس سے جو کچھ معلوم ہوا اس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔ آج شام آقا جان اور طلحی کو ایک اہم میٹنگ میں ملنا تھا۔ یہ دراصل ایک جلسہ تھا۔ ائرپورٹ کی طرف ایک بڑے فٹ بال اسٹیڈیم میں آج، یہاں کا نیا فرمانروا رائے زل لوگوں سے خطاب کررہا تھا۔ (کہنے کو تو وہ فرمانروا تھا لیکن جاننے والے جانتے تھے کہ وہ ایجنسی کی کٹھ پتلی ہے)

یہ جلسہ سہ پہر چار بجے کے لگ بھگ ہونا تھا۔ سیکیورٹی کے انتہائی سخت انتظامات تھے۔ ذاتی باڈی گارڈ کی حیثیت سے آسیاں آؤٹ ڈور میں ہر گھڑی آقا جان کے ساتھ رہتا تھا۔ آسیاں اس چار رکنی موٹر سائیکل سوار اسکواڈ کا رکن تھا جو آقا جان کی گاڑی کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ آسیاں کی "ہیوی سرکاری بائیک" آقا جان کی مرسیڈیز کے آگے دائیں جانب رہتی تھی۔ جب آقا جان گاڑی سے اتر کر کسی "پبلک پلیس" پر جاتا تھا تو آسیاں اور اس کا بائیں جانب والا ساتھی آقا جان کے عقب میں پیدل ہوتے تھے۔ آسیاں نے شدید اذیت کا شکار ہونے کے بعد ہمیں جو معلومات دیں ان سے پتا چلا کہ موٹر سائیکل سواروں کی یونیفارمز، بلٹ پروف جیکٹس، موٹر سائیکلز اور دیگر سارے لوازمات سیکیورٹی کے "برانچ آفس" میں ہوتے ہیں۔ یہ برانچ آفس ڈی پیلس کے قریب ہی واقع تھا۔ یہ لوگ برانچ آفس سے تیار ہوکر اور اپنی بائیکس لے کر نکلتے تھے اور ڈی پیلس کے مین گیٹ پر تیار کھڑے ہوجاتے تھے۔ جونہی آقا جان کی گاڑی ڈی پیلس سے برآمد ہوتی تھی، وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگتے تھے۔

آسیاں کی ساری باتیں سننے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ میں آج سہ پہر آسیاں کی جگہ لوں گا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ برانچ آفس میں داخل ہوتا ہی جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔ یہاں سی سی ٹی وی کیمرے تھے۔ جگہ جگہ آٹومیٹک شناخت کا سسٹم تھا......

جدید "سینسرز" پر فنگر پرنٹ اسکین ہوتے تھے اور

سلامتی تک دروازے خود کھولتے تھے۔ صرف ایک چیز ایسی تھی جو کسی حد تک میرے حق میں جاتی تھی اور وہ یہ کہ برانچ آفس کے تین چار بیرونی کیمرے کام نہیں کر رہے تھے۔

گھر کے بیسمنٹ میں آسیاں سے ہماری تفتیش جاری تھی کہ اس کے سیل فون پر کال آگئی۔ اس سلسلے میں ہم آسیاں کو پہلے ہی کڑی ہدایات دے چکے تھے۔ میرے اشارے پر اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف ایجنسی کا کوئی امریکن آفیسر انگلش میں بات کر رہا تھا۔

''ہیلو آسیاں! تم ٹائمنگ نوٹ کر چکے ہو؟''

''جی سر۔'' آسیاں نے اپنی آواز حتی الامکان نارمل رکھتے ہوئے کہا۔

''تمہیں دو بجے ڈی پیلس کے مین گیٹ پر ہونا چاہیے۔ آقا صاحب ڈھائی بجے کے بعد کسی بھی وقت باہر آسکتے ہیں۔''

''جی سر۔''

''کوئی سوال؟''

''سر! ہم چاروں ہوں گے؟''

''نہیں.....تم دونوں جاؤ گے۔ مختار اور راجر کی ڈیوٹی اوان صاحب کے ساتھ ہے۔''

''او کے سر۔'' آسیاں نے اپنی کراہ دباتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنی ٹوٹی ہوئی کلائی کو دوسرے ہاتھ سے تھام رکھا تھا۔

بات ختم کرنے کے بعد وہ لمبی سانسیں لینے لگا۔ اس کی پیشانی پسینے سے تر تھی۔

اس کے اور امریکن آفیسر کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی، وضاحت طلب تھی۔ آسیاں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ اس وقت ''وی آئی پیز'' کی نقل و حرکت بہت زیادہ ہے۔ اس لیے آقا جان کے ساتھ چار گارڈز کے بجائے دو گارڈز ہوں گے۔ (ان میں سے ایک آسیاں تھا)

آسیاں کا پیٹ اور کندھے وغیرہ ہم نے کرسی کے ساتھ باندھ رکھے تھے۔ اس کے بالائی کپڑے پھٹ چکے تھے اور اندر سے کسرتی جسم جھلک دکھا رہا تھا۔ قسطینا کے جاں بحق ہونے والے گارڈ براڈے کی طرح آسیاں بھی فولادی شخص تھا۔ مگر فی الوقت یہ فولاد ہمارے لیے گرم لوہا بنا ہوا تھا، ہم اسے جس طرف چاہیں موڑ رہے تھے۔ جب میں نے ایک تیز دھار چاقو سے آسیاں کے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا اچانک کاٹ ڈالا تو وہ درد سے چلا اٹھا۔ اس کی بھاری بھرکم آواز نہ جانے میں کون کررہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں شدید حیرت تھی۔ جیسے خاموشی کی زبان میں مجھ سے پوچھ رہا ہو.....یہ کیا کر دیا؟ سب کچھ تو بتا رہا ہوں۔ کس بات پر اڑی کی ہے؟

خون زخم میں سے تیزی کے ساتھ نکل رہا تھا۔ طیش اور درد سے بے تاب ہو کر آسیاں نے خود کو چھڑانا چاہا۔ کرسی الٹ گئی۔ وہ پہلو کے بل کرسی سمیت گرا۔ مکرر ارشاد کے طور پر قسطینا نے اس کے کھوپڑے کو رائفل کے دستے سے بجایا۔ وہ کسی علاقائی زبان میں دہاڑنے لگا اور واویلا کرنے لگا۔ اس کا کٹا ہوا انگوٹھا فرش پر پڑا تھا اور کریہہ منظر پیش کر رہا تھا۔

''یہ کیوں کیا؟'' قسطینا کو بھی تھوڑی سی حیرت ہوئی، کیونکہ آسیاں ہر طرح تعاون کر رہا تھا۔

''یہ انگوٹھا کام آئے گا۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ آواز بس اتنی تھی کہ قسطینا ہی سن سکی۔

پہلے تو قسطینا نے خالی خالی آنکھوں سے میری طرف دیکھا پھر ایک دم اس کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔

میں نے کٹے ہوئے انگوٹھے کو ایک ٹشو پیپر میں لپیٹا اور پھر پولیتھین کے ایک چھوٹے لفافے میں ڈال لیا۔

''مار دو..... مجھے جان سے ہی مار دو۔'' آسیاں دہاڑ رہا تھا۔

قسطینا بے رحم لہجے میں بولی۔ ''گھبراؤ مت، تمہاری یہ خواہش بھی پوری کر دیں گے۔ کوئی ایسا افسوس نہیں ہوگا ہمیں، تمہاری کھوپڑی توڑ کر۔''

اس کے ہاتھ کا خون بند کرنے کے لیے میں نے وہاں روئی رکھ کر چوڑی ٹیپ چپکا دی مگر خون کے قطرے پھر بھی گرتے رہے۔ اس کے واویلے کے باوجود میں نے اس کے ہاتھ پھر کرسی سے باندھ دیے۔

قسطینا نے اس کی بندشیں چیک کیں اور ہم بیسمنٹ کا دروازہ لاک کر کے اوپر آگئے۔ سنبل یہاں سکڑی سمٹی ایک صوفے پر بیٹھی تھی۔ وہ جسمانی اور مالی طور پر بری طرح لوٹی گئی تھی مگر یوں لگتا تھا کہ اسے مالی نقصان کا زیادہ دکھ ہے۔

میں نے آسیاں کے ذاتی کمرے کی تلاشی لی۔ جلد ہی مجھے ایک الماری کے خفیہ خانے سے پندرہ بیس گرام ہیروئن..... کچھ نقدی اور سونے کے ایک درجن بسکٹ مل گئے۔ نقدی اور سونا ملا کر کافی مالیت بنتی تھی۔ میں نے سنبل سے کہا۔ ''گھبراؤ مت، یہ سب تمہارا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی میں

نے برونائی ڈالرز، امریکن ڈالرز اور سونے کے بسکٹ سنبل کے سامنے رکھ دیے۔

اس کی بجھی ہوئی آنکھوں میں روشنی نمودار ہو گئی مگر چہرے پر خوف بھی تھا۔ وہ ہراساں نظروں سے اردگرد دیکھ رہی تھی۔ ''وہ کہاں گیا ہے؟'' وہ بولی۔

''تہ خانے میں ہے۔ اس کی طرف سے بے فکر رہو۔''

''وہ بہت زور زور سے بول رہا تھا اور رو رہا تھا۔ کیا تم لوگوں نے اسے مارا ہے؟''

''کیا نہیں مارنا چاہیے تھا؟''

''وہ بہت خطرناک شخص لگتا ہے......'' وہ بولی۔

''اس کی کافی ساری خطرناکی، ناک کے راستے نکل چکی ہے۔ باقی بھی نکل جائے گی۔'' قسطینا دوسرے کمروں کی تلاشی لے رہی تھی۔ کھٹ پٹ کی مدھم آوازیں آرہی تھیں۔ اچانک مجھے قسطینا کی ہلکی سی کراہ سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی اوپر تلے تین فائر ہوئے اور در و دیوار گونج گئے۔

سنبل کی آنکھوں میں بے پناہ خوف امڈ آیا۔ وہ لپک کر واش روم میں گھس گئی۔ میں پستول نکال کر قسطینا کی طرف لپکا۔ وہ اس دروازے کے پاس تھی جہاں سے سیڑھیاں تہ خانے میں جاتی تھیں۔ میں نے دیکھا قسطینا کے ہاتھ میں رائفل ہے اور چند فٹ کے فاصلے پر آسیاں مردہ پڑا ہے۔ کرسی ابھی تک اس کی پشت سے بندھی ہوئی تھی، مگر وہ کسی طرح اپنے ہاتھ کھولنے میں کامیاب رہا تھا۔ اس کے پاس ڈپلی کیٹ چابی موجود تھی۔ اس نے تہ خانے کا دروازہ کھول کر سیڑھیاں طے کی تھیں۔ کرسی کی ایک ٹوٹی ہوئی وزنی ٹانگ اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے اسی ٹانگ سے قسطینا پر عقب سے وار کیا اور اس کی فائرنگ کا نشانہ بن گیا۔ قسطینا کے سر پر چوٹ آئی تھی مگر بہت شدید نہیں تھی۔

''کافی جلدی خواہش پوری ہو گئی اس کی۔'' میں نے کہا۔

قسطینا بولی۔ ''فائرنگ کی آواز باہر بھی گئی ہو گی۔ کہیں فارم میں سے کچھ لوگ یہاں نہ پہنچ جائیں۔ بیرونی دروازے لاک کر دو۔''

میں نے دروازے لاک کر دیے۔

قریباً پانچ منٹ تک ہم بالکل الرٹ رہے لیکن فارم ہاؤس کے باقی حصے میں کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ شاید اس فائرنگ کو ہوائی فائرنگ سمجھا گیا تھا یا کسی دوسری روٹین میں لے لیا گیا تھا۔ اگلے ایک گھنٹے کے اندر ہم اپنی پلاننگ کے مطابق آگے بڑھنے کے لیے بالکل تیار تھے۔ یہ ایک بڑی مکمل منصوبہ بندی تھی مگر منصوبہ کتنا بھی پرفیکٹ ہو جب تک اس پر عمل شروع نہ ہو اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ قسطینا بدستور برقع نما لبادے میں تھی۔ میں نے اپنے چہرے کو پی کیپ اور چوڑے شیشوں والی عینک سے چھپانے کی کوشش کی تھی۔

☆☆☆

آسیاں کی لاش کو تہ خانے میں چھپانے کے بعد ہم نے گھر میں اپنی موجودگی کے تمام آثار ختم کیے۔ ہم نے گیٹ کیپر مراد کو بھی اسی سرونٹ کوارٹر میں بند کر دیا جہاں آسیاں کا خانساماں موجود تھا۔ دونوں کے منہ میں کپڑے ٹھونس کر ان کی مشکیں بے حد احتیاط سے کس دی گئی تھیں۔ سرونٹ کوارٹر کے مختصر باتھ روم میں وہ دونوں جیسے ''پیک'' ہو کر رہ گئے تھے، ہم ان کی طرف سے مطمئن تھے۔

ہم نے آسیاں کی 2002 ماڈل کی ٹوسیٹر گاڑی پر سفر کیا۔ سنبل بھی ہمارے ساتھ تھی۔ پروگرام کے عین مطابق ہم نے سنبل کو بڑی رازداری کے ساتھ ایک رہائشی کالونی کے چھوٹے سے گھر میں اتار دیا۔ یہ ایک ایسے لیکچرار کا گھر تھا جو ہر طرح سے قسطینا کا وفادار تھا اور سنبل جہاں سو فیصد محفوظ تھی۔

سنبل کے بوجھ سے آزاد ہونے کے بعد ہمارا اصل کام شروع ہوا۔ اب دن کا اجالا اچھی طرح پھیل چکا تھا مگر سڑکوں پر آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ بس کسی وقت کوئی پرائیویٹ یا فوجی گاڑی فراٹے کے ساتھ گزر جاتی تھی۔ جگہ جگہ بمباری اور گولہ باری کے آثار بھی نظر آتے تھے۔ درختوں کے درمیان ایک ذیلی سڑک پر ہم نے آسیاں کی ٹوسیٹر گاڑی روک لی۔ یہ جگہ رکنے کے لیے ہر لحاظ سے محفوظ تھی۔

''اب بتاؤ کیا کرنا ہے؟'' قسطینا نے سامنے سڑک پر دیکھتے ہوئے کہا۔

''برانچ آفس کے اندر گھسنا ہے۔''

وہ بولی۔ ''اندر گھسنے کے لیے یہ وقت بہترین ہے مگر اس وقت بھی داخلی دروازے پر ایک دو گارڈز تو ضرور موجود ہوں گے۔''

''انہیں آپ سنبھال لیجیے گا۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو پھر یہ تو ہے نا۔'' میں نے جیکٹ کے نیچے پستول کو چھو کر کہا۔ یہ جیکٹ اور پستول آسیاں ہی کا تھا۔

آسیاں کا کٹا ہوا انگوٹھا پولیتھین کے لفافے میں لپٹا ہوا میری پتلون کی جیب میں موجود تھا اور میں اسی کی مدد سے برانچ آفس کی نہایت سخت سیکیورٹی کے حصار میں گھسنے والا تھا۔ پروگرام کے مطابق مجھے وہاں سے آسیاں کا مکمل لباس، اس کا اسپیشل آئی ڈی، اس کی پائلٹ موٹر بائیک اور دیگر اشیا حاصل کرنا تھیں اور پھر آقا جان کے پروٹوکول کا حصہ بن کر اس کے قافلے کے ساتھ فٹ بال اسٹیڈیم پہنچنا تھا۔ یقینی بات تھی کہ اگر میں بخیریت اسٹیڈیم تک پہنچ گیا تو پھر مجھے اسٹیج تک پہنچنے میں بھی دشواری نہیں ہوگی۔ نئے عزت مآب رائے زل کو بھی اسٹیج پر ہی ہونا تھا، وہاں اسے نشانہ بنانا میرے لیے بہت زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اصل مشکل اسے نشانہ بنانے کے بعد میرا صحیح سلامت رہنا تھا۔ یقینی بات تھی کہ ایسے موقعوں پر فائرنگ کرنے والے کو فوراً چھاپ لیا جاتا ہے اور اس کی بکا بوٹی بھی موقع پر ہی کر دی جاتی ہے۔

اس صورتِ حال سے بچنے کے لیے قسطینا نے ایک پلان تیار کیا تھا۔ اس کی ذہانت کی داد دینا پڑتی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ جاماجی کی سپریم کمانڈر رہ چکی تھی۔ محترم آدم جیسے جانباز مجاہد کی بیٹی تھی۔ فنِ حرب اس کے خون میں شامل تھا۔ وہ آسیاں کے گھر سے ایک خاص چیز اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔ یہ شے خاصی وزنی تھی اور سیاہ رنگ کے ایک بڑے شاپر میں لپیٹ کر نشستوں کے پیچھے گھسا دی گئی تھی۔ یہ امریکی ساخت کا ایک نہایت طاقتور ٹائم بم تھا۔ قسطینا کے اندازے کے مطابق اس میں کم و بیش دس کلو ٹی این ٹی موجود تھا۔ یہ بم قسطینا کو آسیاں کے گھر کے تہ خانے سے ملا تھا اور اس نے فوراً اس سے کام لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

وہ بڑے اطمینان سے بولی۔ ''شاہ زائب! مجھے یقین ہے یہ تدبیر کام کرے گی۔ شرط یہی ہے کہ ہماری ٹائمنگ بالکل درست ہو۔''

''ٹائمنگ کی فکر آپ نہ کریں مگر کیا آپ اس ڈیوائس کے ساتھ مطلوبہ فاصلے تک پہنچ پائیں گی؟''

''شاہ زائب! اس فٹ بال اسٹیڈیم اور اس کے قرب و جوار کو میں اسی طرح جانتی ہوں جس طرح تم اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کو۔ پارکنگ لاٹ کا بڑا حصہ اسٹیڈیم کی شمالی جانب ہے۔ یہاں سے اسٹیڈیم کا فاصلہ نصف کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہوگا۔ اسٹیج کا فاصلہ 200 میٹر کے لگ بھگ۔ مزید ہو جائے گا۔ مجھے پورا یقین ہے وہاں تک دھماکے کی آواز کافی شدت سے پہنچے گی۔ دو تین سیکنڈ کے لیے تو ہر شخص اس آواز کی طرف متوجہ ہو جائے گا۔ ان دو تین سیکنڈ میں تم اپنے پسٹل کی پانچ چھ گولیاں تو رائے زل کی چربی میں اتار ہی سکتے ہو۔''

''اس کے بعد؟''

''اس کے بعد ظاہر ہے افراتفری کا عالم ہوگا۔ اگر تمہاری قسمت اچھی ہوئی...... اور مجھے یقین ہے کہ وہ اچھی ہے تو تم وہاں سے مکھن کے بال کی طرح نکل سکو گے۔''

''آپ کو یقین ہے کہ پارکنگ لاٹ میں گاڑی لے جاتے وقت سخت چیکنگ نہیں ہوگی؟''

''مجھے یقین ہے۔ تمہیں بتایا ہے نا کہ پارکنگ لاٹ کے اگلے کنارے اور اسٹیڈیم کی بیرونی دیوار کا فاصلہ نصف کلومیٹر کے قریب ہے۔ اس عوامی پارکنگ میں سخت سیکیورٹی ضروری نہیں سمجھی جاتی۔ پارکنگ لاٹ میں داخل ہونے کے بعد میں کوشش کروں گی کہ پارکنگ لاٹ کے اگلے کنارے تک پہنچ جاؤں۔''

''کیا وقت ہوا ہے آپ کی گھڑی میں؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے اپنے چمکدار بوائے کٹ بالوں میں انگلیاں چلائیں اور رسٹ واچ دیکھتے ہوئے بولی۔ ''چھ بج کر اٹھارہ منٹ اور بیس سیکنڈ۔''

میں نے اس کی رسٹ واچ دیکھتے ہوئے اپنی گھڑی پر ٹائم درست کر لیا۔ ''کتنے بجے بلاسٹ ہوگا؟'' میں نے اس سے دریافت کیا۔

''تین بج کر پچپن اور ستاون منٹ کے درمیان۔ ان دو منٹس میں تم پوری طرح چوکس رہو گے، انگلی ٹریگر پر اور نگاہیں رائے زل پر۔''

''او کے۔''

''اور اب میرے خیال میں ہمیں برانچ آفس کی طرف چلنا چاہیے۔''

میں نے انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی آگے بڑھا دی۔ پانچ منٹ بعد ہم سیکیورٹی آفس کے عین سامنے چھوٹی سڑک پر موجود تھے۔ ہم نے آسیاں کی زرد ٹو سیٹر کار درختوں میں چھپا دی تھی...... اور اب ڈینی فلاور کے پودوں کے پیچھے کھڑے آفس کے گیٹ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ صبح کے ان اولین لمحوں میں آفس کے مین گیٹ پر صرف دو گارڈز نظر آ رہے تھے۔ یہ عمارت زیادہ بڑی نہیں تھی مگر اس کی باؤنڈری لائن پندرہ فٹ کے لگ بھگ اونچی تھی۔

ایک گارڈ کسی کام سے اندر گیا تو قسطینا بولی۔ ''میں

اس دوسرے کو باتوں میں لگاتی ہوں تم اندر چلے جاؤ...... یہ اچھا موقع ہے۔"

اس نے اپنے برقع نما لبادے کے سامنے والے بٹن کھولے...... مجھ سے چاقو لے کر اپنی قمیص کو سامنے سے کٹ لگایا اور گریبان کو نیچے تک چاک کر دیا۔ پھر برقعے کو سر اور چہرے پر درست کیا۔ اب نقاب میں سے بس اس کی آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ تیز چمک والی آنکھیں...... جن میں دلیری اور بے خوفی کی یلغار تھی۔ اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور ہولے سے دبا کر بولی۔ "گڈ لک ایسٹرن۔"

"گڈ لک یور ہائی نس۔" میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا اور بائیں جانب والے درختوں میں چلا گیا۔

میں گارڈ کی نگاہ بچا کر چلتا ہوا گیٹ کے اتنے نزدیک پہنچ گیا جتنا پہنچ سکتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ قسطینا باہر نکلی اور گارڈ کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے گارڈ سے کچھ کہا اور اپنا لباس دکھا کر درختوں کی طرف اشارہ کیا جیسے بتا رہی ہو کہ کوئی اس سے دست درازی کر کے درختوں کی طرف نکل گیا ہے۔ میرے لیے اتنا وقت کافی تھا۔ میں تیزی سے گیٹ کے اندر چلا گیا۔ اس آفس کا پورا نقشہ آسیاں مجھے ازبر کرا چکا تھا۔ میں دس پندرہ قدم سیدھا چلنے کے بعد اس پورشن کی طرف مڑ گیا جہاں واش رومز تھے۔ میں نے ایک الماری میں سے کسی کا تولیا اور صابن نکالا اور ایک واش روم میں گھس گیا۔ دھڑکن بڑھ چکی تھی۔ یہ سب رسک ہی رسک تھا، امید تو یہی تھی کہ مین گیٹ اور ڈرائیو وے کے کیمرے خراب ہوں گے اور مجھے گھستے دیکھا نہیں گیا ہوگا۔ لیکن اگر ایسا نہیں تھا تو چند سیکنڈ کے اندر الارم وغیرہ بج سکتے تھے۔

قریباً دو منٹ خیریت سے گزر گئے تو مجھے کچھ تسلی ہوئی۔ میں نے شاور کھول رکھا تھا تاکہ پانی گرنے کی آواز آتی رہے۔ میرا نہانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، ہاں میں نے سر تھوڑا سا گیلا کر لیا تھا۔ میں نے زرد رنگ کا تولیا سر پر ڈالا اور سر رگڑتا ہوا باہر نکل آیا۔ یہ تولیا سی سی ٹی وی کیمروں سے میری شناخت چھپا رہا تھا۔ آسیاں کے کٹے ہوئے انگوٹھے سے کام لینے کا وقت آ گیا تھا۔ دو افراد کے درمیان سے گزر کر میں ایک کوریڈور میں مڑا۔ میرے سامنے پہلا سلائڈنگ دروازہ تھا۔ دروازے کی سائڈ پر فنگر پرنٹ چیک کرنے والا سینسر لگا تھا۔ میں جدید ٹیکنالوجی کو جدید چکما دینے جا رہا تھا۔ آسیاں کا کٹا ہوا انگوٹھا میری مٹھی میں تھا۔ میں نے بڑے اعتماد سے انگوٹھے کو "سینسر" پر رکھا۔ رزلٹ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ دروازہ بدستور بند تھا۔ میں نے انگوٹھے کو تھوڑا سا دبایا۔ ایک ہلکی سرسراہٹ کے ساتھ ٹھوس اسٹیل کا دروازہ کھلتا چلا گیا۔

میں اندر داخل ہو گیا۔ صبح سویرے دفتر میں عملہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ میں نے تولیا بدستور سر پر رکھا ہوا تھا اور اسے گاہے بگاہے سر پر رگڑ رہا تھا۔ چند قدم چلنے کے بعد میں نے ایک اور دروازہ اسی طرح آنجہانی آسیاں کے انگوٹھے کی مدد سے کھولا۔ سامنے ایک ہال نما کمرا تھا۔ یہاں دو افراد کمپیوٹرز پر مصروف تھے۔ وہ میل اور فی میل تھے۔ انہوں نے ذرا تعجب سے مجھے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے کوئی سوال کرتے، میں سر رگڑتا ہوا تیزی سے دوسرے کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہ سارا اعتماد کا کھیل تھا۔

میں اب جس کمرے میں پہنچا تھا وہ میرا کمرا تھا۔ یعنی "مرحوم و مغفور" ہمایوں آسیاں کا۔ آقا جان کے اہم ترین سیکیورٹی افسروں میں سے ایک...... اس کا باڈی گارڈ اور اس کے قافلے کے آگے آگے ڈھال بن کر چلنے والا آسیاں جو اب اپنے گھر میں تہ خانے کے "سیپٹک ٹینک" میں مردہ پڑا تھا۔ میں نے آسیاں کے انگوٹھے کو ایک جدید الماری کے "سینسر" پر رکھا اور الماری کا دروازہ ایک طرف سلائڈ کر گیا۔ یہاں آسیاں کا پورا کاسٹیوم موجود تھا۔ یعنی لباس، جوتے، بلٹ پروف جیکٹ اور بالائی جیکٹ جس پر سیکیورٹی ڈپارٹمنٹ کا مونوگرام تھا۔ آسیاں کا گلے میں آویزاں کرنے والا آئی ڈی، اور سرکاری پسٹل بھی یہاں موجود تھا۔ اس کے علاوہ فل سائز ہیلمٹ جو اب میری شناخت چھپانے میں مدد کر سکتا تھا۔

میں نے تسلی کر لی تھی۔ کمرے میں سی سی ٹی وی کیمرا موجود نہیں تھا۔ آسیاں کا سیل فون میرے پاس ہی موجود تھا مگر فی الحال میں نے اسے آف کر دیا۔ میرا ڈیوٹی ٹائم یعنی آسیاں کا ڈیوٹی ٹائم شروع ہونے میں ابھی کم و بیش چار گھنٹے باقی تھے مگر میں نے ابھی سے اس کا روپ دھار لیا بلکہ ہیلمٹ بھی سر پر دھر لیا۔

اپنی موٹر بائیک چیک کرنے کے لیے میں آفس کے عقبی پورشن میں آ گیا۔ ایک جدید گیراج میں چھ عدد شاندار ہیوی موٹر بائیکس موجود تھیں۔ صبح سویرے عملے کا کوئی فرد یہاں موجود نہیں تھا۔ آسیاں کی موٹر بائیک کا نمبر مجھے زبانی یاد تھا۔ بائیک کی چابی مجھے اسی کی الماری میں سے مل گئی تھی۔ میں نے اگنیشن آن کر کے موٹر بائیک کو اسٹارٹ کرنا چاہا اور اسی وقت مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں نے ریہرسل کر

کے اچھا ہی کیا ہے۔ موٹر بائیک اسٹارٹ نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے اسے چیک کیا اور پتا چلا کہ یہاں بھی ہینڈل کی نچلی جانب ایک فنگر پرنٹ سینسر موجود ہے۔ یعنی موٹر بائیک کو بھی فنگر پرنٹس کی ضرورت تھی۔ یہاں پھر آسیاں کا انگوٹھا استعمال ہوا۔ پانچ ہارس پاور کی یاماہا ایک دلکش آواز کے ساتھ جاگ گئی۔

یہی وقت تھا جب مجھے اپنے عقب میں آہٹ کا احساس ہوا۔ ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجی اور اس کے ساتھ ہی میرا دھیان اس تیز دھار فوجی خنجر کی طرف چلا گیا جو میری جیکٹ کے نیچے موجود تھا۔ خنجر میری گرفت سے بس سات آٹھ انچ کے فاصلے پر تھا...... میں نے مڑ کر دیکھا، دو افراد اندر داخل ہو رہے تھے۔ شکلوں اور حلیے سے جاپانی لگتے تھے۔ غالباً وہ موٹر بائیکس کی دیکھ بھال کے لیے یہاں موجود تھے۔

ایک جاپانی نے چیک کر انگلش میں کہا۔ ”جناب! آپ اتنے سویرے یہاں؟“

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا اور موٹر بائیک کے انجن کی طرف جھک گیا جیسے اس کی آواز پر غور کر رہا ہوں۔

”کوئی مسئلہ ہے سر؟“ دوسرے جاپانی نے پوچھا۔

”نہیں، سب ٹھیک ہے۔“ میں نے ہیلمٹ کے اندر بری طرح کھانستے ہوئے اور بیٹھی ہوئی نزلہ زدہ آواز میں کہا۔

”آپ کی...... طبیعت خراب لگ رہی ہے جناب۔“

مجھے ایک بار پھر کھانسی کا دورہ پڑا اور میں نے کھانستے کھانستے ہی اثبات میں سر ہلا دیا۔

”آپ کو آرام کرنا چاہیے۔“ پہلا جاپانی جو غالباً ہیڈ مکینک تھا، ہمدردی سے بولا۔

میں کھانستے ہوئے ہی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

”مسٹر الیگزینڈر کتنے بجے تک آئیں گے سر؟“ دوسرے جاپانی نے عقب سے ہانک لگائی۔

میں نے بالکل بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مجھے ٹھیک پتا نہیں۔ اور اگر کوئی میرا پوچھے تو کہنا میں کچھ دیر کے لیے کمرے میں آرام کر رہا ہوں۔“

”او کے سر۔“ جاپانی کی طرف سے جواب ملا۔ میں آگے بڑھ گیا۔

اب تک تو خیریت گزر رہی تھی۔ آگے کا کچھ پتا نہیں تھا۔ ایک اندھا کنواں تھا جس میں سے کچھ بھی برآمد ہو سکتا تھا۔ برانچ آفس میں اب تھوڑی بہت چہل پہل نظر آنے لگی تھی۔ ہیلمٹ بہت زبردست تھا۔ لوئر پورشن کافی چوڑا تھا۔ میری آنکھوں اور ناک کا کچھ حصہ ہی دکھائی دیتا تھا۔ سامنے سے سیکیورٹی کی ایک اہلکار مکمل یونیفارم میں آتی دکھائی دی۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ تاہم خیریت گزری۔ ٹی سیل اہلکار نے مجھے بغور نہیں دیکھا اور سر جھکا کر سلام کرتی ہوئی گزر گئی۔

میں اپنے یعنی آسیاں کے کمرے میں پہنچ گیا اور دروازہ اندر سے بولٹ کر لیا۔ اس بار بھی دروازہ کھولنے میں آسیاں کا بے جان انگوٹھا ہی استعمال ہوا تھا۔ انگوٹھا اب کچھ سخت ہو گیا تھا۔ اور اس کا رنگ بھی بدل رہا تھا۔ میں نے تو آسیاں کا صرف انگوٹھا حاصل کیا تھا بعض لوگ آنکھیں تک نکال لیتے ہیں اور ان کے ذریعے فنگر پرنٹ سینسرز کو دھوکا دیتے ہیں۔

آرام دہ بیڈ پر لیٹ کر میں آنے والی ہنگامہ خیز گھڑیوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ میرا دھیان بار بار قسطینا کی طرف بھی جا رہا تھا۔ وہ ارادے کی پکی تھی اور مقصد کے حصول کے لیے کوئی بھی قدم اٹھانے کے لیے تیار رہتی تھی۔ داخلی دروازے پر موجود گارڈ کو پوری طرح اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اس نے اپنا لباس پھاڑا تھا اور نیم عریانی کی پروا بھی نہیں کی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ انسانی رویوں اور نفسیات کو اچھی طرح سمجھتی ہے۔ مجھے وہ سین یاد آ گیا جب کچھ روز قبل ہم دونوں نیوسٹی میں داخل ہوئے تھے اور چیف گیرٹ پر وار کرنے کے لیے برج کلب میں پہنچے تھے۔ قسطینا نے ایک موقع پر بڑا برمحل قدم اٹھایا تھا۔ نشے میں دھت فوجی افسر نے اسے اپنے ساتھ ڈانس کی دعوت دی جو قسطینا نے فوراً قبول کر لی تھی۔ دوران رقص گرے افسر نے قسطینا کے چہرے پر بوسوں کی بوچھاڑ کر دی تھی جسے اس نے خندہ پیشانی سے برداشت کیا تھا۔ تاہم اگلے پندرہ بیس منٹ کے اندر اس نے بدلہ چکا دیا تھا اور فوجی افسر کو کلب کے ایک کمرے میں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

برانچ آفس میں رونق بڑھتی جا رہی تھی۔ آوازوں سے پتا چلتا تھا کہ روزمرہ کے کام اپنی پوری رفتار سے شروع ہو چکے ہیں۔ گھڑی کی سوئیاں آگے کو سرک رہی تھیں۔ عمل کا وقت قریب آ رہا تھا۔

☆☆☆

دو بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے جب میں نے آسیاں والا سیل فون آن کیا۔ ابھی سیل فون آن ہوئے بمشکل دو

منٹ ہی ہوئے تھے کہ اس پر کال آ گئی۔ حسب توقع یہ میرے ساتھی پائلٹ (موٹر سائیکل سوار) الیگزینڈر کی ہی تھی۔ میں نے کال ریسیو کی۔ اس کی چنگھاڑتی ہوئی آواز ابھری ”کہاں دفع ہو گئے ہو، فون بھی بند کیا ہوا ہے۔ وقت دیکھ رہے ہو کیا ہوا ہے، میں باہر کھڑا تمہاری جان کو رو رہا ہوں۔“ الیگزینڈر جیسے پھٹ پڑا۔

میں نے بری طرح کھانستے ہوئے کہا۔ ”سوری، بس آ رہا ہوں۔ میڈیسن لی تھی۔ نیند آ گئی۔“ میری آواز بے حد بھرائی ہوئی تھی۔

”شٹ اپ، تھوڑی دیر اور سو لو۔“ اس نے انگلش میں کہا اور جھلائے ہوئے انداز میں فون بند کر دیا۔

میں تیار تو پہلے سے تھا۔ گلے میں آئی ڈی کارڈ آویزاں کیا اور بھاگم بھاگ گیراج تک پہنچا۔ ہیوی یاماہا میں چابی گھمائی۔ آسیان کے انگوٹھے نے ایک بار پھر مدد کی۔ بائیک اسٹارٹ ہوئی اور میں اسے ڈرائیو وے سے گزار کر باہر لے آیا۔ ڈی پیلس کا عظیم الشان مین گیٹ یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اردگرد سخت حفاظتی انتظامات نظر آ رہے تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین چیک پوسٹیں تھیں جہاں گرے فوجی اور ایجنسی کے امریکن چوکس کھڑے تھے۔ گرین فورس کے اہلکار کہیں دکھائی نہیں دیتے تھے۔ میں نے دیکھا ڈی پیلس کے ایک بلند برج پر نیوٹی کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ جگہ جگہ فربہ اندام رائے زل اس کی والدہ بانا دانی اور آقا جان کی تصویریں نظر آ رہی تھیں...... اور شاید یہی آقا جان چاہتا تھا۔

پروٹوکول کی گاڑیاں اپنی جگہ پر موجود تھیں۔ الیگزینڈر کی موٹر بائیک سب سے آگے تھی۔ وہ بائیں جانب تھا۔ میں نے دائیں جانب اپنی بائیک لگا دی۔ اس کا ہوٹر چیک کیا اور چوکس ہو کر بیٹھ گیا۔ الیگزینڈر نے میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ اس کی یہ خفگی میرے لیے سود مند تھی۔ آقا جان کی گاڑی اب کسی بھی وقت نمودار ہو سکتی تھی۔ سب تناؤ کی کیفیت میں تھے...... اور پھر ڈی پیلس کا عظیم الشان مین گیٹ جو کسی قلعے کے دروازے کی طرح نظر آتا تھا سلائیڈ کر کے کھلا اور سیاہ مرسیڈیز برآمد ہوئی جس پر نیوٹی کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اس کے عقب میں بھی کچھ سرکاری گاڑیاں موجود تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ آقا جان کو یہاں نائب حکمران کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ جونہی پُرشکوہ مرسیڈیز رینگتی ہوئی ہمارے قریب پہنچی ہم بھی حرکت میں آ گئے۔ ہوٹر بجنا شروع ہو گئے اور آقا جان کا قافلہ تیزی سے فٹ بال اسٹیڈیم کی طرف بڑھنے لگا۔ آقا جان اور دیگر وی آئی پیز کے روٹ پر تمام ٹریفک بند کر دی گئی تھی۔ دونوں طرف چوکس مسلح اہلکار کثیر تعداد میں موجود تھے۔ چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی۔ مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے ہم اس چوراہے پر پہنچے جہاں سے ایک سڑک علمی کی پراپرٹی ”آشیانے“ کی طرف جاتی تھی۔ آشیانے نامی اس تفریح گاہ کو اب یہ لوگ عقوبت خانے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

پتا نہیں کیوں اس سڑک کو دیکھتے ہی مجھے جاناں یاد آ گئی۔ اس کا قاتل بھی تو یہ آقا جان ہی تھا۔ آقا جان کے ہی ایک کارندے کے خنجر سے زخمی ہو کر وہ مجھ تک پہنچی تھی اور پھر میری گود میں دم توڑا تھا۔ وہ کچلی مسلی ہوئی لیکن بہت رومان پسند لڑکی تھی...... خوب صورت تصورات کی دنیا میں رہنے والی۔ اس نے مرنے سے پہلے بڑی چاہت سے ایک نظم لکھی تھی اور اس میں اپنے خون کی روشنائی استعمال کی تھی۔

میں اسے کیسے بھلا دوں
وہ تو میری رگ رگ میں بس چکا ہے
میں برف کے اندھیرے گھر میں تھی
اور پل پل ختم ہو رہی تھی میری زندگی
وہ سورج بن کر آیا
تیرگی چھٹ گئی
برف بھی پگھل گئی
میں پھر سے جی اٹھی......

ہوٹر گونج رہے تھے۔ ایمرجنسی لائٹس چمک رہی تھیں۔ ڈھلتے سورج کی روشنی میں آقا جان کا قافلہ خالی سڑکوں پر فراٹے بھرتا فٹ بال اسٹیڈیم تک پہنچ چکا تھا۔ یہاں جگہ جگہ خاردار تاروں کی باڑیں تھیں۔ اسٹیڈیم میں عوام الناس کے داخلے کے لیے علیحدہ راستے تھے۔ آج یہاں رائے زل نے اپنا فاتحانہ خطاب کرنا تھا۔ اندازہ تو یہی ہوتا تھا کہ یہ خطاب سننے والوں کی زیادہ تعداد نیوٹی سے تعلق رکھتی ہوگی۔ آقا جان کا طویل قافلہ بڑی شان کے ساتھ اسٹیڈیم کے وی آئی پی گیٹ سے اندر داخل ہوا۔ اسٹیڈیم میں خاصی بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے اور مزید آ رہے تھے۔ ہر طرف رائے زل کی تصویروں اور نیوٹی کے جھنڈوں کی بہار تھی۔ کہیں کہیں جاماجی کا دو رنگا پرچم بھی دکھائی دے جاتا تھا۔ سیکورٹی کے انتظامات یہاں بھی بہت سخت تھے۔ پنڈال اور اسٹیج کے درمیان کم و بیش چالیس میٹر

کا فاصلہ رکھا گیا تھا۔ اسٹیج خاصی بلندی پر تھا اور اس کے سامنے کی جانب قریباً 6x50 فٹ کا بلٹ پروف شیشہ تھا۔ اسٹیج اور پنڈال کے درمیان خاردار تاروں کے چھلے اور سیکڑوں گارڈز تھے۔ اسٹیج پر جانے کے لیے ایک عارضی لفٹ لگائی گئی تھی۔ ایک ایک فرد کا آئی ڈی چیک کرنے کے بعد اسے اوپر جانے دیا جارہا تھا۔

ہم آقا جان کے ساتھ ہی بغیر کسی خصوصی چیکنگ کے اسٹیج پر پہنچ گئے۔ جب آقا جان اپنی مرسیڈیز سے باہر نکلا تھا اس وقت مجھے پتا چلا تھا کہ اس کے ساتھ ہر وقت سوٹ بوٹ میں رہنے والا حلمی بھی موجود ہے۔ ابھی آقا جان اور حلمی وغیرہ کو اپنی نشستیں سنبھالے ہوئے چار پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ ہوٹروں کی آوازیں پھر سنائی دینے لگیں۔ سیکیورٹی اہلکاروں میں ہلچل نظر آئی اور اس کے ساتھ ہی پنڈال میں بھی جوش کی لہر دکھائی دینے لگی۔

''عزت مآب زندہ باد۔''

''مادام ہانا زندہ باد۔''

''انقلاب...... انقلاب۔''

ہر طرف ایسے ہی نعروں کی گونج تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ نعرے لگانے والے زیادہ تر نیوسٹی کے لوگ ہی تھے جن کو خصوصی انتظامات کر کے جلسہ گاہ تک پہنچایا گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ جزیرے کا فاتح اور نیا فرمانروا رائے زل تشریف لارہا ہے۔ درجنوں چمچماتی گاڑیوں اور موٹر بائیکس کے پروٹوکول کے ساتھ اس کا شاندار قافلہ اسٹیڈیم میں داخل ہوا اور اسٹیج کے عین نیچے پہنچ گیا۔ رائے زل نے ماڈل کی لیموزین میں تھا۔ سرخ قالینوں پر اس کا استقبال دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ بچیوں نے اسے گلدستے پیش کیے اور وہ سیکیورٹی کے نہایت سخت حصار میں لفٹ کے ذریعے اسٹیج پر پہنچ گیا۔ وہ برونائی طرز کے لمبے چغے میں تھا۔ اس چغے میں اس کا چربی دار جسم جیسے مچل مچل جارہا تھا۔ چغے کا پچھلا حصہ ڈیڑھ دو میٹر تک فرش پر گھسٹتا آرہا تھا۔ اس کے سر پر طلائی تاروں اور قیمتی جواہرات سے مزین ایک شاندار ٹوپی تھی۔

جونہی وہ اسٹیج پر پہنچا اور اس نے عوام الناس کی طرف دیکھ کر اپنے دونوں ہاتھ ہلائے پنڈال میں مدوجزر کی کیفیت پیدا ہوئی۔ سیکڑوں پرچم لہرانے لگے اور اسٹیڈیم فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھا۔

رائے زل کی تقریر سے پہلے چند تقاریر اور بھی تھیں۔ سب سے پہلے وہ شخص مائیک پر آیا جس نے عین اس وقت قسطینا اور افقائی سے غداری کی تھی جب جنگ پورے زور پر تھی۔ دقیانوسیت کے مرے ہوئے اس کمانڈر کا نام اوان تھا۔ اس نے علی الاعلان کہا تھا کہ مادام ہانا وائی اپنے خلاف چلنے والوں کو بھسم کر ڈالے گی۔ وہ اپنے ہزاروں رضا کاروں کے ساتھ جنگ سے باہر ہو گیا تھا۔

اب وہ لمبے چوڑے بلٹ پروف شیشے کے عقب میں کھڑا ہو کر زوردار خطاب کر رہا تھا۔ رائے زل اور اس کی ماں کی شان میں قصیدے پڑھ رہا تھا۔

اوان کے بعد حلمی کو مختصر خطاب کی دعوت دی گئی۔ اس نے آتے ساتھ قسطینا پر لفظی گولہ باری شروع کر دی۔ ملائی میں بولا۔ ''وہ اقتدار کی بھوکی ہے۔ اس کی وجہ سے امن کا معاہدہ سبوتاژ ہوا اور بھائی چارے کی وہ فضا برباد ہوئی جو ''عزت مآب رائے زل'' کی آمد کے وقت پیدا ہوئی تھی۔ جاماجی کے لاکھوں شہریوں نے عزت مآب کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کر دیے تھے مگر اس کے ساتھیوں نے پُرامن گرے فورس پر حملے کیے اور نتیجے میں سیکڑوں بے گناہ مارے گئے۔''

حلمی نے آقا جان کی شان میں بھی زبردست قصیدہ گوئی کی اور اسے عظیم لیڈر قرار دیا۔ وہ بولا۔ ''اگر عزت مآب رائے زل نے محترم آقا جان کو جاماجی میں اپنا نائب بنایا ہے اور وسیع اختیار دیے ہیں تو یقیناً وہ خود کو اس کا اہل بھی ثابت کریں گے۔ یہ محترم آقا جان ہی ہیں جن کی وجہ سے خونریزی کا طوفان رکا اور آج نیوسٹی اور جاماجی کے لوگ اپنے اختلاف بھلا کر ایک پرچم تلے جمع ہیں۔''

ہجوم میں سے آقا جان کے حق میں نعرے بلند ہوئے اور ہزاروں پرچم لہرائے گئے۔ آقا جان کی چندیا سہ پہر کی دھوپ میں چمک رہی تھی اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ سب سے پہلے اسی کی چندیا میں گولی اتاروں۔ گھڑی کی سوئیاں حرکت میں تھیں۔ چھوٹی سوئی چار کے ہندسے کے نزدیک پہنچ چکی تھی اور بڑی دس سے آگے نکلی ہوئی تھی۔ تین بج کر ترپن منٹ ہو چکے تھے۔ صرف دو منٹ کا فرق رہ گیا تھا۔ الیگزینڈر کی طرح میرا مشین پسٹل بھی ایک بیلٹ کے ذریعے میرے کندھے سے جھول رہا تھا۔ پسٹل کا میگزین سیدھا اور لمبا تھا۔ اس میں خاصی گولیوں کی گنجائش تھی۔ یہ نائن ایم ایم کی گولیاں تھیں۔ یہ معروف برانڈ MAC10 کا پسٹل تھا۔ وہ میری ناف کے قریب تھا اور اس کی نال تھوڑا نیچے جھکی ہوئی تھی۔ الیگزینڈر صدارتی کرسی کی دوسری جانب دس پندرہ قدم کے فاصلے پر تھا اور آقا جان کے عین عقب میں چوکس کھڑا تھا۔ بالکل اٹین شین...... باڈی گارڈز

کے مؤدب انداز میں وہ اپنے سر کو ساکت رکھے ہوئے تھا، بس آنکھوں کو حرکت دے رہا تھا۔ کم از کم آٹھ مزید باڈی گارڈز اس وسیع اسٹیج پر موجود تھے۔ میں نے خود کو جان بوجھ کر آقا جان سے دور اور رائے زل سے نزدیک رکھا ہوا تھا۔

آخر وہ وقت آگیا جب تالیوں اور نعروں کے بے پناہ شور میں کرخت چہرہ آقا جان اپنے جسم کو جھلاتا ہوا مائیک پر پہنچا۔ میری دھڑکن کی رفتار بڑھ چکی تھی۔ تین بج کر پچپن منٹ ہو چکے تھے۔ اگر قسطینا اپنے پلان میں کامیاب ہوتی تھی تو پھر اگلے ڈیڑھ دو منٹ کے اندر اسٹیڈیم سے کچھ فاصلے پر ایک زوردار دھماکا ہونے والا تھا۔

میں نے MAC10 مشین پسٹل کا رخ غیر محسوس طور پر رائے زل کی جانب موڑ لیا اور انگلی ٹریگر پر رکھ لی۔ پسٹل، برسٹ پر تھا۔ آقا جان خطاب کا آغاز کر چکا تھا۔ اس نے بڑے دھیمے انداز میں اسٹارٹ لیا تھا۔ سب سے پہلے اس نے عزت مآب ریان فردوس کی ''حادثاتی'' موت پر افسوس کا اظہار کیا۔ وہ بولا۔ ''ہم ہرگز وہ نہیں چاہتے تھے جو ہوا۔ ہم نے بیشتر مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچایا ہے، جو باقی رہ گئے ہیں وہ بھی اپنے انجام کو پہنچیں گے اور اگر......''

یہ آخری الفاظ تھے جو آقا جان نے بولے۔ فلک شگاف دھماکے نے جیسے سماعتوں کو سن کر دیا۔ پورا اسٹیج بری طرح لرزا تھا۔ مجھے اسی ساعت کا انتظار تھا...... شاید ہزاروں کے اس مجمع میں، میں واحد...... ہاں واحد شخص تھا جس نے دھماکے کے رخ پر نہیں دیکھا تھا۔ میری نگاہ تو صدارتی نشست سے چپکی ہوئی تھی۔ وہی نشست جس پر ریچھ نما رائے زل اپنی ساری چربی اور ساری خباثت کو سمیٹے بیٹھا تھا۔ میں نے ٹریگر دبایا۔ کم از کم پانچ گولیاں رائے زل کو لگیں۔ دوسرے سیکنڈ میں پسٹل کا رخ آقا جان کی طرف ہو چکا تھا۔ مگر وہ اپنی جگہ پر نہیں تھا۔ خوف کے سبب نیچے گر چکا تھا۔ یا اس کی ''پھرتی'' اسے کسی اوٹ میں لے گئی تھی۔ مجھے حلمی نظر آیا اور میں نے اگلا برسٹ اس کے نام کر دیا۔ پسٹل بدستور نارمل انداز میں میری ناف پر جھول رہا تھا۔ یہ سب کچھ زیادہ سے زیادہ دو یا تین سیکنڈ میں مکمل ہو گیا تھا۔

پھر لوگ جیسے سکتے کی کیفیت سے نکلے اور یکایک ہر طرف کہرام بچ گیا۔ درجنوں ''معززین'' نے جانیں بچانے کے لیے اسٹیج سے چھلانگیں لگا دیں۔ رائے زل صدارتی کرسی پر بے حرکت بیٹھا تھا، ابھی شاید کسی کو پتا نہیں چلا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو چکا ہے۔ ابھی تو غالباً اس کے

زخموں سے خون بہنا بھی شروع نہیں ہوا تھا۔ اس کے باڈی گارڈز اس کی طرف جھپٹ رہے تھے جیسے اسے اپنے حفاظتی گھیرے میں لینا چاہ رہے ہوں۔ وہ جانتے نہیں تھے کہ پورے حفاظتی انتظامات کے ساتھ بلٹ پروف جیکٹ پہن کر بلٹ پروف شیشے کے پیچھے بیٹھنے والا سامنے سے نہیں عقب سے نشانہ بن چکا ہے۔

کچھ دیگر لوگوں کی طرح میں نے بھی نیچے کی طرف آٹھ دس زینے طے کیے اور پھر قریباً پندرہ فٹ کی بلندی سے چھلانگ لگا دی۔ میں پنجوں کے بل گرا۔ کچھ بوجھ میں نے دائیں ہاتھ سے سہارا۔ بائیں کندھے میں شدید ٹیس اٹھی۔ مگر اس وقت ٹیسوں پر دھیان دینے کا موقع نہیں تھا۔ ہر طرف ایک قیامت بپا تھی۔ سیکیورٹی اہلکاروں سمیت کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ وہ فائرنگ کا منبع ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ صرف بھاگ دوڑ میں مصروف تھے۔

اسٹیڈیم سے باہر پارکنگ لاٹ کی جانب دو اور چھوٹے دھماکے ہوئے۔ شعلے بلندی کی طرف گئے اور دھوئیں کے بادل مزید گہرے ہو گئے۔ یقیناً دھماکے کے بعد مزید گاڑیاں آگ پکڑ رہی تھیں۔ آسیاں کا کٹا ہوا انگوٹھا میرے لیے ''اسم اعظم'' کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ میں نے اسے موٹر بائیک کے چوکور سینسر پر رکھا۔ اسے اسٹارٹ کیا اور ہر طرف پھیلی ہوئی افراتفری کا حصہ بن گیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد میں اسٹیڈیم سے باہر تھا۔ ایمبولینس اور فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کے سائرن اپنی کریہہ آوازوں میں چلانا شروع ہو گئے تھے۔ مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ میں یہ سب کچھ کر چکا ہوں...... اور اب سلامتی سے سڑک پر موجود ہوں۔ یہ سب کچھ جاگتی آنکھوں کے خواب جیسا تھا۔

☆☆☆

رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ میں سلائڈنگ پتھر کو حرکت دے کر اپنی خفیہ پناہ گاہ میں داخل ہوا۔ میری نگاہوں نے سب سے پہلے قسطینا کو ڈھونڈا۔ وہ مجھ سے پہلے ہی پناہ گاہ میں پہنچ چکی تھی۔ وہ دوڑ کر آئی اور سب کی پروا کیے بغیر مجھ سے بغلگیر ہو گئی۔ ''ویل ڈن شاہ زائب! تم نے کر دکھایا، تم نے واقعی کر دکھایا۔'' وہ جوش کے عالم میں مجھے بھینچ کر بولی۔

''آپ...... سب خیریت سے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل خیریت سے ہیں۔'' وہ بولی۔ ''لیکن تمہارا شکار خیریت سے نہیں ہے۔ رائے زل شدید زخمی ہو کر اسپتال پہنچ چکا ہے۔ اس کی حالت نازک ہے۔''

''علمی صاحب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔'' انیق نے پاس ہی سے لقمہ دیا۔

''ہاں وہ موقع پر ہی ختم ہو گیا تھا۔'' قسطینا نے تائید کی۔ ''آقا جان نے اسٹیج سے چھلانگ لگائی تھی۔ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔''

ٹی وی پر بریکنگ نیوز چل رہی تھیں۔ ایک تہلکہ سا مچا ہوا تھا۔ رائے زل کی حالت کے بارے میں پل پل کی خبر دی جا رہی تھی۔ سرکاری ذرائع کہہ رہے تھے کہ رائے زل کی گردن اور جبڑے میں تین گولیاں لگی ہیں اور ان کی حالت بہتر ہو رہی ہے۔ مگر صحافتی ذرائع بتا رہے تھے کہ رائے زل کو چھ کے قریب گولیاں لگی ہیں اور ان کی ریڑھ کے بالائی مہرے بے طرح متاثر ہوئے ہیں۔

''آپ یہاں کیسے پہنچیں؟'' میں نے قسطینا سے پوچھا۔

''پانچ چھ میل تک ایک گاڑی سے لفٹ لی، پھر پیدل مارچ کیا...... اور تم؟''

''میں آسیاں کی موٹر بائیک پر تھا۔ سٹی سینٹر سے نکل کر ائرپورٹ کی طرف آ گیا، پھر خطرہ محسوس ہوا۔ موٹر بائیک سمیت ایک زیر تعمیر پلازا کی بیسمنٹ میں چلا گیا۔ قریباً دو گھنٹے وہاں رکا۔ پھر آسیاں والی یونیفارم اتار دی۔ نیچے یہی اپنے کپڑے موجود تھے۔ موٹر بائیک، سیل فون، ہیلمٹ وغیرہ سب کچھ وہیں چھوڑ دیا۔ چھپتا چھپاتا ہائی وے تک پہنچا اور پھر ٹیلوں میں شارٹ کٹ لگا کر یہاں آ گیا۔ آپ کی پیش گوئی ٹھیک رہی، قسمت نے بھی ساتھ دیا ہے۔''

قسطینا، فارس جان اور ابراہیم وغیرہ کی آنکھوں میں سوال تو اور بھی تھے مگر ٹی وی پر جو نیوز چل رہی تھیں وہ بھی بے حد توجہ طلب تھیں۔ نیوز رپورٹر انتہائی سنسنی خیز آواز میں بول رہا تھا۔ اب تک جو اطلاعات موصول ہوئی ہیں ان کے مطابق قریباً تین بج کر چھپن منٹ پر اسٹیڈیم کے شمالی پارکنگ لاٹ میں کھڑی ایک ٹوسیٹر گاڑی میں خوفناک دھماکا ہوا اور کئی گاڑیوں کو آگ لگ گئی۔ عین یہی وقت تھا جب جلسہ گاہ میں اسٹیج کے انتہائی سخت سیکیورٹی سسٹم کو ناکام بنا کر عزت مآب رائے زل پر فائرنگ کی گئی۔ اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ دھماکے اور فائرنگ میں گہرا ربط تھا۔ جس ٹوسیٹر گاڑی میں دھماکا ہوا یہ محترم آقا جان کے اسی باڈی گارڈ ہمایوں آسیاں کے زیر استعمال تھی جو اپنے گھر کے سینک

ٹینک میں مردہ پائے گئے ہیں۔ مسٹر آسیاں کی موٹر بائیک اور دیگر اشیا کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا۔"

نیوز اسٹوڈیو میں بیٹھے نیوز کاسٹر نے اپنے رپورٹر سے پوچھا۔ "کہا جا رہا ہے کہ مجرموں نے نہایت ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہوئے باڈی گارڈ آسیاں کا دایاں انگوٹھا کاٹا اور اسی انگوٹھے کو برانچ آفس میں گھسنے کے لیے استعمال کیا۔ کیا یہ بات درست ہے؟"

رپورٹر نے مائیک کو ہونٹوں کے قریب کرتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں، برانچ آفس سے جو شواہد مل رہے ہیں، ان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مسٹر آسیاں کے کٹے ہوئے انگوٹھے کی مدد سے تمام سینسرز کو دھوکا دیا گیا اور ہر مطلوبہ چیز تک رسائی حاصل کی گئی۔"

نیوز کاسٹر نے کہا۔ "لیکن یہاں سوال اٹھتا ہے کہ مجرم یا مجرمان آفس میں داخل کیسے ہوئے، سی سی ٹی وی کیمرے کیا کر رہے تھے؟"

"آپ نے بڑا اہم سوال پوچھا ہے۔ جو تازہ اطلاعات مل رہی ہیں ان سے پتا چل رہا ہے کہ سیکیورٹی مہیا کرنے والوں کی اپنی سیکیورٹی بھی ٹھیک نہیں تھی۔ آفس کے بیرونی حصے کو "کوریج" دینے والے کم از کم تین کیمرے خراب پڑے تھے۔ اس کے علاوہ ......"

"ایک منٹ ٹھہریں۔" نیوز کاسٹر نے اپنے رپورٹر کو روکا اور بولا۔ "ناظرین! اس وقت محترم جناب آقا جان اسپتال سے میڈیا کو بریف کر رہے ہیں۔ ہم آپ کو وہاں لیے چلتے ہیں۔"

چند سیکنڈ بعد ایل سی ڈی کی اسکرین پر آقا جان کی پریشان شکل نظر آئی۔ اس کی ناک کا بل ہمیشہ سے زیادہ موٹا نظر آ رہا تھا۔ چہرے پر تازہ خراشیں بھی تھیں۔ ایک ٹانگ پلاستر میں جکڑی ہوئی تھی۔ وہ بستر پر نیم دراز تھا۔

اشک بار لہجے میں بولا۔ "طلعی نے جام شہادت نوش کیا ہے۔ ہم سب بھی جاماجی کی خاطر اپنی جانیں دینے کے لیے تیار ہیں۔ کسی بھی صورت ان باغیوں کے سامنے سر نہیں جھکائیں گے۔ ہم حق پر ہیں اور حق والے کسی چیز سے ڈرتے نہیں ہیں......"

"بس اسٹیج سے چھلانگ لگاتے ہیں۔" انیق نے ہولے سے لقمہ دیا۔

آقا جان نے بات جاری رکھی۔ "میں اپنے عوام کو بتانا چاہتا ہوں کہ عزت مآب رائے زل کی حالت بہتر ہو رہی ہے۔ بہترین ڈاکٹرز... کی ایک ٹیم ان کو ہر ممکن طبی سہولت دے رہی ہے۔ آپ ان کے لیے دعا کریں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس سانحے کے "ذمے دار" بدترین انجام سے بچ نہیں سکیں گے۔ ہم ان کے گرد گھیرا تنگ کر رہے ہیں۔ انہیں زمین کی ساتویں تہ سے ڈھونڈ نکالیں گے۔"

ایک نمائندے نے سوال کیا۔ "جناب! یہ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ یہ حملہ عبدالکریم اور اس کے ساتھیوں کو سرعام پھانسی دینے کا ردعمل ہے...... اور اس حملے کی ماسٹر مائنڈ قسطینا اور اس کے قریبی ساتھی ہیں۔ اس بارے میں جناب کا کیا خیال ہے؟"

"ہم ہر پہلو سے تفتیش کر رہے ہیں۔ بہت جلد حقائق آپ کے سامنے ہوں گے۔ جہاں تک سرعام پھانسیوں کا تعلق ہے...... یہ پھانسیاں قانون کے تقاضے پورے کرنے کے بعد دی جا رہی ہیں اور یہ آئندہ بھی ہوں گی۔ ہم اپنے اصولی موقف سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹیں گے۔"

ابھی آقا جان کی بریفنگ ختم ہی ہوئی تھی کہ ایک اور بریکنگ نیوز کے الفاظ اسکرین پر چمکنے لگے۔ نیوز کاسٹر نے سنسنی خیز اعلان کیا۔ "اور ناظرین، یہ تازہ ترین فوٹیج ہمیں موصول ہوئی ہے، ہم آپ کے ساتھ شیئر کر رہے ہیں......"

اس کے ساتھ ہی برانچ آفس کے اندر کی ایک فوٹیج اسکرین پر دکھائی جانے لگی۔ یہ وہی مناظر تھے جب میں واش روم کے اندر سے سر پر زرد تولیا ڈال کر نکلا تھا اور اپنے بال رگڑتا ہوا کمرے کی جانب گیا تھا۔ تصویر واضح نہیں تھی مگر قد کاٹھ پہچانا جا رہا تھا۔ میرے متحرک ہیولے کے گرد سرخ دائرہ دکھایا جا رہا تھا۔

نیوز کاسٹر پُرجوش انداز میں بولنے لگا۔ "تفتیشی ادارے کے مطابق یہ وہ شخص ہے جو سیکیورٹی سسٹم کو دھوکا دے کر دفتر میں داخل ہوا اور پھر باڈی گارڈ آسیاں کے روپ میں یہاں سے نکلا۔ یہ فوٹیج دیکھنے کے بعد اس خیال کو مزید تقویت مل رہی ہے کہ شاید یہ وہی شاہ زیب ہے جو بیس عدد نہایت مطلوب افراد کی فہرست میں شامل ہے...... اور یہی وہ شخص ہے جس نے بعد ازاں جلسہ گاہ میں عزت مآب کو نشانہ بنایا ہے۔ یہاں ہم آپ کو ایک بار پھر بتاتے چلیں کہ آج سہ پہر فٹ بال اسٹیڈیم میں ہونے والے سنگین حملے میں جناب طلعی شہید اور عزت مآب سخت زخمی ہوئے ہیں۔ ہجوم میں بھگدڑ مچنے کے سبب پانچ افراد کے جاں بحق اور پچاس سے زائد کے زخمی ہونے کی اطلاعات ہیں۔ اس کے علاوہ پارکنگ لاٹ میں قریباً دس کلو بارود کا جو دھماکا ہوا اس

میں درجنوں گاڑیاں تباہ ہو گئیں اور دو افراد جان سے گئے۔''

نیوز کاسٹر کا شور و غل جاری تھا۔ قسطینا کی زبانی مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ سنتیل کو بھی بحفاظت یہاں لے آئی ہے۔ سنتیل ساتھ والے کمرے میں سو رہی تھی۔ اتنے میں، میں ایک شخص کو دیکھ کر بُری طرح چونک اٹھا۔ یہ شخص ٹی وی اسکرین پر نہیں ہماری پناہ گاہ کے اندرونی دروازے پر نمودار ہوا تھا۔ یہ بن مشہد تھا۔ گرین فورس کا وہی جانباز جو ایک گریڈ کیپٹن کی حیثیت سے تیونس میں موجود تھا اور جس نے برج کلب والے مشن میں ہماری بھرپور مدد کی تھی۔ ہم ایک دوسرے کی طرف بڑھے اور بغلگیر ہو گئے۔ اس نے بڑی محبت سے میرے شانے کو چوما اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''یس مسٹر شاہ زیب! آپ نے یادگار مزاحمت کا حق ادا کر دیا۔ آج کا حملہ حاجاجی کی تاریخ میں یاد رکھا جائے گا۔''

''لیکن تم یہاں کیسے؟'' میں نے اسے خود سے جدا کرتے ہوئے پوچھا۔

قسطینا بولی۔ ''یہ میرے ساتھ یہاں پہنچا ہے۔ تم نے مجھ سے پوچھا نہیں کہ اسٹیڈیم کی پارکنگ میں دھماکے کے بعد جس شخص نے مجھے لفٹ دی وہ کون تھا؟ وہ مشہد ہی تھا۔ بہت بُرے وقت میں میری نگاہ اس پر پڑ گئی اور میں اس کی گاڑی میں گھس گئی۔''

''ونڈرفل، یہ تو زبردست کام ہوا۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔

قسطینا کے سامنے بن مشہد بے حد مؤدب نظر آ رہا تھا۔ اس نے انکساری سے کہا۔ ''یہ میرے لیے بے حد اعزاز کی بات ہے کہ چند دن میں، میں نے دوسری بار اپنی سپریم کمانڈر کو ریسکیو کیا ہے۔''

فارس جان بھی بن مشہد کی کارکردگی سے بہت خوش نظر آتا تھا۔ اس نے بن مشہد کا کندھا تھپک کر اس کے لیے تعریفی جملے کہے۔

قسطینا بولی۔ ''لیکن مشہد کچھ اہم باتیں بھی بتا رہا ہے اور یہ تشویش ناک ہیں۔ مشہد کا خیال ہے کہ ہم اس پناہ گاہ میں اب زیادہ دیر محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔''

ابراہیم نے کہا۔ ''میں بھی بن مشہد کے خیال کی تائید کرتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ اب ہماری تلاش کا کام بہت وسیع پیمانے پر شروع ہو جائے گا۔ ہمیں جو فیصلہ بھی کرنا ہے، اگلے ایک آدھ روز میں کر لینا چاہیے۔''

میں نے کہا۔ ''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہمارے پاس اس سے اچھی کوئی پناہ گاہ ہے؟''

قسطینا اور فارس جان نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر قسطینا نے ہولے سے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہم ابھی کھانے کے بعد اس بارے میں بات کرتے ہیں۔''

زینب حسبِ معمول شال میں لپٹی لپٹائی ایک گوشے میں بیٹھی تھی اور ڈبڈبائی نظروں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ وہ خاموشی کی زبان میں مجھے بتا رہی تھی کہ اس نے یہاں میری غیر موجودگی کو بری طرح محسوس کیا ہے۔ میں بے ساختہ اس کی طرف بڑھا اور اس کے قریب بیٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ وہ ساکت بیٹھی رہی۔ جیسے کسی بھی طرح کا اظہار اس کے لیے ممکن نہ ہو۔ میں اس کے سر پر ہاتھ رکھتا تھا تو پورا چاند گڑھی اور چاند گڑھی کے سارے حالات نگاہوں کے سامنے لہرا جاتے تھے۔ وہ ''بڑے بڑے پروں والے عقابوں'' میں پھنسی ہوئی ایک چڑیا تھی اور میں نے اپنی بساط کے مطابق اس کے تحفظ کی قسم کھائی تھی۔

تازہ ترین خبروں کا سلسلہ جاری تھا۔ میں چھوٹے کمرے میں جا کر سجاول کو دیکھنا چاہ رہا تھا۔ میں کمرے کی طرف بڑھا تو اتیق نے مجھے روک لیا۔ ''ٹھہریں، وہ سو رہا ہے۔''

''طبیعت کیسی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلے سے بہت بہتر ہے اور یہ بہتری یوں ہی نہیں آئی جناب، اس کے لیے بڑی محنت ہوئی ہے۔ ایک طویل چلّہ کاٹا ہے میں نے۔ کل آدھی رات ایک ٹانگ پر کھڑا رہا ہوں۔ سانس روک کر اور منہ بند کر کے۔''

میں نے کہا۔ ''اتنی دیر اگر تم نے واقعی منہ بند رکھا ہے تو بڑا کام کیا ہے۔''

''آپ مذاق فرما رہے ہیں مگر یقین کریں امریش...... ہم...... میرا مطلب ہے سجاول صاحب میں جو اچھی تبدیلی آ رہی ہے وہ میرے خاص وظیفوں کا ہی نتیجہ ہے۔ ابھی تو آپ کنجوسی کر رہے ہیں۔ اگر دھونی کا انتظام کر دیں تو سجاول صاحب چاروں خانے فٹ ہو جائیں۔''

''دھونی؟ کیا مطلب؟''

''میں نے آپ سے گزارش کی تھی کہ ہزار ہزار کے پانچ چھ نوٹوں کو جلا کر ان کی دھونی اپنے چلّے میں شامل کرنا چاہتا ہوں مگر آپ غور ہی نہیں فرما رہے۔''

میں نے کہا۔ ''میرا تو خیال ہے کہ تمہیں نوٹوں کے

بجائے لال مرچوں کی دھونی کی ضرورت ہے اور وہ بھی الٹا لٹکا کر۔ جب بھی بات چیت کا وقت ملتا ہے تمہاری بکواس شروع ہوجاتی ہے۔ کئی ''اہم باتیں'' بیچ میں رہ جاتی ہیں۔''

وہ شرما کر بولا۔''میری شادی کا ذکر تو ابھی آپ گول ہی رہنے دیں تو بہتر ہے۔''

میں نے کہا۔''زیادہ غلط فہمی میں نہ رہو۔ اتنی جلدی تمہیں رشتہ ملنے والا بھی نہیں ہے۔ میں کچھ اور بات کہہ رہا ہوں۔''

''کون سی بات؟'' وہ ذرا قریب کھسک آیا۔

''وہی خط والی بات...... وہ دوسرا خط کون سا تھا جو پہلوان حشمت نے ارسال کیا تھا؟'' میں نے سرگوشی میں کہا۔

''او...... اچھا...... وہ تو واقعی لیٹ سے لیٹ تر ہوتا جارہا ہے۔ میں نے بھی کھولا نہیں ہے، ابھی تھوڑی دیر میں جب سب سونے کے لیے لیٹ جائیں گے تو پڑھ لیں گے۔''

میں نے اٹھ کر سجاول والے کمرے میں جھانکا۔ وہ کروٹ لے کر سو رہا تھا۔ اس کے چہرے کی اضطرابی کیفیت اب ماند نظر آتی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اب وہ کچھ کھا پی بھی رہا ہے۔ میں نے فی الوقت اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

رات کا کھانا حسب معمول خشک راشن پر مشتمل تھا۔ اس راشن میں میٹھے اور نمکین بسکٹس، انرجی بارز اور چاکلیٹس کے علاوہ ہنٹر بیف بھی شامل تھا۔ سادے پانی کے علاوہ دیگر ڈرنکس بھی موجود تھے۔ کھانے کے بعد ایک بار پھر نیوز واچنگ شروع ہوئی تاہم کسی دوسری پناہ گاہ میں شفٹ ہونے والا موضوع زیر بحث نہیں آیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بن مشہد موجود نہیں تھا، کمانڈر فارس جان نے بتایا کہ وہ کسی ضروری کام سے نکلا ہے۔

میں نے کہا۔''فارس جان! بن مشہد کو پتا ہے کہ ہم کہاں ہیں۔ اس کا یوں نکلنا خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ......''

''نہیں نہیں، میں اس کی وفاداری پر شبہ نہیں کررہا لیکن اگر خدانخواستہ...... خدانخواستہ وہ کہیں پکڑا جاتا ہے تو؟''

''آپ اس بارے میں کوئی پکر (فکر) نہ کریں۔'' فارس جان مسکرا کر بولا۔''وہ جاسوس ہے اور اسے تشدد سہنے کا اتنا زیادہ ٹریننگ دیا گیا ہے کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتا۔''

''پھر بھی رسک تو ہے۔''

''ام آپ کو یقین دلاتا ہے، مشہد ان چند لوگوں میں سے ہے جو مر تو سکتا ہے پر اپنی زبان نہیں کھول سکتا۔''

پھر فارس جان نے ایک واقعہ سنایا کہ کس طرح مشہد کے ایک ساتھی نے پکڑے جانے کے بعد سائنائیڈ کا کیپسول نگل لیا تھا...... اور مزید احتیاط کے طور پر تیسری منزل کی کھڑکی سے چھلانگ بھی لگا دی تھی۔ دراصل یہ لوگ گرین فورس کے مشہور و معروف پاسبان بریگیڈ سے لیے گئے تھے۔

رات دس بجے کے لگ بھگ زینب اور ابراہیم سونے کے لیے لیٹ گئے۔ فارس جان بھی اونگھ رہا تھا۔ قسطینا کسی گہری سوچ میں گم لیٹی ہوئی تھی۔ شاید آج جو تہلکہ خیز دن گزرا تھا اس کے خونی مناظر اس کی نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ سنسنی خیز خبروں کی تکرار سے اکتا کر ہم نے ٹی وی آف کردیا تھا۔

میں، انیق اور سیف پاس پاس ہی لیٹتے تھے۔ یہ بیڈز دیوار کے ساتھ اوپر نیچے فکس تھے۔ سیف سب سے اوپر والے بیڈ پر ہوتا تھا۔ وہ بھی آج جلدی لیٹ گیا تھا۔ میں اور انیق دیوار سے ٹیک لگائے فرشی گدے پر بیٹھے تھے۔ انیق نے ایک تکیے کے غلاف میں سنبھالا ہوا خط نکالا۔ لفافہ کھولا۔ اس میں کاپی سائز کے دو کاغذ تھے۔ ایک پہلوان حشمت کی طرف سے تھا۔ یہ مختصر تحریر تھی۔ پہلوان نے اپنے مخصوص عالمانہ انداز میں لکھا تھا۔

''شاہ زیب! تم ابھی ریشی کو بھولے تو ناہیں ہوگے۔ اور وہ بھی ''کیامت'' تک تمہیں ناہیں بھول سکتی۔ تم نے اسے پردے والی سرکار کے چنگل سے رہائی دلائی۔ ایک طرح سے تم اسے موت سے زندگی کی طرف واپس لائے۔ اب اس کی شادی ہوچکی ہے۔ چند روز پہلے وہ میرے پاس آئی اور اس نے یہ خط مجھے دیا اور بڑی آجزی سے درخواست کی کہ میں اسے تم تک پہنچادوں، سو اپنا فرض پورا کررہا ہوں۔

ہم تو محبتوں کے سفیر ہیں
ہم تو ازل سے فکیر (فقیر) ہیں
اسی لیے ہے دامن چاک ہمارا
ہاں اسی لیے ہم لیر و لیر ہیں
(لیر ولیر یعنی ٹکڑے ٹکڑے)

دوسرے کاغذ کی تحریر اور روشنائی مختلف تھی۔ یہ ریشی ہی کا لکھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے شاہ زیب بھائی کہہ کر مخاطب کیا تھا اور لکھا تھا:

آپ نے میرے لیے جو کچھ کیا، میں اسے کبھی بھلا نہ سکوں گی۔ آپ نہ ہوتے تو وہ ملنگی ڈیرا ضرور میری جان لے لیتا۔ جب تک زندہ ہوں آپ کو دعائیں دوں گی۔ میں جانتی ہوں آپ نے یہ سب کچھ میری بچپن کی سہیلی تاجور کے کہنے پر کیا۔ اس طرح سے میں تاجور کی بھی احسان مند ہوں۔ لیکن میں تاجور کے بارے میں بہت دکھی بھی ہوں۔ ایک سہیلی کی حیثیت سے اسے جتنا بھی جانتی ہوں شاید کوئی اور نہ جانتا ہوگا۔ پتا نہیں کہ مجھے آپ سے یہ بات کہنی چاہیے یا نہیں لیکن سچ یہی ہے کہ وہ پوجنے کی حد تک آپ سے پیار کرتی ہے اور جہاں تک میں نے سمجھا ہے، آپ بھی اسے دل کی گہرائیوں سے چاہتے ہیں۔ مجھے نہیں پتا کہ آپ کے درمیان یہ دوریاں کیسے آگئی ہیں۔ اگر یہ دوریاں تاجور کی وجہ سے آئی ہیں تو میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ اب پچھتا رہی ہوگی۔ میں اچھی طرح...... بہت اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہ آپ کے سوا کسی اور کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ سکے گی۔ وہ ایک جھوٹی زندگی جیے گی۔

سوچتی ہوں، کاش میرے پر ہوتے، میں اڑ کر آپ دونوں کے پاس پہنچ جاتی۔ آپ کی غلط فہمیاں دور کرتی اور آپ کو پھر سے ملا دیتی۔ لیکن میں ایک بے بس لڑکی ہوں۔ بس ہاتھ جوڑ کر آپ سے ایک درخواست کرتی ہوں جس طرح بھی ہو، آپ اسے خود سے دور نہ جانے دیں، وہ آپ کو کھو کر عمر بھر روتی رہے گی۔ میں ایک بار پھر کہتی ہوں، جتنا میں اسے جانتی ہوں اور کوئی نہیں جانتا۔

فقط آپ کی ہمدرد اور احسان مند۔''

خط نے میرے رگ و پے میں عجیب سی سنسنی دوڑا دی تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے سیف کی طرف دیکھا۔ صرف چند فٹ کی دوری پر وہ اپنے بیڈ پر موجود تھا۔ جو خط میرے ہاتھ میں لرز رہا تھا وہ اس لڑکی کے بارے میں تھا جو اس کی منگیتر تھی اور بہت جلد اس کے ساتھ شادی کے بندھن میں بندھنے والی تھی۔

میں انیق کو چند دن پہلے آگاہ کر چکا تھا کہ سیف وہی ہے جس کے ساتھ سکھیرا گاؤں میں تاجور کی منگنی ہوئی ہے۔ انیق کو بتانے سے میرا مقصد یہی تھا کہ کہیں وہ بے دھیانی میں سیف کے سامنے میرے اور تاجور کے تعلق کا ذکر نہ کر بیٹھے۔ میری طرح انیق کو بھی یہ جان کر از حد حیرت ہوئی تھی کہ سیف، تاجور کا ہونے والا شوہر ہے۔ اسے ایک زبردست اتفاق ہی کہا جا سکتا تھا کہ اس وقت وہ یہاں پاکستان سے ہزاروں میل دور اس جزیرے میں ہمارے ساتھ سویا ہوا تھا۔

انیق نے بھی بغور سیف کی طرف دیکھا پھر سرگوشی میں بولا۔ ''سو رہا ہے۔''

میں نے خط کو ایک بار پھر پڑھا۔ یہ ایک سہیلی کے لیے ایک لڑکی کے سچے کھرے جذبات اور دکھ بھرے احساسات تھے۔ نجانے کیوں میری نگاہوں میں ایک بار پھر وہ وڈیو کلپ گھوم گیا، جو چند روز پیشتر میں نے ڈی پیلس کے ایک کمرے کے اندر سیف کے موبائل میں دیکھا تھا۔ تاجور کا جھکا ہوا سا سر، پیشانی پر جھولتی لٹیں...... اور اس کی کھوئی کھوئی سی آواز...... ہاں یہ غلطی تو ہوئی ہے...... یہ غلطی تو ہوئی ہے۔

غلطی تو شاید مجھ سے بھی ہوئی تھی۔ میں اس کو اپنے اتنا قریب لا کر...... قریب نہیں رکھ سکا تھا۔ وہ میرے طرزِ زندگی سے خوف زدہ ہو کر مجھ سے کچھ فاصلے پر چلی گئی تھی۔ میں نے بھی یہ فاصلہ پاٹنے کی کوشش نہیں کی تھی اور اسے دور جانے دیا تھا۔

ریشمی کے دل میں ہم دونوں کے لیے تڑپ موجود تھی۔ وہ جانتی تھی کہ میں نے چاند گڑھی میں تاجور کے لیے بہت کچھ کیا تھا۔ وہ پیر ولایت اور اپنے غنڈے منگیتر اسحاق کے چنگل میں پھنسی ہوئی تھی۔ میں نے اسے اور اس کی فیملی کو اس گھیرے سے نکالا۔ پیر ولایت کا اور عالمگیر کا زور توڑا...... اور پھر یہاں تک بھی ہوا کہ اسحاق عرف ساتے سے تاجور کی جان ہمیشہ کے لیے چھوٹ گئی۔ بظاہر ہمارے راستے میں کوئی بہت بڑی رکاوٹ نہ رہی لیکن پھر ہم خود ہی اپنے راستے کی رکاوٹ بن گئے۔ پتا نہیں کہ کبھی کبھی ایسا کیوں ہوتا ہے۔ پیار خود ہی اپنا دشمن ہو جاتا ہے۔ کوئی بیرونی رکاوٹ نہیں ہوتی لیکن وہ خود ہی اپنے لیے انا، خوف یا اصول کی کوئی دیوار کھڑی کر لیتا ہے۔ میں ان لوگوں میں سے بننا نہیں چاہتا تھا جو ساری عمر ان دیواروں سے ٹکرا کر خود کو لہولہان کرتے رہتے ہیں مگر نجانے کیوں حالات بار بار تاجور کی شبیہ کو میرے سامنے لے آتے تھے۔

اس رات میں دیر تک جاگتا رہا۔ غنودگی کی حالت میں، میں نے اسے اپنے سامنے دیکھا۔ وہ چاند گڑھی کی سنہری دھوپ میں کیکروں اور بیریوں کے پاس کھڑی تھی۔ سردیوں کی شام تیزی سے ڈھلتی جا رہی تھی۔ تاجور کے پس منظر میں کچے پکے گھروندوں سے چولہوں کا دھواں اٹھ رہا تھا۔ وہ اداس لہجے میں بولی۔ ''جب مجھے اپنے پاس رکھنے کا موقع تھا، آپ کوشش کر کے مجھے روک سکتے تھے، آپ نے

کچھ نہ کیا۔ اب کیوں مجھے یاد کرتے ہیں، اب مجھے میرے راستے پر چلنے دیں......"

میں نے کہا۔ "میں کچھ نہیں کرتا تاجور، تم خود ہی کسی نہ کسی صورت میں میرے سامنے آجاتی ہو۔ مجھے درہم برہم کردیتی ہو۔"

"میں دل کی گہرائیوں سے کہتی ہو شاہ زیب! اب مجھے بھول جائیں۔ اب میرا سب کچھ وہی ہے جس سے میرے ماں باپ نے میرا ناتا جوڑا ہے۔ وہ اب آپ کے پاس ہے شاہ زیب! اسے کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ اسے صحیح سلامت میرے پاس واپس بھیج دیجیے گا۔ میری اور میرے ماں باپ کی نظریں دن رات اس کا راستہ دیکھ رہی ہیں۔"

میرے تصور کی نگاہیں تاجور کا طواف کرتی رہیں۔ سورج کی الوداعی کرنیں اس کے بے مثل چہرے کو بوسے دے رہی تھیں۔ میں دھیمے قدموں سے اس کی طرف بڑھا۔ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولا۔ "تاجور! ایک آخری بار تم کو چھونا چاہتا ہوں، کیا چھولوں؟"

وہ بے حرکت کھڑی رہی۔ جیسے کچھ بھی کہنا نہ چاہتی ہو۔ میں اس کی طرف جھکا۔ خود کو اس کے چہرے کے قریب کیا۔ اس کے چہرے پر گریز نمودار ہوا، جیسے کوئی ناپسندیدہ بو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی ہو۔ شاید یہ الکحل کی بو تھی جو میرے منہ سے اٹھ رہی تھی۔ میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے چھونا چاہا تو وہ پھر پیچھے ہٹ گئی۔ میں نے دیکھا میرے ہاتھوں پر خون کے چھینٹے تھے۔ یہ کس کا خون تھا؟ شاید کسی ایسے شخص کا جسے میں نے قتل کیا تھا۔

وہ ایک دم اوجھل ہوگئی۔ کھیت کھلیان، مویشیوں کی گھنٹیاں، کچے گھروندے اور ان میں سے اٹھتا ہوا چولہوں کا دھواں، سب کچھ اوجھل ہوگیا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور پاؤں بیڈ سے نیچے اتار دیے۔

اگلے روز صبح سویرے سجاول سے ملاقات ہوئی۔ میں ہمت کر کے اور تالا کھول کر سجاول کے پاس اس کے کمرے میں ہی چلا گیا۔ ویسے میں اس کی طرف سے کسی بھی قسم کی ناگہانی حرکت کے لیے تیار تھا۔ وہ چارپائی نما بیڈ پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا۔ اس کے بدن پر اب تک وہی گرے کلر کی وردی تھی جو شلوار قمیص سے مشابہ تھی۔ (رائے دل کے رضاکار ایسی وردی پہنتے تھے) سجاول نے مجھے دیکھ کر تیوری چڑھائی۔ کچھ دیر خاموش رہا پھر قہرناک لہجے میں بولا۔ "تم نے، تم دونوں نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ دھوکے باز ہو تم دونوں، میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔" طیش کے سبب اس کے منہ سے جیسے جھاگ نکل رہا تھا۔

"یہی تو میں اب تک پوچھ رہا ہوں، میرا قصور بتاؤ۔"

"تم نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا۔" وہ پھنکارا۔ "مڑ کر میری خبر نہ لی۔ نہ کوئی میری مدد کے لیے آیا۔ اور وہ جو مجھے اپنا بھائی کہتی تھی اس نے بھی نہ پوچھا کہ میں کس حال میں ہوں۔ وہاں کس طرح میری کھال ادھیڑی جاتی رہی ہے۔" اس نے اپنا ایک بازو ننگا کیا جس پر چوٹوں کے گہرے نشان موجود تھے۔

"میں سچ کہتا ہوں سجاول، ہم تمہیں ڈھونڈنے کی پوری کوشش کرتے رہے ہیں۔ بڑی بیگم بھی تمہارے لیے ازحد پریشان رہی ہیں۔"

"سب بکواس ہے۔" وہ دہاڑا۔ "یہ سب کیا ہو رہا ہے میرے اردگرد۔ اس سے تو لگتا ہے کہ تم لوگ مجھے ڈھونڈنے کے لیے پریشان نہیں تھے، پکڑنے کے لیے تھے۔ مجھے نہیں پتا یہ کیا سازش ہو رہی ہے۔ مجھے کیوں باندھ کر رکھا ہوا ہے تم لوگوں نے یہاں۔"

وہ بھڑک اٹھا تھا۔ چند سیکنڈ کے لیے مجھے لگا کہ وہ بپھر کر مجھ پر پل پڑے گا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ عجیب لہجے میں پھنکارا۔ "مجھے بتاؤ...... یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے، میں کس طرح پہنچا ہوں یہاں؟"

"تمہیں کیا یاد پڑتا ہے سجاول؟"

وہ الجھن سے بولا۔ "میں ان کی جیل میں تھا۔ میرے سر پر شاید کوئی چوٹ لگ گئی تھی...... میں گر گیا تھا...... مجھے کچھ یاد نہیں آرہا......"

"تمہیں واقعی بہت کچھ یاد نہیں آرہا سجاول۔ لیکن تمہاری یادداشت میں جو گڑبڑ ہے یہ کسی چوٹ یا نشے کی وجہ سے نہیں ہے۔"

"تو کس وجہ سے ہے؟" اس نے پیشانی مسلی۔

"میں ابھی بتاؤں گا تو تمہیں یقین نہیں آئے گا، ہوسکتا ہے کہ ایک آدھ دن میں تمہیں خود ہی کچھ یاد آجائے۔"

وہ ایک بار پھر طیش میں آگیا۔ "تم زیادہ ڈرامے نہ کرو، ہم...... مجھے سخت چوٹ ماری گئی ہے...... اور یہ تم میں سے ہی کسی نے ماری ہے۔" اس نے اپنی کنپٹی کے نیلگوں گومڑ کو سہلایا۔ مجھے یاد آیا کہ ڈی ہلیس میں کس طرح اپنا دفاع کرتے ہوئے مجھے سجاول کو یہ ضرب لگانا پڑی تھی۔

یہ واقعی بڑی ظالم چوٹ تھی۔ اگر یہ تھوڑی سی مزید

سخت ہوئی تو سجاول کی جان بھی جاسکتی تھی۔ سجاول کا پارا پھر چڑھ رہا تھا۔ انیق ادھ کھلی کھڑکی میں سے یہ سب کچھ تاڑ رہا تھا۔ اس کے کہنے پر سیف نے مجھے پکارا۔ ''شاہ زیب بھائی! ذرا جلدی بات سنیں۔'' یہ بڑی بروقت ''کال'' تھی۔

''میں ابھی آیا۔'' کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا اور آہنی دروازہ حسب سابق باہر سے بند کر دیا۔

سجاول چنگھاڑا۔ ''ہتھکڑیاں لگا دو مجھے، بیڑیاں پہنا دو۔ کسی پنجرے میں بند کر دو۔ نہیں تو میں چیر پھاڑ ڈالوں گا تمہیں......'' اس نے کمرے میں کسی چیز کو ٹھوکر ماری اور اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ بہرحال اس کے بعد کوئی پریشان کن آواز نہیں آئی۔

دوسرے کمرے میں پہنچ کر انیق نے کہا۔ ''شاہ زیب بھائی! اب بھی دھونی کے لیے مان جائیں۔ ہزار ہزار کے نہ سہی، سو سو کے نوٹ ہی دے دیں۔ اگر کیش نہیں تو چیک کی دھونی بھی دی جاسکتی ہے لیکن کراس نہیں ہونا چاہیے۔''

شاید وہ مزید بک بک کرتا مگر میری صورت دیکھ کر سنجیدہ ہو گیا۔ میں نے قالین پر بیٹھ کر دیوار سے ٹیک لگائی۔ سجاول کی حالت میں واضح بہتری نظر آرہی تھی۔ آج اس نے گالی گلوچ نہیں کیا تھا۔ نہ ہی یہ ''سنگین الزام'' لگایا تھا کہ میری وجہ سے اس کی ماؤں اور بہن کو جان سے ہاتھ دھونے پڑے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اگر وہ خود کوئی ایسی بات نہیں کہہ رہا تھا تو ہمیں بھی یاد کرانے کی کیا ضرورت تھی۔

ڈاکٹر ماریہ نے ہپناٹزم کے بارے میں جو باتیں کہی تھیں وہ بڑی مدلل تھیں۔ اب سجاول کی کیفیت کے نشیب و فراز دیکھ کر میری نظر میں ان باتوں کی اہمیت بڑھ رہی تھی۔

ابھی میں، انیق اور سیف کمرے میں بند سجاول کے حوالے سے ہی بات کر رہے تھے کہ پناہ گاہ کا نکوئی پتھر سرکنے کی مدھم آواز آئی۔ قسطینا دہانے کے بالکل قریب تھی، اس نے فوراً اپنی آٹومیٹک رائفل سنبھال لی۔

اندر آنے والا بن مشہد تھا۔ بن مشہد کے چہرے پر زلزلے کی کیفیت نظر آرہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان تھا، میں اسے بھی پہچانتا تھا۔ دونوں کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ پتا چلتا تھا کہ باہر بارش ہو رہی ہے۔

بن مشہد نے سلائڈنگ پتھر کو دھکیل کر داخلی راستہ بند کر دیا۔ قسطینا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''یور ہائی نس! ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ وہ لوگ ٹیلوں تک تو پہنچ چکے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ ہمارے قدموں کے نشان ان کی رہنمائی

کریں گے۔ بے شک پتھریلی زمین ہے لیکن کہیں کہیں بھربھری مٹی اور ریت بھی ہے۔''

''تمہاری کیا رائے ہے بن مشہد؟'' قسطینا نے پوچھا۔

''ہمیں یہاں سے نکلنے میں بالکل دیر نہیں کرنی چاہیے۔ بارش ہو رہی ہے، نگرانی بہت کم ہے۔ یہ اچھا موقع ہے۔''

''کیسے جائیں گے؟'' ابراہیم نے پوچھا۔

''یور ہائی نس! گاڑی کا انتظام ہے، اللہ نے چاہا تو دشواری نہیں ہوگی۔''

''فوجی گاڑی ہے؟'' فارس جان نے سوال کیا۔

''جی ہاں، گریے فوجیوں کے ''میس'' کے لیے گوشت لے کر جارہے ہیں۔ سفر کے لیے یہ گاڑی بہترین رہے گی۔''

''لیکن جانا کہاں ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''قریباً پانچ میل کا سفر ہے خشکی پر اور قریباً آدھ گھنٹے کا پانی پر۔'' قسطینا نے مختصر جواب دیا۔ میں سمجھ گیا کہ فی الوقت وہ تفصیل میں جانا نہیں چاہتی۔

میں نے سوالیہ نظروں سے فارس جان کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اس صورت حال سے مطمئن نظر آرہا تھا۔

اگلے آدھے گھنٹے میں بے حد تیزی کے ساتھ پناہ گاہ چھوڑنے کی تیاری کر لی گئی۔ اس تیاری میں سب سے اہم کردار انیق نے ہی ادا کیا تھا۔ اس نے سجاول کے لیے جو چائے بھجوائی تھی وہ نشہ آور تھی۔ سجاول پہلے ہی مسکن ادویات کے زیر اثر تھا، اسے انٹاغفیل ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ جب وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا تو مزید احتیاط کے طور پر اسے ایک انجکشن بھی دے دیا گیا۔ اس کے لیے ایک دستی اسٹریچر گاڑی میں موجود تھا۔

وقتِ رخصت پناہ گاہ سے ہر وہ ثبوت مٹا دیا گیا جو کسی بھی طور پر ہمارے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ داخلی راستے کے قرب و جوار سے قدموں کے نشان بھی ختم کیے گئے۔

دوپہر کے بارہ بجے کا وقت ہوگا جب ہم سب سرنگ میں سفر کر کے ایک گھاٹی میں نکلے۔ بادل اتنے گہرے تھے کہ دن کے وقت بھی رات کا سماں تھا۔ بارش مسلسل ہو رہی تھی۔ قریب ہی گریے فورس کا ایک ٹرک کھڑا تھا جس کو ایک بڑی ترپال نے ڈھانپا ہوا تھا۔ ترپال کے نیچے ذبح کیا ہوا گوشت تھا۔ مگر یہ کسی حلال جانور کا نہیں سور کا گوشت تھا۔

درجنوں ایسے سور جن کی کھال اتری ہوئی تھی اور پیٹ آلائشوں سے صاف تھا، ٹرک میں پڑے تھے۔ ہمیں بھی ترپال کے نیچے ان کے ساتھ ہی لیٹنا تھا۔ سب سے زیادہ کراہیت زینب فدا محسوس کررہی تھی۔ اس نے بمشکل اپنی ابکائی روکی اور پھر ابراہیم کے ساتھ گوشت کے اوپر پہلو کے بل لیٹ گئی۔ سنبل نے بھی کچھ دیر ہچکچانے کے بعد اس کی تقلید کی۔ قسطینا اور فارس جان سمیت ہم سب نیم گرم گوشت کے اوپر لیٹ گئے۔ بن مشہد اور تبارک نے ہمارے اوپر ترپال کھینچ دی۔ بڑی مضبوط ترپال تھی۔ بارش کے تریڑے اس پر پڑتے تھے تو آواز پیدا ہوتی تھی۔ ہمارا اسلحہ ہمارے ہاتھوں میں تھا، میں نے پشت کے بل لیٹ کر مشین پسٹل اپنے سینے پر رکھ لیا تھا تاکہ کسی بھی وقت استعمال میں لا سکوں۔ قسطینا میری بائیں جانب تھی اور اس نے بھی اپنی آٹومیٹک رائفل اپنے پیٹ پر رکھی ہوئی تھی۔ اس کی نال میری پسلیوں سے چھورہی تھی۔

میں نے ہولے سے کہا۔ ''کہیں شوٹ ہی نہ فرما دیجیے گا۔''

''مرنے سے ڈرتے ہو؟''

''مرنے سے تو نہیں ڈرتا.....لیکن اتنی بارش میں کفن دفن کا انتظام ذرا مشکل ہوجاتا ہے۔''

''مریں تمہارے دشمن۔'' اس نے سرگوشی میں کہا اور رائفل کا رخ بدل لیا۔ پھر ذرا وقفے سے بولی۔ ''ویسے تمہارے مشین پسٹل کا رخ بھی میری ہی طرف ہے لیکن مجھے تو تمہارے پسٹل سے بالکل خوف نہیں آتا۔ بلکہ اس کی گولی سے مرنا کافی آسان ہوگا۔''

بہت زور سے بجلی کڑکی ہم سب تھرا کر رہ گئے۔ میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمیں موت وغیرہ سے ہٹ کر کوئی بات کرنی چاہیے۔ موسم ٹھیک نہیں ہے۔''

ٹرک نے ایک تیز ٹرن لیا اور پھر اونچے نیچے راستے پر بری طرح اچھلنے لگا۔

انیق بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ شاید مشہد صاحب نے کسی ناکے کو بائی پاس کیا ہے۔''

قسطینا بولی۔ ''تم شکل سے ضرور الو لگتے ہو لیکن باتیں سمجھداری کی کرتے ہو۔''

''بہت شکریہ یور ہائی نس۔'' انیق نے خوش ہو کر کہا۔ اتنی بات تو میری سمجھ میں آگئی تھی کہ ہم جزیرے سے نکل رہے ہیں اور کھلے سمندر میں کسی اور جگہ پر جارہے ہیں مگر ہماری معلومات کے مطابق کوسٹل گارڈز پورے ساحل کی زبردست نگرانی کررہے تھے۔ ان کو چکما دینے کا بن مشہد کے پاس کوئی خاص پلان تھا۔ وقت رخصت قسطینا نے مجھے صرف اتنا بتایا تھا کہ بن مشہد نے کسی لانچ کے ملاح سے بات کی ہے اور اس سے معاملہ طے ہوا ہے۔ قسطینا چیف گیرٹ کو اپنے والد کا اہم ترین قاتل سمجھتی تھی اور وہ برج کلب والے فضائی حملے کے بعد ہلاک ہوچکا تھا۔ قاتل نمبر دو بھی رائے زل تھا اور وہ شدید زخمی ہو کر اسپتال میں بے ہوش پڑا تھا۔ بے شک سرکاری ذرائع بتارہے تھے کہ اس کی حالت کچھ بہتر ہے لیکن یہ اطلاعات قابل بھروسا نہیں تھیں۔ بہت دنوں بعد قسطینا قدرے خوش نظر آرہی تھی اور ہلکے پھلکے انداز میں بات کررہی تھی۔

چند منٹ تک غیر ہموار راستے پر ہچکولے کھانے کے بعد بریڈفورڈ کا ٹرک ایک جگہ رک گیا۔ بن مشہد کی ہدایت کے مطابق ہم اپنی جگہوں پر بے حرکت پڑے رہے۔ بے حرکت لیکن پوری طرح تیار۔

تازہ ذبح کیے گئے جانوروں کے گوشت کی گرمی اب نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ ایک طرح کی نمی اور چپچپاہٹ کا احساس ہورہا تھا۔ زینب نے نجانے کس طرح اپنی ابکائیاں روکی ہوئی تھیں۔ بارش قدرے ہلکی ہوگئی تھی لیکن جب میں نے ترپال کا ایک کونا ہٹا کر باہر جھانکا تو گہرے بادلوں نے بدستور رات کا سماں پیدا کر رکھا تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر سمندر کا پانی ہلکورے لے رہا تھا اور لہروں کا ہلکا ہلکا شور بارش کی آواز میں گڈمڈ ہورہا تھا۔ پام کے بلند درخت ہمارے سروں پر جھوم رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر ایک بڑی لانچ نظر آئی۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اس لانچ پر گریے فورس کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ بہرحال یہ فوجی لانچ نہیں لگتی تھی۔ بن مشہد اور تبارک اونچے پتھروں کے درمیان کھڑے درمیانی عمر کے ایک ملاح نما شخص سے گفتگو کررہے تھے۔ تبارک کے ہاتھ میں چھتری تھی جو اس نے مشہد پر اور خود پر تان رکھی تھی۔ تنومند ملاح کے ہاتھ میں بھی ایک چھتری تھی، یوں محسوس ہوا کہ کچھ لین دین ہورہا ہے۔ ایک ہیلی کاپٹر بہت نیچے پرواز کرتا ہوا ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گیا۔ میں نے ترپال پھر اوڑھ لی۔

سنبل کی منمناتی ہوئی سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''اور کتنی دیر اس طرح لیٹنا پڑے گا، میری تو کمر ٹوٹ گئی ہے۔''

''بس تھوڑی دیر اور۔'' میں نے تیز سرگوشی میں کہا۔ ''لیکن اونچی آواز میں نہ بولو۔ ورنہ سچ مچ کوئی کمر توڑ نے

والا آجائے گا۔"

وہ چپ ہوگئی۔ جو ڈالرز اور سونے کے ٹکڑے (بسکٹس) اسے آسیاں کے گھر سے حاصل ہوئے تھے، وہ ریگ زین کے ایک مضبوط بیگ میں تھے اور سنبل نے اپنے سینے سے لگا رکھے تھے۔ نیم بے ہوش سجاول بھی سنبل کے قریب ہی پشت کے بل پڑا تھا۔ اسے فارس جان، انیق اور مشہد نے مل کر ٹرک میں "لوڈ" کیا تھا۔ سیف نے بھی ہاتھ بٹایا تھا۔ ویسے انیق نے ایک انجکشن بھر کر تیار رکھا ہوا تھا کہ اگر راستے میں وہ کوئی گڑبڑ کرے تو اس کے بازو میں سوئی ٹھوکی جاسکے۔

دس پندرہ منٹ بعد قدموں کی آواز آئی پھر ترپال کے ایک گوشے کو اٹھایا گیا۔ بن مشہد نے اپنا سر اندر گھسایا اور قسطینا سے مخاطب ہو کر بولا۔ "یور ہائی نس! سب او کے ہے۔ بارش ہورہی ہے۔ باہر نکلنے کے لیے یہ اچھا موقع ہے۔ گرے گارڈز ہم سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ ہمیں بڑی تیزی لیکن بڑی احتیاط کے ساتھ لانچ پر پہنچنا ہوگا۔"

"ہم تیار ہیں۔" قسطینا نے کہا۔

"ہم پہلے خود لانچ میں پہنچیں گے، اس کے بعد مسٹر سجاول کو اسٹریچر پر لے جائیں گے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔" انیق نے فوراً تائید کی۔ انداز میں شرارت تھی۔

میں نے کہا۔ "وہ ہوش میں آتا جارہا ہے اور میں تمہاری باتیں ریکارڈ بھی کررہا ہوں۔"

"میں نے کوئی بری بات تو نہیں کی جناب۔" انیق بولا۔

"نہیں...... اس کے بارے میں تمہاری ساری باتیں ہی اچھی ہوتی ہیں۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ وہ خاموش ہوگیا۔ (ویسے چند دن پہلے میجر وارث کو بروقت شوٹ کر کے، انیق نے جو کارکردگی دکھائی تھی، اس نے مجھے دلی طور پر متاثر کیا تھا)

بن مشہد اور تبارک نے ہمارے اوپر سے ترپال ہٹا دی۔ ہم احتیاط سے نیچے اترے۔ زینب اور سنبل کو اترنے میں ذرا دشواری ہوئی۔ زینب کو ابراہیم اور قسطینا نے سہارا دے کر اتارا۔ سنبل کی مدد میں نے اور انیق نے کی۔ میرے بازو کی سوجن ختم ہوچکی تھی اور درد بھی نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا مگر تشویش ناک بات یہ تھی کہ میں اس بازو کو آزادانہ حرکت نہیں دے سکتا تھا۔

بن مشہد اور تبارک نے قسطینا اور ابراہیم پر چھتریاں تاننا چاہیں لیکن دونوں نے ہی انکار کردیا۔ صورت حال ان تکلفات کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ ہم سب پتھروں اور پودوں کے درمیان جھک کر بھاگتے اور کبھی تیز چلتے لانچ تک پہنچ گئے۔ وہ تیز لہروں پر ہچکولے کھا رہی تھی اور بھیگا ہوا جھنڈا پھڑ پھڑا رہا تھا۔ لہریں کنارے کے پتھروں سے ٹکرا کر جھاگ اڑاتی تھیں اور خشکی پر آگے تک چلی جاتی تھیں۔

ہم ایک عارضی پلیٹ فارم کے ذریعے قطار کی شکل میں لانچ کے اندر چلے گئے اور پھر ایک سیڑھی کے ذریعے نچلے حصے میں اتر گئے۔ اس لانچ پر سامنے کی جانب "آن گورنمنٹ ڈیوٹی" کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ لانچ کے نچلے حصے میں شراب کی بوتلوں کے بہت سے خالی کریٹ پڑے تھے۔ ڈبا بند خوراک کے کچھ کارٹن بھی تھے جن پر "آرمی سپلائی" کے الفاظ درج تھے۔ پتا چلا کہ یہ فوجی لانچ تو نہیں لیکن فوجیوں کے کارگو اور رسد کے لیے استعمال ہورہی ہے۔ اسی لیے اس پر گرے فورس کا پرچم بھی لہرا رہا تھا۔

لانچ چلانے والا ایک گندا سا ملائیشین تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی کھچڑی داڑھی تھی۔ آنکھیں کثرتِ شراب نوشی سے سوجی ہوئی تھیں۔ اس نے قسطینا اور سنبل وغیرہ کو بڑی بھوکی نظروں سے دیکھا اور ہم سے مخاطب ہوتے ہوئے اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کی۔ اس کا نام وانسن معلوم ہوا۔

انیق نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "موسیو وانسن! آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی، میرا خیال ہے کہ اب ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا چاہیے۔"

"او کے، میں تیار ہوں۔" وہ بھرائی ہوئی پاٹ دار آواز میں بولا اور لانچ کے کنٹرول کی طرف بڑھا۔

بن مشہد نے کہا۔ "ٹھہرو بھئی! ابھی ایک سواری اور ہے۔ ہم لا رہے ہیں۔"

وانسن رک گیا۔ انیق نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "ایک تو، اسے کوئی بھولتا بھی نہیں۔" اس کا اشارہ یقیناً سجاول کی طرف ہی تھا۔

میں نے کہا۔ "ہم خیر خیریت سے کہیں پہنچ جائیں، پھر میں اس بارے میں تم سے نمٹتا ہوں۔"

اس نے مسکینی صورت بنائی اور سیف کو لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "آؤ بھئی لے آئیں بھاجی سجاول کو۔" اس نے کہا۔

وہ دونوں بن مشہد کے ساتھ باہر چلے گئے۔

تین چار منٹ بعد سجاول بھی لانچ میں موجود تھا۔ وانسن کی جیب گرم ہوچکی تھی۔ اس نے رم کی ایک بوتل کھولی اور ایک چوتھائی غٹاغٹ چڑھا گیا۔ قسطینا اسے گھور رہی

بھی۔ وہ بولا۔ ''میڈم! پریشان نہیں ہونا۔ میں ساری بھی چڑھ جاؤں تو لانچ کو ڈوبنے نہیں دوں گا۔ جس طرح ایک عورت ایک بھرپور مرد کے اشاروں پر چلتی ہے، یہ بھی میرا کہا مانتی ہے۔'' اس نے فقرہ مکمل کرتے ہوئے ایک آنکھ دبائی۔

قسطینا بُرا سا منہ بنا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ وہ جانتا نہیں تھا کہ جسے وہ بے پروائی سے میڈم کہہ رہا ہے وہ اس جزیرے کی اہم ترین شخصیت ہر ہائی نس قسطینا ہے اور جو دبلا پتلا سا لڑکا، لکڑی کے ایک کارٹن پر بھیگے کپڑوں اور بھیگے بالوں کے ساتھ بیٹھا ہے وہ یہاں کا ولی عہد ہر ہائی نس ابراہیم ہے۔ وہ قسطینا اور ابراہیم وغیرہ کو پہچان نہیں پایا تھا اور ہمیں ان ''عام شہریوں'' میں سے ہی سمجھ رہا تھا جو بدمست گرے فوجیوں اور رائے زل کے ڈر سے جاماجی سے چوری چھپے نکل رہے تھے۔

اتنے میں بن مشہد لمبے ڈگ بھرتا ہوا نیچے آ گیا۔ وانسن سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''بڑے بھائی، لگتا ہے تم کچھ زیادہ ہی چڑھا گئے ہو، اگر کہو تو لانچ میں چلا لوں۔''

''کاٹھ کے الو ہو تم۔ میں بتا تو رہا ہوں، یہ لانچ نہیں میری عورت ہے۔ ہم ایک دوسرے کو بڑی اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اب تو یہ بھی کہتی ہے کہ مجھے نشے کے بغیر ہاتھ مت لگاؤ۔''

بن مشہد نے کہا۔ ''کچھ مردوں کو غلط فہمی بھی تو ہوتی ہے کہ وہ اپنی عورتوں کو بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ان کی پیٹھ پیچھے وہ انہیں گالیاں دیتی ہیں۔''

''کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتے ہو؟'' وانسن نے کڑے تیوروں کے ساتھ کہا۔

''مجھے افسوس ہے وانسن! تم مزید شراب نہیں پی سکو گے۔ ہاں تم نے کہا ہے کہ تمہاری بیوی بیمار ہے اور اسے علاج کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے۔ تمہاری جیب میں جو پیسے ہیں وہ تمہاری بیوی تک ضرور پہنچ جائیں گے اور امید ہے کہ یہ لانچ بھی تمہارے گھر والوں تک پہنچ جائے گی۔''

تبارک بڑی خاموشی کے ساتھ وانسن کے عقب میں کھڑا تھا۔ اس نے ایک بڑے اسکریو رینچ کی زوردار ضرب وانسن کے سر کے عقبی حصے میں لگائی۔ وہ لکڑی کے فرش پر اوندھے منہ گرا۔ زینب اور سنبل بے ساختہ چلا اٹھی تھیں۔ وانسن جو پہلے ہی بدمست تھا۔ نیم بے ہوش ہو گیا۔ بن مشہد اور تبارک اسے گھسیٹ کر لوہے کی سیڑھی سے اوپر لے گئے لیکن اس سے پہلے انہوں نے وانسن کے بدبودار کوٹ کی جیبوں سے لانچ کی چابیاں اور بڑے نوٹوں کی دو گڈیاں نکال لی تھیں۔ تیسری چیز جو نکلی وہ ایک بڑا شکاری چاقو تھا۔ کمانڈر فارس جان بھی ان تینوں کے ساتھ ہی اوپر گیا۔

سنبل نے میرا بازو دباتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ اس کو مار دیں گے؟''

''نہیں، اوپر جا کر بند کر دیں گے۔'' میں نے سنبل کو مزید خوف زدگی سے بچانے کے لیے جھوٹ بولا ورنہ ادھیڑ عمر وانسن کی موت میں بن مشہد کی آنکھوں میں پڑھ چکا تھا اور شاید اپنی ''منزل'' کو راز رکھنے کا یہی ایک محفوظ ترین طریقہ تھا۔ ڈالرز کی خاطر مالکوں کو دھوکا دینے والا ہمیں بھی دھوکا دے سکتا تھا۔

چند سیکنڈ بعد سائیلنسر لگے پستول کی مدھم آواز لانچ کے اس زیریں حصے تک پہنچی۔ قسطینا نے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ وانسن ختم ہو چکا تھا۔

قریباً پندرہ منٹ بعد یہ لانچ تھرتھرائی اور پھر حرکت میں آ گئی۔ ہم کھلے سمندر کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔

''کیا تبارک بھی ہمارے ساتھ ہے؟'' میں نے قسطینا سے پوچھا۔

''ہاں، وہ ٹرک کو کچھ فاصلے پر چھوڑ کر واپس آ گیا ہے اور ہمارے ساتھ ہے۔'' قسطینا نے جواب دیا۔

لانچ ہچکولے کھاتی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ بارش زوروں پر تھی۔ ایک طرح سے ہمارے اوپر نیچے اور دائیں بائیں ہر طرف پانی ہی تھا۔ اس پانی میں بہت سے خطرات چھپے ہوئے تھے۔ لانچ کے خراب ہو جانے کا خطرہ، کوسٹل گارڈز کی نظر میں آ جانے کا خطرہ، راستے سے بھٹک جانے کا خطرہ۔ بن مشہد بڑی مشاقی سے لانچ کو شمال مغرب کی طرف اڑائے چلا جا رہا تھا۔ ہم ہر قسم کے خطرے سے نمٹنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔

اچانک ایک جگہ لانچ کی رفتار آہستہ ہوئی اور پھر وہ رک گئی۔ ''پرابلم۔'' قسطینا نے زیرِ لب کہا۔

زینب اور سنبل کے چہرے زرد ہو گئے۔ لیکن میں نے پہلی مرتبہ یہ دیکھا کہ ابراہیم نارمل رہا۔ اس کے لباس میں بھرا ہوا پستول موجود تھا اور وقت پڑنے پر وہ اسے استعمال کرنے کا ارادہ بھی رکھتا تھا۔ زینب دعائیہ انداز میں کچھ بڑبڑانے لگی۔ قسطینا نے اٹھ کر بلب آف کر دیا اور لانچ کے اس زیریں پورشن میں تاریکی پھیل گئی۔ میں، سیف کے سانسوں کی تیز آواز سن رہا تھا۔ وہ لڑائی بھڑائی کے معاملات میں بڑا جذباتی تھا۔ خاص طور سے میرے

کندھے سے کندھا ملا کر لڑنے کے لیے وہ ہر وقت تیار رہتا تھا۔

ہم اوپر سے آنے والی آوازوں کو سننے کی کوشش کررہے تھے لیکن کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ کمانڈر فارس جان نے کہا۔ ”ہمارے خیال میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں، یہ روٹین کا چیکنگ ہے جو یہ لوگ کرتا ہے۔“

انیق نے کہا۔ ”لیکن اگر انہوں نے لانچ پر آکر چیکنگ کی تو بھانڈا پھوٹ جائے گا۔“

”خوتب بھانڈا ہی نہیں اور بھی بہت کچھ پھوٹے گا۔“ فارس جان نے رائفل کے دستے پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

قسطینا اس کی سپہ سالار تھی اور وہ اس کی حفاظت کے لیے جان نثار کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔

بہرحال فارس کا کہا درست ثابت ہوا۔ شدید تناؤ کے دو تین منٹ گزر گئے اور لانچ ایک فرحت بخش ہچکولے کے ساتھ آگے روانہ ہوگئی۔

قریباً پچیس منٹ کے تیز رفتار سفر کے بعد ہم چھوٹے چھوٹے ٹاپوؤں کے ایک سلسلے میں داخل ہوئے اور پھر ایک الگ تھلگ ٹاپو کے قریب جاکر رک گئے۔ یہاں اردگرد چھ سات کلومیٹر تک پانی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا سوائے ایک پرانے زنگ آلود جہاز کے۔ لیکن یہ پورا جہاز نہیں تھا صرف اس کی دم کا کچھ حصہ تھا۔ باقی جہاز پانی کے اندر تھا اور ریت اور چٹانوں میں کہیں پھنسا ہوا تھا۔ اسے ڈوبے ہوئے شاید کئی عشرے گزر چکے تھے۔ یہ کوئی بہت بڑا جہاز نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں سمندر بھی بہت گہرا نہیں ہے۔ ٹاپو سے جہاز کا فاصلہ ایک کلومیٹر کے لگ بھگ تھا۔

ہماری لانچ جھاڑ جھنکاڑ اور آبی نباتات سے ڈھکے ہوئے ایک کنارے پر جاکر رکی۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ بارش اب پھوار کی صورت برس رہی تھی اور کچھ روشنی بھی ہوگئی تھی۔ یہاں چاروں طرف مکمل سکوت تھا۔ ہم ایک ایک کرکے احتیاط کے ساتھ لانچ سے اترآئے اور نباتات سے اٹے ہوئے اس چھوٹے سے ٹاپو پر قدم رنجہ فرمایا۔ قسطینا نے بھیگی ہوئی سرد ہوا میں گہری سانس لی اور بولی۔ ”اس ٹاپو کو فاری یا فاری پولاؤ کہا جاتا ہے۔ مقامی زبان میں فاری کا مطلب بدقسمت ہے۔“

”بدقسمت کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”وہی ڈوبا ہوا جہاز جو سامنے نظر آرہا ہے۔ چند ماہی گیروں کو اس ٹاپو کے اردگرد حادثات بھی پیش آئے اور پھر لوگوں نے اس طرف آنا ہی چھوڑ دیا۔ بس اسی طرح سے لوگوں کے عقیدے بنتے ہیں۔ حالانکہ یہ بدقسمت نہیں بلکہ خوش قسمت اور بہت خوب صورت ٹاپو ہے۔“

”خوش قسمت کس حوالے سے؟“

وہ مسکرائی۔ ”ساری باتیں یہیں کھڑے کھڑے پوچھ لوگے، ہمیں آگے چلنا چاہیے، کوئی ہیلی کاپٹر اس طرف آنکلا تو مصیبت پڑ جائے گی۔“

بن مشہد نے لانچ کو چوڑے پتوں والے بڑے بڑے آبی پودوں کے نیچے کیموفلاج کردیا۔ مگر وہ اب بھی کہیں کہیں سے دکھائی دے رہی تھی۔ قسطینا میری نظر کے زاویے کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں شاہ زائب! ابن مشہد اپنے کام میں ماہر ہے۔ یہ اس پر شاخیں وغیرہ کاٹ کر اس طرح پھیلائے گا کہ کوئی اس کے قریب آکر بھی اس کو شناخت نہیں کرسکے گا۔“

ہم نہایت گھنے درختوں کے درمیان سنبھل سنبھل کر آگے بڑھنے لگے۔ سجاول والا اسٹریچر انیق اور کمانڈر فارس جان نے اٹھا رکھا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ تھک گئے تو اسٹریچر سیف اور بن مشہد نے اٹھالیا۔ بن مشہد آگے اور سیف پیچھے تھا۔ میں بن مشہد کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ بارش کچھ دیر کے لیے تھم گئی تھی مگر گھنے درخت اب بھی چھینٹے پھینک رہے تھے۔ ہر طرف نکھری ہوئی ہریالی تھی۔ کسی وقت نامعلوم پرندوں کی آوازیں بھی سنائی دے جاتی تھیں۔ پرندوں اور حشرات کے علاوہ کئی پودے بھی ہمارے لیے بالکل اجنبی تھے۔

میں نے بن مشہد کے پہلو میں چلتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ”والٹس کی لاش کہاں پھینکی؟“

”راستے میں۔“ اس نے ہولے سے کہا۔ ”اسے مار کر افسوس ہوا لیکن یہ ضروری تھا۔“

”یہ ٹاپو زیادہ بڑا تو نہیں لگتا۔“ میں نے موضوع بدلا۔

”نہیں، تین چار میل سے زیادہ لمبائی نہیں ہے۔ چوڑائی بھی ڈیڑھ میل کے لگ بھگ ہوگی۔ ہمیں بس تین چار سو میٹر آگے جانا ہے۔“

”ہر ہائی نس قسطینا کا کہنا ہے کہ کوئی زمین دوز پناہ گاہ ہے؟“

”جی ہاں، دیکھ کر آپ کا دل خوش ہو جائے گا۔ یہ لوگ پوری گریٹ فورس کو بھی ڈھونڈنے پر لگا دیں تو انشاء اللہ ہم تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ خوراک وغیرہ کی بھی کوئی کمی

نہیں ہوں یہاں...... صرف ایک مسئلہ ہوگا۔
''وہ کیا؟''
''یہ جگہ اردگرد سے بالکل کٹی ہوئی ہے۔ ہم سیل فون وغیرہ استعمال نہیں کرسکیں گے۔ یہ پتا نہیں چل سکے گا کہ جاماجی میں اور اردگرد کیا ہورہا ہے۔''

ہم چلتے جارہے تھے۔ کئی جگہ درخت اور پودے اتنے گھنے تھے کہ تبارک کو شاخیں توڑنی یا کاٹنی پڑ رہی تھیں۔ ہمارے اردگرد چھوٹے بڑے پتھر اور سبزی مائل چٹانیں تھیں۔ ایسے ہی ایک بڑے پتھر کے پاس پہنچ کر ہم رک گئے۔ یہ کائی اور روئیدگی کے سبب سبزی مائل خیالے رنگ کا نظر آرہا تھا۔ بن مشہد اور تبارک پتھر کے قریب کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے انیق اور سیف کو بھی مدد کے لیے بُلا لیا۔

میں سمجھ گیا کہ یہاں کیا ہونے جارہا ہے۔ ہماری پہلی پناہ گاہ کی طرح یہاں بھی ایک سرکنے والا پتھر موجود تھا۔ انہوں نے مل کر اسے دھکیلا۔ اگر یہ کوئی عام پتھر ہوتا تو شاید دو درجن افراد بھی اسے اس کی جگہ سے ہلا نہ سکتے مگر اب چار پانچ افراد نے اسے ایک جانب سرکا دیا۔ یہاں بھی وہی سسٹم نظر آیا۔ یہ پتھر ایک نہایت مضبوط فولادی ریلنگ پر بال بیرنگز کے ذریعے حرکت کرتا تھا۔ پتھر ہٹا تو قریباً آٹھ فٹ ضرب چھ فٹ کے خلا میں سیڑھیاں نظر آئیں۔ یہ پتھروں کو تراش کر بنائی گئی تھیں اور کسی اسپائرل کی سیڑھیوں کے مانند بہت ایزی تھیں۔

بن مشہد اور تبارک اپنے ساتھ جو مختصر سامان لائے تھے ان میں چار عدد طاقتور ٹارچیں بھی موجود تھیں۔ ان میں دو ٹارچیں ایسی تھیں جو سر پر پہنے جانے والی آہنی ٹوپی میں نصب تھیں۔ تبارک اور بن مشہد نے یہ کیپ ٹارچز پہن لیں۔ ان کی روشنی دور تک جانے لگی۔ سبزی مائل پتھر کو دوبارہ سرکا کر خلا کو بند کردیا گیا۔ ہم بارش کی رم جھم سے محفوظ ہوگئے۔ سیڑھیاں اتنی آسان تھیں کہ سجاول کے اسٹریچر کو حرکت دینے میں بھی کوئی دشواری نہیں ہورہی تھی۔
''یہ ہم کہاں اترتے جارہے ہیں شاہ زیب بھائی؟'' انیق نے ڈری ڈری آواز میں کہا۔
''زیادہ اداکاری نہ کرو۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے بھی تمہیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم نے کئی سخت چلے کاٹے ہوئے ہیں۔ پیر کامل کی منزل تک پہنچنے والے ہو۔''
''لیکن میں ایسی جگہ مرنا نہیں چاہتا جہاں میرا مزار ہی نہ بن سکے۔ کل کلاں میرے ماننے والے مجھے کہاں ڈھونڈتے پھریں گے...... اور سنا ہے کہ خونی چمگادڑیں تو پیری فقیری کے حوالے سے ویسے بھی زیادہ نالج نہیں رکھتیں۔''
''مجھے تو تمہارے سوا یہاں کوئی چمگادڑ نظر نہیں آرہی اور میرا خیال ہے کہ ہوگی بھی نہیں۔''
سیف نے کہا۔ ''یہ پانی کی آواز کیسی آرہی ہے؟''
آواز واقعی آرہی تھی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے قسطینا کی طرف دیکھا۔ ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ ہولے سے مسکرائی۔ ہم چند قدم مزید آگے گئے اور آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ یقین نہیں آیا کہ ہم سب کچھ اپنی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ زیرزمین پانی کا ایک دریا بہہ رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے پتھروں سے ٹکراتا یہ پانی تیزی سے نشیب کی طرف بڑھتا چلا جارہا تھا۔ یہاں سبزہ نہیں تھا مگر آبِ حیات کی جھلکیاں نظر آتی تھیں۔
انیق نے لرزاں آواز میں کہا۔ ''مجھے احمد رشدی کا ایک پرانا گانا یاد آرہا ہے۔ قسمت کا لکھا ٹل سکتا ہے...... دریا انڈر گراؤنڈ چل سکتا ہے...... جم سکتی ہے سورج کی کرن...... وغیرہ وغیرہ......''
سیف بولا۔ ''یار! احمد رشدی کو یاد کرنے کے لیے یہ کوئی مناسب جگہ نہیں ہے۔ کوئی اللہ توبہ کرو۔''
یہ ایک وسیع و عریض جگہ تھی۔ ہم بولتے تھے تو ہماری آوازیں بلند و بالا چھت سے ٹکرا کر دیر تک گونجتی تھیں۔ میں نے زیرزمین بہنے والے دریاؤں کے بارے میں سنا تھا مگر کبھی کسی ایسے دریا کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں گا، یہ توقع نہیں تھی۔ اس سارے نظارے میں عجیب سی ہیبت آمیز دلچسپی تھی۔ اتنی بلند چھت کے نیچے اس بارشی دریا کے کنارے کھڑے ہم کیڑے مکوڑے ہی نظر آتے تھے۔ کوئی عجیب وضع کا کیڑا... زینب کے پاؤں پر چڑھا تو اس نے چلانا شروع کردیا۔ ابراہیم نے کیڑے کو ہٹایا اور اپنے پاؤں تلے مسلا۔ ''آگے نکلنا چاہیے۔'' قسطینا نے کہا اور اس کی آواز دیر تک پتھریلی دیواروں میں گونجتی رہی۔
قریباً پانچ منٹ بعد ہم ایک شاندار چیمبر میں موجود تھے۔ اس پتھریلے چیمبر کے اردگرد اور بھی کئی چھوٹے بڑے چیمبر اور راہداریاں موجود تھیں۔ یہ سب کچھ قدرتی تھا۔ بے حد صاف ستھرا اور ہوادار۔ اگر کوئی کمی تھی تو وہ روشنی کی تھی۔ اس کمی کو موم بتیوں کی مدد سے دور کیا گیا۔ ہماری پہلی پناہ گاہ کی طرح یہاں بھی بیشتر ضروریاتِ زندگی اور آسائشیں موجود تھیں۔ بستر، کرسیاں اور میز۔ لکڑی کی

الماریاں جن پر خوب صورتی سے رنگ روغن کیا گیا تھا۔ یہاں دو کچن بھی موجود تھے اور گیس سلنڈر بھی دکھائی دیے۔ قسطینا نے کہا۔ ”یہاں دو بڑے جنریٹرز اور کافی آئل بھی موجود ہے لیکن یہ سسٹم چونکہ طویل عرصے سے استعمال نہیں ہوا اس لیے چالو حالت میں نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم جلد ہی اسے قابلِ استعمال بنالیں گے۔“

”ایسی کتنی پناہ گاہوں کا انتظام کر رکھا ہے آپ نے؟“ میں نے پوچھا۔

”صرف دو۔“ وہ بولی۔ ”ایک وہ تھی جہاں سے ہم آئے ہیں، اور ایک یہ جہاں موجود ہیں اور یہ پناہ گاہیں بھی ڈیڈی کی دور اندیشی کا نتیجہ تھیں۔ انہیں اندازہ تھا کہ دھیرے دھیرے رائے زل کا دباؤ ہم پر بڑھتا جائے گا۔ انہوں نے عزت مآب اور فیملی کی حفاظت کے لیے یہ انتظام کیا تھا مگر حالات کے تیور دیکھ کر عزت مآب تو ویسے ہی پاکستان چلے گئے تھے۔“ شاید وہ اور بھی کچھ کہتی مگر ابراہیم تھوڑی دور دوسرے کمرے میں موجود تھا۔ قسطینا نہیں چاہتی تھی کہ ابراہیم کے والد کے بارے میں کوئی سخت بات ابراہیم کے کانوں تک پہنچے۔

انیق کچھ فاصلے پر بیٹھا تھا اور اپنے گیلے جوتے اتار رہا تھا۔ اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”یا اللہ خیر، ہمیں ہر طرح کی بلاؤں سے محفوظ رکھ۔“

پہلے تو مجھے پتا نہیں چلا کہ اس نے یہ دعائیہ انداز کیوں اختیار کیا ہے پھر میری نگاہ سجاول والے اسٹریچر پر پڑی۔ اس نے کسمسانا شروع کر دیا تھا اور سر کو دائیں بائیں حرکت دے رہا تھا۔ میں اسے دیکھنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے سکون بخش دوا کی ایک اور ڈوز کی ضرورت تھی۔

☆☆☆

رات تک ہم اپنی اپنی جگہ پر ”سیٹ“ ہو چکے تھے۔ یہ واقعی ایک وی آئی پی پناہ گاہ تھی۔ زمین دوز دریا کا شور یہاں ایک مدھم موسیقی کی طرح گونجتا تھا۔ موم بتیوں کا ایک بڑا ذخیرہ یہاں موجود تھا۔ اس کے علاوہ گیس کیپسس بھی تھے۔ بہت دنوں کے بعد ہم نے خشک راشن کے بجائے تازہ پکا ہوا کھانا کھایا۔ یہ کھانا تیار کرنے میں زینب، سنبل اور سیف نے حصہ لیا۔ سیف پنجابی پٹھان تھا۔ خوراک کھانا تو جانتا ہی تھا، پکانا بھی خوب جانتا تھا، اس نے پراٹھے تیار کیے۔ ساتھ میں سفید چنوں کا سالن تھا۔ لاہوری کھانے کا مزہ آگیا۔ ابراہیم تو خیر پاکستان میں رہ کر آیا تھا لیکن قسطینا اور ابن مشہد وغیرہ کے لیے یہ ذائقہ اجنبی تھا۔ قسطینا سوں سوں کرتی رہی اور ہمارا دل رکھنے کے لیے کھاتی بھی رہی۔

کھانے کے بعد باقی تو باہر چلے گئے۔ میں، قسطینا، فارس جان اور ابراہیم بیٹھے رہے۔ اسی دوران میں کیپٹن ڈاکٹر تبارک بھی اجازت لے کر اندر آ گیا اور بیٹھ گیا۔ کمانڈر فارس جان نے شستہ انگلش میں قسطینا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”یور ہائی نس! آپ کے لیے بلکہ ہم سب کے لیے ایک اچھی خبر ہے۔“ فارس کے چمکدار چہرے پر دبا دبا جوش تھا۔

”کس حوالے سے؟“ قسطینا نے دریافت کیا۔

فارس جان نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر ارادہ بدل کر بولا۔ ”ڈاکٹر تبارک تم خود ہی بتاؤ۔“

تبارک نے مؤدب انداز میں کہا۔ ”یور ہائی نس! میڈیا پر رائے زل کی صحت میں بہتری کے متعلق خبریں چلائی جا رہی ہیں لیکن صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ آپ کا یہ خادم اس وقت خود اسپتال میں موجود تھا جب زخمی رائے زل اور مردہ حلمی صاحب کو وہاں لایا گیا۔ میری موجودگی میں ہی سینئر سرجنوں نے رائے زل کو آپریٹ بھی کیا تھا۔ رائے زل نے بلٹ پروف جیکٹ پہن رکھی تھی مگر وہ اس کے کوئی کام نہ آئی۔ محترم شاہ زیب نے بڑی عقلمندی سے اس کے سر کو نشانہ بنایا تھا۔ کم از کم ایک گولی رائے زل کی گردن میں ایسی لگی ہے جس نے اس کی ”اسپائنل کینال“ کو تباہ کر دیا ہے۔ اس کا نچلا دھڑ بالکل کام نہیں کر رہا اور ایک نیورو فزیشن کی حیثیت سے مجھے لگتا ہے کہ یہ کبھی کام کرے گا بھی نہیں۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ وہ مفلوج ہو گیا ہے؟“ قسطینا نے سنسنی آمیز لہجے میں پوچھا۔

”ایک سو ایک فیصد یور ہائی نس، نائن ایم ایم پسٹل کی دو گولیاں اس کی گردن میں لگی ہیں مگر ریڑھ کے بالائی مہروں میں لگنے والی گولی نے اس کے دماغ کا رشتہ بدن کے نچلے حصے سے کاٹ ڈالا ہے۔ کوئی کرشمہ نہ ہو جائے ورنہ ایسے مریض کبھی ٹھیک نہیں ہوتے، ان کے زیریں جسم کے سارے افعال ختم ہو جاتے ہیں۔ جتنی دیر جیتے ہیں اذیت کی زندگی جیتے ہیں۔“

قسطینا نے ایک گہری سانس لی۔ کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔ ”کہتے ہیں کہ دشمن کی موت اور تکلیف پر خوش نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ایک دن آپ کے دوستوں کو بھی ایسی ہی صورتِ حال کا سامنا کرنا ہوتا ہے لیکن کچھ دشمن سانپوں

اور بچھوؤں سے کہیں زیادہ زہریلے اور خطرناک ہوتے ہیں، ان کا سر کچلا جائے تو...... سکون کا سانس تو آتا ہی ہے، کیوں ابراہیم؟"

ابراہیم کے چہرے سے بھی اطمینان جھلک رہا تھا۔ وہ متانت سے بولا۔ "آپ ٹھیک کہتی ہیں مسٹر قسطینا۔ وہ ایک خونی درندہ ہے اور اس کا مفلوج ہو جانا خوش آئند ہے۔"

ڈاکٹر تبارک نے کہا۔ "میں پھر عرض کرتا ہوں جناب کہ یہ کوئی عارضی کیفیت نہیں ہے۔ قدرت نے اس شخص کو اس کی چیرہ دستیوں کی قرار واقعی سزا دی ہے۔ وہ اب صحت کی طرف لوٹ نہیں سکے گا۔ اگر میں یہ کہوں تو شاید بے جا نہ ہو کہ وہ اب ایک زندہ لاش ہے۔"

میری نگاہوں میں نجانے کیوں ذہین آنکھوں والی دلکش ڈاکٹر ماریہ کا چہرہ گھوم گیا۔ وہ اپنے عزیزوں اور اہلِ شہر کو رائے زل کے غیظ و غضب سے بچانے کے لیے خاموشی سے اس کے پاس چلی گئی تھی۔ اپنی حیثیت کے مطابق اس نے جو قربانی دی تھی وہ معمولی نہیں تھی۔ ڈاکٹر ماریہ جیسے نجانے کتنے مرد و زن مادام ہاناوانی کے ستمگر بیٹے کی من مانیوں کا شکار ہو چکے تھے۔ مجھے لگا میرے سینے کے انگاروں پر ایک نرم پھوار سی پڑ گئی ہے۔

قسطینا نے ستائشی نظروں سے میری جانب دیکھا اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولی۔ "اب تک جو کچھ ہوا ہے، اس میں 80 فیصد کردار شاہ زائب کا ہے۔ میں دل کی گہرائیوں سے شاہ زائب کی ممنون ہوں۔" (میری تعریف کرتے ہوئے وہ کبھی جھجکتی نہیں تھی۔ حالانکہ ڈی ٹیکس میں کئی کمانڈر اس کا برا بھی مناتے رہتے تھے)

میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس نے بڑی ادا سے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا حکم دیا۔ فارس جان اور تبارک مسکرانے لگے۔

ابراہیم نے نمناک آنکھوں کے ساتھ کہا۔ "میں جانتا ہوں ہمارے محترم ماموں آدم کو شہید کرنے کے بعد چیف گیرٹ اور رائے زل نے جشن منایا تھا اور شیرینی تقسیم کی تھی۔ ہم شیرینی تو تقسیم نہیں کریں گے لیکن یہ دعا ضرور مانگیں گے کہ جن لوگوں نے ہم پر ظلم کے پہاڑ توڑے ہیں، خدا ان کو نیست و نابود کرے۔ دنیا میں جہاں جہاں بھی طاقتور...... کمزوروں کی آواز کو دبا رہے ہیں اور ان پر عرصۂ حیات تنگ کر رہے ہیں ان کو ذلت اور رسوائی نصیب ہو۔"

یہ اسی شب کا واقعہ ہے۔ میں اپنے آرام دہ بستر پر سونے کے لیے لیٹا تھا۔ بارشی موسم کے باعث ہلکی خنکی محسوس ہو رہی تھی۔ فضا میں معدنیات کی دھیمی سی مہک تھی۔ کمر تک کمبل اوڑھ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اچانک احساس ہوا کہ کوئی آہستگی سے بستر پر بیٹھا ہے اور اس نے میری پنڈلیاں تھام لی ہیں۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ یہ سیف تھا۔ وہ میری ٹانگیں دبانے لگا۔ "اوئے کبڈی شاہ! یہ کیا کر رہے ہو؟" میں نے اپنی ٹانگیں سمیٹنا چاہیں۔

اس نے بڑی مسکین صورت بنائی۔ "آپ کو اللہ سوہنے کا واسطہ استاد جی، مجھے یہ کرنے دیں۔ مجھے بہت اچھا لگے گا۔"

"یار! کیوں جونک بن کر مجھ سے چمٹ گئے ہو۔ سچ پوچھو تو میں اس گھڑی کو پچھتا رہا ہوں جب تمہیں ساتھ لانے پر راضی ہو گیا تھا۔"

وہ ڈھٹائی سے مسکرایا۔ "اور میں اس گھڑی کو انمول سمجھ رہا ہوں جب آپ راضی ہوئے تھے۔ یقین کریں مجھے اس وقت کچھ پتا نہیں تھا کہ آپ اتنے بڑے چیمپئن ہیں، اس ویلے بس مجھے یہ لگا تھا کہ آپ میں کچھ نہ کچھ ہے، کچھ بہت خاص۔"

میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "اچھا چلو ٹھیک ہے، مجھ میں کچھ بہت خاص ہے۔ لیکن اب آگے کیا کرنا ہے؟"

"آگے آپ کے ساتھ رہنا ہے جی، آپ کو پیر استاد مانا ہے، پلّہ پکڑا ہے۔"

"اور کبڈی والے جس کو پکڑ لیتے ہیں اسے چھوڑتے نہیں۔" میں نے اس کا فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔ اس نے بتیسی نکال دی۔ وہ اپنے ہاتھوں کو مسلسل میری پنڈلیوں پر حرکت دے رہا تھا۔

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "سیف! کچھ لوگ یہاں سے ہزاروں میل دور پاکستان میں بہت شدت سے تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ ان کو تمہاری ضرورت ہے، تم اس طرح بے وجہ اپنی جان جوکھم میں نہ ڈالو۔"

"میری جان جوکھم میں اس وقت ہو گی جب میں آپ سے دور ہوں گا۔ یقین کریں، میں بہت مزے میں ہوں۔ آپ سے مل کر تو مجھے کبڈی بھی معمولی چیز لگنے لگی ہے۔ میں آپ سے کچھ سیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ جیسا تو شاید میں کبھی بھی نہ بن سکوں لیکن آپ کا شاگرد کہلوانا بھی میرے لیے کچھ کم شان کی بات نہیں ہو گی۔"

"کبڈی کو معمولی نہ کہو، ہر فن کا اپنا مقام ہوتا ہے...... ایک اور بات تم سے کہنا چاہتا ہوں۔ سگریٹ نوشی چھوڑ دو......

اور وہ جو بھی بھی ہونٹ تر کرتے ہو وہ بھی ٹھیک نہیں۔"
"لیکن استاجی......"

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ اس نے اچھا کیا کہ نہیں کہا ورنہ بات لمبی ہو جاتی۔ اسے پتا تھا کہ میں غم و اندوہ کی کیفیت میں الکحل لیتا ہوں...... مگر یہ پتا نہیں تھا کہ کیوں لیتا ہوں۔ اسے یورپ کے نائٹ کلبوں اور ڈنمارک کے ان آتشیں شب و روز کی بھی خبر نہیں تھی جو میں نے بارود کی بو اور خون کے چھینٹوں کے درمیان گزارے تھے۔

وہ باتیں کرتا رہا، اس کے اندر ایک تڑپ سی تھی۔ وہ کچھ بن کر دکھانا چاہتا تھا۔ اپنے اہلِ علاقہ کو، اپنے گھر والوں کو اور شاید...... تاجور کو بھی۔ میں اسے فل اسٹاپ نہ لگاتا تو شاید وہ اسی طرح صبح کر دیتا۔ وہ جا کر اپنے بستر پر لیٹ گیا تو میں اپنے خیالوں میں گم ہو گیا۔ ریشمی کا وہ خط ابھی تک میری جیب میں سرسرا رہا تھا جس میں تاجور کا تذکرہ تھا اور چاند گڑھی کی چاندنی راتوں کی مہک سمائی ہوئی تھی۔

میں تاجور کے بارے میں جتنا بھی سوچتا تھا، میری سوچ ایک نقطے پر آ کر رک جاتی تھی۔ جو خونخوار بھیڑیے میرے پیچھے لگے ہوئے تھے انہوں نے بہت جلد مجھ تک پہنچنا تھا۔ میں ان کی تھوتھنیوں کی بو سونگھ رہا تھا۔ ان کے قدموں کی دھمک سن رہا تھا...... مجھے تو ان کی زد میں آنا ہی تھا جو میرے اردگرد ہوتے وہ بھی لہولہو ہو جاتے تھے۔ کیا تاجور جیسی نازک، شبنم سی پاکیزہ اور شفاف لڑکی کی محبت کا صلہ یہی تھا کہ اسے زندگی کی شروعات میں ہی دردناک موت کی سزا دے دی جاتی۔ میں جان ڈیرک جیسے درندوں کا سایہ بھی اس کے آس پاس دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ جاما جی میں میری شہرت کے بعد میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ جان ڈیرک سے سامنا اب دور کی بات نہیں۔ ہاں...... وہی تھوتھنیوں کی بو، وہی قدموں کی دھمک، وہی آنکھوں سے نکلتے ہوئے شعلے۔ وہ آ رہے تھے...... یا آنے والے تھے۔ دل کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ جی چاہا کہ ایک بار پھر وہ خط نکال کر پڑھوں لیکن حاصل کیا تھا اور سیف چند فٹ کی دوری پر دوسرے بستر پر سو رہا تھا۔ میں نے خط نکالا اور کمبل کے اندر ہی اس کے پرزے کر دیے۔ ان پرزوں کو چولھے میں جھونکنے کے لیے میں کچن نما کمرے کی طرف گیا۔ یہاں بن مشہد ایک کیتلی میں اپنے لیے ادرک کی چائے تیار کر رہا تھا۔ میں نے خط کے ٹکڑے آگ میں پھینک دیے۔

کھڑکی سے باہر دیکھا، دور فاصلے پر دریا کا منظر نظر آیا۔ پانی بدستور رواں تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ باہر بارش بھی ہو رہی ہو گی۔ بلند و بالا سنگلاخ چھت کے نیچے بہتا ہوا یہ دریا عجیب نظارہ پیش کرتا تھا۔ جس روشنی میں دریا کا پانی نظر آ رہا تھا وہ ایک سرچ لائٹ سے پھوٹ رہی تھی۔ یہ سرچ لائٹ دریا کے کنارے ایک شخص کے پاس رکھی تھی۔ وہ شخص بڑی خاموشی سے رات کے اس پہر ایک پتھر سے ٹیک لگائے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ "آپ کو پتا ہے یہ کون ہے؟" بن مشہد نے مجھ سے پوچھا۔

"کمانڈر فارس لگتا ہے...... لیکن...... یہ اس وقت یہاں اُداس بیٹھا ہے۔"

"اس کی اداسی نئی نہیں ہے۔ کافی پرانی ہے۔ یہ کسی سے محبت کرتا ہے۔"

"اوہ......!" میں نے ہونٹ سکیڑے۔ "کیسے کیسے جری جوان، کیوپڈ کے تیر کا شکار ہوتے ہیں، کون ہے وہ؟"

"پتا نہیں...... لیکن ہے ضرور۔" بن مشہد نے زیرِ لب مسکرا کر کہا۔

"کوئی رکاوٹ ہے راستے میں؟"

"لگتا تو ایسے ہی ہے جی۔" بن مشہد نے مختصر جواب دیا۔

میں نے غور سے مشہد کی طرف دیکھا۔ اس کے تاثرات سے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ واقعی بے خبر ہے، یا چھپا رہا ہے۔

☆☆☆

وقت گزر رہا تھا۔ ہمیں اس زیرِ زمین آبی دھارے کے کنارے بسیرا کیے ہوئے اب دو ہفتے ہونے کو آئے تھے۔ یہاں کی زندگی بڑی عجیب اور دلچسپ تھی۔ دن اور رات کا پتا صرف گھڑی کی سوئیوں سے چلتا تھا۔ پانی کی موسیقی مسلسل سنائی دیتی تھی۔ یہاں مچھلیاں بھی تھیں اور کبھی کبھار دو چار خاص قسم کے پرندے بھی سنگلاخ دیواروں سے چمٹے نظر آتے تھے۔ مچھلیوں اور پرندوں کا شکار کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ یہاں اکثر ہوا چلتی رہتی تھی اور جب ہم باتیں کرتے تھے یا شکار کے وقت بلند آواز میں بولتے تھے تو بازگشت دیر تک سنائی دیتی تھی۔ سجاول اب پہلے سے بہت بہتر تھا۔ اسے خود بھی احساس ہو رہا تھا کہ وہ ماضی قریب میں کسی شدید ذہنی تناؤ کا شکار رہا ہے جس کے سبب اس کی یادداشت پر بھی اثر پڑا ہے۔ اسے صرف اتنا یاد تھا کہ اسپتال والی لڑائی کے دوران میں وہ پکڑا گیا تھا اور پھر گرگے فوجیوں نے اسے کسی قلعہ نما جگہ میں لے جا کر بری طرح مارا پیٹا تھا۔ بعد کے واقعات اس کے ذہن سے محو

[illegible]
نتیجہ سمجھتا تھا مگر میری معلومات کچھ اور کہتی تھیں اور جو وہ کہتی تھیں وہ بے حد انوکھا اور نا قابلِ یقین تھا۔ فی الحال میں اس حوالے سے سجاول کے ساتھ زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتا تھا۔
قسطینا آج کل نسبتاً اچھے موڈ میں تھی۔ چیف گیرٹ کی موت اور رائے زل کے زندہ لاش بن جانے کے بعد اسے یہی لگتا تھا کہ اس کے مشن کا ایک حصہ مکمل ہو گیا ہے۔ اب وہ اپنے آپ کو کچھ وقت دینا چاہتی تھی اور جزیرے کے حالات کو بھی دیکھنا چاہتی تھی کہ کس رخ پر جاتے ہیں۔ اسے یقین تھا کہ بہت جلد جزیرے کے عوام میں بے چینی کی لہر زبردست تحریک کی شکل اختیار کرے گی۔ وہ خوف کی دیواریں توڑ کر سڑکوں پر نکلیں گے اور یہی وقت میدانِ عمل میں آنے کا ہوگا۔ تاہم کسی وقت وہ اپنے قریبی ساتھیوں کی موت اور جدائی پر غم زدہ بھی ہوتی تھی۔ یہ وقفے چھوٹے لیکن گمبھیر ہوتے تھے۔ وہ مسلسل میرے قریب بھی آ رہی تھی۔ کسی وقت شام کے بعد ہم چھوٹی ٹارچیں لے کر دریا کے ساتھ ساتھ آگے نکل جاتے۔ عجیب وضع کی چٹانوں اور آبی حیات کا نظارہ کرتے۔ ہمیں ایسے حشرات نظر آتے جو اس زیرِ زمین آبی گزرگاہ کی بلند چھت سے جھالروں کی طرح لٹک رہے ہوتے اور ان میں سے جگنوؤں جیسی روشنی پھوٹتی۔ ایسی مچھلیاں دیکھتے جو ہفت رنگ ہوتیں اور ان کے شفاف جسموں میں سے اندرونی اعضا دکھائی دیتے تھے۔
یہ بڑی عجیب دنیا تھی۔
کبھی کسی تنہا گوشے میں، میں اسے چھوتا اور اس کے چہرے پر رنگ بکھر جاتے۔ میں اس کے لیے ایک ''لونگ لیجنڈ'' تھا۔ وہ مجھ سے ملنے سے بہت پہلے ہی میری پرستار تھی۔ اب وہ مجھے چھونا چاہتی تھی، مجھے زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتی تھی۔ مجھے بھی کسی کو بھلانے کے لیے اس کی ضرورت تھی۔
ایک دن ایسی ہی ایک طلسماتی شام کے اندھیرے میں ہم دریا کے کنارے پتھروں کی اوٹ میں نیم دراز تھے۔ اس نے میری قمیص کے سارے بٹن کھول دیے۔ میرے سینے کو چھوتی چھوتی میرے زخمی کندھے تک چلی گئی۔ اس کو چوم کر بولی۔ ''شاہ زائب! مجھے تمہارے بازو کی بہت فکر رہتی ہے۔ کیا اب یہ کبھی ٹھیک نہیں ہو سکے گا؟''
''کیوں نہیں، اس گھیرے سے نکلیں گے تو سب کچھ ممکن ہو جائے گا۔''
''ہوں......!'' اس نے ہنکارا بھرا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر بولی۔ ''لیکن اس گھیرے سے نکلنے کے بعد بہت کچھ [illegible] ٹھیک ہو جائے گا۔''
''کیا مطلب؟''
''پتا نہیں حالات کیا ہوں، تم کہاں جاؤ، میں کہاں جاؤں؟''
''تو پھر؟''
''میں مرنے سے پہلے، خوب اچھی طرح جینا چاہتی ہوں۔''
''وہ کس طرح؟''
وہ مسکرائی۔ ''ہر طرح...... اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایسٹرن کنگ کو بہت اچھی طرح جاننا چاہتی ہوں۔ بہت قریب سے۔'' اس نے اپنا سر میرے سینے پر ڈال دیا اور میرے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی۔
کتنی ہی دیر ہم اسی طرح لیٹے رہے۔ دل کے سرپٹ دوڑنے کی آواز سنتے رہے۔ ایک دم اس نے میرے سینے سے سر اٹھایا اور بولی۔ ''شاہ زائب! کیا ہم شادی نہیں کر سکتے؟''
میں اس اچانک سوال پر سناٹے میں رہ گیا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ بھی بیٹھ گئی اور ذرا شوخی سے میری طرف دیکھنے لگی۔ بہت بڑی کمانڈر تھی...... لیکن تھی تو ایک لڑکی ہی۔
''یہ کیسے ہو سکتا ہے قسطینا؟'' میں نے کہا۔
''جب ہم ایک دوسرے کے قریب آنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے آمادہ ہیں تو یہ بھی ہو سکتا ہے۔''
''لیکن...... صرف ایک دوسرے کے قریب آنے کے لیے...... شادی؟ کہتے ہیں کہ شادی تو ایک بہت بڑے بندھن کا نام ہے، زندگی بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ......''
''یہ تو دقیانوسی باتیں ہیں لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے شاہ زائب! میں شاید تمہارے ساتھ گزارنے کے لیے ایک زندگی کو بھی کم سمجھتی ہوں۔''
''آپ جذباتی ہو رہی ہیں۔''
''وہ تو میں ہوں، اور خاص طور پر تمہارے لیے۔''
وہ میری انگلیوں کی ساخت اور ہاتھوں کی بناوٹ کو دیکھنے لگی۔ اپنے ہاتھوں کو میرے ہاتھوں میں الجھانے لگی۔ باہر شاید بارش تھی، دریا کا بہاؤ تیز ہو رہا تھا۔
رات کو میں دیر تک سوچتا رہا، میں جانتا تھا کہ اپنی ذات کے تمام تر وقار کے باوجود وہ مجھے بہت چاہتی ہے۔ یہ مجھ سے زیادہ میرے جسم کی اور شاید میری ناموری کی چاہت تھی۔ میں اس کے لیے سپر اسٹار تھا اور وہ جیسے مجھے ''ڈسکور'' کرنے کی خواہش مند تھی۔ دوسری طرف میں اس

[illegible]
فراموشی چاہتا تھا اور قسطینا کی حسین قربت اس کا بہترین ذریعہ بن سکتی تھی۔ گویا محبت تو میری طرف بھی نہیں تھی۔ تو پھر یہ کیا تھا؟ سوچتے سوچتے میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں کئی دنوں سے ایک شک میں مبتلا تھا۔ اس شک کا تعلق فارس جان سے تھا۔ میں نے وال کلاک پر نظر دوڑائی۔ رات کے گیارہ بجے تھے۔ سب سو رہے تھے، میں بغیر آواز پیدا کیے اپنی جگہ سے اٹھا اور فارس کے کمرے کی طرف بڑھا۔ راستے میں ابراہیم کا کمرا تھا۔ میں نے کھڑکی سے جھانکا، وہ نیا نویلا دولھا اپنے بیڈ پر تنہا سو رہا تھا۔ اس کی بے بس دلہن کسی اور کمرے میں تھی۔ یہ کیسی مجبوری تھی، ایک ناقابل عبور دیوار ان کے راستے میں کھڑی تھی۔

میں کھڑکی کے سامنے سے گزر کر اس کمرے میں پہنچا جہاں فارس اور بن مشہد سو رہے تھے۔ لیمپ کی روشنی بہت مدھم تھی۔ فارس جان کی سیاہ جیکٹ ایک ہینگر سے جھول رہی تھی۔ اس جیکٹ کی اندرونی جیب میں ایک ڈائری تھی۔ میں نے فارس جان کو کئی مرتبہ یہ ڈائری لکھتے دیکھا تھا۔ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ ڈائری نکالی اور واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ ڈائری کے پہلے ہی صفحے پر یہ شعر تھا۔

نہیں تیرا نشیمن، قصر سلطانی کے گنبد پر......

یہ شعر فارس جان کے مجاہدانہ مزاج کی عکاسی کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں واقعی ایک عقاب کی سی چمک تھی۔ بلند قد، چوڑا سینہ، دوستوں میں بہت نرم مزاج اور خوش اخلاق، دشمنوں کے لیے فولاد کی طرح سخت اور سراپا قہر۔

میں نے اگلا صفحہ پلٹا...... پھر اس سے اگلا...... پھر کئی صفحات پلٹ ڈالے۔ لیکن اگر میرا خیال تھا کہ فارس جان کی اس ڈائری سے مجھے اس کی زندگی میں جھانکنے کا کوئی موقع ملے گا، تو سخت مایوسی ہوئی۔ پہلے صفحے کے سوا یہ ساری ڈائری کسی ناقابل فہم زبان میں لکھی تھی۔ رسم الخط بھی بالکل اجنبی تھا۔ مجھے تو یہ پشتو بھی نہیں لگتی تھی، میں جگہ جگہ سے دیکھتا رہا۔ سوائے تاریخوں کے کوئی ایک لفظ پلے نہیں پڑا۔ شاید اسی لیے فارس جان نے یہ ذاتی ڈائری اتنی بے پروائی سے جیب میں ڈالی ہوئی تھی۔

یکا یک میرا دھیان انیق کی طرف چلا گیا۔ مایوسی کے اندھیرے میں امید کی کرنیں چمکیں۔ انیق کی خوبیوں میں سے ایک اہم ترین خوبی اس کی زبان فہمی تھی۔ وہ ان گنت زبانوں کی شد بد رکھتا تھا۔ اس کی یہ صلاحیت کرشماتی تھی۔

میں نے اسی وقت اسے جگا دیا۔ وہ میرے قریب
[illegible]
سجاول کی جانب ہی دیکھا جو ساتھ والے کمرے میں ڈبل بیڈ پر خراٹے لے رہا تھا۔ اس نے اطمینان کی سانس لی پھر بولا۔ ''مجھے تو لگا تھا کہ امریش پوری میرے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا ہے۔''

''اگر ایسے ہی کرتے رہو گے تو ایک دن ضرور چڑھے گا۔'' میں نے کہا اور اسے اپنے ساتھ لے کر اپنے بیڈ کی طرف آ گیا۔ اس نے پوری طرح جاگنے اور میری بات سمجھنے میں تین چار منٹ لگا دیے۔ میں نے ڈائری اس کے سامنے کر دی۔ وہ صفحات پلٹنے لگا اور بغور دیکھنے لگا آخر بولا۔ ''اس کا ایک لفظ میرے پلے نہیں پڑا۔''

''بکواس نہ کرو۔'' میں نے اسے جھاڑا۔

وہ بولا۔ ''ناراض کیوں ہو رہے ہیں۔ کہہ تو رہا ہوں کہ جتنے صفحے دیکھے ہیں ان میں سے ایک لفظ میرے پلے نہیں پڑا، باقی تقریباً سارے پڑ گئے ہیں۔''

میری دھڑکن بڑھ گئی۔ ''ایک نمبر کے کھوچل ہو تم، بتاؤ کیا لکھا ہے؟''

''یہ دراصل پشتو اور ہندکو کی ملی جلی شکل ہے۔ مجھے تو یہ اپنے کمانڈر صاحب کی پریم کہانی لگ رہی ہے۔ جگہ جگہ اپنے دل کی واردات بیان کی گئی ہے۔ یہ ڈھائی تین سال کے اندراجات ہیں۔''

''لکھا کیا ہے؟''

میرے کہنے پر انیق نے پڑھنا شروع کیا۔ جہاں غیر اہم واقعات ہوتے تھے وہ چھوڑ دیتا تھا۔ کچھ حصوں کو ٹھیک سے سمجھنے کے لیے دوبارہ پڑھتا تھا۔ تفصیل میں جانے سے ذکر طویل ہو جائے گا۔ یہ کمانڈر فارس جان کی چشم کشا ڈائری تھی۔ ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ کمانڈر فارس جان اپنی سپریم کمانڈر قسطینا کی دیرینہ محبت میں گرفتار ہے۔ شروع کے ڈیڑھ دو برسوں میں یہ محبت بالکل خاموش رہی۔ پھر ایک دو ایسے واقعات ہوئے کہ قسطینا بھی فارس جان کے سینے میں سلگنے والی آگ کی تپش سے آگاہ ہو گئی۔ تاہم اس نے کبھی فارس جان کو کوئی مثبت اشارہ نہیں دیا۔ دوسری طرف فارس جان ادب و احترام کے دائرے کا اسیر تھا۔ فارس جان نے اپنی طویل ڈائری میں قسطینا کو ''ق'' کے علامتی نام سے لکھا تھا۔ اپنی ڈائری میں اس نے کئی جگہ تحریر کیا تھا کہ وہ انہیں پرستش کی حد تک چاہتا ہے مگر یہ بھی نہیں چاہے گا کہ اس کی وجہ سے ان کے نام پر کوئی حرف آئے۔

لحاف کی اوٹ میں رکھ کر ہم بڑی احتیاط سے یہ

دو دن پہلے بن مشہد نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ فارس جان کسی کی محبت میں ڈوبا ہوا ہے۔

☆☆☆

یہ منظر قسطینا کے آرام دہ کمرے کا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ ہوا میں معدنیات کی خوشبو اور بہتے دریا کی موسیقی تھی۔

گیس لیمپ کی روشنی میں قسطینا کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی نظر آ رہی تھی۔ ایسی نمی میں پہلی بار قسطینا کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا اور یہ بھی میری بات ہی کی وجہ سے آئی تھی۔ دراصل آج فیصلے کی رات تھی۔ آج رات ہمیں طے کرنا تھا کہ ہم نے خود کو کسی بندھن میں باندھنا ہے یا نہیں۔ اور میں نے چند سیکنڈ پہلے وہ بات کہہ دی تھی جسے کہنا میرے لیے نہایت مشکل تھا۔ میں نے کہا تھا۔ ”قسطینا! مجھے نہیں لگتا کہ شادی جیسا کوئی بندھن ہمیں خوشی دے سکے گا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کو کھو دیں گے۔“

اس نے گیس لیمپ کی لو کچھ اونچی کر دی۔ اپنی آنکھوں کے کناروں کو چھوٹی انگلی سے صاف کیا اور گہری سانس لے کر بولی۔ ”اس کا مطلب ہے...... آج کی رات ملن کا نہیں جدائی کا آغاز ہوگا۔“

”قسطینا!“ میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ”میں شاید اس قابل تو نہیں ہوں لیکن میں آپ کے لیے ایک لیجنڈ ہوں۔ ایک مشہور و معروف کھلاڑی جو آپ کو صرف اسکرین پر نظر آیا کرتا تھا۔ اب وہ اسٹار کھلاڑی آپ کے سامنے ہے...... لیکن قسطینا اسٹار اس وقت تک ہی اسٹار ہوتا ہے جب تک وہ دور ہوتا ہے۔ قریب سے دیکھنے پر تو چاند میں بھی گڑھوں کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ اس نے اپنے بوائے کٹ بالوں میں انگلیاں چلائیں۔

”آپ کا اور میرا فاصلہ یکسر ختم ہو جائے گا تو پھر آپ کا تجسس اور آپ کی ’فینٹیسی‘ بھی ختم ہو جائے گی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، ایسا ہی ہوگا۔ آپ اپنی نادانی پر حیران ہوں گی۔ پلیز قسطینا! اس فاصلے کو باقی رہنے دیں، ورنہ سب بے وقعت ہو جائے گا۔“

وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ اس نے کھڑکی کی طرف منہ پھیر لیا۔ وہ آج بڑے خوب صورت لباس میں تھی۔ باہر اندھیرا تھا۔ دریا صرف اپنے شور کی صورت میں دکھائی دیتا تھا۔ یہ لمحے ہم دونوں کے لیے بھی بڑے کٹھن لمحے تھے لیکن میں جانتا تھا کہ اس میں ہم دونوں کی بہتری ہے۔ میں بھی صرف اپنی خود فراموشی کے لیے قسطینا کے جذبات سے کھیلنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایک بہادر اور باکمال لڑکی تھی۔ جاماجی کے ہزاروں لاکھوں لوگ اسے چاہتے تھے۔ آنے والے دنوں میں وہ کمانڈر فارس جان جیسے شخص کے ساتھ مل کر کچھ بھی کر سکتی تھی۔

کافی دیر بعد اس نے کھڑکی سے رخ پھیر کر میری طرف دیکھا۔ ”مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت تھی شاہ زائب! لیکن...... میں سمجھ گئی ہوں...... تمہاری محبتیں کسی اور کے لیے ہیں۔ شاید وہی پاکستانی لڑکی جس کا تم نے ذکر کیا تھا۔“

”میں اس بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا قسطینا! لیکن ایک اور بات ہے جو میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں۔“ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ ”کوئی اور ہے قسطینا جو آپ کو بے انتہا شدتوں سے چاہتا ہے۔ وہ آپ کا انمول ساتھی بن سکتا ہے۔ میں تو ایک پردیسی ہوں۔ کل یہاں نہیں ہوں گا۔ وہ آپ کا مستقل سہارا ثابت ہوگا۔ ہر ہر موڑ پر آپ کا ساتھ دے گا۔ آپ کی زندگی کو واقعی زندگی کر دے گا۔“

”تم کس کی بات کر رہے ہو؟“

”آپ نے مجھے لونگ لیجنڈ کہا ہے۔ آپ کا لونگ لیجنڈ آپ سے پہلی اور آخری بار ایک درخواست کر رہا ہے، اسے مایوس نہ کیجیے گا۔ ایک بار نہایت ٹھنڈے دل سے اپنی روح کی گہرائیوں میں جھانک کر ضرور دیکھ لیجیے گا۔ شاید وہ آپ کو وہاں نظر آ جائے۔“

”کون نظر آ جائے شاہ زائب؟“

میں نے فارس جان کی کارڈ سائز تصویر نکال کر قسطینا کے سامنے ساگوان کی ٹیبل پر رکھ دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

قسطینا کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت تھی۔ وہ یک ٹک تصویر کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے پلکیں اٹھائیں، ان میں غیظ و غضب نہیں تھا۔ ایک حیرانی آمیز حزن تھا۔ پھر یہ حزن دھیرے دھیرے ایک ملائمت میں ڈھل گیا۔ میں نے دیکھا جاماجی کی سابقہ پریم کمانڈر کی آنکھوں سے دو آنسو ڈھلے اور اس کے رخساروں پر پھسل گئے۔ لگتا تھا کہ اسٹار اور فاصلے والی بات اس کی سمجھ میں آ رہی ہے...... اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے دل کی گہرائیوں میں کوئی دھندلا سا چہرہ بھی اسے نظر آ رہا ہے۔

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

خاتون سراغ رساں میلینی نے اس نوجوان عورت کی لاش کا غور سے جائزہ لیا جو اس چھوٹی سی اپارٹمنٹ بلڈنگ کے زینے کی پہلی سیڑھی کے پاس پڑی ہوئی تھی۔ اس عورت کا لباس ایک بدوضع سے بلاؤز اور نیلے رنگ کے بدرنگی اسکرٹ پر مشتمل تھا۔ اسکرٹ کا نچلا حصہ گھس چکا تھا۔ اس کے سینڈل بھی سیڑھیوں کے پاس ہی پڑے ہوئے تھے۔

اس نوجوان عورت کی گردن میں ایک قریبی گھڑی

پاسبان

ارشد بیگ

تمناؤں اور خواہشات کے سمندر میں تیراکی کرنے والے وقت کے ساتھ خوب سے خوب تر کی تلاش میں مستقل سرگرداں رہتے رہتے ماہر تیراک بن ہی جاتے ہیں... مگر اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ڈوبنے والے وہاں جان دیتے ہیں جہاں پانی کم ہوتا ہے۔

گھر کی نگہبانی کرنے والے پاسبان کی اونچی اڑان

[illegible] ہوئی تھی اور اس میں گرہ بھی لگی ہوئی تھی۔

''یہ عورت یقیناً خوبرو اور حسین رہی ہوگی۔'' سراغ رساں میلینی نے دل ہی دل میں سوچا۔

''اس کی مالک مکان خاتون نے آج صبح اسے یہاں پڑے ہوئے پایا۔'' اس کے ساتھی سراغ رساں جیک نے زینے کے بائیں جانب ہال وے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

وہاں اندر کی جانب ایک عورت باتھ روب پہنے ایک دروازے میں کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی۔

سراغ رساں میلینی اس عورت کے پاس چلی گئی اور خود کو متعارف کرایا۔

''میں جوآنا گریفتھ ہوں۔'' اس عورت نے کہا۔ ''ایمی میرے کرائے داروں میں سے ایک ہے۔''

''تم نے لاش کس طرح دریافت کی؟'' میلینی نے پوچھا۔

''سنیچر کے روز عام طور پر میں نو بجے کے لگ بھگ سو کر اٹھتی ہوں، ناشتا کرتی ہوں اور پھر ڈاک چیک کرتی ہوں۔ جب میں داخلی دروازے پر جانے کے لیے ہال میں پہنچی تب میری نظر اس پر پڑی۔ میں فوراً ہی یہاں واپس آگئی اور پولیس کو فون کر دیا۔'' مالک مکان خاتون نے بتایا۔

''تم مجھے اس عورت کے بارے میں کیا بتا سکتی ہو...... کیا نام بتایا تھا تم نے اس کا؟''

''ایمی لانچ۔ میں مرنے والی کے بارے میں کچھ بُرا تو نہیں کہنا چاہوں گی لیکن میں اسے زیادہ پسند نہیں کرتی تھی۔ اس نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ وہ ایک اداکارہ بننا چاہتی ہے۔ اس وقت وہ قریب میں واقع ایک ڈائنر میں ویٹرس کے طور پر کام کر رہی تھی اور بالآخر اسے ایک اچھا موقع مل گیا۔''

''اور پھر؟''

''اداکاری میں اس کا کیریئر نہیں بن سکا۔ سو اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کسی دولت مند کے ساتھ شادی کرلے گی۔ اگر تم مجھ سے پوچھو تو وہ مردوں کو اسامی بنا کر روپیا اینٹھنے والی عورت تھی۔'' جوآنا گریفتھ نے بتایا۔

''کیا تمہیں رات کو کسی قسم کے شور وغل یا ہنگامے کی آواز سنائی دی تھی؟''

''نہیں، میرا اپارٹمنٹ وہاں سے خاصے فاصلے پر ہے کہ مجھے کچھ سنائی نہیں دیتا۔''

سراغ رساں میلینی نے مالک مکان خاتون کا شکریہ ادا کیا اور واپس وہاں آگئی جہاں لاش پڑی تھی۔

''ہمارے آدمیوں میں سے ایک کو یہ مقتولہ کے اپارٹمنٹ میں سے ملا ہے۔'' سراغ رساں جیک نے بتایا۔

وہ ایک کاغذ کی شیٹ تھی جو ایک شہادتی بیگ میں رکھی ہوئی تھی۔ اس کاغذ پر یہ لکھا تھا: ''جمعے کے لیے تاریخ طے کرنی ہے۔ سی بارٹن، اوفورنے۔ بی پارٹرج۔''

''معلوم کرو کہ یہ تینوں نام کن کے ہیں اور انہیں ڈھونڈ کر پیر کے روز دفتر میں حاضر کرو۔'' سراغ رساں میلینی نے کہا۔

☆☆☆

پیر کی صبح وہ تینوں افراد پولیس ہیڈکوارٹر میں موجود تھے۔

سراغ رساں جیک نے جس پہلے شخص کو سراغ رساں میلینی کے دفتر میں پیش کیا، اس کا نام برائن پارٹرج تھا۔

''ہاں، میں ایمی کو جانتا ہوں۔'' اس نے میلینی کے سوال کے جواب میں کہا۔ ''میری اس سے ملاقات تب ہوئی تھی جب میں ڈائنر میں لنچ کرنے کے لیے جاتا تھا۔''

''کیا تمہارے تعلقات کی حد یہیں تک تھی؟''

''نہیں، ہم نے باہمی رضامندی سے چند ملاقاتیں بھی کی تھیں۔ میرے خیال میں ایمی ہمارے تعلقات سے اس سے کہیں زیادہ فائدہ حاصل کرنا چاہتی تھی جتنا کہ میں سمجھ رہا تھا۔''

''جمعے کی شب تم کہاں تھے؟''

''ایمی نے مجھے فون کیا تھا اور پوچھا تھا کہ کیا ہم ملاقات کر سکتے ہیں...... فلم دیکھنے جانے یا کسی اور تفریح کے لیے۔ لیکن اس رات میری ایک میٹنگ تھی۔ ہمارے بورڈ اور ہمارے بینک منیجر کے ساتھ ہماری ماہانہ میٹنگ جس میں ہم سود کے ریٹس، سرمایہ کاری اور اسی نوعیت کے دیگر معاملات زیرِ بحث لاتے ہیں۔''

''سو تم مس ایمی لانچ کے ساتھ ڈیٹ پر نہیں گئے تھے؟''

''نہیں۔ جمعے کے روز نہیں گیا تھا۔''

سراغ رساں میلینی کے دفتر میں پیش کیے جانے والے اگلے فرد کا نام کولن بارٹن تھا۔

سراغ رساں میلینی نے اسے ایک مقامی ٹیلی وژن رپورٹر کی حیثیت سے پہچان لیا۔

''میں ایمی کے ہمراہ کئی بار ڈیٹ پر جا چکا ہوں۔''

کولن بارٹن نے اعتراف کیا۔ ”لیکن پھر اس سے تعلقات منقطع کرلیے جب میری آنٹی نے مجھے بتایا کہ وہ کس شے کے پیچھے ہے۔“

”تمہاری آنٹی؟“

”آنٹی جوآنا...... ایمی کی لینڈلیڈی۔ ایمی انہیں بتا چکی تھی کہ اسے شوگر ڈیڈی کی تلاش ہے۔ جوان عورتوں پر فیاضی سے تحائف نچھاور کرنے والے ادھیڑ عمر آدمی کی۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ میری آنٹی ہیں۔“ کولن بارٹن نے کہا۔

”سو تم جمعے کے روز اس کے ساتھ ڈیٹ پر نہیں گئے تھے؟“ سراغ رساں میلینی نے پوچھا۔

”قطعی نہیں۔“

آخری مشتبہ فرد اولیور فورٹے تھا۔

”میں اور ایمی ڈیٹ پر جاتے تھے۔“ اس نے بتایا۔ ”اس نے میرا ٹیلی وژن ایڈ دیکھا تھا۔ شاید تم نے بھی دیکھا ہوگا۔ ’آپ کی قانونی حق تلافی کا وکیل...... اولیور فورٹے!‘ وہ حقیقت میں میرے دفتر آئی تھی اور اس نے کہا تھا کہ اس کے خیال میں ہم ایک پرفیکٹ جوڑی بن سکتے ہیں۔“

”سو جمعہ کی شب تم دونوں کہیں باہر گئے تھے؟“ سراغ رساں میلینی نے پوچھا۔

”نہیں، جمعہ کی رات نو بجے کے بعد تک ایک کلائنٹ کے پاس اس کی وصیت تیار کررہا تھا۔ وہ ایک معذور ہے اور مجھے اس کے گھر جانا پڑا تھا پھر میں اپنے گھر واپس آگیا تھا۔“

سراغ رساں میلینی نے اولیور فورٹے سے معذرت کرلی اور اپنے ساتھی سراغ رساں جیک کے ساتھ آن ملی۔

”ایمی لانچ کے تحریری پیغام میں لکھا ہے کہ جمعے کے روز اس کا ارادہ ان تینوں میں سے کسی ایک کے ساتھ کہیں باہر جانے کا تھا۔“ سراغ رساں جیک نے کہا۔ ”لیکن وہ تینوں جمعے کے روز اس سے ملاقات سے انکاری ہیں۔ کوئی نہ کوئی تو جھوٹ بول رہا ہے۔“

”ہاں!“ سراغ رساں میلینی نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”اور میرے خیال سے مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ جھوٹ کون بول رہا ہے۔“

”وہ کون ہے؟“ جیک نے جاننا چاہا۔

”ایمی لانچ نے ان تینوں کے ساتھ ڈیٹ پر جانے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہی......“

”وہ کیسے؟“

”کیا تم نے مقتولہ کے لباس پر توجہ نہیں دی؟ وہ اس وقت بدوضع بلاؤز، بدرنگی اسکرٹ اور سینڈل پہنے ہوئے تھی...... اور وہ کسی کے ساتھ ڈیٹ پر جانے کا لباس ہرگز نہیں ہوسکتا......“

سراغ رساں جیک نے تائید میں گردن ہلادی۔ ساتھ ہی تجسس سے پوچھا۔ ”مشتبہ وہ تینوں نہیں تو پھر کون ہے؟“

”میرے خیال میں ایمی لانچ کی قاتل اس کی لینڈ لیڈی جوآنا گرینفتھ ہے جو اپنے بھانجے کولن بارٹن کو مردوں کو اسامی بنا کر روپیہ اینٹھنے والی اس عورت کے شکنجے سے بچانا چاہتی تھی۔ جاؤ اسے حراست میں لے کر اس سے سختی سے پوچھ گچھ کرو۔ وہ یقیناً اقرار جرم کرلے گی۔“ سراغ رساں میلینی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

سراغ رساں جیک حکم کی تعمیل کرنے کے لیے تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

سراغ رساں میلینی کے کھاتے میں ایک اور کامیاب کیس کا اضافہ ہوچکا تھا۔

لاٹری

پانچ بچوں کے باپ نے لاٹری میں ایک مہنگا کھلونا جیتا اور خوشی خوشی گھر لے آئے۔ سارے بچوں کو جمع کرکے کہا۔ ”وہ بچہ یہ کھلونا حاصل کرے گا جو بہت ہی فرماں بردار ہو اور کبھی اپنی ماں کو جواب نہ دیتا ہو۔ چاہے وہ کچھ بھی کہے۔“

جس پر پانچوں بچوں نے کچھ دیر سوچا اور ایک ساتھ کہا۔ ”ابو! آپ جیت گئے... یہ کھلونا آپ کا ہوا۔“

وفادار کتا

بیوی نے اپنے شوہر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”ہمارے پاس جو کتا ہے، وہ بہت ہوشیار اور چالاک ہے۔ یہ ہر روز صبح باہر سے اخبار اٹھا کر لاتا ہے۔“

شوہر نے کہا۔ ”یہ تو ہے مگر زیادہ تر پالتو کتے یہ کام روز ہی اپنے مالک کے لیے کرتے ہیں۔“

بیوی بولی۔ ”مگر ہم نے تو کبھی بھی کسی اخبار کا بل نہیں دیا۔ یہ دوسروں کے اخبار ہمارے لیے لاتا ہے۔“

(امریکا سے جاوید کاظمی کے شگفتہ پارے)

مکافات

زویا اعجاز

بعض واقعات بڑے دل سوز ہوتے ہیں ... مدت گزر جانے کے باوجود اس کی کسک دل میں باقی رہتی ہے جیسے کہ بھارت کی تقسیم اور پاکستان کا معرضِ وجود میں آنا... کچھ لوگ مذہب کو مصلحت کی انگشتری میں نگینے کی طرح سجالیتے ہیں ... پھر وہ ہر ہدایت ... عقیدے اور انسانیت سے دور ہوتے جاتے ہیں... ان کی وجہ سے بے علم ... اور سادہ لوگ بھی راستے سے بھٹک جاتے ہیں... ایسی نظر بندی ہوتی ہے کہ جو نہیں ہوتا... وہ بھی نظر آنے لگتا ہے۔ ایک ایسی ہی قوم میں بسنے والے تماشاگر جو توہمات... بدعات... اور خرافات میں سب سے آگے ہیں ... ان کی عبادت اور تماشا ایک ہی چیز ہے ... نفرت اور بدنیتی کے بیچ پرورش پانے والی نسل کی حیلہ سازیاں ... وہ برسوں سے ایک ساتھ تھے ... ایک ہی سرزمین پر رچے بسے تھے... مگر دلوں کے بیچ ہزارہا دوریاں حائل تھیں... دہشت و وحشت زدہ ماحول میں ہونے والی کھلی قتل و غارت گری کی دردناک تصویر کشی...

پاک بھارت تناظر میں لکھی گئی تحریر کے چشم کشا تقاضے......

شام نگر میں آج رنگوں کی برسات تھی۔

ہولی کے تہوار میں سب دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے۔ موقع تھا' دستور تھا' رسم دنیا بھی تھی۔ لڑکیوں کو ہمہ وقت آنچل سنبھال کے رکھنے والی بڑی بوڑھیاں اور نوجوان لڑکوں کو اپنی جوانی کی شرافت و نظم و ضبط سے گندھی زندگی کی مثالیں دیتے رہنے والے بزرگ بھی اپنی موج مستی میں مگن تھے۔ بھنگ کے جہازی سائز گلاس' شواجگوان کے ترانوں کے علاوہ ہولی ہی سے متعلق فلمی گانوں پر رقص کرتی نوجوان نسل ایسا سنہرا

موج بھلا ہاتھ سے کیسے جانے دیتی؟ چوری چوری ملنے والی نئی نظریں دل کا احوال بتانے لگیں۔ اس تہوار میں کئی لڑکے اور لڑکیاں محبت کے بندھن میں بندھ جاتے۔ ایک دوسرے کو رنگ لگاتے محبت کی برکھا میں وہ اپنی ذات کے سب رنگ بھول جاتے۔ شام نگر کی ہندو برادری اپنے اس پسندیدہ تہوار میں مگن تو تھی ہی لیکن سکھ برادری بھی ان کی خوشیوں میں شریک ہونے اور اس دھمال چوکڑی سے لطف اندوز ہونے چلی آئی تھی۔

مغربی سمت میں تو رونقیں فزوں تر تھیں۔ چھوٹے ٹھاکر کے شہری دوست بھنگ کے بجائے ولایتی شراب لنڈھا کر بالکل جامے سے باہر ہو رہے تھے اور پھر اس سارے منظر کو ایک ان چاہی صدا نے گہنا دیا۔

مولوی امام دین مسجد میں نماز عصر کے لیے اذان دے رہا تھا۔

شام نگر کی بوڑھی نسل اگر دنیا میں کسی چیز سے سب سے زیادہ نفرت کرتی تھی تو وہ یہی صدا تھی۔ ان کا بس نہ چلتا کہ اس چھوٹی سی مسجد کو وہاں سے بالکل نابود کر دیں جہاں پہلے امام دین کا باپ دن رات یہی صدائیں لگا تا ان کے سینوں پر مونگ دلتا رہا اور اب اس کی جگہ بیٹے نے لے لی تھی۔

ان سب نے کئی بار پنچایت میں اپنے فیصلے پر عمل کرنے کی حکمتِ عملی بھی تیار کی لیکن ٹھاکر تیج پال نے ان کے سب منصوبے خاک میں ملا دیے۔ تیج پال آج سے کچھ عرصہ قبل اس نفرت کے پرچار میں پیش پیش رہتا تھا لیکن راج نیتی میں آمد کے بعد اس نے نفرت کو مصلحت کے چولے میں چھپا لیا۔ اس کا ولایت پلٹ بیٹا پڑھائی کے ساتھ گوروں سے اور بھی بہت سے گر سیکھ کر آیا تھا۔ اس نے سب سے پہلے باپ کو اپنے جذبات کا بروقت اظہار اور انہیں بطور ہتھیار استعمال سکھایا۔ انہیں مسلمانوں سے نفرت تھی لیکن لوک سبھا میں وہ ان کے ووٹوں کے بغیر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس لیے تھوڑا تحمل، منافقت کی چند تھپکیاں اور ان کے مذہبی جذبات کا وقتی احترام کرنے سے یہ لوگ ان کے دام میں بہ آسانی آجاتے۔

فضا میں گونجتی اذان کی وہ آواز ان کی سماعت کے لیے بہت بڑا امتحان تھی۔ شکتی سنگھ، ارون سنگھ اور شمشیر سنگھ تو ہمیشہ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیا کرتے۔ آج بھی انہوں نے یہی کیا۔ زیرِ لب امام دین کے لیے مغلظات بکتے وہ کسی کرب میں دکھائی دینے لگے۔

چھوٹے تالاب کے پاس اپنے چند دوستوں کے ساتھ کھڑے روپ سنگھ نے اپنے باپ کو اس حالت میں دیکھا تو اس کے ننھے سے دماغ میں کئی سوال پیدا ہونے لگے۔

"یہ باپو کیا کر رہا ہے بلو؟" اس نے شمشیر کے بیٹے سے پوچھا۔

"وہی جو میرا باپو کر رہا ہے..... لگتا ہے بڑے ٹھاکر کے گھر دیوالی والے پٹاخے آج پھر پھوڑے جائیں گے۔ اس کی آواج سے بچنے کے لیے یہ ایسا کر رہے ہیں۔" بلدیو سنگھ عرف بلو نے اندازہ لگایا۔ ان دونوں نے کبھی ایسی صورتِ حال کا سامنا نہیں کیا تھا اس لیے بہت حیران ہو رہے تھے۔

"باپو تو ایسا روج ہی کرتا ہے بھیا۔" روپ سنگھ کی بہن سندر کور نے اسے نئی اطلاع بہم پہنچائی۔

"جھر یا گئی ہے کیا سندری؟ میں نے تو پہلے کبھی نہیں دیکھا ایسے۔"

"تم گھر میں رہتے ہی کب ہو بھیا۔ اسکول کے بعد جیا دو سے تو دوستوں کے ساتھ میدان میں بتاتے ہو۔ میں تو روج دیکھتی ہوں یہ۔" آٹھ سالہ سندر کور نے معصومیت سے کہا۔

"تو نے کبھی پوچھا نہیں اپنے باپو سے سندری! وہ کیوں کرتا ہے ایسا؟" بلدیو نے تجسس سے پوچھا۔

"نا بابا نا! مجھے تو باپو سے بہت ڈر لگتا ہے۔ میں تو نہیں پوچھ سکتی اس سے کچھ۔" سندر کور سہم گئی۔

"میں پوچھوں گا آج۔ جرور پوچھوں گا۔" روپ سرسراتی آواز میں بولا۔

"ہاں! میں بھی پوچھوں گا۔" بلو بھی جوش میں آگیا۔

اذان اب مکمل ہو گئی تھی۔ بیزار اور کوفت زدہ لوگ ایک دفعہ پھر اپنی سابقہ سرگرمیوں میں مشغول ہو گئے۔ وہ سب بچے تو پہلے ہی ایک دوسرے کو تالاب میں دھکا دینے کے لیے ایک دوسرے کے پیچھے لپک رہے تھے۔ اس دوفٹ گہرے تالاب میں انہوں نے بھی رنگ گھول رکھے تھے۔

رونق اور شور وغل ایک بار پھر اپنے جوبن پر تھا۔

☆☆☆

کچے صحن میں چار پائیاں بچھی تھیں۔ موسم بہت خوشگوار تھا اس لیے شکتی سنگھ کمرے کے بجائے کھلے آسمان تلے سونے کو ترجیح دیتا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر قبل ہی بیوی سے اس کی خاصی بحث ہوئی تھی جو کئی روز سے پڑوس والے گاؤں میں اپنے میکے جانے کے لیے بضد تھی لیکن شکتی بے پروائی سے اس کا یہ مطالبہ ٹال دیتا اور آج بھی وہ بچوں کو لیے اپنے ہندو دوستوں کی خوشنودی کے لیے سارا دن باہر ہی گزار آیا تھا۔

"باپو! مجھے ایک گل کرنی ہے تجھ سے۔" دس سالہ روپ

اس کے پاس چلا آیا۔
"آ میرے شیر پتر! ایک نہیں تو سو گلاں پچھ میرے سے۔" اس نے بیٹے کو اپنے ساتھ ہی چارپائی پر لٹالیا۔
"آج تو نے چاچا شمشیر اور اروِن نے اپنے کانوں میں انگلیاں کیوں ڈال رکھی تھیں؟"
"امام دین کی آواج سے بچنے کے لیے۔" وہ منہ بنا کر بولا۔ "تو بھی ایسا ہی کیا کر۔"
"لیکن کیوں باپو؟"
"اوئے پتر! یہ مُسلے جادوگر ہوتے ہیں۔ یہ دن میں پانچ وقت منتر پڑھتے ہیں اور اپنے قابو میں کر لیتے ہیں۔ میرے ایک چاچے کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا تھا انہوں نے۔"
"وہ کیسے بھلا؟" روپ متجسس ہوا۔
"بڑا اچا لمبا شیر جوان تھا میرا چاچا۔ لیکن اس کی بدقسمتی تھی کہ امام دین کے باپ سے بڑی یاری تھی۔ بس پھر اپنا دھرم چھوڑ کر مُسلا بن گیا وہ بھی۔"
"اب کدھر ہوتا ہے وہ چاچا؟"
"پاکستان چلا گیا تھا۔ کہتا تھا ایتھے رہ کے ہندو ہمیں جینے نہیں دیں گے۔" شکتی کے لہجے میں بے پناہ نفرت تھی۔
"پاکستان وہی ہے ناں باپو! جو سبز کپڑے پہنے بھارت سے میچ کھیلتا ہے۔"
"ہاں! وہی ہے۔ ساڈا دیش ٹکڑے ٹکڑے کر دیا انہوں نے! نرک میں جلیں گے یہ۔"
"تو واپس چھین لیں اُن سے اپنا دیش! پچھلے سال راجیش نے بھی تو اپنی زمین چھینی تھی آنند سے۔" وہ اپنے معصوم ذہن کے مطابق سوال کرتا جا رہا تھا۔
"چھین لیں گے۔ وہ وقت جلد آئے گا۔ ہماری سینا اُن سے سب کچھ چھینے گی۔ میں تو تجھے بھی سینا میں بھیجنا چاہتا ہوں۔ جائے گا ناں تو؟"
"ہاں باپو! میں جرور جاؤں گا!"
"وچن دے مجھے کہ تو کبھی بھی کسی مُسلے سے یاری نہیں لگائے گا۔" شکتی نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔
"وچن دیتا ہوں۔"
"شاباش میرا شیر! جیوندا رہ۔" وہ اس کا ماتھا چوم کر بولا۔
روپ کی نظریں آسمان کے سیاہ آنچل میں پروئے موتیوں پر بھٹک رہی تھیں۔ شکتی اسے اب پاکستان کے متعلق اور بھی بہت سی باتیں بتا رہا تھا لیکن وہ تھکاوٹ سے چور تھا اس لیے جلد ہی نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح بہت سنسنی خیز تھی۔
عوامی تعطیل کی وجہ سے کوئی بھی اسکول نہ گیا اور سبھی تالاب کے پاس درختوں کے جھنڈ میں اکٹھے ہو گئے۔ روپ، بلو، وجے، نندو اور رامو بھی اسی کی طرح بہت سے انکشافات کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ کل کے واقعے نے انہیں بھی اسی طرح متجسس کیا تھا اور ان کے والدین نے شکتی سنگھ ہی کی طرح پاکستان اور مسلمانوں کے متعلق اپنی 'محبت' سے ان کے دلوں میں بھی آبیاری کر دی تھی۔
"میں نے پتاجی سے پوچھا امام دین اور اس کا باپ کیوں نہ چلے گئے اپنے پاکستان؟" وجے اب انہیں اپنی کتھا سنا رہا تھا۔
"تو کیا کہا انہوں نے پھر؟" سب بیک وقت بولے۔
"انہوں نے کہا کہ یہ یہاں پر مُسلوں کے جاسوس بن کر رہ رہا ہے۔ ہمارے دیش کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔"
"اوئے اس کی ایسی کی تیسی! میں اپنی کرپان سے اُس کا پیٹ پھاڑ دوں گا۔" بلو جوش سے چلایا۔
"نہیں بلو! ایسے تو پولیس تجھے گرفتار کر لے گی۔ میرے پتاجی نے کہا تھا ایسے کام کرو کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔" نندو عمر میں ان سب سے بڑا تھا اس لیے اس کی شرارتیں اچھی خاصی شرانگیز ہوا کرتیں۔
"کوئی پلان ہے کیا تیرے ذہن میں؟" ان سب کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔
"بالکل! ایک نہیں...... ایک سو ایک منصوبے ہیں میرے پاس!" وہ اترایا۔
اگلے ہی لمحے وہ سر جوڑے دم سادھ کر اس کا نیا منصوبہ سن رہے تھے۔

☆☆☆

آسمان پر چمکتی قندیلیں اب بجھنے کو تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں مشرق سے سورج کسی بادشاہ کی سی شان سے نمودار ہوتا اور یہ سب درباری اس کے جلووں کے سامنے ماند پڑ جاتے۔
مسجد کے دروازے سے باہر دو ہیولے پُراسرار سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ یہ بلو اور وجے تھے۔ چند قدموں کے فاصلے پر دائیں جانب روپ اور رامو چوکنے انداز میں کھڑے تھے جبکہ بائیں جانب چوکیداری نندو نے سنبھال رکھی تھی۔

وجے کے ہاتھ میں ایک باریک سی تار تھی۔ جس کی مدد سے وہ چندے کے ڈبے پر لگا تالا کھول رہا تھا۔ کھٹاک کی ہلکی سی آواز پر انہیں اپنی کامیابی کا یقین ہو گیا۔ چمکتی آنکھوں اور جوش سے لبریز چہرے اب منصوبے کی اگلی کڑی پر عمل کرنے لگے۔

چندے کے لیے موجود رقم کا صفایا بہت اطمینان سے کیا گیا۔ یہ پیسے اگلے کئی دنوں کے لیے ان کی موج مستی کے لیے کافی تھے۔ اس کام سے فارغ ہو کر وجے نے اسی پھرتی سے مسجد کے دروازے کا تالا بھی کھول دیا اور اندر داخل ہو گئے۔

نندو کی ہدایات کے مطابق انہوں نے اپنے جوتے باہر ہی اتار دیے تھے۔ اس عمل میں کسی قسم کے احترام کا جذبہ شامل نہیں تھا بلکہ وہ مسجد کے صاف ستھرے فرش پر اپنے جوتوں سے کسی قسم کا کوئی 'نشان' نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ بائیں دیوار کے ساتھ ایک ساکٹ نصب تھا جس میں مسجد کا سارا برقی نظام موجود تھا۔ ان دونوں نے تمام تاریں کاٹ دیں۔ اس کے بعد دبے قدموں چلتے وہ سیڑھیاں اوپر چڑھے اور ایک کونے میں موجود چھوٹے سے اسپیکر میں ہلکا سا تیزاب ملا پانی ڈال دیا۔

منصوبے کی مکمل کامیابی نے ان کے جسموں میں بجلیاں دوڑا دی تھیں۔ اب کچھ ہی دیر بعد مسجد کے عقب میں واقع ایک حجرے سے امام دین نے اذان دینے کے لیے آنا تھا وہ اس سے پہلے ہی وہاں سے رفو چکر ہو گئے۔

اس روز شام نگر میں پہلی بار امام دین کی منحنی آواز نے اسے بہت محظوظ کیا۔ چیدہ نمازیوں نے لالٹین کی روشنی میں نماز ادا کی۔ وہ انہیں اس فریضے کی ادائیگی سے روک تو نہ پائے تھے لیکن ان کی وقتی اذیت نے بہت شاد کر دیا تھا۔ اپنے گھروں میں روانگی کے وقت چند روز بعد کے منصوبے کی بابت وہ بہت پُرجوش تھے۔

☆☆☆

شام نگر پر رات کے سائے مسلط تھے۔ امام دین عشا کی اذان کے بعد نمازیوں کے لیے صفیں درست کر رہا تھا۔ چندے کی چوری کے باوجود مسلم آبادی نے فوری طور پر مسجد کے لیے اسپیکر اور برقی نظام کا بندوبست کر دیا تھا بلکہ وہ تو اب کسی چھوٹے موٹے جنریٹر کی خریداری پر غور بھی کرنے لگے تھے تاکہ مستقبل میں ایسی کوئی بھی شرانگیزی اذان و نماز کے عمل میں رکاوٹ نہ بن سکے۔

نندو اور روپ دو بالٹیاں تھامے درختوں کی آڑ میں جماعت شروع ہونے کے منتظر تھے۔ پندرہ منٹ بعد انہیں سر پر ٹوپیاں جمائے نمازی مسجد میں جاتے نظر آئے تو وہ چوکنّے ہو گئے۔ حسبِ روایت انہوں نے جوتیاں باہر اتار دیں۔ رامو نے سیٹی بجا کر اگلے قدم کے لیے میدان صاف ہونے کا اشارہ دیا تو وہ فوراً حرکت میں آ گئے۔

اپنے جوتے وجے اور بلو کے حوالے کرنے کے بعد انہوں پاؤں پر ایک خاص کپڑا لپیٹا اور مضبوطی سے قدم جماتے مسجد میں داخل ہو گئے جہاں سب نمازی سجدے میں موجود تھے۔ نندو نے بالٹی میں موجود مواد اُن سب پر پھینکا اور تیر کی طرح اپنی جگہ چھوڑ کے باہر دوڑ آیا۔ روپ سنگھ بھی وہاں پڑے جوتوں میں وہی مواد انڈیل چکا تھا۔ باہر نکلتے ہی انہوں نے کپڑا اتار کر بالٹیوں سمیت اندر ہی پھینکا اور نندو کے گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔

گائے کے گوبر ملے اس پانی سے وہاں پیدا ہونے والی 'تباہی' وہ خواہش کے باوجود دیکھ نہ سکتے تھے۔ ان تمام کاموں کے لیے انہیں اپنے بڑوں کی 'آشیر باد' کے ساتھ اپنی شناخت پوشیدہ رکھنے کی سخت تنبیہ تھی جسے وہ اس وقت تو سمجھ نہ پائے تھے تاہم اگلے روز ٹھاکر جج پال کے بلاوے سے اس مصلحت کے قائل ہو گئے۔

امام دین نے ان تخریبی کارروائیوں کی اطلاع بلا کم و کاست ٹھاکر کو دے دی۔ وہ اپنی نوک دار مونچھوں کو تاؤ دیتا چھوٹی چھوٹی عیار آنکھوں میں بظاہر ہمدردی سموئے اس کے دُکھ میں برابر شریک تھا۔

''فکر کیوں کرتے ہو امام دین؟ میں آج ہی سب کو پنچایت میں بلاتا ہوں۔ اس انیائے پر میں کیسے خاموش رہ سکتا ہوں بھلا؟''

''بہت شکریہ جناب! اگر بات چیت سے اس مسئلے کا حل نکل آئے تو شام نگر کے لیے یقیناً بہت بہتر ہوگا۔ ورنہ ایسی کھلم کھلا بے ہودہ اور اوچھی حرکتوں پر مسلمان بھی چپ تو بیٹھے نہیں رہ سکتے۔'' اس نے سلیقے سے اپنا مدعا بیان کیا۔

''تم چنتا نہیں کرو امام! ہم اس کا بہتر حل نکالیں گے۔ اگر تم چاہو تو مسجد کی صفائی ستھرائی کے لیے میں اپنے خاص ملازم روانہ کر دیتا ہوں۔'' مہندر پال نے باپ کے چہرے پر آنے والی سختی دیکھ کر بات سنبھالی۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے جی! ہم سب نے مل بانٹ کر اسی وقت یہ کام کر لیا تھا۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''آپ سے بہرحال انصاف کی امید ضرور رہے گی۔''

اس کی روانگی کے بعد جج پال گہری سوچ میں مستغرق

[illegible]

’’کائر نہیں ہوں میں! تمہارے ہر منصوبے میں ساتھ دیتا رہا ہوں اور مت بھولو مجھے بھی ان مسلوں سے اتنی ہی نفرت ہے جتنی تمہیں۔‘‘

’’تو پھر اب کیوں پیچھے ہٹ رہے ہو؟‘‘ رامو نے کہا۔ ’’اور یہ بس آخری مشن ہے ہمارا۔ اس کے بعد پھر پڑھائی پر دھیان دیں گے۔‘‘

روپ نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ نندو انہیں اب جزئیات سے آگاہ کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سب اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے لیکن روپ وہیں بیٹھا تالاب میں چھوٹے چھوٹے کنکر پھینکتا رہا۔

’’کیا کر رہے ہیں برخوردار؟‘‘ اس کے عقب سے ایک آواز ابھری۔ وہ چونک کر پلٹا۔ امام دین سفید بے شکن شلوار قمیص میں ملبوس کھڑا تھا۔ سر پر گول جالی دار ٹوپی اور کندھے پر رومال اس کی شخصیت پر بہت بھاتے تھے۔ اس کے جسم میں کوئی خم نہ تھا۔

’’تم سے مطلب! جاؤ اپنا رستہ ناپو!‘‘

’’میں جانتا ہوں روپ سنگھ کہ تم لوگ ہم مسلمانوں سے بہت نفرت کرتے... لیکن اگر ٹھنڈے دل سے سوچو تو ہم میں ایک رشتہ بہرحال ہمیشہ موجود رہے گا۔‘‘

’’اگر تم شیر سنگھ کی بات کر رہے ہو تو میں اس رشتے کو نہیں مانتا...... سمجھے!‘‘

’’نہیں برخوردار! میں اُن کی بات نہیں کر رہا۔ میں تو اس عظمت کی بابت تمہیں یاد دہانی کروا رہا ہوں جو اس کائنات کے ہر انسان سے جڑی ہے...... مذہب، فرقوں اور تفرقات سے قطع نظر ہم آپس میں ’انسانیت‘ کے رشتے سے منسلک ہیں۔‘‘

’’میں ان فضول باتوں کو نہیں مانتا۔‘‘

’’مان لوگے...... وہ وقت بہت جلد آئے گا۔‘‘

’’تمہاری یہ چکنی چپڑی باتیں مجھ پہ اثر نہیں کریں گی۔ شکل گم کرو اب اپنی۔‘‘ روپ تنفر سے بولا۔

’’میں تمہیں صرف اتنا کہوں گا روپ سنگھ کہ اپنے دوستوں کے ساتھ یہ سب حرکات چھوڑ دو۔ چلتی ہوائیں اور بہتی ندیوں کی روانی کوئی نہیں روک سکتا۔ تم لوگ کچھ بھی کر لو...... میری قوم کے جذبے بھی ماند نہیں کرسکو گے۔ تم جب بھی، جہاں بھی ہمیں للکارو گے...... ہم آپسی اختلافات بھول کر ایک ہوجائیں گے...... جیسے اب تم سب کی شرارتوں نے بستی کے مسلمانوں کو متحد کر دیا ہے۔‘‘ امام دین اس کی آنکھوں

تھا۔ بظاہر ان لڑکوں کے کارناموں نے اسے دلی خوشی دی تھی۔ اپنے ’خاص ملازمین‘ سے اسے ’ذمے داران‘ کی خبر بھی ہو چکی تھی۔ اس نے ان سبھی کے ’سرپرستوں‘ کو بلوا کر ان کی خوب پیٹھ ٹھونکی اور آئندہ کے لیے مزید محتاط کارروائیوں کا عندیہ بھی دے دیا۔

بڑے ٹھاکر کی اس پشت پناہی پر وہ پھولے نہ سمانے لگے۔

☆☆☆

تالاب کے کنارے ماحول میں بہت گرما گرمی تھی۔ نندو اور وجے اپنے بڑوں کی اس طلبی پر بہت سیخ پا تھے۔

’’اس مولوی کی جرأت تو دیکھو۔ ٹھاکر صاحب کے پاس جا پہنچا۔‘‘ وجے نے تلملا کر کہا۔

’’یہ ساری ڈھیل خود ٹھاکر ہی کی تو دی ہوئی ہے۔ جب سے چھوٹا ٹھاکر ولایت سے آیا ہے، وہ ان مسلمانوں کو کچھ بھی کہنے نہیں دیتا۔‘‘ نندو نے درست قیاس کیا تھا۔ ان کے اس طیش اور تلملاہٹ کی اصل وجہ یہ تھی کہ گاؤں کے چند نوجوانوں نے رات کے وقت مسجد کے باہر باری باری پہرا دینے کی ذمے داری اٹھا لی تھی۔ مشتاق سبزی فروش نے نہر کے پاس اپنے پھلوں اور سبزیوں کا ٹھیلا اٹھا کر مسجد کے سامنے لگا لیا۔ اس چوبیس گھنٹے کی چوکیداری نے ان کے سیکڑوں منصوبے خاک میں ملا دیئے۔ ان کا بس چلتا تو امام دین کی ہستی کو شام نگر سے نابود کر دیتے جس کی جادوگری کی بدولت کئی لوگوں نے اپنا آرام وسکون تج دیا اور وہ کامیاب ہونے کے باوجود ناکام ٹھہرے تھے۔

’’اچھا! اب جو ہوا سو ہوا...... تھوڑا سے ان گلی باتوں کو بھول جاؤ اور پڑھائی پہ دھیان دے لو۔‘‘ روپ سنگھ سنجیدگی سے بولا۔

’’ایسے کیسے چھڈ دیں روپ!‘‘ بلو نے کہا۔ ’’بدلہ تو لیں گے ہم۔‘‘

’’میرے پاس ایک بڑا دھانسو آئیڈیا ہے۔ بس جرا ہمت کرو تم لوگ۔‘‘ نندو نے اپنی آنکھیں گھمائیں۔

اگلے چند لمحوں میں اس نے اپنے ذہن میں پنپتے شیطانی خیال کی تفصیل اپنے ساتھیوں کے گوش گزار کر دی۔

’’نہیں نندو! یہ جیادتی ہے۔ ایسا کچھ طے نہیں ہوا تھا پہلے۔‘‘ روپ بدک گیا۔

’’اوئے چپ کر جا تو۔ جیادہ مہان بننے کی جرورت نہیں۔‘‘ وجے غرایا۔

’’اس کا نام روپ نہیں روپا ہونا چاہیے تھا۔ کائر کہیں

میں ہاتھ صاف کر سنبھالا۔

"چھپا گیا ہے تو۔ میں تیرے منہ نہیں لگنا چاہتا۔" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر چل دیا۔

اس مختصر ملاقات اور امام دین کی ان سب باتوں سے آگاہی جان کر وہ نندو کے منصوبہ پر عمل کرنے کے لیے مکمل تیار ہو گیا۔

☆☆☆

گرمی اور حبس نے ہر سُو ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ وہ پانچوں شام نگر کی بیرونی سڑک کے کنارے لگے دو رُویہ درختوں کی شاخوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ امام دین صبح کی نماز کے بعد شہر روانہ ہوا تھا اور وہ جانتے تھے کہ دوپہر سے قبل وہ بہر صورت لوٹ آئے گا۔

انتظار کی گھڑیاں زیادہ طویل ثابت نہ ہوئیں۔ وہ بس سے اترا اور مضبوط قدموں سے چلتا اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کی صحت اس بڑھاپے میں بھی قابلِ رشک تھی۔ نندو نے طے شدہ منصوبے کے مطابق اپنی غلیل سے اس کی دائیں ران پر نشانہ لگایا۔ درحقیقت وہ اس کی ٹانگوں، بازو اور کندھوں کو نشانہ بنا کر اسے کسی دائمی معذوری کا تحفہ دینا چاہتے تھے۔ لیکن اسی پل امام دین کا پاؤں ہلکا سا رپٹ گیا اور وہ دائیں جانب جھک گیا۔

اس بے وقت جھکاؤ نے ان سبھی کے نشانے خطا کر دیے۔ نندو کی طرف سے پھینکا جانے والا پتھر ران کے بجائے زیرِ ناف جا لگا۔ وجے، بلو اور رامو کے کندھوں پر کیے جانے والے وار پوری قوت سے اس کا سر کھول گئے۔ روپ سنگھ کا نشانہ اس کے گھٹنے کی ہڈی توڑ گیا۔

چند سیکنڈوں میں ساری صورتِ حال یکسر تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ اپنے مورچوں سے بدک کر نکلے اور واپس گاؤں کی جانب دوڑ لگا دی۔ امام دین کے سر سے بہنے والا لہو اس کا چہرہ رنگین کر رہا تھا۔ اس کی نظروں سے جھلکتے کرب اور بے بسی نے روپ سنگھ کے قدم ساکت کر دیے اور وہ بے اختیار اس کے قریب چلا آیا۔ اس کے لہو رنگ ہونٹوں سے باآواز بلند کچھ کلمات برآمد ہونے لگے۔ روپ جانتا تھا کہ یہ اس کی مذہبی کتاب کے الفاظ ہیں۔ اس نے فلموں میں کئی مسلم کرداروں کو مرتے وقت اسی طرح کے الفاظ بولتے بہت دفعہ سنا تھا۔

امام دین کے چہرے پر اب ایک سکون آمیز کیفیت جھلک رہی تھی۔ اس کی بوڑھی آنکھیں روپ کی نظروں میں دور تک جھانکنے لگیں۔

"اس وقت کا انتظار کرو بس روپ سنگھ!" اس کے لبوں سے سرسراتی صدا اٹھی اور سر ایک جانب ڈھلک گیا۔

وہ کرب، بے بسی، مسکراہٹ اور الفاظ اس کے ذہن پر نقش ہو گئے۔ اس کا دل چاہا اپنے کپڑے پھاڑ کر چہرے اور جسم پر بھبوت مَل لے اور دور جنگلوں میں بھاگ جائے لیکن یہ کیفیت بھی لمحاتی ثابت ہوئی۔ وہ نفرت سے اسے ٹھوکر مارتا وہاں سے واپس لوٹ گیا۔

☆☆☆

امام دین کی موت پر اُن میں سے کسی کو بھی رتی بھر ملال یا افسوس نہ تھا۔ عقلمندی کا مظاہرہ کرتے انہوں نے اپنے اس کارنامے کی خبر گھر میں بھی کسی کے گوش گزار نہ کی اور حرفِ غلط کی طرح سب کچھ فراموش کر کے اپنی پڑھائی میں مگن ہو گئے۔

شام نگر کی مسلم آبادی نے اس حادثے پر بہت واویلا مچایا لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز بھلا کسی نے سنی ہے؟ امام دین لاولد تھا۔ مسجد میں اس کی جگہ ایک اور عمر رسیدہ شخص مہر داد نے لے لی اور زندگی ایک بار پھر اپنے معمول پر آ گئی۔

شرارتیں اور شر انگیزی جاری رکھے روپ نے میٹرک کے امتحان میں بہت اعلیٰ نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔ وہ بلاشبہ بہت ذہین لڑکا تھا۔ ایک بار کہیں بھی سنی یا پڑھی ہوئی بات اس کے دماغ میں ہمیشہ کے لیے نقش ہو جاتی۔ زرخیز ذہن اب باتوں کی گہرائی میں جا کر سوچنے کی صلاحیت سے بھی مالا مال تھا۔ اس کے بچپن کی وہ ٹولی بھی اپنی اپنی زندگیوں میں خوب مگن تھی۔ نندو اور بلو نے آرٹس کالج میں داخلہ لے لیا۔ رامو وکیل بننا چاہتا تھا جبکہ وجے سول انجینئرنگ کے لیے جی جان سے کوشاں رہتا۔

عمر بڑھنے کے ساتھ ذمے داریوں میں اضافہ ہوا تو جیون کی ریل بہت رفتار سے دوڑنے لگی۔ بچپن تو بہت پہلے کسی جنکشن پر چھوٹ گیا تھا۔ اب تو محض اپنی بقا اور مستقبل محفوظ کرنے کی ایک میراتھن دوڑ جاری تھی جو آخری سانس تک رک ہی نہ سکتی تھی۔ رکنے کی صورت میں کچلے جانے کے خطرات سے بھی وہ بخوبی آگاہ تھے۔

کھیت کھلیانوں میں بے فکری سے لکن میٹی کھیلنا، غلیل سے چڑیوں کے نشانے لگانا اور شرط لگا کر بنٹے کھیلنا بھی کبھی پچھلے جنم کا کوئی قصہ معلوم ہونے لگتا تھا۔ ان کی شرارتوں کی مسند اب شام نگر کی نئی نسل نے سنبھال لی۔ وہ ان سے زیادہ جوشیلے اور دلیر تھے اور ان ہی کی طرح مسلم بچوں کا ناطقہ بند کرنا بھی سب کا محبوب مشغلہ تھا۔ مسلمانوں اور پاکستان سے

نفرت و دشمنی ایک اثاثے کی طرح سینہ بہ سینہ منتقل ہوئی تھی اور اب اس کا ماخذ اپنے اصل سے کئی گنا بڑھ چکا تھا۔

میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد شکتی سنگھ نے گاؤں بھر میں لڈو بانٹے اور اس سے ایک بار پھر فوج میں شمولیت کا وعدہ لیا۔ شام نگر میں فوجی کے والدین کی بہت عزت کی جاتی تھی اور اس گھر کی بیٹیوں کے رشتے بھی بہت چاؤ سے لیے جاتے۔

روپ سنگھ نے امرتسر کے ایک 'ہری سنگھ کالج' میں داخلہ لے لیا اور یہاں اسے اپنے 'پڑوسی ملک' کی بابت بہت سے انکشافات نے دنگ کر دیا۔ کالج کے اساتذہ گاہے بگاہے ان کے سیاسی نظریات کی 'ٹیوننگ' کرتے رہتے اور انہیں بھی پوشیدہ حقائق سے آگاہ کرنا بھی اپنا فرض سمجھتے۔

"یہ ان لٹیروں کا دیش ہے جو ہمارے خزانوں پر سانپ بن کر ہزاروں سال بیٹھے رہے۔ صدیوں پہلے یہاں محمود غزنوی آیا جس نے ہمارے مندر تباہ کر کے بھگوان جی کی مورتیاں بھٹی میں پگھلا کر اپنی مسجدوں کی سیڑھیاں اور دہلیزیں بنالیں۔ ہمارے دیش کے ٹکڑے کر دیے گئے۔ ہم سے علیحدہ ہوتے ہوئے ان کا تکبر آکاش کو چھوتا تھا لیکن یہ کبھی بھی اپنا دیش سنبھال ہی نہ پائے۔ آج ان کے ہاں آئے روز بم بلاسٹ ہوتے ہیں تو کبھی کوئی آفت ان پہ ٹوٹ پڑتی ہے۔ یہ سب ہمارے پرکھوں کا شراپ ہے جو انہیں کبھی خوش نہ رہنے دے گا۔" ان کا جوشِ خطابت سب لڑکوں میں ایک نئی روح پھونک دیتا۔ وہ فوج میں جلد از جلد شمولیت کے لیے مچلنے لگتے۔

کالج کے پہلے سال کے امتحان ختم ہوئے تو وہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ بارڈر پر ہونے والی پریڈ دیکھنے کے لیے روانہ ہو گیا۔ تمام لڑکے اپنی آنکھوں سے اس پریشانی' ملال اور بے بسی کو مجسم دیکھنا چاہتے تھے جس کا نقشہ ان کے اساتذہ نے ہمیشہ کسی خوابناک منظر کی طرح تراشا تھا۔

بارڈر پر دھکم پیل کے باعث وہ ایک ساتھ تو نہ بیٹھ سکے لیکن اس صورتِ حال کا فائدہ یہ ہوا کہ روپ سنگھ کو بالکل اگلی نشستوں میں جگہ مل گئی۔ یہاں سے سرحد پار کے رہائشی واضح نظر آ رہے تھے۔ وہ گہری نظروں سے انہیں دیکھتا اپنے ذہن میں موجود خاکے سے موازنہ کرتا رہا۔

اساتذہ کے بتائے گئے اور فلموں' ڈراموں میں دکھائے گئے مسلمان فوجی بے چین طبیعت' حاسد نگاہوں اور مضحکہ خیز حرکات کے مالک ہوتے تھے جبکہ یہاں نظر آنے والے رینجرز میں ان خصوصیات کا کہیں کوئی شائبہ نہ تھا۔ ان کے بارعب چہرے چٹانی ارادوں کی حامل نگاہیں اور تنے ہوئے جسم دیکھ کر وہ لاشعوری طور پر کسی دباؤ کا شکار ہونے لگا۔

"رینجرز کا یہ عالم ہے تو فوجی کیسے ہوں گے ان کے؟" اس کے ذہن میں ایک سوال ابھرا تھا۔

یہاں سے مایوس ہو کر اس نے اپنی نظریں عوام پر گاڑ دیں۔ اسے ہر عمر کے لوگ دکھائی دیے۔ ذہن میں فوری طور پر اپنے میڈیا پر دکھائی جانے والی دکھی' بے بس نگاہوں اور آزردہ چہروں والی لڑکیاں گھوم گئیں جن کے سر تو ڈھکے ہوتے تھے لیکن ان کا سینہ اس دوپٹے سے بے نیاز ہوتا۔ اب اس کے سامنے موجود لڑکیاں سلیقے سے چادر اوڑھے یا نقاب میں ملبوس تھیں۔ چند ایک نے مغربی لباس بھی زیب تن کر رکھا تھا لیکن ان سبھی کی آنکھوں' چہروں اور حرکات و سکنات میں اعتماد و وقار کی جھلک نمایاں تھی۔

کچھ یہی حال نوجوان لڑکوں کا تھا۔ اسے کہیں بھی سرمہ بھری آنکھوں' میلی نظروں' لفنگے انداز اور وطن سے بیزاری ظاہر کرتے تو جوان دکھائی نہ دیے۔ بے بس' لاچار' آزردہ بوڑھوں کی جگہ خوش باش' چمکتے چہروں والے باوقار لوگ بیٹھے دیکھ کر وہ پہلی بار مایوسی اور غصے کی ملی جلی کیفیت کا شکار ہوا تھا۔

"عجیب لوگ ہیں یہ! اتنا کچھ سہتے ہیں اپنے دیش میں...... پھر بھی کیسی بے فکری اور اطمینان سے بیٹھے ہیں......" اس نے خود کلامی کی۔

☆☆☆

نفرت و عزم کا یہ سفر یونہی جاری رہا اور کچھ سالوں بعد روپ سنگھ فوج میں بھرتی ہو گیا۔

وہ دن شکتی سنگھ کے لیے کسی تہوار سے کم نہ تھا۔ اس کا برسوں پرانا خواب مجسم تعبیر اس کے سامنے موجود تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک گئے۔

"کیوں روتا ہے باپو؟ تجھے تو خوش ہونا چاہیے اب۔" اس نے بڑی محبت سے کہا۔

"بہت خوش ہوں میرے شیر پتر! اب مینوں چنتا کی کیا لوڑ؟ بس تو کیول اپنا وچن یاد رکھنا...... اساں کا بچھڑا ہوا دیش جرور واپس لے کے آنا۔" بوڑھے شکتی سنگھ کی آرزو آج بھی برقرار تھی۔

"وچن دیتا ہوں......" اس نے مسکرا کر باپ کو اپنے چوڑے سینے میں بھینچ لیا۔

"اب میں اپنے چن پتر کے لیے پنڈ کی سب سے سوہنی کڑی کو نوہہ (بہو) بنا کے لاؤں گی۔ ایسے ڈھول

دشمنوں سے بیاہ کروں گی روپ کا...... کہ سالوں تک تمام عمر بھول نہ پائے گا۔" اس کی ماں نے اپنے ارادے ظاہر کیے تو اس کے دل میں ایک گدگداہٹ سی ہونے لگی۔

"جیسے تیری اچھا ہے بے!" اس نے ماں کا سر چومتے ہوئے سعادت مندی سے کہا تو وہ نہال ہو گئی۔

"ابھی سندر کور کے لیے بھی ایک دو وڈے چنگے رشتے موجود ہیں۔ اگلی واری جب تو آئے گا تو اس کے بیاہ سے بھی فارغ ہو جائیں گے۔" شکتی نے بتایا۔

"ٹھیک ہے باپو! کسی قسم کی کوئی کمی نہ رہے میری بھین کو بس! پیسوں کی بھی کوئی چنتا مت کرنا۔" اس کے دل میں بہن کے لیے بے پناہ محبت تھی۔

شکتی سنگھ مان اور شفقت سے اس کی پشت تھپکتا کمرے میں چلا گیا اور وہ یونہی ہوا خوری کے لیے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

جیپ ایک فوجی عمارت کے باہر آ کر رکی تو تین افراد سوچتی نگاہوں اور ماتھے پر بل لیے اترے اور مخصوص فوجی چال چلتے عمارت میں داخل ہو گئے۔ ان کے بشروں سے بے چینی اور تجسس بھی جھلکنے لگا لیکن وہ شعوری کوشش کے تحت اسے دبا لیتے۔

یہ لانس نائیک روپ سنگھ اور اس کے دو ساتھی موہن داس اور آکاش شرما تھے۔

گزرے چند سالوں میں روپ کی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں آئی تھیں۔ سندر کور کے بعد اس کی شادی بھی ارون سنگھ کی بی۔ اے پاس بیٹی سے ہو گئی۔ جو بہت خوبصورت سمجھ دار اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی جس نے صحیح معنوں میں اس کا گھر ایک جنت بنا دیا۔

ذاتی زندگی کے برعکس اس کا قومی اور بین الاقوامی جیون ایک بھونچال کی زد میں تھا۔ ملک میں ایک نئی حکومت نے باگ ڈور سنبھالنے کے بعد 'پڑوسیوں' کے لیے عرصہ حیات تنگ کرنا شروع کر دیا۔ حکومتی پارٹی کو کئی اور ممالک کا 'آشیر باد' بھی حاصل تھا اس لیے اب وہ کھل کر کھیلنے میں مگن تھے۔ اس پڑوسی ملک کی سب سے بڑی دکھتی رگ، 'کشمیر' کی وہ ریاست تھی جسے بھارت بہر صورت اپنے قبضے میں رکھنے پر مصر تھا جبکہ دوسری جانب وہ بھی اس کے 'حقِ ملکیت' سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھے۔

سالہا سال سے جاری اس کشمکش نے اب ایک حتمی موڑ لے لیا۔ حکومت نے ایک خاص مقصد کے لیے منتخب فوجیوں کو ہیڈ کوارٹر میں طلب کرنے کا حتمی فوجی ہائی کمان کے سپرد کیا۔ روپ سنگھ بھی اسی طلبی پر وہاں آیا تھا۔

کانفرنس ہال کی فضا کافی تناؤ زدہ تھی۔ وہاں موجود دیگر افسران... صورت حال کی سنگینی سے آگاہ تھے۔ انہیں ایک ایسی جگہ پر تعینات کیے جانے کا امکان تھا جہاں ملک کا سب سے بڑا ادارہ نصف صدی گزرنے کے باوجود مٹھی بھر باغیوں کو کچلنے میں ناکام رہا تھا۔

سربراہی کرسی پر میجر رام سنگھ اپنی تنگ پیشانی پر گہری تیوریاں لیے موجود تھا۔ اس نے اپنے سامنے موجود درجنوں افراد پر گہری نظر ڈالی اور چند لمحاتی توقف سے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"سمے آ گیا ہے کہ اب ناسور کی طرح اس وادی میں موجود باغیوں کا مکمل خاتمہ کر دیا جائے۔ ان کی کمر تو ہماری سینا پہلے ہی توڑ چکی ہے۔ اس گرتی ہوئی دیوار کو ایک آخری دھکے کی ضرورت ہے۔ آپ سب کو وہاں مقامی افراد کے سرحد پار رابطوں کی کھوج کے علاوہ پہلے سے موجود جوانوں کے ہاتھ مضبوط کرنے ہیں۔"

"سر!" تمام افسران بیک وقت بولے۔

"یہ مشن بہر صورت مکمل کرنا ہے جوانو! پاکستانی حکومت ہماری سینا کے خلاف بہت زہر اگل رہی ہے۔ ہائی کمان کے بہت سخت آرڈر ہیں کہ یہ وار ان پر ہی پلٹ دیا جائے۔ اس لیے کسی بھی سستی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس وادی کے ہر مسلمان کی سانسیں چھین لینی ہیں۔ ان کی نسل کا مکمل خاتمہ کرنا ہے۔"

"سر!" سب نے کھڑے ہو کر اپنی اطاعت و رضامندی کا یقین دلایا۔

"اوکے جنٹل مین! یو مے گو ناؤ! باقی تفصیلات آپ سب کو آج شام مل جائیں گی۔" رام سنگھ نے میٹنگ برخاست کر دی تو وہ سیلوٹ کرتے وہاں سے رخصت ہو گئے۔

روپ سنگھ اس مشن کے لیے بہت پر جوش تھا۔ کشمیر کے متعلق اس کی معلومات صرف ٹی وی اور اخبارات تک ہی محدود تھیں اور اب اس کی لازوال خوبصورتی کے ساتھ وہاں موجود مسلمانوں کے خلاف اس مشن نے اس میں نئی روح پھونک دی۔

وہ بمشکل ایک ہفتے کی مختصر چھٹی پر گھر آیا تھا۔ اہل و عیال بھی اس ذمے داری پر بہت مسرور تھے۔ شکتی سنگھ نے اس کی خوب پیٹھ ٹھونکی۔

"وڈا چنگا موقع ملا ہے تجھے روپے! اپنے دیش کا مان

رکھنا اور ان مسلوں کو وہاں سے باہر نکال کے ہی واپس لوٹنا!"

"ہاں باپو! ایسا ہی کروں گا۔ تو چنتا کیوں کرتا ہے؟" وہ سرشاری سے بولا۔

جوہی البتہ قدرے اداس محسوس ہوتی تھی۔ وہ رومانوی اور دھیمے مزاج کی لڑکی تھی جو ایک فوجی کی زندگی سے ہم آہنگ ہو کر بھی کہیں نہ کہیں اپنی زندگی میں ایک خلا محسوس کرتی۔ وہ امید سے تھی اس لیے شوہر کو وقت بے وقت اپنے پاس دیکھنے کی فطری خواہش کے ہاتھوں مغلوب ہونے لگی۔

"سنا ہے جی کہ کشمیر کی لڑکیاں بہت سندر ہوتی ہیں۔" واپسی سے ایک رات قبل وہ کھوئے ہوئے لہجے میں کہنے لگی۔

"ہاں! سنا تو میں نے بھی یہی ہے! اب جا رہا ہوں تو دیکھ بھی لوں گا۔" وہ اس کا اشارہ سمجھ گیا تھا اس لیے شرارت سے بولا۔

"بس دیکھنے کی حد سے آگے مت جائیے گا...... ورنہ ......"

"ورنہ کیا مادام؟"

"میں باپو سے کہہ کر آپ کا شام نگر سے کورٹ مارشل کروا دوں گی۔" وہ انگلی اٹھائے تنبیہ کرنے لگی۔

اس کی بے ساختہ دھمکی پر روپ کے لیے ہنسی ضبط کرنا محال ہو گیا۔

☆☆☆

روپ کی پوسٹنگ اننت ناگ میں ہوئی۔ اس تاریخی تجارتی اور قدیم شہر میں آمد سے وہ بہت خوش تھا۔ اپنی نئی ذمے داریاں اسے بہت پسند آئی تھیں۔ بچپن سے ورثے میں ملا ایک قرض چکانے کا موقع اب آ گیا تھا۔

وہ مقامی آبادی کی بغاوت اور سوچ بچار کے بارے میں بہت سے تصوراتی خاکے تراش لایا تھا۔ انہیں اپنے 'جرم' کی قرار واقعی سزا دینے کے لیے اس کا جوش آسمانوں کو چھو رہا تھا۔ اس وادی کی خوبصورتی نے اسے اس قدر مسحور کر دیا تھا کہ وہ یہاں 'حقِ ملکیت' کا دعویٰ کرنے والوں سے مزید نفرت کرنے لگا۔

'بہاروں' کے اس شہر میں آمد کے بعد جانے کیوں اُسے فضاؤں میں بہار تو کہیں دکھائی ہی نہ دیتی۔ اس کے حواس وہاں محض خزاں رسیدگی محسوس کرتے۔ ہواؤں میں خاموشیوں کا بسیرا تھا۔ عجب اداسی کا موسم تھا جو اسے ٹھہرا ہوا محسوس ہوتا۔ ایسا سناٹا اور اداسی اسے بچپن میں اپنے دادا اور دادی کی وفات کے بعد شام نگر میں ہر سو چھائی نظر آئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ موت کی رتھ بے آواز قدموں سے آتی ہے مگر اپنی روانگی کے بعد گرد و پیش کی ہر شے میں نادیدہ کراہیں اور آنسو چھوڑ جاتی ہے جو اس کی موجودگی کا نقارہ ہوتے ہیں۔ اننت ناگ میں ان آنسوؤں کی نمی اس کے دل میں سیلن پیدا کرنے لگی لیکن اس نے یہ احساس خود پر حاوی ہی نہ ہونے دیا۔ بصورت دیگر اس کے 'ہتھیار' کند ہونے میں دیر نہ لگتی۔

آرمی میس کا ماحول اسے قدرے پُراسرار لگا۔ نو بھرتی شدہ اہلکاروں میں اسے اپنے جیسا جوش و جذبہ جھلکتا دکھائی دیتا تاہم سینئر اہلکار بیزاری اور چڑچڑاہٹ کا شکار نظر آتے۔ خاموشی نے ان کا وجود ڈھانپ رکھا تھا۔ سرد خاموش نگاہیں اکثر خلاؤں میں جانے کیا تلاشتی رہتیں۔ روپ سنگھ کسی بڑے معرکہ کا منتظر تھا۔ ایسا معرکہ جو اس کی رگوں میں پارے کی طرح مچلتی نفرت اور ابلتے لہو کی تسکین کا سامان کر سکے اور بالآخر یہ موقع اسے مل گیا۔

☆☆☆

وہ جمعے کا روز تھا۔

رات کی ہلکی بارش کے بعد سورج کی کرنیں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ انہیں ہائی کمان کی جانب سے بہت چوکنے رہنے کا حکم تھا۔ وادی میں کئی روز سے کرفیو نافذ تھا۔ ایک جوان 'باغی' کی موت کے بعد مقامی لوگوں کے جذبات بے قابو تھے۔ وہ آئے روز احتجاجی ریلیاں نکالتے اور زخمی ہو کر پلٹ جاتے لیکن اپنی ضد سے ایک انچ پیچھے ہٹنے کو تیار نہ ہوتے۔

اس روز انہیں ان افراد کو مسجدوں میں نماز کی ادائیگی سے کسی بھی صورت روکنا تھا۔ مسجدوں کے دروازوں پر قفل بندی تھی اور ہر عمارت پر کم از کم چار افراد کا پہرا بٹھا دیا گیا۔ روپ سنگھ اس ساری صورتِ حال سے بہت مطمئن اور سرشار تھا۔ یہ کھیل تو وہ بچپن میں اپنے دوستوں کے ساتھ بھی کھیلتا رہا تھا۔ تب اسے کامل فتح نصیب نہ ہوتی تھی کیونکہ کم عمری اور اختیارات میں کمی ان کی راہیں کھوٹی کر دیتی لیکن آج معاملہ بہر حال مختلف تھا۔ آج اس کے پٹھوں میں جوانی کا جوش موجود تھا اور ہاتھوں میں اس دنیا کی سب سے طاقتور شے...... ٹھنڈے لوہے کا پُرحدت لمس اس کے لہو میں سنسناہٹ پیدا کرنے لگا۔

"آج اس کھیل میں جیت ہر صورت میری ہو گی۔" سامنے سے نمودار ہوتے ایک جمِ غفیر کو دیکھ کر اس نے خود کلامی کی۔

سڑک پر خار دار تاروں سے رستہ مکمل بند تھا۔ ہجوم کی

پیش قدمی بالآخر ایک مقام پر آ کر رک گئی۔ پہلی رو میں چند عمر رسیدہ اور جہاندیدہ افراد موجود تھے جو بہت تحمل سے فوجی اہلکاروں کو نماز جمعے کی ادائیگی کے لیے راستے کھولنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ فوج ٹس سے مس نہ ہوئی۔ انہیں بہر صورت یہ اجتماع روکنے کا حکم تھا سرتابی ممکن ہی نہ تھی۔

وقت گزرنے پر اب ہجوم میں بے چینی اور اضطراب کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ نوجوانوں کے چہروں سے چھلکتا خون ابلنے کو بے تاب تھا۔ انہوں نے پوری قوت سے باڑ دھکیلی لیکن آگ اگلتے ہتھیاروں کے سامنے کوئی تدبیر کام نہ آئی۔ وہ بارود کے نشان جسموں پر سجائے گرتے رہے۔ آنکھوں میں نفرت اور چہروں پر چھایا عزم اب بھی جوں کا توں برقرار تھا۔

روپ سنگھ بھی ایک مسجد کے باہر تعینات تھا۔ بغلی گلی سے ایک گروہ برآمد ہوا اور دیوانہ وار ان سے بھڑ گیا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی رائفل سیدھی کی اور اندھا دھند ان پر فائرنگ شروع کر دی۔ ان کے جوابی وار سے اس کے تینوں ساتھی کام آ گئے۔ لیکن وہ ڈٹا رہا۔

''آج کوئی یہاں پر اپنے کانوں میں انگلیاں نہیں ٹھونسے گا۔ آج مرو گے تم سب کے سب۔'' وہ حقارت سے دہاڑتا انہیں خون میں نہلاتا رہا۔

چند ہی لمحوں بعد اس کے سامنے لاشوں کا ایک ڈھیر موجود تھا۔ اس کے حلق سے قہقہے ابلنے کو بے تاب تھے لیکن پھر ایک صدا نے ان قہقہوں کو بے موت مار دیا۔ اس ٹولے نے دانستہ خود سے الجھا کر چند نوجوانوں کو مسجد کی عقبی سمت سے چھت پر پہنچا دیا تھا۔ اور اب ایک سرپھرے نے اذان کی صدا بلند کر دی تھی۔ روپ سنگھ کرنٹ کھا کر پلٹا اور بھاگتا ہوا عقبی جانب چلا گیا۔

چھت پر ایک سرخ چہرے والا انیس بیس سالہ باریش لڑکا اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھے اذان دے رہا تھا۔ اس کے گلے کی پھولی ہوئی نیلی رگیں اسے واضح نظر آ رہی تھیں۔ روپ نے اپنی رائفل سنگل شاٹ پر سیٹ کی اور اس کے حلق کا نشانہ لے کر فائر کھول دیا۔ لہو کا ایک فوارہ فضا میں اچھلا اور اس کی زبان خاموش ہو گئی۔

ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر کے بغیر دوسرے لڑکے نے اس کی جگہ سنبھال لی اور وہیں سے اذان شروع کر دی۔ روپ تلملا کر رہ گیا۔ اس لڑکے پر اس نے تین فائر چلائے لیکن بے سود۔ وہ فائرنگ کرتا رہا، چھت کی منڈیر کی اوٹ میں بیٹھے نوجوان ایک کے بعد اٹھتے اذان مکمل کرتے رہے۔ جب تک روپ نے خود چھت پر پہنچ کر ان سب کا صفایا کرنے کا ارادہ کیا۔ اذان اپنی تکمیل تک پہنچ گئی۔

امام دین کی قوم کے لونڈوں نے ایک بار پھر اسے شکست دے دی۔ غصے اور کرودھ سے وہ اپنے حواس کھونے لگا۔

☆☆☆

یہ وادی ہی لہو رنگ تھی۔

اس کا ہر گوشہ جبر کے تسلط میں جکڑا ہوا تھا۔ انسانیت کی دھجیاں سرِعام اڑائی جاتیں۔ ابلیسیت دیوانہ وار یوں رقص کرتی کہ کائنات کی ہر شے ششدر رہ جاتی۔ سیکڑوں جوان تفتیش کے بہانے عقوبت خانوں میں پہنچا دیے جاتے جس کے بعد وہ صرف زندگی سے ناتا توڑ کر ہی وہاں سے نکل پاتے۔ احتجاجی مظاہروں میں زخمی ہونے والے مقامی افراد کو روپ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر کئی بار اسپتالوں اور دوا خانوں میں حتیٰ کہ آپریشن تھیٹرز میں موت کے گھاٹ اتارا۔ لہو کی چاٹ نے انہیں درندگی عطا کر دی تھی اور اس نئے 'عہدے' پر وہ پھولے نہ سماتے۔

عورت اس خطے کی سب سے ارزاں مخلوق تھی۔ سرو قد، قندھاری رخسار، جھیل سی گہری آنکھیں اور دمکتا روپ ان سب کی مرغوب غذا تھی۔ وہ بن پیے ہی مدہوش ہونے لگتے۔ جنس کا دیو آزادانہ گلی کوچوں میں گھومتا۔ روپ سنگھ نے بھی چند ماہ میں ہی اس دیو کی طاقت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔ وہ لوگ بے دھڑک کسی بھی گھر میں گھس جاتے اور بلا تخصیص ہر عمر کی خواتین کی بے حرمتی کرتے۔ روپ اس 'کارِ خیر' کے بعد انہیں زندگی کی قید سے آزاد کر دیا کرتا تھا۔ اس کے پیشِ نظر محض ایک ہی مقصد تھا۔ وہ اس وادی کو عورتوں کے معاملے میں بنجر بنا دینا چاہتا تھا تاکہ وہ کوئی اور 'امام دین' پیدا نہ کر سکیں۔

یہاں اسے ہر سو امام دین ہی نظر آیا کرتے۔ بچے 'بوڑھے' جوان 'عورتیں اسی کا پرتو تھے اور اب وہ ان کی ہلاکت کے بغیر چین سے سانس بھی نہ لے سکتا تھا۔

☆☆☆

آگ اور خون کا یہ کھیل ایک نامعلوم مدت سے جاری تھا۔

انا اور طاقت کے گھمنڈ کی یہ جنگ کئی نسلیں اجاڑ چکی تھی۔ ہر روز ان گنت جنازے اٹھتے۔ ہر گھر قبرستان تھا لیکن اب بھی مظلوم کے دل سے آزادی کی تڑپ ختم ہو پائی تھی نہ ظالم کے دل سے جبر کی تمنا۔

روپ سنگھ کے اعصاب پر بھی تھکاوٹ سی طاری ہونے لگی۔ اسے اب سمجھ آرہا تھا کہ آغاز میں یہاں پہلے سے موجود اہلکار خاموشی اور بیزاری کا شکار کیوں تھے۔ وہ بھی اسی کی طرح اپنا جوش و جذبہ رائگاں جاتے دیکھ کر اس کیفیت میں مبتلا ہوئے ہوں گے۔

''میں ان سے کبھی ہار نہیں مانوں گا.......... ماروں گا یا مرجاؤں گا۔'' وہ روزانہ یہی اعادہ کرتا۔

آرمی بیس کے ہیڈ کوارٹر میں کچھ روز سے ایک نئی ہلچل دکھائی دینے لگی تھی۔ فوجی اہلکاروں کو ایک نئی طرز کی بندوق کی حوالگی کی شنید تھی۔ موہن داس ایک روز اسے اپنے فون سیٹ کی مدد سے اس جدید گن کا ماڈل اور فیچرز دکھاتا کافی پرجوش تھا۔

''دیکھ لینا روپ سنگھ! ان کے دوئیں دوئیں سے آزادی کا لفظ ہی مٹادے گی یہ گن۔'' وہ اعتماد سے بولا۔

روپ خالی اور ویران نظروں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

''کیا یہ بندوقیں وہ کام کر دیں گی۔ جو یہ.......... نہ کرسکیں۔'' اس نے ایک غلیظ گالی دی۔

''کیا ہوگیا ہے تجھے؟ ہوش کر۔'' موہن اس کے لہجے سے بوکھلا گیا۔

''سچ کہہ رہا ہوں یار! تجھے یاد ہے میجر رام سنگھ نے ہمیں یہاں بھیجتے ہوئے کیا کہا تھا۔ یہی ناں کہ ان کی کمر توڑ دی گئی ہے...... بس یہ گرتی ہوئی دیواریں ہیں جنہیں کیول ایک دھکے کی ضرورت ہے۔''

''ہاں! مجھے یاد ہے۔'' موہن الجھ گیا۔

''تو ہم کیا اتنے ماہ سے یہاں جھک مار رہے ہیں؟ اتنے دھکے کسی پہاڑ کو دیے جائیں تو وہ بھی اپنی جگہ چھوڑ دے...... لیکن یہ مسلے ٹس سے مس نہیں ہو رہے۔'' روپ ہاتھ مسلتے ہوئے بولا۔

''تو کیا میجر نے جھوٹ بولا تھا ہم سے؟'' موہن بے یقین تھا۔

''نہیں! وہ انہیں سمجھ ہی نہیں پایا آج تک...... بس یہی فرق ہے۔''

''ہونہہ! وہ اتنی سینئر پوسٹ پر بیٹھا ہے اور تو کہہ رہا ہے کہ اسے وہ نہیں پتا جو تجھے علم ہے۔'' وہ ہنسنے لگا۔

''ہاں! مجھے علم ہوگیا ہے...... ان کی کمر ایسے نہیں ٹوٹ سکتی جو طریقہ ہم نے اپنا رکھا ہے، وہ بھی فائدہ نہیں دے گا...... ان کی موت تب ہوگی جب ان کا جذبہ مرے گا...... ورنہ یہ گن تو کیا...... انہیں ایٹم بم بھی مار دو گے یہ تب بھی اپنی بقا کا رستہ ڈھونڈ لیں گے ہم ایسے نہیں ہرا سکتے انہیں۔ امام دین ٹھیک ہی کہتا تھا...... بالکل ٹھیک کہتا تھا۔''

''کون امام دین؟ تو پگلا تو نہیں گیا۔''

''دل چاہتا ہے امام سے ایک بار پھر ملوں......'' وہ اب بھی اپنے ہوش میں نہ تھا۔

''دھیرے بول کم بخت! یہاں کسی نے تجھے افسروں کے خلاف بولتے سن لیا تو بہت برا ہوگا۔'' موہن نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے تنبیہ کی۔

''اس سے برا اور کیا ہوگا میرے ساتھ؟'' وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھ گیا۔

روپ سنگھ کی اننت ناگ آمد کو اب ایک سال بیت چلا تھا۔ وہ کئی دنوں سے شام نگر جانے کے لیے چھٹی کی درخواست دیے بیٹھا تھا لیکن اس کے 'سچے نشانے' کی وجہ سے اسے دانستہ نظر انداز کیا جا رہا تھا۔ اس کی بیزاری اور چڑچڑاہٹ کی ایک بڑی وجہ اپنے مقصد میں متواتر ناکامی بھی تھی۔ اس قدر خون ریزی اور تباہی پھیلانے کے بعد وہ آج بھی کامیابی کے امرت سے بالکل تشنہ تھا۔ یہ ناکامی اس کے حوصلے میں دراڑیں پیدا کرنے لگی۔

دوسری جانب جوہی نے جب سے اسے بیٹی کی پیدائش کی خبر دی تھی، وہ مزید بے تابی سے چھٹی کی منظوری کا منتظر تھا۔ بیٹی کو اپنی بانہوں میں تھامنے کی تڑپ نے اسے بے حال کر رکھا تھا۔ ابتدا میں کچھ دن شوہر کو ضد اور پیار سے کھینچے کے بعد جوہی نے خاموشی اختیار کرلی۔ اب وہ بیٹی کی ڈھیروں تصویریں اسے ارسال کردیتی۔ گل گوتھنا سا کول وجود دیکھ کر اس کے دل میں محبت کے سوتے پھوٹنے لگتے۔

روپ کے مزاج میں تبدیلی اب کسی سے بھی ڈھکی چھپی نہ رہی تھی۔ بات بات پر اسے غصہ آنے لگا۔ وہ اپنی اس کیفیت کو خود بھی سمجھ نہ پا رہا تھا۔ بس اردگرد کی ہر شے ایک میالی اور بہت بری لگنے لگی۔ اس رات میس میں کھانے کے لیے سب اکٹھے ہوگئے۔ وہاں بھی آپس میں چہلیں کرتے فحش لطائف کے تبادلے میں مگن تھے۔ پھر کھانا لگتے ہی ان کے چہروں کے زاویے بگڑنے لگے۔ کھانے میں کچھ دن سے ایک تنزلی سامنے آنے لگی تھی۔ دال بھات تو خیر پہلے بھی ملتی لیکن اب ذائقے میں وہ پہلے سی بات نہ رہی۔ وہ اس تبدیلی پر جز بز تھے تو زباں بندی پر مجبور بھی۔

روپ نے بددلی سے دو چار لقمے زہر مار کیے اور غصے سے سر جھٹکتا اٹھ گیا۔

☆☆☆

''بھارتی سینا کی وہاں بڑی دہشت ہے باپو! وہ بہت

ڈرتے نہیں ہم سے۔ … ان کے پاؤں دباتا روپ سنگھ اسے سہانے سپنوں کے خوش رنگ جگنو تھماتے بولا۔

”تو سچ کہہ رہا ہے روپے!“ شکتی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

”ہاں باپو! وہ سب جلد ہی وادی خالی کر دیں گے۔ گھروں کے گھر اجاڑ ڈالے ہیں ہم نے۔ واہگرو کی کرپا سے اب دہشتے زیادہ دور نہیں ہم سے۔“ وہ اپنے دل میں اٹھتی نفرت دباتا فراٹے سے کہانیاں گھڑ رہا تھا۔

کفر خدا خدا کر کے ٹوٹ ہی گیا تھا اور اسے پندرہ روز کی چھٹی مل گئی۔ شام نگر پہنچتے ہی شکتی سنگھ نے اسے اپنی کامیابیوں کے قصے سنانے کے لیے دھر لیا اور اس روز سے وہ ہر رات بیٹے کو پاس بٹھا کر اس کی بہادری کے کارنامے سننے پر بضد رہتا۔

”واہگرو کا خالصہ ...... واہگرو کی جے......... انہیں وہاں سے نکال کے ہی دم لینا پڑا!“ جوش سے اس کا سانس پھول گیا۔

”ایسا ہی ہوگا باپو! ایسا ہی ہوگا۔“ وہ مسکرایا۔

”واہگرو تیری سہائتا کرے...... اچھا چل اب میری خدمت چھڈ...... اپنی لوگائی کے پاس جا۔“

پندرہ دن اسی آنکھ مچولی میں پر لگائے بیت گئے۔ اس عرصے میں اپنی جھوٹی کہانیوں نے اس کی روح میں ایک غیر مطمئن اور خلا کی سی کیفیت پیدا کر دی۔ وہ شدت سے ان قصوں کی مجسم تعبیر دیکھنے کا خواہاں تھا۔

اننت ناگ میں حالات جوں کے توں برقرار تھے۔ پیلٹ گنز پر کام شروع ہو چکا تھا۔ مقامی لوگ ہر روز لہو اگلتی آنکھوں اور زخم زخم چہروں کے ساتھ چھلنی ہوتے وجود سے گرتے اور ہر بار تازہ دم ہو کر ان کے مقابل آ کھڑے ہوتے۔ کبھی کبھی تو اسے ایسا محسوس ہونے لگتا کہ امام دین ایک بدروح بن کر ان سب کے وجود میں بیک وقت سا گیا ہے۔ اس کے متبسم لہجے میں ادا کیے گئے فقرات اکثر اس کی سماعت میں گونجتے رہتے۔

”ہواؤں کی تیزی اور بہتی ندیوں کی روانی کوئی نہیں روک سکتا۔“

یہ الفاظ مجسم صورت اختیار کیے اس کا خوب منہ چڑاتے۔

وقت بیتنے کے ساتھ ساتھ ان کے فرائض کے اوقات کار میں مزید سختی در آئی۔ وہ سولہ سے اٹھارہ گھنٹے ڈیوٹی پر رہتے۔ ان کی فرض شناسی میں رتی بھر کوئی کوتاہی نہ تھی۔ حب الوطنی کا جذبہ بھی روزِ اول جیسا توانا تھا۔ بھارت ماتا کے لیے کٹ مرنے کی تمنا بھی برقرار تھی۔ وہ دشمن کو مارنا بھی جانتے تھے اور اپنے دیش کے لیے مرنا بھی لیکن اس بار وہ ایک عجیب النوع دشمن سے نبرد آزما تھے۔ یہ ایسی دشمنی تھی جس کے بارے میں کسی کتاب، ادارے یا ٹرینر نے بتایا نہ سمجھایا...... اس برف پوش وادی میں حب الوطنی کے نام پر انا کی بھینٹ چڑھتے وہ فوجی ایک ہی سوال میں الجھے تھے۔

”یہ کیسی افتاد آن پڑی ہے؟“

☆☆☆

”موہن داس کدھر ہے؟ آج صبح سے نظر نہیں آیا وہ۔“ روپ نے آکاش سے پوچھا۔

”وہ اپنی نئی ڈیوٹی بھگتانے گیا ہوا ہے۔“ آکاش معنی خیزی سے بولا۔

”کونسی نئی ڈیوٹی یار؟“ وہ حیران تھا۔

”آنے والا ہی ہوگا...... اسی سے پوچھ لینا۔“

تھوڑی ہی دیر بعد موہن مضمحل وجود اور لال انگارا آنکھیں لیے اندر داخل ہوا۔

”ابے! کہاں آوارہ گردی کرتا پھر رہا ہے تو؟“ روپ نے اس کے حلیے پر چوٹ کی۔ ”کہیں دیسی شراب کے چکروں میں تو نہیں پڑ گیا؟“

”ہنس لے بیٹا! ابھی تیرا وقت ہے...... ہنس لے...... جلد ہی یہ ڈھول تیرے گلے میں پڑنے والا ہے...... جو تجھے خود ہی بجانا بھی پڑے گا اور اس کی تھاپ پر ناچنا بھی پڑے گا۔“ موہن نے سلگتی آنکھوں سے اسے دیکھ کر کہا۔

”لگتا ہے زیادہ ہی چڑھا آیا ہے تو۔“

”نہیں روپے! سچ کہہ رہا ہے یہ...... بہت بڑی مصیبت میں پھنس چکی ہے ادھر کچھ جوانوں کی جان......“ آکاش دھیرے سے بولا۔

”کھل کر بتاؤ یار...... کیا زنانیوں کی طرح نخرے کر رہے ہو۔“

”یہاں کچھ افسر لوگ ہیں جو جونیئر اہلکاروں کو اپنے گھروں میں بلوا کر ذاتی کام کرواتے ہیں...... ان کی گاڑیاں دھونا، کتے نہلانا، سبزی ترکاری لا کر دینا، جوتیاں پالش کرنا، ان کی بیویوں کی سیوا کرنا...... یہ سب کام کرنے پڑتے ہیں ہر صورت۔“ موہن نے بتایا۔

”یہ کیا بے ہودگی ہے؟“ روپ کا دماغ الٹ گیا۔ ”کیا سرکار نے ہمیں اس لیے یہاں بھیجا تھا؟“

[illegible]
بادشاہ! ہر دو ہفتے بعد ایک نیا جوان اپنے گھروں میں طلب کر لیتے ہیں یہ۔'' آکاش ہنس کر بولا۔ وہ خود بھی یہ تذلیل سہہ چکا تھا۔

''اور ان کو جو سرکاری نوکر ملتے ہیں؟ وہ کدھر جاتے ہیں؟'' روپ حیران تھا۔

''بہت بڑا گڑ بڑ گھوٹالا ہو رہا ہے یہاں...... بہت سی باتیں قانون کے خلاف ہونے لگی ہیں جن کا کوئی سرا ابھی مل ہی نہیں رہا۔ پچھلے ہفتے میجر سنگھانیہ نے کیپٹن اروڑا کی بیوی کے ساتھ کئی راتیں کالی کی ہیں...... اروڑا خود بھی شامل تھا اس کھیل میں۔'' موہن نے ایک اور انکشاف کیا۔

''تجھے کیسے پتا یہ سب؟'' روپ نے آنکھیں پھیلائیں۔

''ویسے ہی...... جیسے یہ پتا ہے کہ آج رات سے کیپٹن اروڑا سنگھانیہ کی بیٹی کے ساتھ ہوٹل میں اگلی کئی راتیں گزارے گا۔'' موہن نے گہری سانس بھری۔ ''اور تو بھی تیاری پکڑ لے۔ کیا خبر اس چاکری میں اگلا نمبر تیرا ہی ہو۔''

''مجھے یقین نہیں ہو رہا...... ہم یہاں جنگ کرنے آئے ہیں...... اور یہ سب کیا ہونے لگا ہے۔'' وہ اپنا سر دائیں بائیں جھٹکنے لگا۔

''تجھے اگر یقین نہیں آ رہا تو خود چلنا میرے ساتھ اور سب دیکھ لینا۔'' موہن جھنجلا گیا۔ ''اب چلو کھانے کے لیے...... ورنہ کچھ بھی حصے نہ آئے گا۔''

میس میں آج خلافِ معمول خاموشی چھائی تھی۔ کھانا سامنے آتے ہی روپ سنگھ پر حیرت کا ایک اور پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

''یہ...... سب کیا ہے؟'' اس نے سوکھے پاپڑ جیسی پتلی روٹی اپنے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں اٹھا کر لہرائی۔

''خاموشی سے کھا لے بیٹا! ورنہ یہ بھی نصیب نہ ہو گی۔'' موہن تلخی سے بولا۔

سوکھے پاپڑ جیسی اس روٹی کے ساتھ پانی سی پتلی دال موجود تھی۔ جس کا زرد رنگ صرف ہلدی کی مرہونِ منت تھا۔ نمک کا استعمال بھی معمولی سا تھا۔ لہسن، پیاز کا بگھار تو شاید اسے چھو کر بھی نہ گزرا تھا۔ وہ دھیرے سے اٹھا اور انتہائی کونے میں موجود رسوئی میں چلا گیا جہاں ایک باورچی بڑے سے توے پر روٹیاں سینک رہا تھا۔

''کیا بات ہے شمبو؟ کیا تجھے بھی لہسن، پیاز سے پرہیز ہو گیا ہے کوئی جو ہمیں ایسے بدمزہ کھانے کھلا رہا ہے...... اچار ہے نہ کوئی سلاد...... یہ ہم فوجیوں کا کھانا ہے یا گدھے گھوڑوں کا؟ اوپر والوں کو تیری شکایت کرنی پڑے گی اب۔'' شمبو بھی امرتسر ہی کے ایک گاؤں سے تعلق رکھتا تھا اس لیے ان دونوں کی خوب بنتی تھی۔

''روپ بابو! جو مل رہا ہے اس پر بھی شکر کر د بھگوان کا...... ورنہ مجھے تو لگتا ہے کہ کل کو اینٹ پتھر ہی کھانے پڑیں گے یہاں۔'' شمبو نے آٹے کا پیڑا چوڑا کرتے ہوئے کہا۔

''کمال ہے بھئی! ہر بندہ مجھے نصیحتیں کرنے پر تلا ہے آج تو...... یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟''

''آنکھیں اور کان کھلے رکھو...... جلد ہی پتا چل جائے گا۔'' وہ پیڑا توے پر پھیلاتے ہوئے بولا۔

ناقص، بدذائقہ کھانے کے علاوہ موہن کی غیر سرکاری ڈیوٹی اسی طرح چلتی رہی۔ کچھ دن بعد اس سارے قضیے کا پس منظر بھی اس کے سامنے واضح ہو گیا۔ انہیں حکومت کی جانب سے جو راشن الاٹ ہوتا، وہ متعلقہ وزراء کے گوداموں میں پہنچ جاتا جسے بعد ازاں فروخت کر کے دام کھرے کر لیے جاتے۔ نچلے درجے کے اہلکاروں کی ڈیوٹی میں بھی اضافہ ہوتا نظر آ رہا تھا۔

روپ کے ذہن میں ایک منصوبہ پرورش پانے لگا۔ اسے علم تھا کہ یہاں کئی افراد محض کسی بھرم کے باعث خاموش ہیں۔ موجودہ صورتِ حال ان کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز کرنے لگی تھی اور انہیں صرف ایک موقع کی تلاش تھی۔

اس نے موہن کو اعتماد میں لینے کا فیصلہ کیا اور اپنا منصوبہ اس کے گوش گزار دیا۔

''بہت خطرہ ہے اس میں روپ! خواہ مخواہ کہیں اپنی گردن ہی نہ پھنس جائے۔'' وہ بدک گیا۔

''ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا...... اگر اب بھی یہ قدم نہ اٹھایا تو یہاں اتنا خون بہانے کا کیا فائدہ؟ یہ لوگ تو ہماری آپسی پھوٹ کو ہی ہتھیار بنا لیں گے۔''

موہن اب بھی خاموش تھا لیکن اس کی سوچتی آنکھوں میں نیم رضامندی کا تاثر دیکھ کر روپ مطمئن ہو گیا۔

☆☆☆

اگلے روز وہ موہن کے ساتھ میجر سنگھانیہ کے گھر موجود تھا۔ اس کی وہاں آمد کسی کے لیے بھی اچنبھے کا باعث نہیں تھی کیونکہ اس خدمت گزاری کے لیے اگلا شخص وہی نامزد ہوا تھا۔ روپ نے انتہائی ہوشیاری اور غیر محسوس طریقے سے موہن کے تمام تر مناظر اپنے موبائل فون میں مقید کر لیے۔ اشیائے خورد و نوش کے معیار اور رسوئی کے تمام تر نظام کی

ویڈیو وہ اپنی مِس رنگ ’کنٹری‘ کے ساتھ پہلے ہی بنا چکا تھا۔
شام گئے واپسی کے بعد اس نے بہت سکون اور تسلی سے ان دونوں ویڈیوز کو ایڈٹ کیا۔ اور اپنے صوتی تاثرات کے ساتھ اسے سوشل میڈیا پر اپلوڈ کر دیا۔ اس نے سرکار کے خلاف ایک بھی لفظ ادا نہ کیا تھا۔ اسے صرف اپنے ’سینئر افسران‘ کی خود غرضی اور بے حسی پر تاؤ تھا۔ اس اہم ترین میدانِ جنگ میں سپاہیانہ ولولے کا زیاں‘ ذاتی چاکری اور شدید سردی میں سولہ سے اٹھارہ گھنٹے ڈیوٹی کرنے والے اپنے ساتھیوں کا درد اس ویڈیو میں سموتے اس نے میڈیا اور عوام سے انصاف کی اپیل کی تھی۔

رات کو سونے سے قبل اس نے ایک بار پھر سوشل میڈیا کا ایک مختصر دورہ کیا۔ اس کی ویڈیو کروڑوں افراد دیکھ چکے تھے۔ ان کے کمنٹس میں اپنے فوجی بھائیوں کے لیے محبت اور اس ’انیائے‘ کے خلاف سخت ایکشن لینے کی تجاویز پڑھ کر اسے اپنی کامیابی کا مکمل یقین ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ویڈیو اس وقت ملک بھر کے ٹی وی چینلز پر بریکنگ نیوز کی طرح چل رہی ہو گی۔ بھارتی حکومت کی لاعلمی اب ختم ہوتے ہی ان افسران کے گرد گھیرا تنگ ہو جانے کی قوی امید لیے وہ نیند کی خوشنما وادیوں میں کھو گیا۔

☆☆☆

وہ کسی صحرا میں موجود تھا۔
سورج کی تپش اس کا تن من جھلسا رہی تھی اور شدید پیاس نے حلق میں اَن گنت کانٹے اگا دیے تھے۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا وہ کسی سائے کی تلاش میں تھا لیکن سایہ تو کہیں بھی میسر نہ تھا۔ تا حدِ نگاہ صرف چبھتی ہوئی دھوپ تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں دھیرے دھیرے کھولنی شروع کیں۔ سورج اب عین اس کے سر پر تھا۔ وہ اس کی حدت سے بچنے کے لیے اپنی آنکھوں کو ڈھانپنا چاہتا تھا لیکن ہاتھوں کو ہلانے سے قاصر تھا۔

چند لمحات بعد اس کے حواس بحال ہوئے تو اسے اپنی اصل صورتِ حال کا ادراک ہونا شروع ہوا۔ وہ کسی کرسی پر بندھا بیٹھا تھا۔ اس کے اوپر نیچی چھت کے عین وسط میں ایک تیز‘ ناقابلِ برداشت روشنی والا بلب روشن تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی مختصر سے کمرے میں پابندِ سلاسل ہے۔ اس کے سامنے ایک میز موجود تھی اور مخالف سمت میں ایک اور کرسی کا ہیولا نظر آ رہا تھا۔

تیز ترین روشنی کے باعث اس کا سر پھٹنے کے قریب تھا۔ درد اب برداشت سے باہر تھا۔

’’کوئی ہے یہاں...... بند کر دو اِسے......‘‘ وہ اذیت سے آنکھیں میچ کر چلایا لیکن جواب ندارد۔ متواتر چیخ پکار سے اس کا حلق مزید خشک ہو گیا اور نیم غشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔
نامعلوم وقت تک وہ اسی حالت میں پڑا رہا پھر اس کی سماعت نے دائیں جانب سے ایک دروازہ کھلنے کی ہلکی سی آواز سنی۔ بھاری بوٹوں کی چاپ مخالف سمت میں موجود کرسی تک آ کر رک گئی۔

’’کیا حال ہیں روپ سنگھ جی! کوئی تکلیف تو نہیں ہمارے مہمان خانے میں؟‘‘ ایک سرد آواز ابھری۔
’’مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟‘‘ وہ حلق کے بل چلایا۔
’’آواز نیچی رکھ حرامزادے! ورنہ تیری زبان گُدّی سے کھینچ لوں گا۔‘‘ ایک زنّاٹے دار تھپڑ اس کے چودہ طبق روشن کر گیا۔

روپ سمجھ گیا کہ وہ ملٹری انٹیلی جنس کے نرغے میں پھنس گیا ہے۔ اس کی سچائی اور بہادری بھارت سرکار کے ساتھ انٹیلی جنس تک بھی پہنچ گئی تھی اور اس جرأت و ہمت کو تمغا دینے کے لیے وہ خاموشی سے اسے اٹھا لائے تھے۔
’’بہت غلط کر رہے ہو تم لوگ میرے ساتھ...... میں نردوش ہوں...... مجھے یہاں اس طرح قید کر کے کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟‘‘ وہ بے خوفی سے بولا۔
’’پاکستان سے تیرا کیا تعلق ہے؟‘‘ اسی سرد آواز نے پوچھا۔
’’نفرت کا۔‘‘ جواب بے ساختہ تھا۔
’’اور پاکستانیوں سے۔‘‘
’’نفرت سے بڑھ کر میرے پاس کوئی شبد نہیں۔‘‘
’’آئی۔ ایس۔ آئی سے تیرے رابطے کیسے ہوئے؟‘‘
’’میرا اُن سے کوئی رابطہ نہیں۔‘‘
’’تو اس ویڈیو کے لیے تجھے تیری ماں نے خط ڈالا تھا کیا؟‘‘ ایک اور تھپڑ اس کے بائیں گال پر پڑا۔ اسے اپنے منہ میں لہو کا نمکین ذائقہ محسوس ہونے لگا۔
’’اس ویڈیو کے لیے تیری ماں نے مجھے خط ڈالا تھا۔‘‘ وہ حقارت سے بولا۔ اسے علم ہو گیا تھا کہ وہ ’را‘ اور ملٹری انٹیلی جنس کے ایک خصوصی ونگ کے ہتھے چڑھا ہے جو پاکستان اور آئی ایس آئی سے تعلق کے معمولی شبے کے تحت اپنے شکار کو دوسرا سانس بھی لینے نہ دیتے تھے۔
اس کے عقب سے ایک زوردار گھونسا سر پر پڑا اور وہ میز کے کونے سے جا ٹکرایا۔ اپنے اس پاس نادیدہ موت کے

سامنے دیکھ کر اس کا دماغ بالکل ہی الٹ گیا۔

"سچائی کا سامنا کرنے کی ہمت پیدا کرو کائرو! ہم سپاہی جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں اور ہمارے اپنے ہی دشمنی پر تلے ہیں۔ کیوں اپنی سیتا کو دیمک کی طرح کھوکھلا کر رہے ہو؟"

"کیسی دشمنی؟ تیرے علاوہ تو کسی کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی..... بول کتنے میں بیچا اپنا دیش؟"

"تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں اس الزام کا۔"

"ثبوت تو بہت سے ہیں..... بہتر یہی ہے اپنے لیے مشکلیں کھڑی نہ کر۔"

روپ سنگھ خاموش رہا۔

"خالصتان کے لیے کن تنظیموں سے تیرا رابطہ ہے؟"

"میں کہہ چکا ہوں..... میرا کسی سے کوئی رابطہ نہیں۔" وہ غرایا۔ اپنا انجام سامنے دیکھ کر اس کے دل سے سبھی خوف مٹ گئے تھے۔

"وچار کیا ہیں تیرے خالصتان کے متعلق؟" اس کے خفیف اشارے پر پیچھے کھڑے شخص نے روپ کی گردن کی حساس رگوں کو مسلنا شروع کردیا۔

"پہلے تو میں نے بھی اس بارے سوچا ہی نہ تھا۔ لیکن آج محسوس ہوتا ہے ہمارے پرکھوں نے بڑی غلطی کی..... ہمیں کسی ہڈی کی طرح پھینک گئے..... اس ہڈی کو چچوڑنے میں مگن ہیں تمہارے فوجی..... اپنے ہی آشیانے کو دیمک کی طرح چاٹ رہے ہو تم لوگ..... اپنی فوج کو تباہ کر رہے ہو۔ اس طرح کشمیر کبھی نہیں ملے گا سرکار کو۔ یہی چلن رہے تو یہ سپنا بھی پورا نہیں ہوگا۔ ہم فوجی ہیں..... طویلے کے گدھے گھوڑے نہیں جو افسروں کے تلوے چاٹیں..... ہم اگر خالصتان میں ہوتے تو کسی کی ذاتی چاکری نہ کرنی پڑتی..... بڑی غلطی کی ہمارے پرکھوں نے....." وہ بے اختیار چلایا۔ "سینوں میں جلتی آگ تم خود بجھا رہے ہو..... یہ آگ تمہی کو جلا ڈالے گی..... جلا ڈالے گی..... امام دین ٹھیک کہتا تھا..... ہم بہتی ندیوں کی روانی روک ہی نہیں سکتے۔"

اس کے عقب میں موجود جلاد صفت انسان نے اسے بری طرح رگید کر لہولہان کردیا۔

"ٹھیک ہے! جلد ہی تجھ سے دوسری ملاقات ہوگی۔" مخالف سمت میں موجود افسر سرسراتے لہجے میں کہتا چلا گیا۔

اس قید خانے میں دن اور رات کا کوئی تصور نہ تھا۔ وہ جانے کتنے پہروں بھوک، پیاس سے بے حال سردی اور تاریکی سے الجھتا رہا۔ امید کا ایک چراغ اب بھی دل میں روشن تھا کہ سرکار اس 'اپنا پن' کے خلاف جب قدم اٹھائے گی تو اس کی بے گناہی اور دیش بھگتی خود بخود واضح ہوجائے گی۔

بھوک اور پیاس نے اس کے معدے کو اپنے نوکیلے پنجوں سے ادھیڑنا شروع کردیا۔ اعصاب بالکل نڈھال ہو چکے تھے اور آواز کا یہ عالم تھا کہ خود اس کی سماعت بھی اپنے الفاظ تک بمشکل پہنچ پاتی۔ غشی کی کیفیت مسلسل طاری رہنے لگی تو ایک روز اس سرد جہنم کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے گئے اور دائیں بازو سے گھسیٹ کر ایک دوسرے کمرے میں لے جایا گیا جہاں ایک طرف تین بارعب اور بھاری بھرکم افراد بیٹھے تھے۔ اس کا نیم مردہ تن کسی کیڑے مکوڑے کی طرح ایک آہنی کٹہرے میں پھینک دیا گیا۔

یکدم اسے بائیں جانب ایک شناسا چہرے کی موجودگی کا احساس ہوا۔ مندی آنکھوں اور جھولتے سر سے بمشکل اس نے اپنی نظر جمائی تو اسے موہن داس کی جھلک نے بے تاب کردیا۔ امید قدرے بڑھ گئی۔

ایک بڑی سی میز کے عقب میں بیٹھے تینوں افراد اپنے سامنے موجود کاغذات کا مطالعہ کررہے تھے۔

"کیس بالکل واضح ہے..... روپ سنگھ نے پاکستانی سرکار کے کہنے پر اپنے دیش کی بدنامی کی۔ موہن داس کی گواہی نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردیا ہے۔" اسی سرد و سپاٹ آواز نے اس کی سماعت میں بم پھوڑا۔ وہ ایک کرخت صورت، طویل قامت اور بھاری بھرکم شخص تھا جس کی آنکھوں میں وحشت و نفرت کا ایک طوفان موجزن دکھائی دیتا تھا۔ "جرم ثابت ہو چکا ہے۔" "مجرم روپ سنگھ کے کسی امام دین سے بھی روابط رہے ہیں اور قوی امکان ہے کہ وہی درمیانی کڑی ہوگا۔ اسے جلد از جلد ٹریس کرنے کی ضرورت ہے۔"

"امام دین کبھی نہیں مل سکتا تم لوگوں کو..... ساری زندگی ڈھونڈتے رہو تب بھی نہیں ملے گا۔" اس کے نیم مردہ وجود میں ایک پل میں ہی بے نام سی قوت در آئی۔ پھر سلگتی نظروں سے اس نے موہن کی جانب دیکھا اور تنفر سے بولا: "میں نہیں جانتا تو کیوں یہ جھوٹی گواہی دینے کے لیے تیار ہوگیا ہے..... لیکن ایک بات یاد رکھنا..... یہ دیش دروہی ہے..... تم سب دیش دروہی کررہے ہو۔" وہ چلاتا ہوا بے دم ہوگیا۔

روپ سنگھ کو [illegible] کی تحویل میں دیا جاتا ہے۔ اس کے روابط کسی بھی صورت ٹریس کیے جائیں۔ امام دین کی گرفتاری یقینی بنائی جائے۔'' ایک تند رو افسر نے کاغذات پر دستخط کرتے ہوئے کہا۔

روپ اس ناانصافی پر ششدر رہ گیا۔ ملٹری انٹیلی جنس اور 'را' کی تحویل میں چلے جانے کا مطلب اس سے پوشیدہ نہیں تھا۔ اس کا ریشہ ریشہ ادھیڑ کر تفتیش کی جاتی۔ موت سے بدتر زندگی کے اس تصور نے اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا۔ وہ اپنے پاؤں بمشکل گھسیٹتا کٹہرے میں اٹھا اور اپنا سر دیوانہ وار اس کی آہنی سلاخوں سے ٹکرا دیا۔ خون کا ایک فوارہ نکلا اور اس کا چہرہ رنگین کر گیا۔

☆☆☆

دہلی کے اس دو کمروں کے مکان کا آنگن بہت چھوٹا تھا۔ کونے میں ایک پلاسٹک کی کرسی بچھائے شکتی سنگھ آنگن میں کھیلتے دو بچوں کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ وہ پریتی اور کرن تھے...... روپ سنگھ کی اولاد اور اس کی آخری نشانی۔ وہ دونوں نقلی پستول سے خیالی دشمنوں کو مارنے کا کھیل کھیلنے میں مگن تھے۔

''کھانا تیار ہے باپو! پروس دوں کیا؟'' جوہی کی دھیمی آواز اس کی سماعت میں پڑی۔

''نہیں۔ میتوں بھوک نہیں۔'' اس کی نظر اب بھی بچوں پر ہی تھی۔

''دوا لینے کا سمے ہو چلا ہے۔ تھوڑا سا کھا لیجیے۔'' وہ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اندر چلی گئی۔

اس کی پشت کو دیکھتے شکتی سنگھ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ سانسوں کی روانی اور دل کی دھڑکن سے منسلک ایک درد پوری قوت سے عود آیا اور پردۂ تصور پر اکلوتے بیٹے کا چہرہ اپنی چھب دکھلانے لگا۔ اذیت اور بے بسی دو چند ہو گئی۔ وہ بے اختیار کچھ سال قبل کے مناظر میں کھو گیا۔

روپ سنگھ کے شام نگر میں آخری دورے کے کچھ ہی دن بعد اس کا فون مسلسل بند رہنے لگا۔ جوہی ان دنوں پھر امید سے تھی۔ شوہر کے غیاب نے اسے بہت پریشان کر رکھا تھا۔ پریشانی تو شکتی اور اس کی بیوی کی بھی کم نہ تھی۔ میڈیا پر چلنے والی روپ کی ویڈیو اور اس کی دلیری پر وہ جس قدر خوش تھے اب اس سے کہیں زیادہ مضطرب رہنے لگے تھے۔ روپ سے ہر قسم کا رابطہ منقطع تھا۔

وہ اپنے تئیں جب ہر کوشش کر کے ہار بیٹھے تو آرمی کی جانب سے انہیں دیش درود روپ سنگھ کی لاش موصول ہو گئی۔ اس پر لگنے والے الزامات کی فہرست اس قدر طویل تھی کہ وہ شام نگر کے باسیوں کو کبھی بھی اس کی بیگناہی کا یقین نہ دلا پائے۔ اس کی بوڑھی ماں تو جوان بیٹے کی لاش دیکھ کر اپنا دل تھامے زمین بوس ہو گئی تھی۔ جوہی کی حالت بھی ناقابلِ بیان تھی۔

ان کے لیے شام نگر میں رہنا اور لوگوں کا سامنا کرنا مزید ممکن نہ رہا تو جوہی کے باپ اور بھائیوں کی مدد سے وہ دہلی کے اس نواحی علاقے میں منتقل ہو گئے۔ وہ اس بات سے بھی خائف تھے کہ کہیں حکومتی عتاب انہیں بھی اپنی لپیٹ میں نہ جکڑ لے لیکن قسمت کی دیوی مہربان ہی رہی۔ بھارتی فوج اور حکومت نے انہیں درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔

دہلی میں کوئی بھی ان کے ماضی سے واقف نہ تھا اس لیے وہ بے فکری سے اولاد کی پرورش میں مگن ہو گئے۔ بیٹے اور بیوی کی دائمی جدائی ایک ایسا ناسور بن چکی تھی جو تاعمر یونہی رستا رہتا۔ جوہی نے بھی دوسری شادی کے لیے والدین کے دباؤ میں آنے سے انکار کر دیا۔ دونوں نفوس بچوں کو ایک ہتھیار کی طرح تربیت دے رہے تھے۔ جوہی ایک چھوٹے سے دفتر میں نوکری کرنے لگی۔ شام نگر والی زمینیں ارون سنگھ کے زیرِ مصرف تھیں جن سے حاصل ہونے والا منافع وہ بینک کے بینک اکاؤنٹ میں باقاعدگی سے جمع کروا دیا کرتا۔

کرن اور پریتی کا کھیل اب ختم ہو چکا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا شکتی سنگھ کے پاس آیا اور جوش سے بولا۔

''دادا جی! میں نے سب دشمنوں کو مار گرایا ہے۔''

''جیوندا رہ میرا شیر...... اچھا یہ بتا تو نے وڈے ہو کر کیا بننا ہے؟'' شکتی نے پوتے سے روزانہ کی طرح اعادہ چاہا۔

''میں بڑا فوجی افسر بنوں گا...... اور سب دشمنوں کو ٹھائیں ٹھائیں گولیوں سے اڑا دوں گا۔''

''تیرے دشمن کون ہیں بھلا؟''

''میرے دشمن پاکستانی ہیں...... انہوں نے میرے باپو کی ہتھیا کروائی...... میرا باپو بہت دلیر فوجی تھا...... میں اس کا انتقام جرور لوں گا۔'' وہ رٹے رٹائے فقرات بولتا منہ سے کف اڑانے لگا۔

شکتی سنگھ کا منحنی وجود توانا ہو گیا۔ وہ پوتے کو اپنے ساتھ لپٹائے خوب پیار کرنے لگا۔

''وہ وقت بہت جلد آئے گا۔ میرے روپ کی ہتیا ضائع نہیں ہو گی۔ تو اس کا انتقام جرور لینا...... جرور لینا۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا کھانا کھانے کے لیے اٹھ گیا۔

ناقابلِ گرفت

عابد علی

سراغرساں کتنا ہی ذہین کیوں نہ ہو... کیس کی پیچیدگی کو آسانی میں بھی ڈھال لیتا ہے... مگر جب مجرموں کو کٹہرے میں کھڑا کرنے کا وقت آتا ہے تو اس کے سامنے بند گلی ہوتی... ایسے ہی آفیسر کی کہانی... دیانت داری اس کی سزا بن گئی تھی... مجرموں کی شناخت ہو چکی تھی... مگر الجھنیں تھیں جو سلجھنے کے بجائے الجھائے جا رہی تھیں... حق و ناحق کی کشمکش کا احوال...

سزا کے دائرۂ کار میں آنے والے ناقابلِ گرفت مجرموں کا ماجرا

اسٹرنگر پُل پر جھکا ہوا دریا کے پانی کو بہتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے اور سورج کی شعاعیں پانی کی سطح پر منعکس ہو رہی تھیں۔ بہت سے لوگ شاید یہ سمجھتے ہوں کہ اس موسم میں دریا میں چھلانگ لگانا محفوظ رہے گا لیکن سراغ رساں اسٹرنگر اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کوشش کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے۔ اس نے پانی سے ایسی لاشیں برآمد ہوتی دیکھی تھیں جو ایک ڈراؤنے خواب کے مانند بار بار بوڑھے لوگوں کا پیچھا کرتی رہیں۔ ان میں زیادہ تر خودکشی کرنے والے افراد تھے جبکہ دو مقتولوں کی لاشیں بھی دریا نے اگل دی تھیں۔ جلد یا بدیر سب لاشیں باہر آجاتی تھیں۔

وائٹ کچھ پڑھ رہا تھا۔ فارغ ہو کر اس کے پاس آیا اور وہ بھی جھک کر پانی میں دیکھنے لگا۔

”تمہیں کسی چیز کی تلاش ہے؟“

”ہمیشہ ہی ہوتی ہے۔“

وائٹ نے اپنا سر ہلایا۔ اسٹرنگر نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”تم بھی غور و فکر کرنے کے لیے وقت نہیں نکالتے ؟“

”نہیں، زندگی اتنی مصروف ہو گئی ہے کہ کچھ سوچنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔“

”تمہارا خیال ہے کہ وہ ڈوب کر مرا ہے۔“ اسٹرنگر نے کہا۔ ”میں ایسا نہیں سمجھتا۔“

”تمہارے پاس یہی ایک نکتہ ہے۔“ وائٹ نے کہا۔ ”اس کے علاوہ تم کچھ اور نہیں سوچ سکتے، اب میں جانا چاہوں گا۔“

وہ دو بجے کے بعد میجر انوسٹی گیشن ٹیم پول میں پہنچے۔ راستے میں انہوں نے دریا کے قریب واقع ایک کیفے میں لنچ کیا اور اس کے بعد تھوڑی سی چہل قدمی کی۔ سادہ لباس میں وہ عام شہری لگ رہے تھے۔ بظاہر وہ ایک عام سا دن تھا لیکن ان کے لیے ہمیشہ کی طرح یہ ایک مختلف دن ثابت ہوا۔ ان کی صبح ساؤتھ سائڈ پر گزری جہاں گو دان مل کے نزدیک سیڑھیوں پر ایک شخص کی لاش ملی تھی۔ اسے بری طرح تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس کے جسم پر گہرے زخم تھے اور زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو گئی۔

سینئر سراغ رساں ہونے کی وجہ سے اسٹرنگر کو ہی چیف انسپکٹر براؤن کو ابتدائی رپورٹ دینا تھی۔ اس نے گلا صاف کر کے کہنا شروع کیا۔ ”مقتول کا نام ریمنڈ بیکس ہے۔ عمر چھبیس سال، بے روزگار، کبھی جیل نہیں گیا۔ بیوی بچہ کوئی نہیں۔ البتہ والدین حیات ہیں۔ ہماری جائے واردات پر ان سے بات ہوئی۔ کسی جان پہچان والے شخص نے انہیں فون کر دیا تھا۔ وہ ہم سے پانچ منٹ پہلے وہاں پہنچ گئے تھے۔ وہ پریشان ضرور تھے لیکن جس طرح اس کی موت واقع ہوئی، اس پر انہیں کوئی حیرانی نہیں تھی۔“

چیف انسپکٹر براؤن نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدلا اور بولا۔ ”کیا وہ قریب ہی رہتے ہیں؟“

”جی جناب۔ اسی لیے وہ اتنی جلدی پہنچ گئے۔“

”پیرامیڈیکس؟“

”وہ بھی ہم سے پہلے جائے وقوعہ پر پہنچ گئے تھے لیکن وہ پہلے ہی مر چکا تھا۔ اس لیے کچھ نہ کر سکے۔ البتہ اس کے والدین کی تسلی کے لیے ضروری کارروائی میں مصروف ہو گئے تھے۔“

براؤن نے سر ہلایا اور بولا۔ ”تم نے کوئی غیر معمولی بات نوٹ کی؟“

”نہیں۔“

”اس شخص کا کوئی دشمن تھا؟“

”ابتدائی تحقیقات سے ایسا کچھ ظاہر نہیں ہوتا۔“

”لیکن......“ وائٹ کے منہ سے بے اختیار نکلا پھر

خیال آیا کہ اس کا خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔

''لیکن کیا؟'' براؤن نے پوچھا۔

اسٹرنگر نے ایک نظر اپنے ساتھی سراغ رساں کو دیکھا اور گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''لیکن وہاں کے ایک رہائشی نے بتایا ہے کہ حال ہی میں ریمنڈ پیسے بنانے کے چکر میں پڑ گیا تھا۔''

''وہ کیسے؟''

وائٹ ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اس کا بیان لے لیا ہے جناب لیکن اس نے اپنا نام بتانے سے انکار کر دیا۔''

''اس نے اپنے بیان میں کیا کہا؟''

''اس کا کہنا تھا کہ لڑکے کے پاس گیمز کے ٹکٹ تھے جو اس نے قانونی طریقے سے حاصل نہیں کیے بلکہ وہ دلال کے طور پر کام کر رہا تھا۔''

''تمہارا اشارہ کامن ویلتھ گیمز کی جانب ہے؟''

''جی جناب۔'' اسٹرنگر نے کہا۔ ''اگر وہ ٹکٹ جعلی ہوئے تو خریدنے والوں کو جلد ہی پتا چل جائے گا لیکن یہ قتل کی وجہ نہیں ہو سکتی۔''

براؤن نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ ''کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ گزشتہ ایک سال سے ایسٹ اینڈ ساؤتھ سائڈ کی صفائی کر رہے ہیں۔ انہوں نے اطراف کی عمارتیں خالی کرا دی ہیں اور وہ علاقے سے تمام ناپسندیدہ عناصر کو ہٹا رہے ہیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''یہ دوسرا مرحلہ ہو سکتا ہے۔ آپ گلاسگو 2014ء دیکھنے آئیں۔ ہم آپ کے آرام کی خاطر اپنے ایجنٹ کو مار دیں گے۔''

اسٹرنگر نے کہا۔ ''مجھے یقین نہیں کہ اس کا کوئی تعلق بنتا
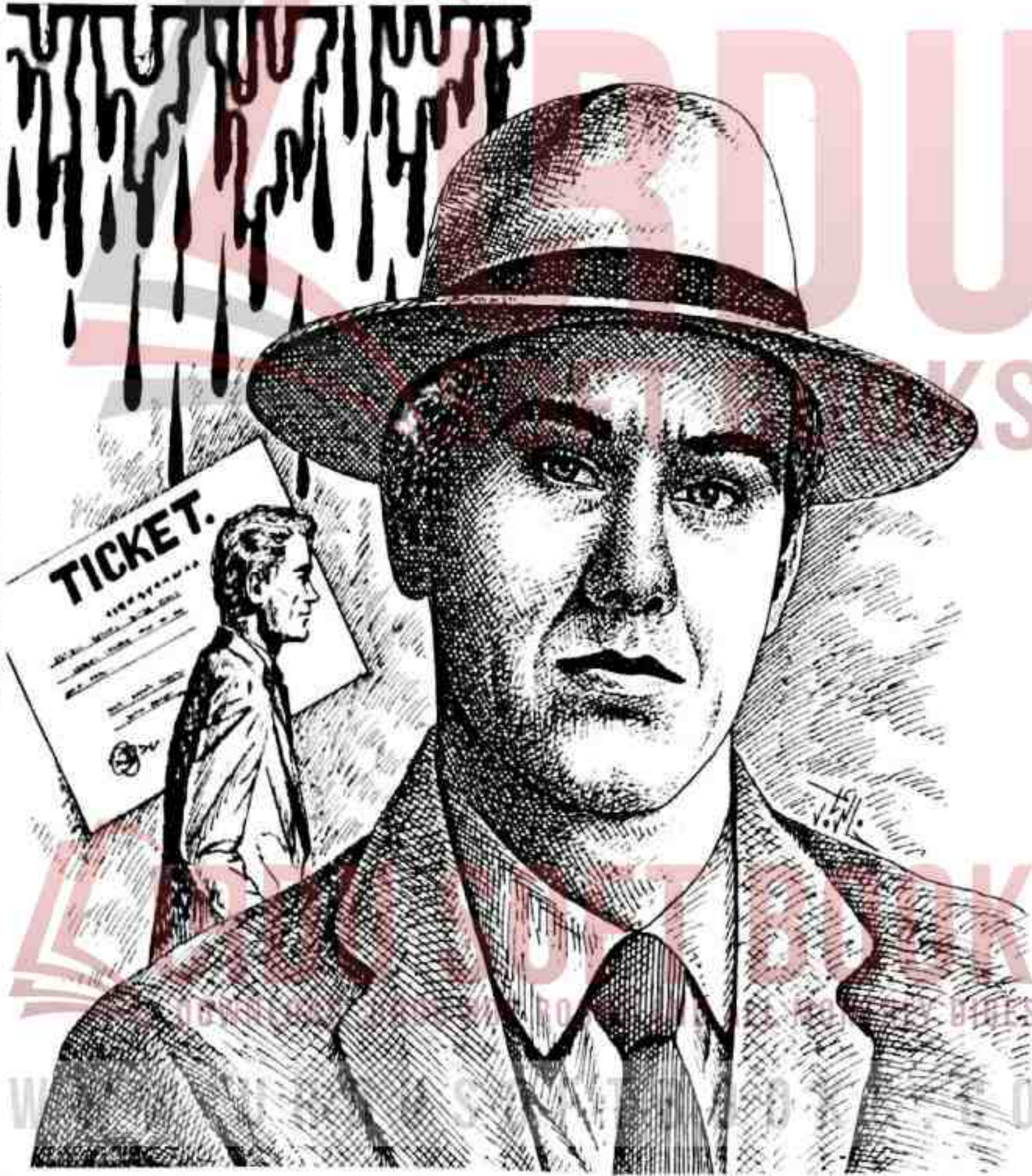
ہے۔ میرا مطلب دلالی سے ہے۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ اس میں پیسے کی زیادہ اہمیت ہے۔''

''تمہارے خیال میں یہ ڈکیتی تھی؟''

''میں یہی سمجھتا ہوں۔''

وہ دونوں اپنے کمرے میں واپس آگئے۔ وائٹ نے اس کی میز پر جھکتے ہوئے کہا۔ ''تم نہیں سمجھتے کہ اس دلالی کا اس کی موت سے کوئی تعلق ہے؟''

''نہیں، یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ غلط وقت پر غلط جگہ چلا گیا تھا۔''

وائٹ نے سر ہلایا اور ایک کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''اب تم کیا سوچ رہے ہو؟''

''میرا خیال ہے کہ یہ کیس بھی غیر حل شدہ ہی رہے گا۔ ہمیں ڈی این اے سے کچھ ثبوت مل سکتے ہیں لیکن ان کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ ان کی مدد سے ہم قاتل کو بھی تلاش نہیں کر پائیں گے۔''

وائٹ کندھے اچکا کر رہ گیا۔

''زیادہ تر کیس اس لیے حل ہو جاتے ہیں کہ قاتل لاش کے پاس اپنی کوئی نہ کوئی نشانی چھوڑ جاتا ہے یا اس قتل کا کوئی عینی شاہد ہوتا ہے۔ بعض اوقات سی سی ٹی وی کیمروں کی مدد سے بھی قاتل پکڑا جاتا ہے۔ زیادہ تر مجرم احمق ہوتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم نے قتل کے زیادہ کیس نہیں کیے لیکن تم دیکھ لو گے کہ اس کیس میں ایسا کچھ نہیں ہے۔''

وائٹ سر ہلا کر رہ گیا۔ اسٹرنگر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو کہ میں راستے میں لنچ کرنے کیوں رک گیا تھا۔ تاکہ سکون کے کچھ لمحے میسر آ جائیں کیونکہ اس طرح کے کیس میں سر درد کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔''

وائٹ نے سر پر ہاتھ پھیرا اور اپنی نشست پر چلا گیا۔ اسٹرنگر نے الیکٹرانک کارڈ دیکھنا شروع کر دیے۔ اس نے ایک وکیل کے کارڈ پر کلک کیا اور بولا۔ ''ہیلو، مسٹر سراغ رساں۔''

وائٹ اس کے عقب میں بیٹھا ریمنڈ کے بارے میں معلومات اکٹھی کر رہا تھا۔ اس نے ٹائپنگ روک دی اور اپنی کرسی گھماتے ہوئے بولا۔ ''کیا تمہیں اس کے ماضی سے کچھ معلوم ہو گیا؟''

''میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ ہم اس شخص کے بارے میں کافی کچھ جانتے ہیں۔ اسے کام کرتے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے اس کے سابقہ ریکارڈ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس بات کے امکانات ہیں کہ کسی کو اس سے عداوت ہو لیکن اس کی نوعیت بہت معمولی ہے لیکن یہ امکان بہت کم ہے کہ اس نے کسی غلط آدمی کو دھوکا دیا یا خاموشی کے ضابطے کی خلاف ورزی کی۔ اسے کسی گاڑی نے ٹکر نہیں ماری۔ یہ کسی حکم کی بجا آوری نہیں تھی بلکہ محض ایک ڈکیتی ہے۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ حملہ آور مقتول کے لیے اجنبی تھا اور نہ ہی اس نے کسی منصوبہ بندی کے تحت یہ قتل کیا۔''

''مجھے تو وہ شخص بدکردار لگتا ہے۔'' وائٹ نے کہا۔

''میں نے جو قتل کا پہلا کیس کیا، اس میں بھی ایسا ہی سین تھا۔ اس وقت میں تمہاری طرح کانسٹیبل تھا اور مجھے ملازمت پر آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ میری ڈیوٹی انسپکٹر کرافورڈ کے ساتھ تھی۔ ہمیں ایک لاش کی موجودگی کی اطلاع ملی۔ وہ بھی اس کی طرح کچھ عرصے سے منشیات فروشی کر رہا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، اس کی خون آلود لاش ایک گلی میں پڑی ہوئی تھی۔ اس پر چاقو سے وار کیے گئے تھے جس سے لگ رہا تھا کہ اسے کرائے کے قاتل نے مارا ہے۔ ہم جائے واردات سے ہٹ گئے اور وہاں سے چل دیے۔ تین گلیاں چھوڑ کر ایک بند دکان نظر آئی جس کی ڈیوڑھی میں وہ احمق چھپا ہوا تھا اور اس وقت بھی اس کے ہاتھ میں چاقو اور کپڑوں پر خون کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ ہم اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور اعتراف جرم کر لیا۔''

''اس نے کیا وجہ بتائی؟''

''وہ مقتول کو نہیں جانتا تھا۔ اسے پیسوں کی ضرورت تھی۔ اس نے مقتول کو ایک پب میں جوا کھیلتے اور کچھ رقم جیتتے ہوئے دیکھا تو اس کے پیچھے لگ گیا۔ وہ گلی اس کام کے لیے بہت مناسب تھی اور وہ شخص پہلے بھی اس طرح کی وارداتیں کر چکا تھا چنانچہ اس نے معمول کے مطابق اپنی کارروائی شروع کر دی لیکن اس بار اسے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔''

''چنانچہ اس نے چاقو سے وار کر دیا؟''

اسٹرنگر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ اس پر پے در پے وار کرتا رہا۔ جرم کرنا آسان نہیں ہوتا۔ یہ کوئی روٹی خریدنے یا چائے میں چینی ڈالنے والی بات نہیں ہے۔ قاتل چاہے کتنا ہی نفسیاتی کیوں نہ ہو۔ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات ضرور ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ غلط ہے۔ لہٰذا اس کے لیے اپنے آپ پر قابو پانا آسان ہو

جاتا ہے۔ کس نے بہت سے پیشہ ور مجرموں تو یہ ہے سنا ہے کہ ان کا طریقہ واردات دوسروں سے مختلف ہے اور وہ منصوبہ بندی کے تحت اپنا کام کرتے ہیں لیکن آخر میں ان سے کوئی نہ کوئی چھوٹی سی غلطی سرزد ہو جاتی ہے جس سے لگتا ہے کہ وہ کوئی پیشہ ور مجرم نہیں بلکہ انہوں نے شوقیہ جرم کیا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر توقف کیا اور بولا۔ "یہ معاملہ کچھ زیادہ ہی پُراسرار ہے کیونکہ ہم نے جائے واردات کے قریب کسی کو نہیں دیکھا اور نہ ہی کوئی شہادت ملی۔ فارنسک سے بھی کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ مجرم کوئی حماقت کر دے یا اس کی قسمت ساتھ نہ دے تبھی وہ پکڑا جائے گا۔"

وائٹ نے تائید میں سر ہلایا اور دوبارہ اپنی میز پر جا کر کام کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور اس نے اسٹرنگر کے سامنے ایک پرنٹ آؤٹ رکھ دیا۔

اسٹرنگر سینڈوچ کھانے میں معروف تھا۔ اس نے کہا۔ "تم خود ہی بتا دو۔"

"ٹھیک ہے۔ تم چاہتے ہو کہ میں ہی اس کی وضاحت کروں۔" وائٹ نے کاغذ اپنی طرف کھینچا اور جلدی جلدی پڑھنے لگا۔ "پچھلی بار وہ ٹکٹوں کی دلالی کرتا ہوا پکڑا گیا اور اسے چھڑانے کیلون اینڈ ہیرس سے ایک بندہ آیا تھا۔"

"ٹھہرو، مجھے اندازہ لگانے دو۔"

"اوہ ہاں۔" اس نے چند لمحے بعد کہا۔ "کارتھ پیٹرسن۔"

وہ ایک بے قرینہ شخص تھا اور دوسرے وکیلوں کے مذاق کا نشانہ بنتا رہتا تھا لیکن اندر سے بے حد ہوشیار، بے رحم اور اخلاقیات سے عاری شخص تھا اور اس کی وجۂ شہرت صرف ایک موکل کی وجہ سے تھی جس کا نام سولومن بوکن تھا اور وہ گلاسگو کا سب سے امیر ترین منشیات کا سوداگر تھا۔ اس کے علاوہ ہتھیاروں کی خرید و فروخت اور عصمت فروشی کے اڈے بھی اس کے نام کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ اس کا سارا کاروبار غیر قانونی تھا اور وہ کسی وقت بھی قانون کی گرفت میں آسکتا تھا۔

"گویا وہ بوکن کی دلالی کر رہا تھا؟" اسٹرنگر نے پیٹرسن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وائٹ نے کندھے اچکائے اور بولا۔ "ممکن ہے کہ وہ کمیشن لیتا ہو۔"

"اس شہر میں بہت زیادہ گینگسٹر نہیں ہوں گے۔"

"تم جانتے ہو کہ بوکن میں مقابلے کا رجحان بہت زیادہ ہے۔"

دونوں چند لمحے خاموش رہے پھر اسٹرنگر نے وائٹ سے وہ کاغذ لیتے ہوئے کہا۔ "پیٹرسن نے چار سال پہلے اس شخص ہیکس کے لیے کام کیا تھا؟"

"ہاں۔"

"اس کے بعد کچھ نہیں کیا۔ پچھلی بار جب ہیکس پکڑا گیا تب بھی پیٹرسن خاموش رہا۔"

"اب وہ قانونی معاونت بھی فراہم نہیں کرتا۔"

"یعنی وہ بوکن کے لیے کام نہیں کر رہا؟"

"لیکن وہ اب بھی دلالی کرتا ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ بوکن کے آدمی اس بارے میں کیا سوچتے ہوں گے؟"

اسٹرنگر نے دوبارہ وہ کاغذ پڑھا اور بولا۔ "پھر ہمیں پیٹرسن کے پاس جا کر اس سے بات کرنی چاہیے۔"

وائٹ نے اپنی ٹائی کی ناٹ ٹھیک کی اور بولا۔ "کیوں نہیں۔ کم از کم یہ تو لگے گا کہ ہم کچھ کر رہے ہیں اور چیف کو بھی اطمینان ہو جائے گا۔"

☆☆☆

پیٹرسن ایک پستہ قد شخص تھا۔ اس کے سر کے بال ایک طرف سے غائب ہو رہے تھے اور اس کی بائیں آنکھ مستقل آدھی بند رہتی تھی۔ جب اسٹرنگر اور وائٹ اس کے دفتر پہنچے تو اس نے خوش دلی سے ان کا استقبال کیا۔ اسٹرنگر نے رسمی جملوں کا سہارا لینے کے بجائے مطلب کی بات کی اور کہا۔

"کئی سال پہلے تم نے ریمنڈ ہیکس نامی ایک شخص کی پیروی کی تھی۔"

"ہاں، مجھے یاد آ گیا۔ وہ ٹکٹوں کی دلالی کرتا ہے۔"

"تمہاری یادداشت بہت اچھی ہے۔" وائٹ بولا۔

"میرے کام میں اس کی ضرورت ہے۔ اچھی یادداشت اور اچھی جیکٹ۔"

اسٹرنگر نے کہا۔ "ہیکس مر چکا ہے۔"

"بہت افسوس ہوا۔ وہ اچھا لڑکا تھا اور اپنی ماں سے بہت محبت کرتا تھا۔"

"اس کی ماں بہت پریشان ہے۔" وائٹ نے کہا۔

"میں اس کے گھر دفتر کی طرف سے پھول بھیجوں گا۔"

اسٹرنگر نے کہا۔ "اس کیس کے ختم ہونے کے بعد تم نے بھی اس کے لیے کچھ نہیں کیا۔"

"جہاں تک میں جانتا ہوں۔ اس کی کوئی وجہ نہیں تھی۔"

"تم کسی کو قانونی مدد فراہم نہیں کرتے۔" وائٹ نے کہا۔ "پھر پہلی مرتبہ اس کی پیروی کیوں کی؟"

پیٹرسن نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اچھا سوال ہے کانسٹیبل وائٹ۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بہت تیز جا رہے ہو۔ چند سالوں بعد تم ہر ایک کو بتاؤ گے کہ اسے کیا کرنا ہے۔" اس نے مسکرا کر اسٹرنگر کی طرف دیکھا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "وہ کیس میں نے ایک اور موکل کا ساتھ دینے کے لیے لیا تھا۔"

"اس کا نام بتا سکتے ہو؟"

"پیٹرسن نے کہا۔ "میری بھی کچھ اخلاقیات ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم صفائی کے وکیلوں کے بارے میں کیا سوچتے ہو اور تمہیں یہ بھی اندازہ ہے کہ ہم کس کی نمائندگی کرتے ہیں۔ لیکن ہماری بھی ضرورت ہے اور ہمارا ایک کردار ہے۔ ہم اپنے موکل کو اس وقت تک بے گناہ سمجھتے ہیں جب تک جرم ثابت نہ ہو جائے اور اس سے بھی زیادہ اہم یہ کہ ہمارے بھی کچھ اصول ہیں۔"

اسٹرنگر نے کہا۔ "تم رازداری کا تحفظ کر رہے ہو؟"

"بالکل۔" پیٹرسن ناک پر چشمہ جماتے ہوئے بولا۔ "لیکن ممکن ہے کہ میں اپنے موکل سے خود ہی بات کر لوں۔ دیکھوں گا کہ وہ ریمنڈ کے بارے میں تم سے رضاکارانہ طور پر بات کرنے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔"

"یہ ایک قابلِ تعریف اقدام ہوگا۔" اسٹرنگر نے کہا۔

☆☆☆

پیٹرسن کا دفتر شہر کے وسط میں واقع سینٹ ونسٹن اسٹریٹ پر تھا۔ باہر آ کر دونوں سراغ رساں فٹ پاتھ پر آ کر اطراف کا جائزہ لینے لگے کہ کہیں ان کی نگرانی تو نہیں ہو رہی۔ اس کے بعد وہ سڑک کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس جگہ تک گئے جہاں ان کی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ انہیں راستے میں ایک بے گھر شخص ملا جو ہاتھ میں ایک پیالہ لیے ہوئے کھڑا تھا۔ وائٹ نے اپنی جیب میں سے چند سکے نکال کر اس کے پیالے میں ڈال دیے۔

راستے میں اسٹرنگر نے کہا۔ "جو بات میں نہیں سمجھ سکا وہ یہ کہ بیکس کامن ویلتھ گیمز کے ٹکٹوں کی دلالی کر رہا تھا۔"

"لیکن کسی کو یہ معلوم نہیں کہ اس نے وہ ٹکٹ کہاں سے حاصل کیے؟"

"وہ کیا اس کی کوئی اہمیت ہے۔ چاہے اس نے جعل سازی کی ہو یا انہیں دوبارہ فروخت کر رہا ہو۔ دونوں صورتوں میں وہ قانون شکنی کا مرتکب ہوا۔ کسی کو اس کی لاش سے وہ ٹکٹ نہیں ملے جو ہم نے سنا ہے اور نہ ہی اس کی جیبوں میں پائے گئے۔ کیا اس نے وہ تمام ٹکٹ بیچ دیے تھے یا کوئی لے گیا۔"

گاڑی میں سوار ہو کر اسٹرنگر نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی جبکہ وائٹ نے برابر والی نشست پر بیٹھ کر اسٹیریو آن کر دیا اور بولا۔ "وہ بوکن کے لیے دلالی کرتا تھا۔ ہم یہ بات جانتے ہیں گو کہ ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں۔"

"یقیناً۔" اسٹرنگر نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن لگتا ہے کہ پیٹرسن نے کسی بھی تنظیم سے اپنا تعلق ختم کر لیا ہے۔ اس نے بڑی مشکل سے بیکس کی پیروی کرنے کا اعتراف کیا۔ اس کا مطلب ہے کہ بیکس کا پیٹرسن سے کوئی رابطہ نہیں تھا اور وہ اپنے پرانے سپلائر کے لیے دلالی کر رہا تھا۔"

"ٹھیک ہے ایسا ہوتا ہے لیکن بوکن شاید کبھی بیکس سے نہیں ملا۔ تم جانتے ہو کہ اس کا کام کس طرح چلتا ہے۔ وہ روز بروز گوشہ نشین ہوتا جا رہا ہے۔ اپنے معاونین اور ان کی ایجنٹوں سے حصہ وصول کرتا ہے لیکن وہ خود ناقابلِ گرفت ہے۔"

"یقیناً لیکن وہ جانتا ہے کہ اس کے علم میں لائے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ ہم اس پر متفق ہیں۔"

اسٹرنگر کی توجہ سڑک پر تھی، اس نے کہا۔ "ہاں ٹھیک ہے۔"

"لہٰذا اگر بیکس اس کے لیے کام کر رہا تھا تو کم از کم بوکن کو اس کا نام تو معلوم ہوگا اور اس کی منظوری سے ہی وہ اس کام میں شامل ہوا ہوگا۔"

"درست۔"

"اس جیسا شخص کمیشن یا کسی اور بات کی پروا نہیں کرتا۔ وہ صرف اتنا کام کرتا ہے جس سے اس کا گزارہ ہو سکے۔ دلالی اس کا مشغلہ تھا اور اس طرح اسے کامن ویلتھ گیمز دیکھنے کا بھی موقع مل رہا تھا۔"

"پھر کسی نے اس پر چاقو سے حملہ کیوں کیا اور مرنے کے لیے چھوڑ کر چلا گیا۔"

"مجھے اس میں دو امکانات نظر آ رہے ہیں۔ اگر ہم غور کریں تو اس کا تعلق بوکن سے بنتا ہے۔ پہلا امکان یہ ہے کہ بیکس اس سے دھوکا کر رہا ہو اور زائد قیمت پر ٹکٹ

فروخت کر کے اصل معاہدے کی خلاف ورزی کر رہا ہو یا پھر اس نے یہ ٹکٹ چوری کیے ہوں۔"

"نہیں، بوگن کے عملے سے ٹکٹ چرانا ممکن نہیں۔ مجھے پہلا امکان زیادہ قریب لگتا ہے۔" اسٹرنگر نے کہا۔

"یعنی وہ بوگن کو دھوکا دے رہا تھا؟"

"یقیناً۔ اس کا براہِ راست بوگن سے واسطہ نہیں تھا۔ وہ محض اس کا آلۂ کار تھا۔ ممکن ہے اس نے یہی سوچا ہو کہ تھوڑی بہت ہیرا پھیری کا اسے پتا بھی نہیں چلے گا یا جس سے اس کی ڈیلنگ ہے، وہ بھی اس کا نوٹس نہ لے۔"

"پھر وہ کون ہے جس سے بیکس ڈیلنگ کر رہا تھا؟"

اسٹرنگر نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا رخ جنوب کی طرف تھا۔

☆☆☆

پرانے زمانے میں دکانوں کے باہر ایک چھوٹی سی تانبے کی گھنٹی لگی ہوئی تھی جو کسی گاہک کی آمد پر بجنے لگتی تھی۔ جب یہ دونوں سراغ رساں کونے کی ایک دکان میں داخل ہوئے تو اسی طرح کی الیکٹرانک گھنٹی بجنے لگی۔ دکاندار نے سر اٹھا کر آنے والے گاہک کو دیکھا۔ اس نے اسٹرنگر کو دیکھا جو ایک میگزین کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا پھر وہ کاؤنٹر پر جھکتے ہوئے بولا۔

"تھامس میکوری! کام کیسا چل رہا ہے؟"

"ٹھیک ہے۔ تم بتاؤ کیسے آنا ہوا؟"

اسٹرنگر مسکراتے ہوئے وائٹ کی طرف مڑا۔ "وائٹ، میں تمہیں مقامی کمیونٹی کی ایک اہم شخصیت تھامس میکوری سے ملواتا ہوں اور یہ سراغ رساں کانسٹیبل وائٹ ہے۔"

"کیا مجھے اپنے وکیل کو بلانے کی ضرورت ہے؟" میکوری نے کہا۔

"میں نہیں جانتا۔" وائٹ نے شیلف میں رکھے ہوئے ڈبوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

اسٹرنگر بولا۔ "کاروبار چاہے جیسا بھی ہو لیکن تمہاری حالت کیوں خراب ہو رہی ہے؟"

"لوگ پولیس والوں کی بو سونگھ لیتے ہیں۔ تمہارے جاتے ہی میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

"میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ تم ہمیں یہاں نہیں دیکھنا چاہتے۔"

"تم مجھے ہراساں کر رہے ہو۔" میکوری بولا۔

اسٹرنگر نے کہا۔ "تم جاننا چاہتے ہو کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟"

وائٹ نے کہا۔ "چند سال قبل تم جعلی ٹکٹ بیچ رہے تھے اور جیسا کہ میں نے سنا ہے چند عورتوں نے تمہارے خلاف گواہی بھی دی تھی۔"

اسٹرنگر نے کہا۔ "اس کے پاس اجازت نامہ تھا لیکن اس کے دل میں میل آ گیا۔" "یہ کام تم خود نہیں کر رہے تھے۔ اس کے لیے تم نے لڑکوں کی خدمات حاصل کیں۔ اگر ان کی بات کی جائے تو تم بیکس نامی لڑکے کو جانتے ہو؟"

میکوری نے آہستہ سے کندھے اچکائے۔ وائٹ نے

ایک سردار دوسرے سردار سے۔ ''آج رات کو نیشنل جیوگرافک چینل ضرور دیکھنا، اس میں 21 انچ کا کمن بھورا دکھائیں گے۔''

دوسرا سردار۔ ''یار میں تو نہیں دیکھ سکتا۔''

پہلا سردار۔ ''کیوں؟''

دوسرا سردار۔ ''ہمارا ٹی وی 14 انچ کا ہے۔''

مرسلہ: رضوان تنولی کریڑوی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

کہا۔ ''وہ آج صبح مردہ پایا گیا۔''

میکوری نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا، تب اسٹرنگر نے کہا۔ ''اسے چاقو کے وار کر کے قتل کیا گیا۔''

''میں اسے نہیں جانتا۔''

وائٹ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ کامن ویلتھ گیمز کے ٹکٹوں کی دلالی کر رہا تھا۔''

''کیا وہ ٹکٹ جعلی تھے؟''

''لوگ مختلف باتیں کر رہے ہیں۔''

میکوری نے کہا۔ ''ان دنوں میں یہ دکان چلا رہا ہوں۔ اس کے علاوہ کوئی اور کاروبار نہیں۔ یہ کام سب کے سامنے ہے اور اس میں کوئی بے ایمانی نہیں۔''

''اگر ہم تمہارے مالی معاملات کا جائزہ لیں تو سب کچھ ظاہر ہو جائے گا۔''

''تمہارے پاس وارنٹ ہے۔'' میکوری نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے کہ تم اس طرح یہاں آکر بے بنیاد الزامات نہیں لگا سکتے۔''

تینوں کچھ دیر خاموش کھڑے رہے پھر میکوری بولا۔ ''مجھے گرفتار کرلو۔ مجھ سے پوچھ گچھ کرو، مجھے جیل میں بند کر دو یا میری دکان پر تالا لگا دو۔''

جب وہ جانے لگے تو اسٹرنگر نے پلٹ کر ایک اور جملہ کہا۔ ''تمہارا اس لڑکے سے ایک تعلق بنتا ہے کہ تم دونوں کا ایک ہی وکیل ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر اس نے تمہیں پہلے فون نہیں کیا تو بہت جلد کرے گا۔''

واپسی میں وائٹ نے پوچھا۔ ''ہم نے اب تک کیا حاصل کیا؟''

''یہ ایک منجمد کیس ہے۔ ہم صرف انہیں جتا سکتے ہیں کہ احمق نہیں ہیں اور جانتے ہیں کہ یہیں کیا کرنا ہے۔''

''میں ایک بار پھر پوچھوں گا کہ ہم نے درحقیقت کیا حاصل کیا۔ اس سے ہم کس طرح بیکس کی موت کا معما حل کر سکتے ہیں۔''

''اگر کچھ حاصل نہیں کیا تب بھی یہ احساس ہی بہت دل خوش کن ہے کہ وہ جان جائیں۔ جلد یا بدیر وہ پکڑے جائیں گے۔ ان کے بڑوں کو سوچنے دو کہ ہم اس کیس کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور صرف اس لیے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھے کہ ہم انہیں مجرم ثابت نہیں کر سکتے بلکہ مشتبہ بھی نہیں سمجھتے۔ اس وقت میکوری فون کر کے بوکن کو بتا رہا ہوگا کہ ہماری نگرانی کی ضرورت ہے۔ یوں سمجھ لو کہ ہم اور بوکن حالتِ جنگ میں ہیں اور ایک دوسرے کو گھیر رہے ہیں لیکن تم دیکھ لینا کہ ایک دن ہماری جیت ہوگی۔''

''تم بہت پُراعتماد لگ رہے ہو۔'' وائٹ نے کہا۔

''ہونا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرا راستہ کیا ہے؟''

جب وہ دفتر پہنچے تو چیف انسپکٹر براؤن نے انہیں راستے میں ہی پکڑ لیا اور بولا۔

''تم ساری زندگی ٹھوکریں کھاتے رہے ہو۔ جانتا ہوں یہ بھی پولیس والوں کا ایک طریقہ ہے۔ تم صرف بے وقوفوں کی طرح اپنی انگلیاں دانتوں میں دبائے کھڑے رہو تاوقتیکہ کیس خود بخود حل نہ ہو جائے۔''

''سر؟''

براؤن نے انہیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور دونوں کو انٹرویو روم نمبر دو میں لے گیا۔ باہر کھڑے ہو کر اس نے کہا۔ ''ہم تم دونوں کے واپس آنے کا انتظار کر رہے تھے تاکہ تم اس سے بات کر سکو۔ یہ شخص ایک پرائیویٹ پراپرٹی میں داخل ہو گیا تھا۔ کسی نے اسے دیکھ لیا۔ وہاں کے لوگوں کے لیے یہ ایک غیر معمولی بات تھی چنانچہ اس نے پولیس کو اطلاع دے دی۔ جب اسے گرفتار کیا گیا تو اس کے ابتدائی الفاظ یہ تھے۔ ''میرا اسے مارنے کا مقصد نہیں تھا۔ میرا یہ مقصد نہیں تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے کوئی جرم سرزد ہوا ہے۔''

''تم نے کیسے جانا کہ یہی ہمارا مشتبہ شخص ہے؟''

''پہلی بات تو یہ کہ اس کے پاس سے کامن ویلتھ گیمز کے پچیس جعلی ٹکٹ برآمد ہوئے اور جب اسے کچھ تصویریں دکھائی گئیں تاکہ اسے اندازہ ہو جائے کہ اس نے کس کو لوٹا ہے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور اس نے اعترافِ جرم کر لیا۔''

وائٹ نے کہا۔ ''کیا اس نے بتایا کہ ایسا کیوں

کیا؟''

''تم کس بات کی تنخواہ لیتے ہو۔ اندر جاؤ اور اُس سے پوچھو۔''

وہ لڑکا بائیس سال کا تھا۔ دبلا پتلا اور زرد رُو۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور اس کے سیاہ بال چہرے پر جھول رہے تھے۔ وہ بڑبڑا رہا تھا اور ایک ایک کر کے اپنے بال نوچ رہا تھا۔

''بلی۔'' اسٹرنگر نے کہا۔ ''جانتے ہو کہ اس وقت کہاں ہو؟''

''بلی نے لمحہ بھر کے لیے دیکھا اور بولا۔ ''کیا مجھے موت کی کرسی پر بٹھایا جائے گا؟''

''یہ اسکاٹ لینڈ ہے۔ ہمارے یہاں سزائے موت نہیں ہوتی۔''

''چاہے میں نے کسی کو قتل ہی کیوں نہ کیا ہو؟''

''ہمارے پاس وکیل ہیں اور ان میں سے کسی ایک کو تمہارے لیے بلانا ہوگا کیونکہ ہماری گفتگو کے دوران تمہیں اس کی ضرورت ہوگی ورنہ جو کچھ تم کہو گے، وہ ناقابلِ تسلیم ہوگا۔''

''کیا؟''

''کیا تمہارا کوئی وکیل ہے؟''

''نہیں۔''

''ہم گفتگو شروع کرنے والے ہیں......''

''ہر کوئی جانتا تھا کہ اس کے پاس ٹکٹ ہیں۔'' وہ بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''وہ انہیں بیچ کر پیسے بنا رہا تھا۔''

''بلی......''

''مجھے صرف ایک ٹکٹ چاہیے تھا۔ میں نے سوچا کہ وہ کوئی سخت آدمی نہیں ہے اور مزاحمت نہیں کرے گا اس لیے میرا خیال تھا کہ اس سے ایک ٹکٹ لے لوں۔''

وائٹ ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''لہٰذا تم نے سوچا کہ اُسے لوٹ لو۔''

اسٹرنگر نے ہاتھ اوپر کر کے اپنے ساتھی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ بلی اس وقت جو کہہ رہا تھا، وہ بعد میں اس سے مکر بھی سکتا تھا۔ اس لیے ایک وکیل کی موجودگی ضروری تھی۔ وہ زمانہ گیا جب وہ کسی شخص کو چھ گھنٹے تک کسی وکیل کے بغیر بھی رکھ سکتے تھے لیکن نئے قانون کے مطابق دورانِ تفتیش وکیل کی موجودگی ضروری تھی۔

گو کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ بلی بات کرنا چاہ رہا تھا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''میں نے اس کا پیچھا کیا اور سیڑھیوں پر پہنچ کر چاقو نکال لیا اور کہا کہ اگر وہ ٹکٹ نہیں دے گا تو میں اس کے ٹکڑے کر دوں گا۔ اس نے مجھے دیکھا اور ہنسنے لگا جیسے میں نے اسے کوئی لطیفہ سنایا ہو۔ لیکن میں مذاق نہیں کر رہا تھا۔ میرا مقصد اُسے ہلکا سا کٹ لگانا تھا تاکہ یہ ظاہر ہو سکے کہ میں سنجیدہ ہوں۔''

دونوں سراغ رساں میز پر جھکے ہوئے تھے۔ ان تینوں کے لیے دنیا اس کمرے کی چار دیواری میں سمٹ آئی تھی۔ بلی اعتراف کرنا چاہتا تھا۔ وہ کوئی بدمعاش، جرائم پیشہ یا نفسیاتی مریض نہیں تھا۔ وہ جس انداز میں بیٹھا ہوا تھا جس طرح اس کا دبلا پتلا جسم مختلف زاویوں سے حرکت کرتا تھا اور جس طرح وہ اپنی انگلیاں بالوں میں پھیر رہا تھا۔ وہ سب اس کے جرم کی داستان سنا رہے تھے۔

''میرا مقصد صرف ایک چھوٹا سا کٹ لگانا تھا۔ اس کے چہرے پر پھر میں نے دوسرا تیسرا اور چوتھا وار کیا۔ مجھے ان کی تعداد یاد نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ رونے لگا۔ ''میں نے اسے مار ڈالا۔ اس کے ٹکٹ لیے اور وہاں سے بھاگ گیا۔ کسی نے مجھے نہیں دیکھا۔ کسی نے نہیں۔''

''اسٹرنگر اور وائٹ کے درمیان نگاہوں کا تبادلہ ہوا اور انہوں نے اسے بولنے دیا کیونکہ اسے اس کی ضرورت تھی۔

اس شام اسٹرنگر اپنی رپورٹ تیار کر رہا تھا۔ وائٹ اس کے برابر میں بیٹھا الفاظ کے چناؤ اور تفصیلات پر بحث کر رہا تھا۔ اس رپورٹ کو جمع کرنے سے پہلے انہوں نے ایک وقفہ لیا اور سستانے بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد اسٹرنگر نے کہا۔ ''کیا خیال ہے یہ رپورٹ جمع کر دی جائے۔ جانے کا وقت ہو رہا ہے۔''

''کیوں نہیں؟''

انہوں نے رپورٹ جمع کرائی اور اپنی جیکٹیں سنبھال لیں۔ براؤن اپنے دفتر سے باہر آیا۔ اس نے انہیں جاتے ہوئے دیکھا تو زور سے بولا۔ ''اے...... تم دونوں ایک منٹ رکو۔''

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ انہیں چند سیکنڈ کی تاخیر ہوگئی ورنہ وہ براؤن کی پہنچ سے دور ہو جاتے۔

''تم پیٹرسن سے ملنے گئے تھے؟''

''ہاں۔''

''تب تم تیار ہو جاؤ۔''

''کس کام کے لیے؟'' اسٹرنگر نے پوچھا۔

''اس کی لاش ابھی ابھی دریا سے باہر آئی ہے۔''

''جائے وقوعہ پر جاؤ اور اُسے ایک نظر دیکھ لو۔''

وہاں خاصی گہما گہمی تھی۔ پل کو پہلے ہی بند کر دیا گیا تھا۔ وہاں راہ گیر جمع ہونا شروع ہو گئے تھے تاکہ وہاں ہونے والے واقعہ کی جھلک دیکھ سکیں۔ اسٹرنگر اور وائٹ نے کچھ فاصلے پر گاڑی کھڑی کی اور پیدل ہی جائے وقوعہ کی جانب چل دیے۔ دونوں نے پولیس کی وردی پہن رکھی تھی۔ اس لیے انہیں ہجوم کے درمیان راستہ بنانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ انہیں جائے وقوعہ سے کچھ فاصلے پر روک دیا گیا۔ اس سے پہلے کہ متعلقہ پولیس افسر اُن تک پہنچتی۔ سارجنٹ کیلر ہلکے نقش و نگار کی عورت تھی جس نے اپنے سیاہ بالوں کو پیچھے کی طرف باندھ رکھا تھا۔ اس نے اپنا سر نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال تھا کہ اس نے خودکشی کی ہے جب انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ کون تھا۔''

اسٹرنگر اور وائٹ کے درمیان نظروں کا تبادلہ ہوا۔

''تمہیں کسی نے نہیں بتایا؟''

اسٹرنگر اپنی مسکراہٹ نہ روک سکا۔ ''شاید چیف نے ہمیں چھوٹا سا اشارہ دیا تھا۔''

وائٹ نے کہا۔ ''اس نے ہم سے پوچھا تھا کہ کیا ہم صبح میں اس سے ملے تھے۔''

''پھر تم جان جاؤ گے کہ اس کا گلا کس نے کاٹا ہے۔''

اسٹرنگر وہاں سے چل دیا اور پل پر کھڑے ہو کر پانی میں دیکھنے لگا۔ اندھیرے میں اس کا رنگ مختلف لگ رہا تھا۔ وہ آپ کے سارے گناہ چھپا سکتا ہے اور اس تمام دہشت کو نگل لیتا ہے جو شہر والے اس میں پھینکتے ہیں۔

وائٹ اس کے پاس چلتا ہوا آیا اور وہ بھی اس کے ساتھ کھڑے ہو کر پانی کو دیکھنے لگا۔

''ہم بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔''

''جس کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ ہم سازشیوں اور منصوبہ سازوں کا پیچھا کرتے رہے جبکہ ہمیں صرف ایک احمق شخص کو تلاش کرنا تھا جسے اپنے آپ پر قابو نہ رہا۔''

''پھر پیٹرسن کو کیوں قتل کیا گیا؟''

''کیونکہ لگتا ہے کہ وہ ایسی باتیں کر رہا تھا جس کا اُسے اختیار نہ تھا اور وہ رازداری کے اصول کے خلاف تھیں۔ ممکن ہے کہ جب ہم اس سے ملنے گئے تو اس نے بوکن کو بتا دیا ہو اور خود اس سے ملنے چلا گیا ہو لیکن جب میں نے میکنزی کے

[illegible] بجنے لگی۔ تم جانتے ہو کہ بعد میں افسوس کرنے سے بہتر ہے کہ اس سے پہلے ہی اپنے تحفظ کا بندوبست کر لیا جائے اور پیغام بھیجنے کا اس سے بہتر طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک ایسے شخص کو قتل کر دیا جائے جس کے بارے میں ہم سمجھ رہے تھے کہ وہ تنظیم کے لیے ناگزیر ہے۔

''ہم جانتے ہیں کہ اُسے کس نے قتل کیا یا کم از کم کس کے حکم پر اُسے مارا گیا۔''

''لیکن ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ دونوں واقعات کے پیچھے ایک ہی ہاتھ ہے لیکن ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔''

''لیکن بیکس کا قاتل تو پکڑا گیا۔ بلی نے خود اس قتل کا اعتراف کیا ہے۔'' وائٹ بولا۔

''وہ بھی ہمیں غلط راستے پر ڈالنے کی کوشش تھی۔ میں نے اس کی باتوں پر بالکل بھی یقین نہیں کیا۔ اسی لیے میں چاہ رہا تھا کہ وہ وکیل کی موجودگی میں بیان دے تاکہ بعد میں وہ اس سے نہ مکر سکے لیکن اسے جلدی ہو رہی تھی اور اس کا مقصد یہی تھا کہ ہم معاملے کی تہ تک نہ پہنچ سکیں۔ میں سو فیصد یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ عدالت میں اس کا بیان اس سے بالکل مختلف ہوگا اور پیٹرسن جیسا کوئی اور وکیل اُسے نکال لے جائے گا۔''

وائٹ نے پانی میں تھوکتے ہوئے کہا۔ ''تو یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہے گا؟''

''ہاں جب تک بوکن خود براہِ راست کسی معاملے میں ملوث نہیں ہوتا یا اس کا کوئی ایجنٹ ہمارے ہاتھ نہیں لگ جاتا۔ ظاہر ہے کہ ہم کسی ثبوت کے بغیر کوئی کارروائی نہیں کر سکتے۔''

''کتنی عجیب بات ہے کہ ایک ہی دن میں دو واقعات ہو گئے اور ہم اصل مجرم کو جانتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتے۔'' وائٹ نے بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

''جب تک بوکن جیسے لوگ موجود ہیں۔ یہی کچھ ہوتا رہے گا۔'' اسٹرنگر نے جواب دیا۔

وہ دونوں چلتے ہوئے واپس اس مقام تک پہنچے جہاں لاش پانی سے باہر آئی تھی۔ عین ان کے سر پر ایک ہیلی کاپٹر منڈلا رہا تھا اور اس سے جائے وقوعہ پر روشنی کا دائرہ ڈالا جا رہا تھا۔ جلد ہی وہ لائٹ بجھ گئی اور ہیلی کاپٹر نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔

جھوٹ

عکسِ فاطمہ

کچھ فیصلے وقت اور حالات کے مطابق از خود سرزد ہوتے چلے جاتے ہیں... اس نے بھی صورتِ حال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے فی الفور ایک پھندا تیار کیا... وہ شخص نظروں میں آگیا جس کی گردن تیار کردہ پھندے کے لیے بے حد مناسب تھی...

سچ اور جھوٹ کی گرد میں الجھ جانے والی کہانی کا کلائمیکس

جینس ایک طرف ڈبک گئی جب ٹونی روزاردو اس کے پاس سے تیزی سے دوڑتا ہوا کیرولین برنین کے دو کمروں میں تقسیم مکان کے دروازے سے باہر نکل گیا۔

”ہیلپ...... مرڈر!“ جینس نے صحن میں دوڑتے ہوئے چیخنا شروع کردیا۔

ٹونی نے پلٹ کر کینہ توز نگاہوں سے جینس کی طرف دیکھا، پھر ایک جھٹکے سے اپنی سرخ اسپورٹس کار کا دروازہ کھولا اور لپک کر اس میں سوار ہوگیا۔ اس نے اگنیشن کا
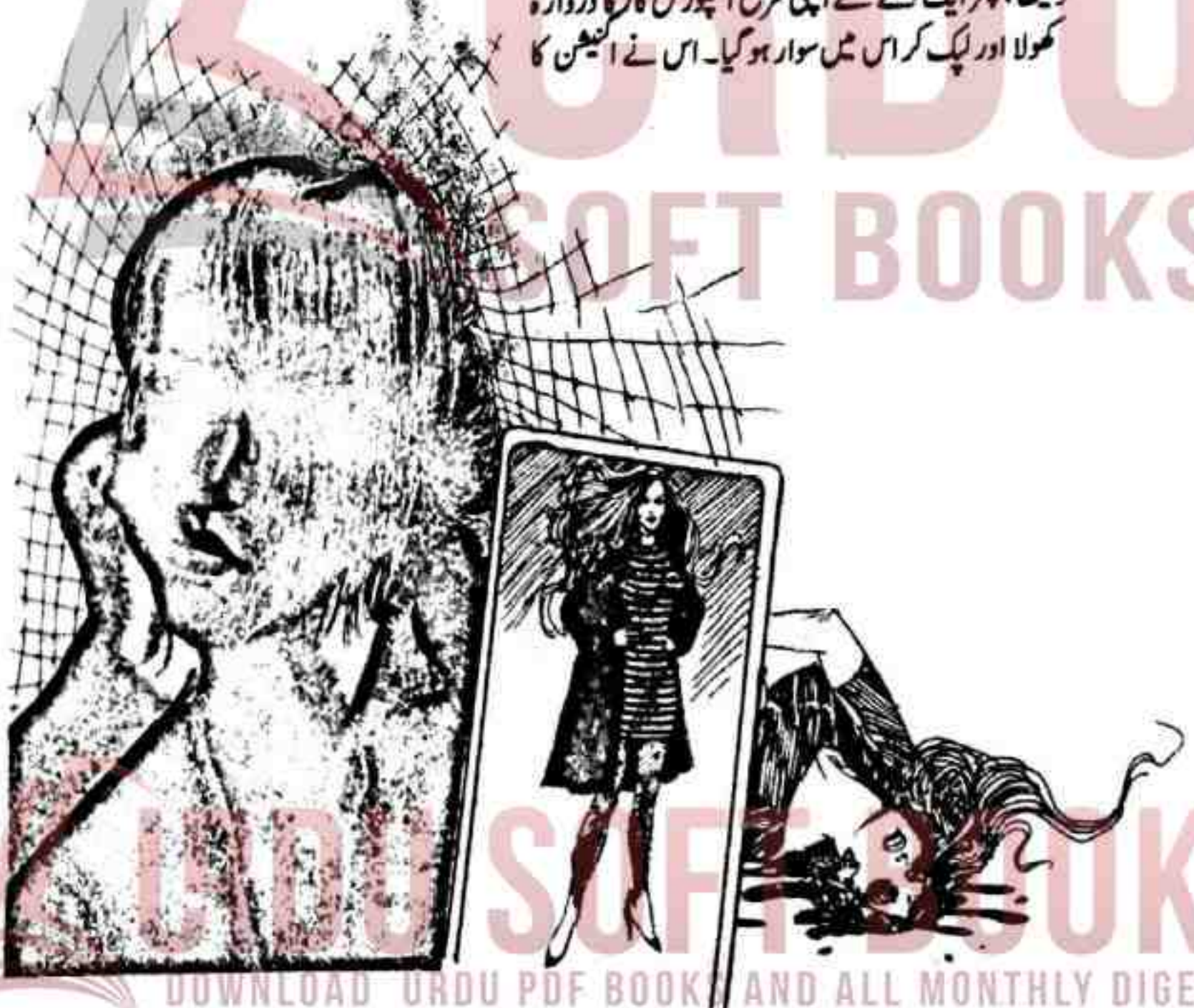
سوچ آن کیا۔ انجن نے ایک بار جھرجھری لی...... دوسری بار جھرجھری لی اور پھر خاموش ہوگیا۔

ٹونی فوراً ہی کار سے اتر کر فٹ پاتھ پر آگیا اور جینس کے پاس پہنچ کر اس کا بازو جھنجوڑتے ہوئے بولا۔ ”یہ میں نے نہیں کیا۔ میں اس سے محبت کرتا تھا۔“

اس وقت تک وہاں کچھ لوگ بھی جمع ہو چکے تھے۔ ان میں ایک پولیس مین بھی تھا جو اپنی ڈیوٹی ختم کر کے واپس جارہا تھا۔ وہ لپکا اور ایک جست لگا کر ٹونی کو رگیدتا ہوا زمین پر آرہا۔

ٹونی پر قابو پانے کے بعد وہ جینس سے مخاطب ہوا۔ ”تمہیں کوئی گزند تو نہیں آئی، میڈم؟ تم ٹھیک تو ہو نا؟“

جینس نے کانپتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”ہاں...... میں ٹھیک ہوں...... لیکن میرے برابر میں رہنے والی عورت کیرولین...... اوہ، میں نہیں سمجھتی کہ اس بے چاری کے لیے کچھ کیا جاسکتا ہے۔ میرے خیال سے اس نے اسے قتل کر دیا ہے۔“

☆☆☆

”مجھے ہر بات تفصیل سے بتاؤ کہ کیا ہوا تھا، مس جینس۔“ سراغ رساں مولی ملرائے نے کہا۔ وہ اپنے پارٹنر سراغ رساں اسٹینلے کے ہمراہ اسی علاقے میں موجود تھی اور فوراً ہی جائے وقوعہ پر پہنچ گئی۔

جینس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”میں کوشش کروں گی۔“ وہ ڈوپلیکس کے سامنے کے چبوترے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ”میں اپنے کچن ٹیبل پر سیریل اور کافی کا ناشتا کر رہی تھی اور اخبار پڑھ رہی تھی کہ اچانک مجھے اپنی پڑوسن کیرولین کی چیخ سنائی دی۔ ہمارے کچن کی مشترکہ دیوار پتلی ہے۔ اس کی چیخ کی آواز پر میں نے جھرجھری سی لی اور اپنے دروازے سے نکل کر اس کے دروازے پر پہنچی۔ میں نے دیکھا کہ ٹونی، کیرولین پر جھکا ہوا تھا۔ اس نے جب مجھے دیکھا تو......“ جینس نے اپنا سر جھکا لیا اور سسکی لینے لگی۔

”اس نے جب تمہیں دیکھا تو پھر کیا ہوا، مس جینس؟“ سراغ رساں مولی ملرائے نے پوچھا۔

”اس کی آنکھیں۔“ جینس نے کہا۔ ”ان میں نفرت کی آگ دہک رہی تھی۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے نظریں اٹھا کر سراغ رساں کی گہری سیاہ آنکھوں میں جھانکا۔ ”مجھے اس شخص سے ہمیشہ خوف آتا تھا۔ شاید تمہارے علم میں ہوگا، وہ جیل بھی جا چکا ہے اور اکثر کیرولین پر جبر کیا کرتا تھا اور اب آخر کار اس نے اپنی حسرت پوری کر لی اور اس بے چاری کو مار ڈالا۔ میں چیختی ہوئی بیرونی دروازے کی جانب دوڑی اور وہ میرے پیچھے لپکا۔ لیکن پھر آخری لمحے میں اس نے اپنا رخ اپنی اسپورٹس کار کی جانب کرلیا۔ لیکن وہ اسے اسٹارٹ نہ کر سکا۔“

”کیا تم نے اسے حقیقت میں مس کیرولین پر حملہ کرتے ہوئے دیکھا تھا؟“

”نہیں۔“ جینس نے جواب دیا۔ ”میں نے تو صرف اس کے چہرے کے تاثرات اور اس کی آنکھوں میں چھائی نفرت کی آگ دیکھی تھی جب اس نے میری جانب دیکھا تھا۔“

سراغ رساں مولی ملرائے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ لیکن اس سے قبل کہ وہ مزید کچھ کہتی اس کے پارٹنر سراغ رساں اسٹینلے نے کیرولین کے گھر کے دروازے سے گردن نکالتے ہوئے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ ”مولی، بیڈروم میں ایک ایسی شے موجود ہے جسے تمہیں ضرور دیکھنا چاہیے......“

”وہ کیا شے ہے؟“

”ایک جیولری بکس ہے جس کی چیزیں فرش پر بکھری ہوئی ہیں۔“

”تم یہیں انتظار کرو۔“ سراغ رساں مولی نے جینس سے کہا۔ پھر وہ سراغ رساں اسٹینلے کے پیچھے کیرولین کے گھر کے اندر چلی گئی۔

☆☆☆

”تمہیں چند لمحے کے لیے میرے ہمراہ اپنے کچن میں چلنا ہوگا مس جینس۔“ جینس کے کانوں میں ایک آواز سنائی دی تو وہ چونک پڑی۔

اس نے آواز کی سمت گردن گھمائی۔ وہ سراغ رساں مولی تھی۔

”کیا؟“ جینس نے پلکیں جھپکاتے ہوئے قدرے حیرانی سے کہا۔ ”میرے کچن میں؟“

”ہاں، ہم آواز کا ایک چھوٹا سا تجربہ کرنا چاہتے ہیں۔“

”اوہ!“ جینس نے قدرے اطمینان کا سانس لیا۔ یہ سراغ رساں عورت تو بے حد ذہین اور چالاک لگتی ہے، جینس نے دل ہی دل میں کہا۔ وہ کیرولین کی چیخ سنائی دینے کی جینس کی داستان کی تصدیق کرنا چاہتی ہے۔ وہ ٹونی کو مجرم ثابت کرنے سے قبل تمام ضروری قانونی تقاضے پورا کرنا چاہتی ہے۔

جینس سراغ رساں مولی کو ساتھ لے کر اپنے کچن میں آگئی۔ اس تجربے کے بارے میں وہ پُراعتماد تھی۔ اسے یقین

تھا کہ کچن کی مشترکہ دیوار کے پار سے دوسری جانب سے چیخ کی آواز یقیناً اس کے کچن میں سنائی دے جائے گی۔

سراغ رساں مولی، جینس کے کچن کی کرسی پر بیٹھ گئی اور اس نے اپنی ایک کہنی خالی کچن ٹیبل پر ٹکائی پھر اپنے سیل فون پر اپنے پارٹنر سے رابطہ قائم کرتے ہوئے بولی۔

''اوکے اسٹینلے، میں تیار ہوں۔''

فوراً ہی دیوار کی دوسری جانب سے ایک مرد کے چیخنے کی بلند آواز سنائی دی۔

جینس نے بمشکل تمام اپنی مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے استفہامیہ نگاہوں سے سراغ رساں مولی کی جانب دیکھا۔

''تھینک یو میڈم۔'' سراغ رساں مولی نے کہا۔

جینس نے سراغ رساں کو اپنے گھر سے رخصت کیا اور اپنے خستہ حال کاؤچ پر دراز ہو گئی۔ اس نے اپنی کامیابی پر بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ وہ اپنے منصوبے میں کامیاب رہی تھی۔

اور ٹونی...... اس کے بچ نکلنے کا اب کوئی امکان نہیں تھا۔ اپنے غصیلے مزاج، اپنے پولیس ریکارڈ اور جائے وقوعہ سے راہ فرار اختیار کرنے کی ناکام کوشش اسے بہ آسانی مجرم ثابت کر سکتی تھی۔

جینس نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا۔ پھر جشن منانے کے لیے وائن کا ایک جام پینے کا ارادہ کیا۔ ابھی اس نے کچن کا آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ دروازے کی اطلاعی گھنٹی بج اٹھی۔

اب کون ہو سکتا ہے؟ ٹوہ لینے والے پڑوسی؟ اخباری نمائندے؟

جینس نے دروازہ کھولا تو سامنے سراغ رساں مولی اور اس کا پارٹنر سراغ رساں اسٹینلے کھڑے تھے۔

''تم ہم سے جھوٹ بولتی رہی ہو؟'' سراغ رساں مولی نے کہا۔ ''تم اس وقت اپنے ناشتے کے درمیان سے اٹھ کر کیرولین کے گھر کی جانب لپک کر نہیں گئی تھیں جب تم نے اس کی چیخ سنی تھی۔''

''یقیناً میں اپنا ناشتا ادھورا چھوڑ کر اس کے گھر کی جانب لپکی تھی۔'' جینس نے تڑخ کر جواب دیا۔

''تو پھر اس وقت تمہارے کچن ٹیبل پر کوئی بھی شے موجود نہیں تھی جب ہم نے وہاں بیٹھ کر آواز کا تجربہ کیا تھا؟ نہ سیریل کا پیالہ، نہ کافی کا کپ، نہ اخبار...... کچھ بھی تو نہیں تھا۔''

جینس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس کے حلق سے کوئی الفاظ نہ نکل سکے۔

اور جب تم نے اس کے بعد جھوٹ بولا تھا تو......

ہاں، میں شرطیہ کہہ سکتی ہوں کہ ہمیں مس کیرولین کے جیولری بکس پر تمہاری انگلیوں کے نشانات بھی مل جائیں گے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ تم سچ سچ سب کچھ بتا دو۔ ورنہ تھانے جا کر تم سے حقیقت اگلوالی جائے گی۔'' سراغ رساں مولی نے تنبیہی لہجے میں کہا۔

جینس نے اپنا سر اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور اس مرتبہ وہ حقیقی آنسوؤں سے رو پڑی۔ ''میرا اسے مار ڈالنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں تو صرف اس کی قیمتی جیولری اور کچھ نقدی چرانا چاہتی تھی۔ میرے پاس کیرولین کے گھر کے عقبی دروازے کی چابی موجود تھی جو چند ماہ قبل اس نے اپنے گھریلو پودوں کی دیکھ بھال کے لیے مجھے دی تھی۔ لہٰذا کیرولین کے گھر میں داخل ہونا کوئی پرابلم نہیں تھا۔ لیکن میں اپنے ارادے میں اس لیے کامیاب نہ ہو سکی کیونکہ کیرولین غیر متوقع طور پر اپنی سنڈے مارننگ کی واک سے معمول سے پہلے واپس آ گئی تھی، اس نے چوری کرتے ہوئے مجھے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔''

''میں پولیس کو فون کر رہی ہوں۔'' اس نے مجھے دھمکی دی تھی۔'' جینس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں اس کے پیچھے لپکی اور اس کے ہاتھ میں موجود سیل فون کو جھپٹ کر دور پھینک دیا اور اسے دھکا دے دیا۔ کیرولین کا سر کاؤنٹر کے تیز دھار کنارے سے ٹکرایا اور وہ فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ عین اسی لمحے ٹونی بھی وہاں آ گیا۔ میں عین موقع پر پکڑی جا سکتی تھی۔ یہ تو شکر ہے کہ وہ احمق کیرولین کا نام پکارتا ہوا اس کے گھر میں داخل ہوا تھا۔ اس طرح مجھے ایک کونے میں دبکنے کا موقع مل گیا تھا۔ سو بظاہر ایسا ہی لگا جیسے کہ موقع پر سب سے پہلے موجود ہونے والا فرد ٹونی ہی تھا۔ میں اسی کو اس جرم میں پھنسانا چاہتی تھی۔ اسی لیے میں نے تمام جھوٹ گھڑے تھے۔'' جینس نے اپنے جرم کا اقرار کرتے ہوئے کہا۔

ٹونی روزِ اوّل سے مسلسل بے گناہ اور معصوم ہونے کا دعویٰ کر رہا تھا۔ جینس کے اقرارِ جرم نے ٹونی کی یہ بات درست ثابت کر دی کہ وہ حقیقت میں بے گناہ تھا۔

''اسے ہتھکڑی پہنا دو۔'' سراغ رساں مولی نے اپنے ساتھی سراغ رساں اسٹینلے سے کہا۔ ''میڈم اب تمہیں ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا۔ تمہیں خاموشی اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔ تم چاہو تو اپنے وکیل کو تھانے میں طلب کر سکتی ہو۔''

آوارہ گرد

قسط: 37

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے [illegible] کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگارنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحریر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

گزشتہ اقساط کا خلاصہ
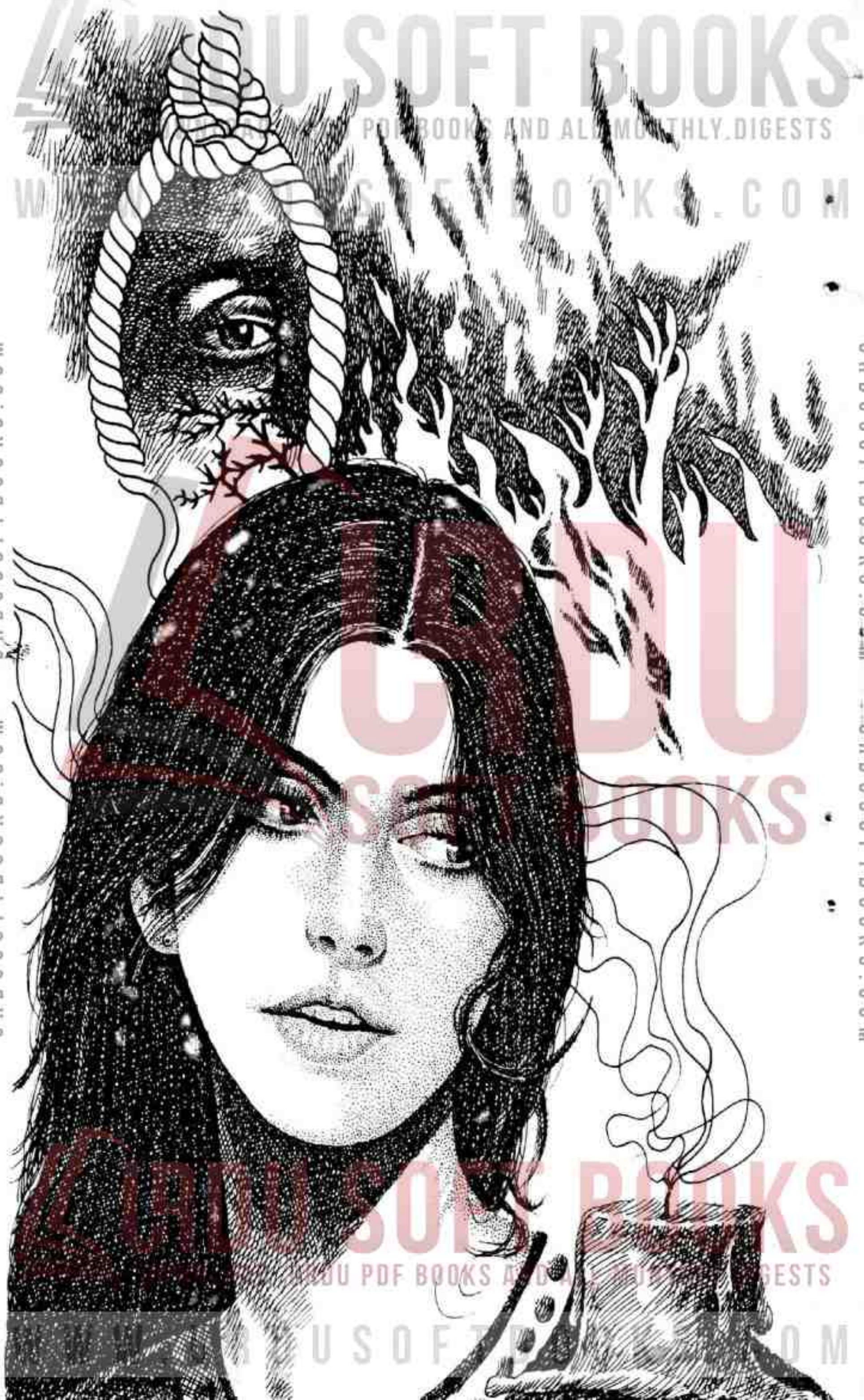
شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی شہزی کو اس سے انسیت ہو گئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرِ نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہو گئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ ایک دن اچانک سرمد بابا کو اس کی بہو عارفہ ادارے سے لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ شہزی کو اپنے اس بوڑھے دوست کے یوں چلے جانے پر بے حد دکھ ہوا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون مختاری بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کمیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازع عرصے سے چل رہا تھا۔ زہرہ بانو شہزی کو دیکھ کر بے ہوش ہو جاتی ہے۔ کمیل دادا شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آ رہا تھا۔ زہرہ بانو، شفیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ "اسپیکٹرم" کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہو جاتی ہے۔ بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے۔ وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمپنی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر لیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ ایک لودو تیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو تلاش کر لیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام مجاہد اور غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو ٹمسی کا ایک افسر کرنل بی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیو ٹمسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ شہزی، کمیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کمیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر لیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر لیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر لیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، ہشام مجھکڑی سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ ہشام اسے پاکستان میں سوئٹ جو زلو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہو چکا ہے اور تین ممالک ہٹلر کی طرح اس ہیرے کی آڑ میں تیسری عالمی جنگ چھڑوانا چاہتے ہیں۔ جسے انہوں نے ورلڈ بگ بینگ کا نام دے رکھا ہے۔ لولوش اور بی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیو ٹمسی کے چند ساتھ ہشام اور کورنیلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر بلیو ٹمسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں وہاں پہلی بار بلیو ٹمسی کے چیف بی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہو گئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھونک کو بے بس کر دیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد ایک ساحل پر جا پہنچتے ہیں۔ وہاں ایک بوڑھا جوگی بابا ان کو اپنی جھونپڑی میں لے جاتا ہے۔ شہزی کی حالت بے حد خراب ہو چکی تھی۔ جوگی بابا اس کا علاج کرتا ہے وہیں پتا چلتا ہے کہ یہ بوڑھا جوگیوں کے ذریعے لوگوں کا خون نچوڑتا تھا۔ شہزی کے دشمن مسلسل تعاقب کرتے ہوئے اس جھونپڑی تک آ پہنچتے ہیں مگر شہزی اس بوڑھے سمیت جھونپڑی کو آگ لگا دیتا ہے اور سوشیلا کے ہمراہ وہاں سے فرار ہو جاتا ہے...... اور بھٹکتے بھٹکتے ایک بستی میں جا پہنچتا ہے۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پر فریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چند ساتھ حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف بی جی بھجوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک ریتا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ ریتا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں ریتا کے باڈی گارڈ وہاں آ جاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہو گیا تھا۔ ابھی شہزی اس انکشاف کے زیرِ اثر تھا کہ ریتا کا سیل فون بج اٹھتا ہے۔ کال سنتے ہی ریتا

شہزی چالاکی سے بلراج کو قابو کر لیتا ہے اور ربنا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ربنا شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیو ٹیکسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیو ٹیکسی۔ کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھوانی شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کیلی داوا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی ''انڈیمان'' پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں کوریلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو ''گل مجارد'' پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا شکور کے ہمراہ گل مجارو کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ نانا شکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ جھاڑی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ نانا شکور کے گارڈ اور ڈرائیور مارے جاتے ہیں۔ سوشیلا کے پیر میں تیر لگ جاتا ہے اور وہ زخمی ہو جاتی ہے۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ کوریلا اور سے جی کو ہارا سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ غیبی مدد کے طور پر اڈوسے کوریلا اور سے جی کو ہارا کے رستے میں آ جاتے ہیں۔ شہزی، سوشیلا کے ساتھ سے جی کو ہارا کی جیپ میں بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدِ نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کر سکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔ یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے مگر سوشیلا کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کر کے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں بری مسلم گروپ کا مجاہد تو لا ان پر حملہ کر دیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم بری مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے۔ پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں گل مجارین سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ شہزی گھنت لا کران کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کر لیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایلیا ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ وہیں لنگڑے کوڑھی کے بھیس میں کیلی داوا اس کے سامنے آ جاتا ہے جسے دیکھ کر شہزی حیران رہ جاتا ہے۔ کیلی داوا کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ ممبئی ائرپورٹ پر بھارتی خفیہ ایجنسی کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بعد ان تینوں کو بلیو ٹیکسی کے ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا جاتا ہے۔ وہاں سے سی جی بھوانی انہیں انڈر ورلڈ ڈان بھولا ناتھ کے نجی قید خانے ڈیول کیج بھیج دیتا ہے۔ وہاں کا ایک قیدی بدمعاش داور شکیلہ پر نظر رکھتا ہے منصوبہ بندی کے تحت شکیلہ داور کو پھانسے میں لے لیتی ہے اور ہمارا کام آسان ہو جاتا ہے۔ داور کو قابو کر کے قید خانے سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے کہ اچانک ہی دھماکے ہوتے ہیں اور ہر طرف گیس بھر جاتی ہے اور پھر ہمیں کچھ ہوش نہ رہا۔ ہوش میں آئے تو خود کو زنجیروں میں بندھا پایا۔ ایک بیگار کیمپ تھا، جس کی کمانڈ بلراج سنگھ کے ہاتھ میں تھی۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے گل مجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مگر شہزی کا ایک امتحان ابھی باقی تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی سے کوئی اہم کام لینا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے منصوبے کے تحت شہزی کو بے ہوش کر کے ایک قید خانے میں پہنچا دیا جاتا ہے جہاں شہزی کو نصیر شاہ کو قابو کرنا تھا جو ہیروں کی کان دریافت کر چکا تھا اور ایڈوانی کے راستے کی بڑی رکاوٹ تھا مگر شہزی نصیر شاہ سے مل کر ایڈوانی کے خلاف ڈبل گیم کھیلنے والا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میرے اعصاب بری طرح تن رہے تھے۔ رگوں میں سنسناہٹ اُترنے لگی تھی اور دوڑتا ہوا لہو لاوا بن کر اُچھلنے لگا تھا۔

کس وقت اور کب کیا کرنا ہے، بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ حقیقت بھی گمان لگتی ہے...... اس وقت؟ یہ سب فطری بھی محسوس ہو اور غیر فطری بھی۔ گویا...... ''فیکٹ اینڈ پرفیکٹ'' اُصول کے تحت اس سنگین اور جان لیوا خطرناک صورتِ حالات میں کب اور کیسا قدم اُٹھانا چاہیے، میں اسی کشمکش و پیچ میں تھا۔

میں نے بلراج سنگھ کے حکم کے سامنے فوراً چپ سادھ لی تھی۔ وہ چلا چلا کر گاڑی نکالنے اور ہمیں ساتھ چلنے کے احکامات صادر کر رہا تھا۔ اسی وقت میں نے موقع تاک کر، سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق فوراً ہی کیمپ میں موجود تو رک کو اپنے ٹرانسمیٹر سے سگنل دے دیا۔

ڈراما در ڈرامے کا ایک اور ''ایکٹ'' شروع ہونے لگا تھا، اب اس کا کلائمیکس دیکھنا تھا کیسا ہوتا ہے۔

جب تک ہم عمارت سے نکل کر باہر کھڑی جیپ میں سوار ہوئے، اچانک میرے کالر پر اٹکے ہوئے ٹرانسمیٹر سے بیپ کی آواز اُبھری۔

''سر! میں کیمپ سے ایک ساتھی کی کال آ رہی ہے، آپ کا حکم ہو تو اسے اٹینڈ کر لوں؟''

میں نے دانستہ بلراج سنگھ سے مودبانہ انداز میں یہ

پل کے پل مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ ''کاؤنٹ ڈاؤن'' شروع ہو چکی ہے۔ اب کسی بھی وقت ایٹم بم پھٹنے والا تھا۔ آر یا پار......

''ترنت کرو......'' وہ کھرکھراتی آواز میں بولا۔ ''لیکن...... انہیں ہرگز یہ نہ بتانا کہ ہم لوگ وہاں پہنچ رہے ہیں۔ کیونکہ ہماری آمد ایک طرح سے بیس کیمپ میں ریڈ کا درجہ رکھتی ہے۔''

''اوکے سر!'' میں نے اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پہ قابو رکھتے ہوئے کہا اور کال اٹینڈ کرلی۔

''او...... نو...... کک...... کب اور کیسے ہوا یہ سب......؟ کیا؟ دونوں قیدیوں نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ پھر...... او...... ہلاک کر دیے گئے؟ پوری تفصیل بتاؤ۔'' میں نے کہا اور کن انکھیوں سے اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے برابر بیٹھے ہوئے بلراج کی طرف بھی دیکھا کہ اس پر اس اچانک جھوٹی خبر کا کیا اثر ہوتا ہے۔

میرے منہ سے یہ سب سن کر وہ اپنی سیٹ سے یوں اُچھلا جیسے اسے کسی بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ میں اس کے بالکل عقب میں سیٹ پر بیٹھا تھا اور میرے ساتھ شلپا بیٹھی تھی، اس کے برابر میں سچانند اور بالکل آخری کی نشستوں پر رتن لال اور دو مسلح افراد براجمان تھے۔

''کک...... کیا ہوا ہے وہاں؟''

بلراج نے غراتی ہوئی آواز میں اپنا سر گھما کے میری طرف دیکھا اور ساتھ ہی اس نے ڈرائیور کو جیپ روکنے کا بھی اشارہ کیا تھا۔ جیپ ایک جھٹکے سے رک گئی اور اس کی محدود فضا میں اچانک ہی خاموشی طاری ہوگئی۔

''سس...... سر! اُن دونوں قیدیوں نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ وہاں موجود ساتھیوں نے دونوں کو فرار ہوتے ہوئے گولیوں کا نشانہ......''

میری بات حلق میں ہی اٹک گئی۔ کیونکہ اسی وقت بلراج کے منہ سے خونخوار انداز کی وحشیانہ غراہٹ ابھری اور پھر میں نے اس کا ایک ہاتھ حرکت میں آتا محسوس کیا، دوسرے ہی لمحے اس نے ایک لمبی نال والا پستول نکال کر میری پیشانی سے لگا دیا اور پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔

''کون ہو تم......؟ اور کس مقصد کے تحت ہم میں شامل ہوئے ہو؟ شاید میں نے تم پر اندھا دھند اعتماد کر کے زندگی کی بھیانک غلطی کر ڈالی ہے۔''

اب میں اسے زیادہ دیر بہلا نہیں سکتا تھا۔ بالآخر وہی ہوا جس کا وسوسہ میرے اندر پہلے ہی سے پھنکار رہا تھا۔

مگر میں نے حالات کو سنبھالا دینے کی کوشش میں کوئی جارحانہ موڈ اختیار کیے بغیر دانستہ ہکلاتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

''سس...... سر! ی ی...... یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''نیچے اُترو تم۔'' بلراج دہاڑا اور اپنی طرف کے دروازے کو ایک زوردار لات رسید کر کے اسے کھولتے ہی نیچے اُتر گیا۔ اس کی دیکھا دیکھی ہم سب بھی اُتر آئے۔

''اسے نہتا کردو......''

جیپ سے باہر آ کر بلراج نے بدستور مجھ پر وہ بھیانک نال والا پستول تانے ہوئے تحکمانہ کہا۔ سچانند اور رتن لال چابی بھرے کھلونوں کی طرح حرکت میں آگئے۔

ابھی ہم ڈارک کیسل کی حدود میں ہی تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہاں اندر موجود چاروں ساتھی مجھے دیکھ رہے ہوں گے۔

مجھے نہتا کردیا گیا اور پھر دو مسلح افراد نے مجھے گرفت میں لے لیا۔ میں ابھی تک حیرت آمیز خوف زدہ ہونے کی ایکٹنگ جاری رکھے ہوئے تھا۔ بلراج نے بیس کیمپ جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔

اس موجودہ بگڑتی ہوئی صورت حال سے شلپا بھی پریشان اور بری طرح اُلجھی ہوئی دکھائی دینے لگی۔

ہم سب ڈارک کیسل کے مرکزی گیٹ کے سامنے احاطے پر موجود تھے۔ بلراج نے اندر جانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور وہیں کھڑے کھڑے اس نے مجھ پر اپنا پستول تان کے پوچھ گچھ شروع کر دی۔

''تمہارا چہرہ، انداز و اطوار ہمیشہ کھٹکتا رہا ہے مجھے مگر تمہارے کارنامے دیکھتے ہوئے میں نے ان پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی اور ادھر ہی شاید میں مار کھا گیا۔'' وہ اب کی بار اپنی بے رحم ٹپکاتی آنکھوں کو سکیڑ سکیڑ کر مجھے غور سے تکے جارہا تھا۔ ''یہ ٹوپی اُتارو اور اپنا چہرہ سیدھا کر کے میری طرف دیکھو......''

اس کا آخری جملہ سننے کے بعد جو تھوڑی بہت اُمید تھی، وہ ختم ہو چلی تھی۔ میرے سر سے ٹوپی اُتاری گئی اور جب میں نے سامنے کھڑے بلراج کے چہرے اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ میرا بظاہر یک ٹک ساتنا کھڑا

[illegible] اندر سے [illegible] شعلوں سے مانند بھڑکنے لگا تھا۔ جو کسی وقت بھی جوالا مکھی بن کے پھٹنے کے قریب تھا۔

وہ اپنے ہاتھ میں پستول تھامے ہوئے چند قدم میرے اور قریب آ گیا۔ پھر میری گردن میں ایک ہاتھ ڈال کر میرا چہرہ اپنے چہرے کے بالکل قریب کر لیا اور پھر دوسرے ہی لمحے میں اسے ایک زبردست شاک کی کیفیت میں بدلتے دیکھا۔

وہ ایک دم مجھ سے یوں دور ہٹتا چلا گیا جیسے اس نے میرے اندر کی بھڑکتی آگ کی حدت کو محسوس کر لیا ہو۔ وہ کچھ ایسے ہی خوف زدہ اور جوشِ غیظ تلے ملے جلے تاثرات لیے یک دم مجھ سے چند قدم پیچھے ہٹ کر دور ہو گیا۔

''شش...... شہزی...... تت...... تم شہزی ہو...... میرے دشمن نمبر ایک......''

وہ جنونانہ انداز میں چلّایا اور اسی وقت اس کا پستول والا ہاتھ میری طرف اُٹھتا چلا گیا، پھر اس سے پہلے کہ میں کوئی حرکت کرتا ''ڈز'' کی آواز سے گولی چل چکی تھی۔

☆☆☆

بلراج سنگھ مجھے پہچانتے ہی اسی وقت گولی مارنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر اچانک ہی نامعلوم سمت سے فائر کی جانے والی گولی نے اس کا پستول والا ہاتھ زخمی کر ڈالا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا، جبکہ خود بلراج سنگھ چیختا ہوا بے اختیار چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑایا۔

ابھی ہم سب حیرت زدہ کھڑے تھے کہ دفعتاً گولیوں کی خوفناک تڑتڑاہٹ ابھری اور مجھے دائیں بائیں سے قابو کیے بلراج کے اسلحہ بدست ساتھی کربیہ انگیز چیخیں مار کر گرتے چلے گئے۔ تب ہی میں نے ڈارک کیسل کی دو قریبی چھوٹی برجیوں میں سے ایک کی آڑ سے کبیل دادا کی جھلک دیکھی اور دوسری آڑ سے اول خیر اور شکیلہ کو متحرک دیکھا۔ بلراج پر گولی غالباً کبیل دادا نے ہی چلائی تھی جبکہ باقیوں پر اول خیر اور شکیلہ نے۔

چند سیکنڈ کے اندر ہی میرے اندر ابلتا ہوا آتش فشاں لاوا اُگلنے لگا اور میرے تھکے ہوئے وجود میں بجلی دوڑ گئی۔ میں نے سچانند اور رتن لال پر کسی زخمی شیر کی طرح جھپٹا مارا۔ ایک کے سینے پر میری زوردار لات پڑی اور دوسرے کے چہرے پر گھونسا۔ وہ دونوں ہی کراہ خارج کرتے ہوئے پیچھے کی طرف اُلٹ گئے۔ میں نے اسی وقت بلراج سنگھ کی جانب جست لگائی جو سنبھلتے ہی اپنے گرے ہوئے پستول کی طرف لپکا تھا، جیسے ہی اس کا دوسرا ہاتھ پستول پر پڑا، میں نے اس کے جھکے ہوئے چہرے پر اپنی دائیں ٹانگ کی ضرب لگا دی۔ وہ اوغ کی آواز خارج کر کے اُلٹ گیا۔

میرے ساتھیوں نے رتن لال اور سچانند پر برسٹ مارا، جس کے باعث وہ اندر کی جانب گرتے پڑتے دوڑنے پر مجبور ہو گئے جبکہ شلپا نے جانے کیا سوچ کر وہیں کھڑے کھڑے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر لیے تھے۔ اس کے چہرے سے شدید قسم کا خوف مترشح تھا۔

''اندر جاؤ اور ایڈوانی کو قابو کرو۔'' میں برجیوں کی جانب منہ کر کے حلق کے بل چلّایا اور پھر بلراج کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ خاصا چالاک ثابت ہوا۔ میرا خیال تھا کہ اس نازک مگر خطرناک گھڑی میں مجھ سے دوبدو مقابلہ کرنے کی ٹھانے گا مگر اس کے برعکس اس نے بھی رتن لال اور سچانند کی طرح دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں بھی اس کے تعاقب میں دوڑا اور ساتھ ہی میں نے اپنے کالر سے اٹکے ٹرانسمیٹر پر بیس کیمپ میں تورک سے رابطہ کیا اور ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

''ہمارا راز فاش ہو چکا ہے اور جنگ شروع ہو چکی ہے۔ اسی وقت دو ساتھیوں کو ٹھکرال والوں کے خفیہ ٹھکانے کی طرف روانہ کر دو کہ ڈارک کیسل پر حملے کے لیے روانہ ہو جائیں۔ باقیوں کو ادھر بھیج دو، جلدی......'' یہ حکم صادر کرتے ہی میں نے دروازے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بلراج پر جھپٹا مارا۔ مجھے پتا تھا وہ اگر ڈارک کیسل میں داخل ہو گیا تو اس کی بھول بھلیوں میں غائب ہو کر ہم سب کے لیے شیطانی روح ثابت ہوگا۔ وہ میری گرفت میں تو نہیں آیا البتہ میرے گرتے گرتے، دونوں ہاتھ اس کی ٹانگوں سے ٹکرا گئے۔ وہ اس سے ذرا ر پٹا کھا کر دروازے کی چوکھٹ کے سنگ مرمر والے فرش پر پھسل کر گرا مگر حیرت انگیز طور پر اپنے حواسوں پر قابو رکھتے ہوئے وہ پھر اُٹھ کر اندر بھاگا اور چوکھٹ پار کر گیا مگر میں مسلسل تعاقب میں تھا۔

میرے پاس اگر پسٹل وغیرہ ہوتا تو میں فوراً ہی اسے نشانہ بنانے میں ذرا عار محسوس نہ کرتا۔ تاہم میں نے اپنی عقابی نظروں سے اسے اوجھل نہیں ہونے دیا تھا، اسی وقت ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور دو گن بردار نمودار ہوئے، وہ ان سے چیخ کر کچھ کہتا ہوا ایک دم ان کے پیچھے جا چھپا اور میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں خود کو ان کی متوقع فائرنگ سے بچانے کی کوشش کرتا، کیونکہ وہ اس کے ہی ساتھی تھے۔ میں نے اپنے دوڑنے کی رفتار کم کیے بغیر ایک جھٹکے کے ساتھ خود کو جھکنے اور ''سلیپری'' فرش پر گرا دیا۔ جب تک وہ اپنی گنز مجھ پر جھکاتے میں ان دونوں کے پیروں سے ٹکرایا۔ دونوں

ہی بیک وقت [illegible] کر رہے اور ان کے عقب میں بزدلوں کی طرح چھپا ہوا بلراج سنگھ یوں اچانک مجھے موت کی طرح اپنے سر پہ پا کر بری طرح بوکھلا گیا۔ مگر اچانک ہی اس کے اندر غیظ آلود جوش نے سر اُبھارا اور وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ وہ مجھ پر جھپٹا۔ اس نے جھک کر میری گردن دبوچنے کی کوشش چاہی تھی، میں فرش سے اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا، میں نے موقع تاک کر اس کے جھکے ہوئے چہرے پر اپنے سر کی زوردار ٹکر رسید کر ڈالی جو اس کی ناک پر لگی۔

ضرب کاری ثابت ہوئی اور وہ کریہہ انگیز چیخ کے ساتھ پیچھے کی طرف لڑکھڑایا اور چکرانے کے انداز میں گر پڑا۔ ادھر وہ دونوں گن بردار سنبھالا لینے اور گن سیدھی کر کے مجھے نشانہ بنانے کے لیے پر تولنے میں مصروف تھے، جبکہ میں ان کی طرف سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہیں ہوا تھا، ایک کو تو میں نے اپنے کاندھے کی ٹھوکر رسید کر دی، دوسرے کی گن پر ہاتھ مارا۔ اس نے ٹریگر دبا دیا۔ برسٹ فائر ہوا اور کوریڈور کے چکنے فرش پر پڑنے والی گولیاں اِدھر اُدھر ہونے لگیں، کیونکہ میں نے اس کی گن کی نال کا رخ عین وقت پر نیچے کر دیا تھا، ورنہ اس کا فائر کیا ہوا برسٹ مجھے چاٹ جاتا۔ تاہم اس طرح گولیاں اُچٹنا بھی کم خطرناک بات نہ تھی۔ میں نے جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے گن کھینچ لی اور لٹھ کی طرح گھما کر اس کی کنپٹی پر اس کا ٹھوس کندا رسید کیا۔ پٹاخے کی آواز چھوٹی، وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گرا اور بے حس و حرکت ہو گیا۔ دوسرا بھاگا تو میں نے اس پر بھی برسٹ فائر کیا۔ زد میں آ کر وہ ہولناک چیخیں خارج کرتا ہوا کوریڈور کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ بلراج پھٹی پھٹی وحشت زدہ آنکھوں سے میری ہولناکیاں دیکھ رہا تھا۔

”خبردار بلراج! حرکت مت کرنا ورنہ تمہارا انجام بھی ایسا ہی ہوگا۔“ میں نے جارحانہ لہجے میں کہا۔ دوسرے ہی لمحے وہ چیخا۔

”فائر...... فائر...... مت چھوڑنا اِسے......“ اس کی وحشت زدہ...... نظروں کو اپنے عقب میں دیکھتا پا کر میں تیزی سے گھوما، مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ میں اس رذیل کے ایک روایتی جھانسے میں آ گیا تھا، پُرطیش انداز میں ہونٹ بھینچ کر میں بگولے کی طرح اس کی طرف پلٹا تو وہ مجھ پر چھلانگ لگا چکا تھا۔ اس کا وجود مجھ سے ٹکرایا اور ہم دونوں ہی نیچے آ رہے۔ گرتے ہی اس نے میرے پیٹ پر اپنی ٹانگ کا گھٹنا رسید کیا، چوٹ اچانک اور زوردار تھی۔ میرے حلق سے کربناک سی چیخ بلند ہوئی، اس نے میرے گن والے ہاتھ پر [illegible] تھا [illegible] مگر اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر میں نے فرش پر پشت کے بل پڑے پڑے اپنے مضروب وجود کو پھرکی کی طرح گھمایا اور میری ہوا میں دو چکھی کی طرح گردش کرتی ٹانگوں کی بیک وقت ضربات بلراج کے چہرے پر پڑیں اور اس کے حلق سے کرب ناک چیخیں خارج ہو گئیں۔ اس کا دماغ بری جھنجھنا گیا تھا۔ گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی، وقت ضائع کیے بغیر میں بہ سرعت حرکت میں آیا اور اکڑوں بیٹھے بیٹھے اپنے سیدھے بازو کا آرم لاک اس کی گردن کے گرد کس دیا۔ پھر اس کے کان میں سنسناتی ہوئی سرگوشی کی۔

”تمہارا کھیل ختم ہوا...... بلراج گھتے......! بس ایک آخری بار سوشیلا کی بہن اوشا کی معصوم نیلی کا تصور کر لے کہ کس طرح تو نے ایڈوانی کے کہنے پر انہیں آگ میں جھونکا تھا۔“

”مم...... مجھے مم...... معاف کر دو شش...... شہزی!“ وہ بھنچی بھنچی آواز میں بولا۔

”میں نے اپنی ساتھی سوشیلا سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا...... جس نے ہر بُرے وقت میں میرا ساتھ دیا۔ گو ٹو ہیل ناؤ...... بہت جلد ایڈوانی بھی وہیں پہنچنے والا ہے۔“

نجانے میں نے اپنے کون سے بپھرے ہوئے جذبے کی تسکین میں اس سے یہ مختصراً مکالمہ بازی کی تھی اور اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی گردن کو جھٹکا دیا۔ وہ یک دم بے حس و حرکت ہو گیا۔ اس کی گردن کا منکا ٹوٹ چکا تھا۔

اسے جہنم واصل کرتے ہی میں گن اٹھا کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ فائرنگ کی آوازیں وقفے وقفے سے سنائی دے رہی تھیں۔ اسی وقت میں نے کپیل دادا کو دوڑتے ہوئے آتے دیکھا۔ اس کے ہمراہ باریہ تھی۔

میں اُٹھ کر ایک طرف کو بھاگا۔ وہ میرے پیچھے دوڑتے رہے۔

”ایڈوانی جانے نہ پائے۔“ میں چلایا۔ عقب میں دوڑتے ہوئے کپیل دادا اور باریہ کو میرے عزم کا احساس ہوا اور پھر وہ رکے نہیں۔

ایڈوانی کے کمرے کے قریب پہنچتے ہی میں نے دروازے پر ایک زوردار لات رسید کی اور وہ کھلتا چلا گیا۔ میں طوفانی بگولے کی طرح اندر داخل ہو گیا۔ ایسے میں میری نس نس میں لہو مثلِ پارہ کی طرح گردش کر رہا تھا۔ میری متلاشی نظریں خالی کمرے میں تیزی سے گردش کر رہی تھیں...... یہی وہ وقت تھا جب میری گردشی نظروں نے

[illegible] ایک طاق
سرسراتی آواز میں بند ہوتے دیکھا۔
’’فرار‘‘ میرے جھنجھلائے ہوئے ذہن میں آناً فاناً ابھرا اور میں تیزی سے پلٹا تو کبیل دادا اور باریہ کو دیکھا۔
’’میرے پیچھے آؤ...... وہ بھاگ رہا ہے۔‘‘
میں کمرے سے نکل کر کوریڈور میں آیا تو کچھ سوچ کر رکا اور پھر باریہ سے ہانپتی ہوئی آواز میں بولا۔
’’باریہ! تم اسی وقت آبادی کی طرف دوڑ جاؤ اور سارے قیدیوں کو رہا کر کے دیگر لوگوں کو بتا دو کہ وہ سب آزاد ہیں اور یہاں آ جائیں۔‘‘
اس کو حکم دیتے ہی میں نے کبیل دادا کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور اندھا دھند دوڑتا ہوا مرکزی دروازے کے بجائے اس سمت لپکا جہاں سے ایک راستہ ڈارک کیسل کے عقب میں جاتا تھا۔ ڈارک کیسل کی اس عمارت میں وقت گزارنے کے باوجود مجھے اس مردود ایڈوانی کی اس خفیہ راہ گزر کا پتا نہ چل سکا تھا۔ بس ایک محتاط اندازے سے میں نے اسی طرف کا رخ کیا جہاں سے اس کے برآمد ہونے کا شبہ تھا مگر وہاں پہنچ کر بھی مجھے کچھ حاصل نہ ہوا۔
ادھر اول خیر اور شکیلہ ڈارک کیسل میں موجود گنتی کے چند مسلح دشمنوں سے نبرد آزما تھے۔ مجھے ان کی فکر نہ تھی۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اول خیر اور شکیلہ جیسے تربیت یافتہ لڑاکوں سے لڑنا، ڈارک کیسل کے ان تیسرے درجے کے زرخرید بدمعاشوں کے بس کی بات نہ تھی...... مجھے صرف اپنے اصل شکار ایڈوانی کی فکر ہو رہی تھی اور اس ہیرے کی جو میں نے اس مردود کے قبضے سے برآمد کرنا تھا۔
میں چند ثانیے ہونٹ اور دانت بھینچے اس عقب کا منظر پیش کرنے والے بُرج پر آ کر نیچے نشیب میں دیکھتا رہا۔ وہاں ایک مختصر سا ہیلی پیڈ بنا ہوا تھا۔ وہاں دو پنکھ والا ایک چاپڑ موجود تھا۔ ایک خیال کے تحت میں نے کبیل دادا سے کہا۔
’’کبیل! یہ چاپڑ دیکھ رہے ہو...... تم فوراً اس کے اندر کہیں چھپ کر بیٹھ جاؤ۔ ممکن ہے ایڈوانی اس تک رسائی حاصل کرنے کے بعد فرار ہونے کی کوشش کرے۔ جب تک میں اسلحے کے کمرائے خاص کی تلاشی لے کر آتا ہوں۔‘‘
میری بات پر کبیل دادا نے بلاتردد حرکت کی اور چاپڑ کی طرف بڑھ گیا۔
میں پلٹا اور دوبارہ دوڑتا ہوا ایڈوانی کے کمرے میں آیا۔ اس کا دروازہ ہنوز کھلا ہوا تھا۔ اسی وقت مجھ سے اول خیر اور شکیلہ بھی آن ٹکرائے۔ انہیں دیکھ کر میں ایک لمحے کے لیے حیران سا ہوا اور پھر اگلے ہی لمحے جوش سے مسکرا دیا۔
دونوں نے ایمونیشن روم سے خاصی تعداد میں اسلحہ قبضے میں کر کے زیورات کی طرح اپنے جسموں پر سجا لیا تھا۔
’’باقی دشمن کہاں گئے؟ ان میں وہ وحشی جنگلی کلی منجارو بھی تھے؟‘‘ میں نے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو اول خیر نے بتایا۔
’’بیشتر مارے گئے ہیں اور کچھ بھاگ گئے ہیں، باقیوں نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ ان میں جانگلی بھی تھے جن کی تم بات کر رہے ہو۔‘‘
’’لیکن شہزی! صرف اتنے ہی دشمن نہیں ہیں یہاں، آبادی کی طرف اور ان کے دوسرے ٹھکانوں کی طرف بھی ہمیں ہلا بولنا ہوگا۔‘‘ شکیلہ بولی۔
’’اس کے لیے میں باریہ کو آبادی کی طرف پہلے ہی روانہ کر چکا ہوں اور ساتھ ہی تورک کو بھی پیغام پہنچا دیا ہے کہ وہ جلد سے جلد شگرال اور دنالیہ کو لے کر اپنے جنگجو ساتھیوں سمیت یہاں پہنچ جائے۔ بے فکر رہو، ان کے بیشتر ساتھی ان سے بددل بھی ہیں۔ سچانند مارا گیا اور رتن لال اپنے دیگر چند ساتھیوں (شلپا سمیت) کے ساتھ ہماری گرفت میں ہے۔‘‘ میں نے کہا۔
’’ہمیں اپنے اصل شکار جنرل ایڈوانی کو ڈھونڈنا ہے۔ وہ ابھی تک ڈارک کیسل میں ہی کہیں چھپا ہوا ہے۔‘‘
وہ سب میرے حکم پر ایڈوانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر پھیل گئے۔ میں اور کبیل دادا وہیں کھڑے رہے تو وہ بولا۔
’’شہزی! مجھے نہیں لگتا کہ اس شکست کے بعد ایڈوانی ڈارک کیسل کے کسی خفیہ گوشے میں چھپا رہ سکتا ہے۔‘‘
’’کیا مطلب؟‘‘
’’وہ جانتا ہے کہ ڈارک کیسل کی یہ عمارت اس کی قبر بھی بن سکتی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ خفیہ راستے سے کہیں دور جا کر ابھرے اور جزیرے سے فرار ہونے کی کوشش کرے؟‘‘
کبیل دادا کی اس بات پر اچانک ہی میرے ذہن رسا میں سرنگ کا لفظ ابھرا اور میں فرطِ جوش سے بولا۔
’’تمہارا خیال سو فیصد درست لگتا ہے دادا! ممکن ہے کہ وہ سرنگ نما کسی خفیہ راستے سے راہ فرار حاصل کرنے کی کوشش میں ہو۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ وہ خفیہ سرنگ یا ایسا کوئی متوقع راستہ تلاش کیسے کیا جائے؟‘‘

اس کے لیے ہمیں قریب ترین ساحل پر کڑی نگاہ رکھنا ہوگی۔ اس کام کے لیے جاوا قبیلے کے لوگوں کو ہر طرف پھیلا دو کیونکہ ان کا اصل غاصب دشمن فرار ہونے کی کوشش میں اپنی کسی خفیہ کمین گاہ میں چھپا بیٹھا ہے۔"

مجھے کبیل دادا کی یہ تجویز کارآمد محسوس ہوئی۔ یہ کام میں نے شکیلہ اور اول خیر کے ذمے لگا دیا جو چند جاوی افراد کے ہمراہ آبادی کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس کے بعد میں نے اور کبیل دادا نے ایک بار پھر ڈارک کیسل کے اندر اور باہر کا ایک ایک گوشہ ٹھونک بجا کر دیکھ لیا مگر اس کی کوئی بھنک یا نشان نہ ملا۔

شنگرال اور اس کے جنگجو ساتھیوں کو لانے کے لیے پہلے سے موجود جیپوں اور گاڑیوں کا استعمال کیا گیا تھا، وہ بھی پہنچ چکے تھے۔ کلی منجارو قبیلے کا کوئی مستقل ٹھکانا نہ تھا، نہ ہی وہ اتنی طاقت میں تھے، تاہم جنرل ایڈوانی وغیرہ سے ان کا اتحاد ہونے کے باعث وہ طاقت ور کہلاتے تھے۔ ان میں سے بھی کئی مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے اور باقی ماندہ فرار ہو گئے تھے۔

بازی پلٹ چکی تھی۔ تخت اور تختے کے اس خطرناک کھیل میں "تخت" ہمارے حصے میں آیا تھا اور "تختہ" دشمنوں کا نصیب، وہ اب تختہ دار پر چڑھ چکے تھے۔

ابھی میں ایڈوانی کی طرف سے پریشانی کا شکار تھا کہ اطلاع ملی کہ جزیرے کے شمال مغرب میں کوئی پُراسرار سی نقل و حرکت دیکھی گئی ہے۔ میں اور کبیل دادا جیپ میں وہاں پہنچے اور ابھی اس مقام سے صرف چند سو گز کے فاصلے پر ہی تھے کہ چونک پڑے۔ وہاں شور اور ساتھ ہی گولیاں چلنے کی آوازیں ابھریں۔ کبیل دادا نے جیپ وہیں روک دی اور ہم دونوں اپنی گنز سنبھالے نیچے اُترے۔

یہ ساحلِ سمندر کے قریب کا علاقہ تھا۔ اس کے قریب ہی جھگی جھگی چٹانوں کا مختصر سا سلسلہ بھی نظر آتا تھا۔ وہاں ہمارے کچھ ساتھی موجود تھے، مگر اب گولیوں کی آوازوں کے ساتھ ہی وہ خوف زدہ ہو کے اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے۔ یہ ہمارے اسلحہ بدست یا جنگجو ساتھی نہیں تھے بلکہ جاوی قبیلے کے ہی لوگ تھے۔ ان کے پاس روایتی ہتھیار تھے۔ چند ایک کے پاس آتشیں ہتھیار بھی تھے اور وہی نامعلوم سمت سے ہونے والی فائرنگ کا نشانہ بنے تھے۔

ابھی تک مجھے اندازہ نہیں ہو پایا تھا کہ یہاں ہو کیا رہا تھا؟ تاہم محتاط روی سے اس مقام کے قدرے قریب پہنچے تو میں بری طرح ٹھٹکا۔

دور سے ہی چٹانوں کے بیچ سے میں نے ایک ندی نالہ سا بہتا دیکھا، یہ خاصا چوڑا تھا اور بہتا ہوا سمندر کی طرف جاتا تھا۔ پل کے پل میرے سوچتے ذہن میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک خیال ابھرا اور میں بدکا۔

"میرے پیچھے آؤ دادا......!" یہ کہتے ہوئے میں اپنی گن سنبھالے اس چٹانی نالے کی طرف بھاگا۔

"ہولے شہزی! اس طرف سے گولیاں چلی تھیں۔"

مجھے اپنے پیچھے بھاگتے ہوئے آتے کبیل دادا کی آواز سنائی دی مگر میں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ میرے ذہن کو اچانک ہی جو بھنک پڑی تھی وہ بری طرح سر پہ سوار تھی۔ میں اندھا دھند اس چٹان سے پھوٹنے والے نالے کی طرف کو دوڑ رہا تھا اور ابھی میں اس سے محض چند ہی قدموں کے فاصلے پر تھا کہ دفعتاً میری تھکی ہوئی سماعتوں میں ایک گھرگھراتی آواز اُبھری اور میں نے اپنی گن سیدھی کر لی۔

اچانک ہی ایک تیز رفتار موٹر بوٹ کو دیکھا۔ اس کا رخ سمندر کی طرف تھا۔ اس میں مجھے ایک ہی فرد سوار دکھائی دیا تھا۔

"گولیاں برساؤ اس پر......" میں حلق کے بل چیخا اور اپنے دونوں پیر ساحل کی ریت پر کیل کرتے ہوئے میں نے موٹر بوٹ پر تڑاتڑ فائرنگ کر دی۔ کبیل دادا نے بھی فوراً میری تقلید کی تھی۔ موٹر بوٹ ابھی سمندر سے چند ہی گز دور تھی کہ اس میں آگ بھڑک اٹھی۔ میں دیوانہ وار اس طرف دوڑا۔ بوٹ اُلٹ کر ساحلی ریت پر آن پڑی تھی۔ میں نے ایک شخص کو کودتے ہوئے دیکھا۔ یہ ایڈوانی تھا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا بریف کیس تھا اور دوسرے ہاتھ میں ٹامی گن ٹائپ کا ہتھیار تھا۔ اس نے نارنجی رنگ کی لائف جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اُتر آیا اور میں اس کی طرف لپکا۔ اسی وقت بوٹ میں دھماکا ہوا اور وہ سلگتے ہوئے شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی۔

"ایڈوانی......رک جاؤ......ورنہ گولی مار دوں گا۔"

اسے سمندر کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھ کر میں چلّایا اور ساتھ ہی اس کے پیروں پر برسٹ چلایا۔ وہ رک گیا اور چلّا کر بریف کیس والا ہاتھ بلند کرتے ہوئے ہذیانی آواز میں بولا۔

"شہزی! میرے قریب مت آنا، ورنہ یہ بریف کیس سمندر میں پھینک دوں گا اور تمہارا ملک ہمیشہ کے لیے اپنی نادر امانت سے محروم ہو جائے گا۔"

یہ کہتے ہی اس نے اپنے دوسرے ہاتھ میں پکڑی

[illegible] سے پہلے ہی میں خود کو ریت پر گرا چکا تھا۔

"تم ٹھیک تو ہو ناں شہزی؟" کبیل دادا کی آواز ابھری۔ میں نے جواب میں کہا۔

"میں ٹھیک ہوں، تم محتاط رہو۔"

"لیکن شہزی! تم اس خبیث کے نشانے پر ہو۔" کبیل دادا بولا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس وقت میری بے چینی اور جوش انتہا کو چھو رہا تھا۔

میں ہک دک سا رہ گیا۔ ایڈوانی کا اشارہ میں سمجھ تو چکا تھا تاہم اسے "مشغول" رکھنے اور پل کے پل کوئی راہ سوچنے کی غرض سے میں نے چلّا کے کہا۔

"ایڈوانی! تم اب کہیں نہیں جاسکتے۔ بہتر یہی ہے کہ خود کو اس بریف کیس سمیت میرے حوالے کردو۔"

"ہرگز نہیں...... شہزی!" وہ پاگلوں کی طرح چلّایا۔ "تم نے مجھے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ میری لاش کو ہی تم اب پاسکو گے۔ میں خود کو سمندر کے حوالے کر رہا ہوں، تمہارے ہیرے سمیت، لیکن اتنا بتادوں یہ ہیرا تمہیں اگر مل بھی گیا تو تم پھر بھی اسے حاصل نہیں کرسکو گے...... ہاہا...... ہاہا، جس پاکستانی پروفیسر (کریم بخش) نے یہ ہیرا دریافت کیا تھا اور اس کا نام طلسم نور ہیرا ایسے ہی نہیں رکھا تھا۔ وہی اس کی طلسمی وجہ ہے، جسے جانے بغیر تمہارے پاس ہوتے ہوئے بھی یہ ہیرا تمہارے پاس نہیں ہوگا۔ ہاہا...... ہاہا...... تمہاری اس کامیابی کو داغدار بنا کے جارہا ہوں میں......"

شکست نے شاید اس کا دماغی توازن بگاڑ کر رکھ دیا تھا مگر اس مردود کی بات نے مجھے واقعی پریشان سا کردیا تھا۔

"آخر کیا مطلب تھا اس شیطان کی بات کا......؟ کہ اگر یہ ہیرا میں سمندر کی تہ سے برآمد بھی کرلوں، تو بھی یہ میرا نہیں رہے گا...... آخر ایسی پُراسرار وجہ کیا تھی اس ہیرے میں......؟ جو میرے پاس ہوتے ہوئے بھی میرے پاس نہ ہوگا۔ میں نے اس کی بات کو لغو خیال کرتے ہوئے ذہن سے جھٹک دیا اور موجودہ صورت پر غور کرنا شروع کیا۔

دونوں صورتوں میں میرے لیے ایک مشکل کھڑی ہو گئی تھی اور میں فیصلہ نہیں کر پارہا تھا کہ اسے جانے دوں یا گولی ماردوں، دونوں ہی صورتوں میں طلسم نور ہیرے والا بریف کیس سمندر بُرد ہونے کا اندیشہ تھا۔

اس نے ایک بار پھر برسٹ چلانے کی کوشش چاہی، مگر وہ نہ چلا، شاید وہ پہلے سے ہی میرے ساتھیوں سے مقابلے میں اپنا راستہ صاف کرنے کے لیے ان پر کافی ساری گولیاں برسا چکا تھا۔

میں اپنی جگہ سے اُٹھا۔ میں اسے زندہ پکڑنا چاہتا تھا۔ وہ سینے تک سمندر میں جا چکا تھا۔ خالی گن اس نے جھلا کر پھینک دی تھی۔ میں نے دیوانہ وار دوڑنا شروع کردیا۔ پیچھے سے کبیل دادا بھی چیختا ہوا مجھے محتاط رہنے کی تلقین کرتا دوڑ پڑا تھا۔

ایڈوانی بریف کیس سمیت سمندر میں کود چکا تھا اور خود کو لہروں کے سپرد کردیا تھا۔ میں بھی سمندر میں اُتر گیا۔ اس نے لائف جیکٹ پہن رکھی تھی۔ مجھے ڈوبنے کا خطرہ تھا مگر مجھ پر یہ دُھن سوار تھی کہ اس امانت کو بچانا ہے۔ کبیل دادا عقب سے چلّاتا اور مجھے روکتا ہی رہ گیا۔ میں درانہ وار ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں کود پڑا۔

لہروں کے شور میں آوازیں دبنے لگی تھیں۔ لائف جیکٹ نہ ہونے کے باعث مجھے تیرنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔ موجیں مجھے ساحل پر دھکیل رہی تھیں جبکہ ایڈوانی لائف جیکٹ کے باعث مقابلتاً تیرتا ہوا کھلے سمندر کی طرف نکلا جارہا تھا۔ تب ہی ایک خیال بہ سرعت میرے ذہن میں ابھرا۔ کم ازکم اس مردود جرنیل کو ہیرے سمیت تو میں ہرگز جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ یہ اس کی دیوانگی تھی۔ اس لاانتہا ہی سمندر میں تیر کر یہ کب تک زندہ رہ سکتا تھا۔ ممکن تھا اس کے اندر فطری طور پر ایک آخری امید جاگی ہو کہ شاید وہ موجوں کے سہارے کسی قریبی ساحل پر پہنچ جائے۔

میں نے بالآخر اپنی گن سیدھی کی اور اس پر گولیاں برسادیں۔ اس کے حلق سے اُبھرنے والی چیخیں بڑی لرزہ خیز تھیں۔ وہ خونم خون ہوگیا۔ بریف کیس غائب ہوچکا تھا۔ میں تیرتا ہوا واپس پلٹا اور ساحل پر آتے ہی میں نے وہاں اپنے اردگرد جمع ہوجانے والے جادی قبائلیوں سے کہا۔

"میں نے تمہارے ایک بڑے اور آخری دشمن کو ختم کردیا ہے، مگر اس نے میرے ملک کی ایک اہم امانت سمندر میں ڈبودی ہے۔ تم میں سے کوئی غوطہ خور تو ہوگا جو اس سیاہ بریف کیس کو ڈھونڈ لائے۔"

میرے یہ کہنے کی دیر تھی، چار پانچ تنگ دھڑنگ جادیوں نے اسی وقت سمندر میں چھلانگ لگادی اور میں تسلی آمیز سانس خارج کرکے نڈھال سا ریت پر بیٹھ گیا۔ اسی وقت کبیل دادا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ بھی میرے قریب بیٹھ گیا تھا۔

’’شہزی! تم واقعی بہت عظیم ہو، خواہ تم دوست ہو یا ایک عام انسان، ہر روپ میں تم عظیم ہو، شاید اس لیے بھی کاتبِ تقدیر تمہاری ہمت اور پُرخلوص جذبے پر تمام راہیں آسان کرتی رہتی ہے۔‘‘ اس کی بات پر میں فقط خفیف سی مسکراہٹ سے اپنا سر جھٹک کر رہ گیا۔

میں اب بھی دعائیں مانگ رہا تھا کہ خدا کرے کہ وہ ہیرے والا بریف کیس مل جائے، اس وقت میرے اندر کی پریشان کن بے چینی فزوں تر ہو رہی تھی۔ کافی دیر گزر گئی، میری اُمید بھری بے قرار نظریں سامنے بے کراں پھیلے سمندر پر جمی ہوئی تھیں، غوطہ خور زیادہ گہرائی تک نہیں جا سکتے تھے۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد سانس لینے کے لیے سطحِ سمندر پر اُبھرتے اور پھر غائب ہو جاتے۔ یہ سلسلہ کافی دیر جاری رہا اور میرا رُواں رُواں اس وقت تشویشناک بے چینی سے پھڑک رہا تھا، میرا تو کوئی بات کرنے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا جبکہ کبیل دادا نجانے کیا کیا کچھ میری تعریفوں میں کہے جا رہا تھا۔

کافی دیر ہم امید و ناامیدی کے بھنور میں ڈوبتے ابھرتے رہے۔ پھر وہ جاوی غوطہ خور ناکام ابھرے۔ میں انہیں خالی ہاتھ دیکھ کر لرز گیا اور ان کی طرف لپکا۔

’’کیا ہوا......؟ نہیں ملا تمہیں وہ بریف کیس؟‘‘

انہوں نے اپنے سر جھکا کر نفی میں سر ہلا دیا تو میں فرطِ غم سے چیخ پڑا۔

’’تم لوگ کیسے غوطہ خور ہو؟ ایک بریف کیس نہیں ڈھونڈ سکے؟ میں نے تم لوگوں کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال کر کیا کچھ نہیں کیا اور تم میرے وطن کی ایک اہم امانت تک کو تلاش نہیں کر سکے......‘‘

مجھ پر غم اور شکست خوردگی نے بہت منفی اثر ڈالا تھا۔ کبیل دادا مجھے سنبھالا دینے لگا تو میں نے اس بے چارے کا ہاتھ بھی جھٹک دیا اور دیوانہ وار سمندر کی طرف لپکا۔

’’میں خود اس ہیرے کو تلاش کروں گا۔‘‘

’’رک جا شہزی! میرے یار! کیا ہو گیا ہے تجھے؟‘‘ کبیل دادا مجھ سے لپٹ گیا۔ باقی لوگ سر جھکائے کھڑے تھے۔

’’چھوڑ دے مجھے کبیل دادا......! میں خود......‘‘ میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ایک چیخ کی آواز ابھری۔ کسی نے ہمیں اس آخری غوطہ خور کی طرف متوجہ کیا تھا جو سمندر سے ابھر کر ساحل کی طرف تیرتا ہوا آ رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کے بریف کیس کی جھلک نظر آئی تھی۔ میرے اندر کی مایوسی اور غم و شکست خوردگی پل بھر میں بے پایاں مسرت میں بدل گئی، مگر دوسرے ہی لمحے میں دھک سا رہ گیا۔ جب وہ آخری جاوی غوطہ خور ساحل پر نڈھال سا ہو کر گرا تو اس کے ہاتھ سے بریف کیس بھی چھوٹ کر ریت پر گر پڑا تھا، مگر اس طرح کہ وہ کھلا پڑا تھا اور میرا منہ چڑا رہا تھا...... میرے اوسان خطا ہونے لگے، اُمید کے اس آخری ٹمٹماتے چراغ میں جیسے روشنی ہی نہ رہی۔ مگر پھر بھی نجانے کیسی دیوانگی مجھ پر سوار تھی کہ میں پاگلوں کی طرح اس کی طرف بھاگا اور بریف کیس اُٹھا کر اسے یوں جھاڑنے لگا جیسے اس کے اندر طلسمِ نور ہیرا نہیں بلکہ کوئی سوئی رکھی ہو۔

بریف کیس کو بالکل خالی پا کر میں نے اُسے غصے سے ایک طرف اُچھال دیا اور گھٹنوں کے بل ساحلی ریت پر گر گیا۔ مجھے سامنے بیکراں پھیلے ہوئے سمندر سے جنرل ایڈوانی کے فاتحانہ قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ وہ کسی بدروح کی طرح چیخ کر کہتا سنائی دیا۔

’’ہاہا...... ہاہا......! شہزی! میں نے تمہاری اس اُدھوری کامیابی کو داغ دار بنا کر ہی چھوڑا...... اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا تو تم بھی خالی ہاتھ ہی رہے۔‘‘

اس اثنا میں اول خیر اور شکیلہ، پھر اس کے تھوڑی دیر بعد باربیہ بھی وہاں کچھ ساتھیوں کے ساتھ آن پہنچی۔ مجھے یوں اس حالتِ دیوانگی میں...... دیکھ کر انہیں دکھ آمیز حیرتوں نے گھیر لیا۔ کبیل دادا مغموم سے لہجے میں دھیرے دھیرے انہیں ساری صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔

’’او...... خیر کا کے! دل چھوٹا کیوں کرتا ہے۔‘‘ معاً ہی اول خیر کی مخصوص آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ساتھ ہی وہ میرے قریب بھی آ گیا اور اپنا ایک ہاتھ میرے کندھے پر رکھ کر سہلانے لگا۔

’’ہم سب تیرے ساتھ ہیں ابھی...... مل کر اس ہیرے کو تلاش کر لیں گے......‘‘

’’کیسے تلاش کر لیں گے یار......؟‘‘ میں نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

’’اُس بریف کیس کو اس بدبخت ایڈوانی نے اپنی زندگی کے عین آخری لمحات میں کھول کر سمندر برد کر دیا تھا۔ کاش! میں اس پر فائرنگ نہ کرتا، مگر وہ ہیرے سمیت فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا تو میری ساری محنت اکارت چلی جاتی، میں اور کیا کرتا یار اول خیر......؟‘‘ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

... حالات کے مطابق کیا ہے۔" وہ مجھے تسلی دے رہا تھا۔

"مگر یار! اب اُس ہیرے کو سمندر میں تلاش کرنا بھوسے میں سوئی ڈھونڈنے کے مترادف ہوگا۔" میں نے شدید مایوسی کے عالم میں کہا۔

"خیر ہے...... خیر ہے کاکے!" وہ تشفی آمیز انداز میں میرا کندھا تھپتھپاتا رہا تو شکیلہ بولی۔ "عمارت کی اگر تلاشی لی جائے تو ایسا ممکن نہ ہوگا کہ یہاں کوئی آکسیجن سلنڈر سمیت غوطہ خوری کا لباس نہ ہو، اگر وہ ہمیں نہیں بھی ملتے تو ہمارے لیے یہ سارا سامان ہائر کرنے میں کیا مشکل ہے، اب ہمیں بھلا کس بات کا خطرہ ہے، یا ہم کون سے قیدی ہیں۔ ہم مکمل فتح حاصل کر چکے ہیں۔ خود ہی ہیرے کو تلاش کرلیں گے۔"

"شکیلہ ٹھیک کہہ رہی ہے، شہزادے!" کبیل دادا نے اس کی تائید کی۔

مگر میرا دل ناکامی کے احساس تلے گھٹنے لگا تھا۔ وہ ہیرا گہرے پانیوں میں جا چکا ہوگا اگر شکیلہ کی بات پر ذرا دیر کے لیے صاد کر بھی لیا جاتا تو ہم کون سا اتنے ماہر غوطہ خور تھے۔ میرا چہرہ بدستور اُترا ہوا پا کر اس بار باریہ نے بڑے پتے کی بات کہی جس سے پہلی بار میرے بجھے ہوئے دل میں ایک موہوم سی آس نے سر اُبھارا۔ وہ بولی۔

"شہزی! فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں، ہیرا جہاں گرا ہے، وہ ساحل اور سمندر کا کنارہ ہے...... رہی بات ماہر غوطہ خوری کی تو اس مسئلے کا حل بھی یہی ہے جو شکیلہ نے بتایا یعنی اگر ہمیں غوطہ خوری کا مخصوص سامان مل جاتا ہے تو ماہر غوطہ خوروں کی ہمارے پاس کمی نہیں۔ وہ آرام سے سمندر اور ساحل کے اس حصے میں جا کر اس ٹکڑے کو کھنگال ڈالیں گے۔ لیکن شرط یہی ہے کہ جو کچھ کیا جائے جلد ہی کر لیا جائے، اس میں تاخیر، ہیرے کو گہرے پانیوں میں لڑھکا دینے کا باعث بنے گی۔"

اس کی بات معقول تھی اور پھر سب کچھ جلدی جلدی نمٹایا گیا۔ ہم سب عمارت میں گھس گئے اور اس کے چپے چپے کو کھنگال ڈالا۔

باریہ کا خیال درست ثابت ہوا تھا۔ ہمیں کم از کم غوطہ خوری کا سامان مل گیا تھا، ہم میں سے تو کسی کو بھی غوطہ خوری کا کوئی خاص تجربہ نہ تھا، ہم یہ لباس پہن کر سمندر کے اندر کی سیر تو کر سکتے تھے، مگر اندر کائی زدہ پودوں اور ریت میں کسی شے کو تلاش کرنا مشکل تھا۔

... پایا اور پانچ جاوی غوطہ خوروں کا لباس پہنے پانی میں اُتر گئے۔ میں نے اللہ سے ہیرا مل جانے کی دعا کی اور اول خیر اور شکیلہ کو وہیں ساحل پر رکے رہنے کا کہا۔ اس کے بعد میں باریہ اور کبیل دادا کے ساتھ دیگر حالات کا جائزہ لینے کے بعد شگرال وغیرہ کے ساتھ آن ملا...... ثنالیہ بھی بھائی کے ساتھ تھی اور دونوں بہن بھائی مجھ سے بے حد متاثر ہی نہیں ہوئے بلکہ میرے ممنون بھی ہو رہے تھے۔

انہوں نے مجھے بتایا کہ اپنی سرزمین پر ان کا مکمل قبضہ ہو چکا تھا۔ میں نے انہیں ڈارک کیسل کی عمارت ڈھانے کا مشورہ دیا تھا اور وہ خود بھی یہی چاہتے تھے کہ اپنے غاصب دشمن کی کوئی بھی نشانی وہاں رہنے نہ دی جائے۔ اس کے بعد میں نے نصیر شاہ وغیرہ کو بھی بیس کیمپ سے بلا لیا تھا، میں نے شگرال اور ثنالیہ کو نصیر شاہ سے آگاہ کیا اور بونیزا پروجیکٹ کے بارے میں بھی تفصیلی بریفنگ دیتے ہوئے انہیں بتایا کہ یہ اب ان کی ملکیت ہے اور اس پروجیکٹ کو جس قدر ممکن ہو سکے راز میں رکھا جائے اور اس دوران انہیں (جاوا قبیلے کو) اپنی افرادی قوت بڑھانے کے ساتھ ساتھ روایتی ہتھیار چھوڑ کر آتشیں ہتھیاروں کی تربیت دیتے ہوئے اپنی باقاعدہ ایک عسکری قوت قائم کریں تاکہ اپنی سرزمین کا جنگی اُصولوں کے تحت تحفظ کر سکیں۔ ان کے پاس اب بونیزا کی صورت میں ایک کثیر سرمایہ ہے جس کے بل بوتے پر یہ لوگ اپنی طاقت بڑھا سکتے ہیں، افرادی قوت کے لیے انہیں دیگر اریب قریب کے قبائلیوں کو بھی اپنے ساتھ ملانا ہوگا اور انہیں بھی جدید خطوط پر تربیت دیتے ہوئے تہذیب و تمدن کے ساتھ ایک بڑے اتحاد کی صورت میں ایک بڑی مسلم ریاست کی داغ بیل ڈال کر رہنا ہوگا جبکہ بھارت کی مسلم تبلیغی جماعتیں انہیں وہ ساری ممکن مدد خود ہی فراہم کر دیں گی جن کی انہیں ضرورت ہوگی۔ یہ کام نصیر شاہ بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔

وہاں اسلام زندہ باد اور میرے حق میں قبائلیوں نے نعرے بلند کرنا شروع کر دیے تھے۔

سوشیلا کو بھی...... بلراج اور ایڈوانی کی میرے ہاتھوں ہلاکت کا علم ہو گیا تھا اور وہ بے اختیار خوشی اور فرطِ جذبات سے مجھ سے لپٹ گئی تھی۔

"شہزی! تم نے اپنا وعدہ پورا کر کے آج مجھ سے اپنی دوستی کا حق ادا کر دیا۔ آج میرے سینے میں بھڑکتی ہوئی آتشِ انتقام ہمیشہ کے لیے سرد ہو گئی جس نے مجھے بے چین

میں اس کے سر پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرنے لگا۔

اس کی ٹانگ اب کافی حد تک بہتر ہو گئی تھی، وہ اب بغیر سہارے کے مگر تھوڑے لنگ کے ساتھ خود بھی چل لیتی تھی۔

یہ سارے اللہ کے کام ہوتے ہیں کہ وہ کسے نیک اور بڑے کاموں کی توفیق عطا فرماتا ہے، میں اسے اپنی خوش نصیبی ہی سمجھتا تھا کہ اسلام کی سربلندی کے لیے یہ نیک اور بڑا کام میرے ہاتھوں تکمیل کو پہنچنے والا تھا۔

میں اب اللہ سے یہی دعائیں مانگ رہا تھا کہ ہیرا مل جائے تو میں اپنے ساتھیوں سمیت اس سرزمین سے اپنے وطن پاکستان کوچ کر جاؤں اور اب عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں کوئی مربوط منصوبہ بندی ترتیب دوں۔

میری اپنی مہمات مجھے کہاں سے کہاں لے آئی تھیں...... عابدہ کا خیال آتا تو دل مسوس کر رہ جاتا، مگر دل میں اُمید ابھی زندہ تھی اور محبت یار بھی باقی تھی۔ اللہ کا ساتھ تو میرے ساتھ ہمیشہ سے ہی تھا، البتہ ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے میرا یہ ایمان تھا کہ ہر کام کے کرنے کا ہی نہیں بلکہ ہونے کا بھی ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔

☆☆☆

طویل جدوجہد کے بعد میری پیاسی اور منتظر سماعتوں نے بالآخر یہ خوش خبری بھی سن لی کہ وہ نایاب و نادر طلسم نور ہیرا سمندر کی تہ سے برآمد کر لیا گیا تھا۔ باریہ کا مشورہ درست ثابت ہوا تھا۔ اس نے یہی کہا تھا کہ ہیرا ابھی ساحل کے قریب ہی سمندر میں کہیں موجود ہوگا اور ضرور مل جائے گا اور ہوا بھی یہی تھا۔

وہ ہیرا دو جادوی غوطہ خوروں کے ہاتھ لگا تھا، جسے بعد میں میری ہدایت کے مطابق اول خیر اور شکیلہ نے اُن سے لے کر فوراً اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔

اس ہیرے سے متعلق بھی میں باریہ سمیت شگراں وغیرہ کو آگاہ کر چکا تھا کہ اس پر ہمارا حق ہے، اس کا ان کی سرزمین یا قبیلے سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ میرے ملک پاکستان کی امانت ہے۔

جب وہ ہیرا اول خیر اور شکیلہ لے کر میرے پاس پہنچے تو میں نے شدت کی بے چینی اور سنسنی آمیز تجسس کے زیرِ اثر اس باکس کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ایک بار پھر میرے ذہن میں اس خبیث جہنم رسید جنرل ایڈوانی کی بکواس گردش کرنے لگی ”تم ہیرے کو پا کر بھی نہ پاسکو گے۔“

خوشی بھی تھی اور ہول بھی آتا تھا۔ وہ ایک باکس تھا۔ یا یوں کہہ لیں ایک چھوٹا سا صندوقچہ، جو بارہ انچ چوڑا اور بارہ ہی انچ لمبا تھا، جبکہ گہرائی نو انچ تھی۔ صندوقچے پر ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے، جو عام سی نوعیت کے تھے، تاہم صندوقچہ کہیں سے بھی قدامت کی شبیہ نہیں دیتا تھا۔ جس کا صاف مطلب تھا کہ ہیرے کو دریافت کرنے کے بعد اسے بعد میں اس صندوقچے میں رکھا گیا ہوگا۔

اس کے ڈھکن اور ”گرد پوش“ میں خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ اس صندوقچے کو خصوصی طور پر شاید اسی ہیرے کو رکھنے کے لیے بنایا گیا تھا۔

مجھے اس نادر روزگار طلسم نور ہیرے سے متعلق ہشام جھنگری مرحوم کی وہ گفتگو یاد آنے لگی جو اس نے پوری تفصیل کے ساتھ مجھے بتائی تھی کہ موئن جودڑو لاڑکانہ میں ڈوکری کے مقام پر ایک مشہور تاریخی کھنڈرات کا حامل علاقہ ہے، جہاں آج سے کچھ سال پہلے.... سندھیالوجی کے ایک پروفیسر کریم بخش نظامانی نے کھدائی کروائی تھی۔ ان کی کوششوں سے ہیرا دریافت ہو گیا تھا۔

”پروفیسر کریم بخش نے اس ہیرے کا نام ”طلسم نور ہیرا“ رکھا تھا۔ یہ نام رکھنے کی وجہ وہ اپنی عرق ریزی اور نجانے کتنی اجنبی، نامانوس اور متروکہ زبان کی تحقیق کے مطابق، ایسی پُراسراریت بتاتے تھے جو اس ہیرے سے وابستہ تھیں۔ نجانے کیا بات تھی جو میں نے اس ہیرے کی بازیافت کے بعد محسوس کی تھی وہ یہ کہ پروفیسر کریم بخش نظامانی گم صم اور عجیب سے رہنے لگے تھے، ان کی ازحد خوشی کو جیسے ایک اسرار بھری چپ کھا گئی تھی۔

”جب میں نے طلسم نور ہیرے کو کھدائی کے بعد پہلی بار دیکھا تو اسے دیکھتے ہی مجھ پر ایک عجیب سا سحر طاری ہو گیا تھا، یہ ہیرا جو ایک بڑے سے کالے اژدھے کے منہ کے اندر کسی سچے نگینے کی طرح رکھا ہوا تھا۔ اس وقت دنیا میں سب سے بڑے، قیمتی اور تاریخی عظمت کے حوالے سے کوہ نور ہیرے کی اہمیت جانی جاتی ہے۔ کوہ نور ہیرا خوب صورتی میں بھی اپنی مثال آپ ہے لیکن پاکستان سے برآمد ہونے والا یہ طلسم نور ہیرا خوب صورتی اور وزن اور سائز میں اس سے بھی نسبتاً بڑا تو تھا ہی، نیز تاریخی ورثے کے حوالے سے بھی اس کی عظمت کوہ نور ہیرے سے بڑھ کر ہی تھی، اس کے علاوہ اس ہیرے میں مجھے ایک عجیب سی پُراسراریت بھی محسوس ہوئی تھی، باوجود کوشش کے میں زیادہ دیر اپنی نظریں

اندر سے غیر مرئی لہریں چھوڑتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، جو میری آنکھوں کے راستے میرے پورے وجود میں سرایت ہو رہی تھیں، جب میں نے تھوڑی کوشش سے اس پر اپنی نگاہیں جمانا چاہیں تو مجھے یوں لگا جیسے میں گرد و پیش سے لاتعلق کسی اور ہی دنیا کی طرف پرواز کرنے لگا ہوں، میری سماعتوں میں عجیب و غریب خوفناک آوازیں آنے لگیں، جس میں چیخ و پکار، پھنکاریں، تیر و تفنگ، میدان جنگ کا سا سماں اور دیو ہیکل درندوں کی دہاڑیں، بے ہنگم قہقہوں کے درمیان آہیں اور سسکیاں اور نجانے کیسی کیسی دل ہولا دینے والی آوازیں تھیں۔ پھر مجھے اپنا وجود منتشر سا محسوس ہونے لگا تھا کہ اچانک مجھے کسی نے شانوں سے پکڑ کے جھنجوڑا، میں جیسے ایک خواب سے بیدار ہو گیا، میں نے دیکھا، پروفیسر صاحب نے مجھے سنبھالا ہوا تھا، وہ خود بھی مجھے پریشان اور حیران نظر آ رہے تھے۔

''مرنے سے پہلے وہ اس بات پر متفکر تھے کہ اگر یہ ہیرا...... نہ ملا تو یہ...... دنیا میں تیسری جنگ عظیم کا سبب بن سکتا ہے، کاش! یہ جلد ہمیں مل جائے، ورنہ اس کے اثرات کسی ہائیڈروجن اور ایٹم بم سے کم نہیں ہوں گے۔

''میرا تعلق بھی چونکہ آثار قدیمہ سے تھا اور پروفیسر کریم بخش نگامانی صاحب کے سب سے زیادہ قریب تھا۔ مجھے بھی اس نادر و انمول ہیرے کے چوری ہونے کا سخت ملال تھا لیکن میں مایوس نہیں ہوا، میں نے بے حد کوشش کی کہ کسی طرح حکومت اور مقتدر حکومتی حلقے اس ہیرے کی تلاش میں میرا ساتھ دیں مگر انہیں تو اپنی خرمستیوں سے ہی کہاں فرصت تھی۔ ان کے لیے تو یہ سب ایک دیوانے کا خواب ہی تھا مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ وطن عزیز کو کس قدر اہمیت کے حامل تاریخی نوادر سے محروم کر دیا گیا تھا، جو اگر پاکستان میں ہوتا تو اس کا کس قدر فائدہ ملک کو ہوتا۔ مگر افسوس کسی حکمراں جماعت نے اسے تلاشنے یا کھوجنے کا بیڑا نہ اٹھایا۔''

بشام چھنگری کی باتوں کے سحر کے بھنور سے ابھر کر میں نے اپنے سر کو زور کا جھٹکا دیا۔

بہرحال...... میں اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا، تب ہی مجھے یہ دیکھ کر ایک دیدنی سی حیرت ہوئی کہ اس صندوقچے میں کوئی ''کی'' سوراخ نظر آ رہا تھا نہ ہی کوئی ایسا ''کھٹکا'' جس سے اسے کھولا جائے۔

''یہ کیسا باکس ہے؟ اس میں کوئی سوراخ نظر نہیں جائے؟'' میں بڑبڑایا۔ کھیل دادا نے وہ صندوقچہ میرے ہاتھ سے لیا اور وہ بھی اس کا بغور جائزہ لینے لگا۔ پھر صندوقچے کو اپنے کان کے قریب لے جا کر ہلایا۔ اس کے بعد نفی میں سر ہلا دیا۔

''لاؤ...... مجھے دو...... میں دیکھتی ہوں۔'' باربیہ نے کہا اور کھیل دادا نے خاموشی سے وہ صندوقچہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ میری یک ٹک سی نظریں باربیہ کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے اس عجیب صندوقچے پر جمی ہوئی تھیں اور سماعتوں میں جہنم رسید ایڈوانی کے وہی زہر آلودہ الفاظ گردش کر رہے تھے۔

''تم اس ہیرے کو پا کر بھی نہ پا سکو گے۔''

اس کی بکواس کا کیا مطلب تھا آخر......؟ میں نے سوچا مگر نہیں...... یہ اس کی محض بکواس نہ تھی۔ کچھ ایسا تھا اس صندوقچے میں جس کا کوئی خفیہ میکنزم تھا اور کوئی بعید نہیں کہ صندوقچہ ایڈوانی نے ہی خاص اسی نادر ہیرے کو دوسروں سے محفوظ رکھنے کے لیے ہی تیار کروایا ہو۔

باربیہ اس صندوقچے کو خاصی دیر تک ٹھونک بجا کر دیکھتی رہی پھر جیسے خود کلامیہ انداز میں ہولے سے بڑبڑائی۔

''ڈونگی......'' کچھ ایسا ہی لفظ اس کے لبوں سے برآمد ہوا تھا۔

''کیا کہا تم نے......؟'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''ڈونگی......'' وہ دوبارہ اسی انداز میں بولی۔ ''یہ ڈونگی ہے...... سلاسکو کا باپ ایرک ایسے ڈونگی سردار بوغا کے لیے بنایا کرتا تھا۔ ان کے جواہرات اور خاص قسم کی مہروں کو رکھنے کے لیے......''

''سلاسکو...... کہیں وہی تو نہیں جو ہمارا ساتھی ہے؟''

''ہاں وہی سلاسکو......'' کہتے ہوئے اس نے چیخ مار کر سلاسکو کو پکارا۔

شگرال اور رضالیہ نے بھی اس صندوقچے کو پہچان لیا تھا اور باربیہ کی بات کی تائید بھی کر دی تھی۔

''سلاسکو......'' وہ پھر چیخی اور تھوڑی ہی دیر بعد سلاسکو ہمارے روبرو تھا۔ باربیہ نے صندوقچہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

''ایسے صندوقچے تمہارا باپ بنایا کرتا تھا۔ یہ کیسے کھلتا ہے؟'' باربیہ نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے

اسے کھول نہیں پایا تو ستالیہ نے کہا۔

"مجھے دو...... میں نے بابا کو ایک بار اپنے سامنے ایسا ہی صندوقچہ کھولتے ہوئے دیکھا تھا۔"

سلاسکو نے فوراً وہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ستالیہ نے وہ صندوقچہ اپنے ہاتھ میں لیا۔ پہلے تو اس کا بہ غور اچھی طرح معائنہ کرتی رہی اس کے بعد وہ زمین پر بیٹھ گئی اور صندوقچہ اپنی گود میں رکھ لیا، پھر مخصوص انداز میں اس کے چاروں طرف ہاتھ پھیرنے لگی، تب ہی اچانک کلک کی آواز ابھری اور وہ کھل گیا اور اس کے اندر رکھے طلسم نور ہیرے کی خوبصورتی دیکھ کر ہم سب کے منہ بھی کھل گئے۔

"بلاشبہ...... اسے دور حاضر کا اب تک دریافت ہونے والا خوبصورت ترین نوادر کہا جا سکتا ہے، مگر افسوس اس کی خوبصورتی کو تیسری عالمی جنگ میں جھونک کر بدصورت بنایا جا رہا تھا۔" سب سے پہلے نصیر شاہ نے اس پر تبصرہ کیا۔

وہ سکتے کی کیفیت میں اس کو دیکھ رہا تھا۔ وہ چیز ہی ایسی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ ایک لمحے کو خود کو فراموش کر چکا تھا۔ صندوقچہ میرے ہاتھوں میں تھا اور میرا اپنا سر اس پر جھکا ہوا تھا۔ باقی وہاں موجود لوگ بھی باری باری قریب آ کر اسے حیرت زدہ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور تعریف کیے بغیر نہیں رہتے۔

وہ ہیرا مرغی کے انڈے کے برابر تھا۔ دن میں بھی اس کی روشنی اور تیزی قابل دید تھی۔

یہ سوچ کر میرا سینہ فخر سے پھول گیا تھا کہ اتنا قیمتی اور دنیا کا خوبصورت ترین ہیرا میرے وطن کی ملکیت تھا۔

اپنی کلی منجارو والی مہم، طلسم نور ہیرے سمیت پایۂ تکمیل کو پہنچتے ہی اب میں واپس پاکستان لوٹنے اور آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرنے کے لیے بے چین ہو گیا۔

میں نے اس سلسلے میں ایک میٹنگ صرف اپنے چاروں ساتھی، کمیل دادا، اول خیر، شکیلہ اور سوشیلا کے ساتھ کرنے کی ٹھانی اور شگرال سے درخواست کی وہ مجھے آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرنے کے لیے میرے مذکورہ چاروں ساتھیوں سمیت کچھ دنوں کے لیے تنہا چھوڑ دے۔ اس نے مسکرا کر اور بغیر برا منائے مجھے اس کی اجازت دے دی۔

جاوا قبیلے کی کمان مکمل طور پر یونیز اپروجیکٹ سمیت شگرال اور ستالیہ کے سپرد کر کے میں ڈارک کیسل کے اس حصے میں اپنے چاروں ساتھیوں سمیت آ گیا۔

ہامی بھری تھی مگر میں نے انکار کر دیا۔ وہ مجھے فقط شکایتی نگاہوں سے گھور کر رہ گئی مگر پھر فوراً ہی مسحور نگاہوں سے مسکرائی بھی تھی۔ تاہم ایک موقعے پر جب میں اپنے ساتھیوں کو ڈارک کیسل کا رخ کرنے کا اشارہ کر چکا تھا اور باربیہ سے آخری بار بات کر رہا تھا تو اس نے کہا۔

"شہزی!...... مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ تمہاری اصل منزل کہیں اور ہے، اس جزیرے سے بھی دور، ان سمندروں سے بھی آگے، لیکن تم نے ہم پر جو احسان عظیم کیا ہے، اس کا بدلہ تو ساری عمر ہم نہیں اُتار سکتے۔"

اس کی بات سن کر میں نے کہا۔ "میرے احسان کا بدلہ بس یہی ہوگا کہ تم سب لوگ یہاں اپنی سرزمین میں آزاد اور خوش رہو۔ نصیر شاہ تم لوگوں کی قسمت بدلنے آیا ہے۔ اس سے پورا تعاون کرنا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اللہ کی طرف سے تم لوگوں کے لیے انعام ہے کہ یہاں دنیا کی سب سے بڑی ہیروں کی کان دریافت ہوئی اور اس جزیرہ انڈیمان کے جن دور افتادہ قبیلوں میں سب سے پہلے اسلام کی روشنی پھیلی ہے، وہ جاوا قبیلہ ہے۔"

میری بات پر باربیہ نے عقیدت اور احترام سے اپنا سر اثبات میں ہلایا تھا۔ پھر میں اسے خدا حافظ کہہ کر ڈارک کیسل کی طرف چل دیا۔

ڈارک کیسل کی عمارت کو ابھی مسمار نہیں کیا گیا تھا۔ یہ کام ہمارے کوچ کرنے تک موقوف رکھا گیا تھا۔ ایسا میری ہدایت پر ہی کیا گیا تھا۔

اپنے ساتھیوں کے ساتھ کسی میٹنگ کا آغاز کرنے سے پہلے میں آنسہ خالدہ اور زہرہ بانو سے رابطہ کرنا چاہتا تھا۔

بالخصوص آنسہ خالدہ سے بات کرنے کی میری بے چینی عروج پر تھی۔

ہم سب سے پہلے ایسے کمرے میں آ گئے جو جنہم واصل ایڈوانی کے زیر استعمال تھا اور یہاں بیٹھ کر دنیا بھر سے وہ لاسلکی رابطے میں رہتا تھا، لیکن جب یہ سارا سسٹم آپریٹ کیا گیا تو میں نے جھلا کر چینل بورڈ پر ہاتھ مارا۔

"وہ بدبخت یہ سارا سسٹم کوڈ لگا کر لاکڈ کر چکا ہے، اب یہ محض کھلونوں سے بڑھ کر ہمارے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔"

"اوہ......" شکیلہ کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔

ہم سب نے ان آلات کے ساتھ بہت سر کھپایا تھا مگر

"میرا خیال ہے اب ہمیں یہاں سے جلد از جلد کوچ کرنے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔" بالآخر کیبل دادا نے کہا۔

"اس سلسلے میں سوشیلا بہن ہماری خاطر خواہ مدد کر سکتی ہے۔" شکیلہ نے کہا۔ "ایڈوانی اور بلراج سنگھ کے مرنے کے بعد اب یہ بالکل آزاد ہے اور بھارت کی شہری بھی۔"

شکیلہ کی بات خاصی حد تک درست تھی۔ میں ابھی خاموش تھا۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے پاس کوئی بھی شناختی کاغذات نہ تھے۔ سوشیلا کا کہنا تھا کہ کاغذات کی تیاری میں خاصا وقت لگ جائے گا۔ کاغذات کی موجودگی کے باوجود ہر صورت میں خطرہ تھا۔

سوچ بچار کے بعد بالآخر میں نے کہا۔ "اتنا رسک اٹھانے سے بہتر ہے کہ ہم نارتھ انڈیمان سے ہی کوچ کرنے کی کوشش کریں۔ یہ قبائلی لوگ کب کام آئیں گے، یہ ہماری ایسے خفیہ اور نسبتاً محفوظ سمندری راستوں کی راہنمائی کر سکتے ہیں۔ جس سے ہم سب اپنا فرار کامیاب بنا سکتے ہیں۔"

ہم سب اسی کمرے میں مختلف نشستوں پر بیٹھے تھے جہاں کبھی شلپا بیٹھی ہوتی تھی۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی اور کوئی نہیں بولا۔ جس کا صاف مطلب تھا کہ سب اس تجویز سے متفق تھے۔ ہم ماہی گیروں کا روپ دھار کے یہاں سے نکلیں۔

جب ہم نے یہی تجویز شنگرال اور حسالیہ کے سامنے رکھی تو انہیں بھی ہمارا اسی طرح یہاں سے نکلنا زیادہ مناسب لگا۔ اس کے لیے ایک عدد فشنگ بوٹ کی ضرورت تھی جو جدید اسٹائل کے بجائے پرانی اور کلاسک طرز کی ہوتی اُتنا ہی ہمارے بہروپ کو اثر انگیز بناتی۔ یہ ان دونوں بہن بھائیوں کا مشورہ تھا، اس کے لیے اُنہوں نے ہمیں ایسی کچھ بوٹس بھی ساحل پر لے جا کر دکھائیں، جنہیں جنرل ایڈوانی کے "دورِ حکومت" میں بے کار جان کر نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ یہ قبائلی اسی کے ذریعے سمندر میں مچھلیاں پکڑتے تھے۔ ایسی ہی ایک نسبتاً بہتر حال بوٹ کو ہم نے منتخب کر لیا۔ اس میں ایندھن سے چلنے والی موٹر بھی فٹ تھی۔

اس بوٹ کو منتخب اور "فائنل" کرنے کے بعد شنگرال نے اپنے ماہر خلاصیوں اور کاریگروں کو اس کی صفائی اور ضروری مرمت پر لگا دیا۔ ایندھن کا ایک ٹینک اضافی بھی رکھ دیا گیا۔ باقی ماہی گیری کا سارا ساز و سامان پہلے ہی سے ساتھ ہی ایک بڑا سا جال بھی ایک مستول پر جھلا دیا، تاکہ دور سے ہی دیکھنے پر اندازہ ہو جائے کہ یہ ماہی گیروں کی کشتی ہے۔ اس کے علاوہ سمندر سے کچھ مچھلیاں پکڑ کر لا دی گئیں۔

اس ساری تیاری میں دو سے ڈیڑھ دن لگ گئے تھے اور اب بس روانگی کی دیر تھی۔

کمپاس وغیرہ ہم نے رکھ لیے تھے اور شنگرال نے اپنے قبیلے کے اُن لوگوں کو ہمارے پاس بٹھا کر ہمیں اچھی طرح سے محفوظ سمندری راستوں کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اس کے لیے انہوں نے رات کا وقت مقرر کیا تھا، آسمان پر تارے ٹمٹما رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں قطبی تارے کے بارے میں بھی بتایا جسے دیکھ اور سمجھ کر ہم سمت کا تعین کرتے رہتے۔

بلاشبہ ہمارا یہ فرار کسی "گریٹ اسکیپ" سے کم نہ تھا۔ اس کے لیے ہم نے اگلے دن رات کا ہی وقت مقرر کیا تھا۔ اسلحہ بھی ہم نے چھپا رکھا تھا۔ تاکہ ضرورت پڑنے پر ہم اسے اپنے دفاع کے لیے استعمال کرتے۔

سوشیلا کو پورٹ بلیئر اور پھر ممبئی پہنچانے کی ذمے داری بھی شنگرال نے لے لی تھی۔ مگر میں پہلے سوشیلا کو یہاں سے بہ خیریت روانہ ہوتے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں تیاری کر لی گئی تھی۔

اس مقصد کے لیے چھوٹی اور تیز رفتار موٹر بوٹ کام میں لانے کا فیصلہ کیا گیا تھا، جو وہاں تین چار کی تعداد میں موجود تھیں۔ ان کا تعلق "مالِ غنیمت" سے تھا۔

سوشیلا کو اگلے دن صبح روانہ ہونا تھا اور اسی دن کی رات ہم سب کو اس جزیرے سے روانگی اختیار کرنا تھی۔ سوشیلا سمیت ہم سب روانگی سے متعلق معاملات طے اور فائنل کر چکے تھے۔

ہم پانچوں ڈارک کیسل کے ایک کمرے میں بیٹھے رات کا کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد چائے کا دور چلا اور ہمارے گریٹ اسکیپ کے اس منصوبے پر ہی غور و خوض اور اس سے متعلق گفتگو ہوتی رہی، تاہم اس بار کی گفتگو کا زیادہ تر لب لباب بچے کھچے دشمنوں اور ان کی باقیات پر متی رہا۔ اس میں سے جی کو ہارا، بھولا ناتھ اور کوربیلا تھے۔ جن کے بارے میں کسی احتیاط کے پیشِ نظر میں نے شنگرال اور حسالیہ کو آگاہ کر دیا تھا۔ انہیں ان سے اب کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔ کیونکہ ایک تو ان کے بہت

اس کے آس پاس خاک چھاننے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

تاہم شنگرال ان کی تلاش جاری رکھے ہوئے تھا جبکہ گوریلا ایک قیدی کی صورت میں ان کے پاس ہی تھی۔ اس کا فیصلہ سوچ سمجھ کر بعد میں کیا جانے والا تھا اور میں نے شنگرال وغیرہ کو اس کے بارے میں تفصیلی آگاہ کر دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ جاوا قبیلہ بہت جلد اپنے یونیزا پروجیکٹ اور بھارتی تبلیغی مسلم جماعتوں کی سپورٹ سے اپنی ذاتی عسکری اور سماجی قوت میں آجائے گا۔

اس کے بعد ہم سونے کے لیے اپنے کمروں کا رخ کرنے لگے۔ ہم سے چند منٹ پہلے ہی سوشیلا اُٹھ کر کمرے سے نکل چکی تھی۔ شکیلہ اور سوشیلا کا ایک ہی کمرا تھا۔ کبیل دادا اسی کمرے میں سوتا تھا جبکہ اول خیر اور میں اس کے برابر والے کمرے میں۔

چنانچہ کبیل دادا تو وہیں ایک کونے میں بچھے بیڈ پر پاؤں پسارے لیٹ گیا، جبکہ میں، اول خیر اور شکیلہ اپنے کمروں میں جانے کے لیے رخصت ہوئے۔

کمرے کے برابر میں ہی ایک مختصر ریلنگ کی صورت میں راستہ بالکونی کی طرف جاتا تھا جس کا رخ کھلے سمندر کی طرف تھا۔

قریب سے گزرتے ہوئے اس طرف جب میری نظر پڑی تو میں چونک سا گیا اور میرے بڑھتے ہوئے قدم آپوں آپ کیل ہو گئے۔ بالکونی کی ریلنگ سے سوشیلا لگی کھڑی تھی اور اس کی میری جانب پشت تھی، چہرہ سامنے بیکراں پھیلے پُرسکون سمندر کی طرف تھا۔ جس کے صاف و شفاف تاروں بھرے آسمان پر چاند کا زرد تھال الٹا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ سوشیلا وہاں جانے کیا دیکھنے میں محو تھی۔

میرے ساتھ چلتے ہوئے اول خیر اور شکیلہ بھی رکے مگر پھر اول خیر نے ہولے سے معنی خیز انداز میں کھنکھار کر شکیلہ کو آگے بڑھنے کا ٹہوکا دیا اور دونوں اپنے اپنے کمروں کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ میں نے بالکونی کی طرف اپنے قدم بڑھا دیے۔

میں سوشیلا کے بالکل عقب میں قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ فضا نرم اور ہلکورے لیتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔ سمندری ہواؤں کے خنک جھونکوں میں تیزی نہیں تھی۔ ہلکہ ان میں ایک تھپکنے اور سہلانے کا انداز تھا۔ ان کی سبک خرامی کی جانب تکے جا رہی تھی اور اس کے انداز میں ایک کھویا پن محسوس ہوتا تھا۔

''سوشی......!'' میں نے ہولے سے اسے پکارا اور تب ہی مجھے اس کی ہلکی سسکی کی آواز سنائی دی۔ اس نے میری طرف گردن موڑے بغیر اپنا سر بھی خفیف سا جھکا لیا۔

یہ محسوس کر کے کہ وہ رو رہی تھی، میرے اپنے دل کو ایک گھونسا لگا۔ ہم جدا ہونے والے تھے، ہمارے درمیان کوئی عہد و پیمان نہیں تھا۔ ہم نے ساتھ جینے اور مرنے کی قسمیں بھی نہیں کھائی تھیں۔ نہ ہی کبھی ایک دوسرے سے محبت کا اظہار کیا تھا۔ ہاں! بہت سا وقت ایک ساتھ ضرور بتایا تھا۔ مشکل اور کٹھن حالات میں ساتھ رہے تھے اور اس دوران میں ایسے لمحات اور ایسی گھڑیاں بھی آئی تھیں، جب ہم قلبی طرح نہیں تو جسمانی طور ایک دوسرے کے قریب بالکل قریب بھی ہو گئے تھے۔ ایسی ساعتوں نے بھی ہمارے کانوں میں پُرشوخ سرگوشیاں کی تھیں جب ہم بھگت گڑھ کے کارواں سرائے اور خون آشام مہارانی کی حویلی کے ایک ہی کمرے میں سوئے تھے۔ وہ خطرناک پل بھی مجھے نہیں بھولے تھے جب انڈیمان کے تاریک جنگلوں میں ہم دونوں یک جسم رہے تھے۔ ممبئی کی شامیں اور سی سائڈ ہوٹل یاد تھے مجھے جب، جہاں ہم مسکراتے اور ہنستے تھے۔

یہ سب کیا تھا؟ کیا کوئی دلی جذبہ، یا جذباتی رشتہ......؟ ایسا نہ تھا تو پھر جیسا مجھ سے بچھڑنے کا اسے دکھ تھا تو مجھے بھی ویسا ہی کیوں ہو رہا تھا۔ یا پھر شاید قربت اور اپنائیت کے رشتے سے تو ضرور میرا اور اس کا کوئی رشتہ استوار ہو ہی چکا تھا۔

''تم رو رہی ہو......سوشی!''

بے اختیار اور اچانک ہی میرے منہ سے یہ نکلا تو اپنی آواز اور لہجے کی اس بوجھل سی...... بھیگی بھیگی سی...... لڑکھڑاہٹ پر ششدر رہ گیا۔

''یقین...... نہیں آتا...... کہ کل کا طلوع ہونے والا سورج ہماری راہیں جدا کر دے گا۔'' وہ ہولے سے ڈبڈبائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''تمہارے عہد کی پختگی اور سچائی نے مجھے شدت کے ساتھ اس بات کا احساس دلایا ہے کہ تمہارے جیسے سچے دوست یوں بچھڑنے کیوں لگتے ہیں؟ ہمیشہ کا ساتھ کیوں نہیں رکھتے۔ ان سے جدا ہو جانے کے دکھ کا احساس مارے کیوں ڈالتا ہے۔''

میں نے ہولے سے اس کے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھا تو اس نے بھی اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا اور میری

سے آنکھیں ہی نہیں اس کا چہرہ بھی چمک رہا تھا۔ ہونٹ خفیف سے واتے اور ان پر تھرتھراہٹ غالب تھی۔ وہ پلٹ کر میرے بہت قریب ہوگئی، اتنی کہ اس کی غمزدہ سی سانسوں کی بازگشت بھی مجھے نوحہ کناں محسوس ہوئی۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے شانے تھام کر ان نمناک آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''سوشی! سچ تو یہی ہے کہ خود مجھے بھی تم سے جدا ہونے کا اتنا ہی دکھ ہے جتنا تمہیں ہے۔ مگر ہم مجبور ہیں، ہمیں جدا ہونا پڑتا ہے، ہمیں زندگی کے دھارے پر بہنا پڑتا ہے۔ اسی کا نام زندگی ہے۔ لیکن کیا یہ کم نہیں کہ ہماری اچھی یادوں میں اچھے دوستوں جیسی یادوں کا بھی خوشگوار اضافہ ہوا...... انشاء اللہ زندگی رہی تو پھر بھی کسی موڑ پر ہم ضرور ملیں گے، اچھے دوستوں کی طرح...... مجھے خوشی ہے کہ میں نے تمہاری معصوم بہن اور اس کی فیملی کے قاتلوں کو عبرت ناک انجام تک پہنچایا، کیا تمہیں اس کی خوشی نہیں؟'' میں نے جان بوجھ کر موضوع بدل دیا۔ وہ بولی۔

''کیوں نہیں شہزی! میں تو بہت خوش ہوں، آج میری دیدی اُوشا کی آتما کو شانتی مل گئی ہوگی اور تمہارا یہ احسان تو......''

''نہیں سوشی!'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''احسان کی بات مت کرو، بھلا دوست بھی ایک دوسرے پر احسان کرتے ہیں؟ وہ تو ایک دوسرے کے برے وقت میں کام آتے ہیں اور پھر دیکھا جائے تو ہم دونوں ہی تو ایک دوسرے کے کام آئے ہیں۔ میں نے تمہاری جان کے دشمنوں اور تمہاری بہن کے قاتلوں کو جہنم رسید کردیا، اپنے ملک کی امانت ان سے چھین لی۔ پھر سب سے بڑی بات جس کا کریڈٹ ہم دونوں کو جاتا ہے، وہ یہ کہ ہم نے دنیا کو ایک بڑی خوف ناک جنگ سے بھی بچالیا۔ ورلڈ بگ بینگ کی اہم منصوبہ سازی کی ابتدا۔ جنرل ایڈوانی اسی جگہ سے کرنا چاہتا تھا اور یہی جگہ اس کی قبر ثابت ہوئی۔''

اس بات پر سوشی ہولے سے طمانیت بھرے انداز میں مسکرائی۔ میں اپنے ہاتھ سے اس کے نمکین چہرے سے آنسو پونچھنے لگا اور پھر تسلی دیتے ہوئے بولا۔

''سوشی! اب تمہاری جان کا کوئی دشمن نہیں بچا، میری دعا ہے کہ تم ممبئی جا کر اپنی ایک نئی اور خوشگوار زندگی کا آغاز کرو۔'' اس پر سوشیلا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے نرم و نازک لبوں سے لگا لیا۔ ''شہزی! دل کی گہرائیوں سے

[illegible]

جائے۔ یاد رکھنا! یہ ایک سچے دوست کی دعا ہے، جو ضرور قبول ہوگی۔''

''انشاء اللہ......'' میں نے زیرلب کہا۔ ''چلو اب آرام کرلو صبح تمہیں سفر بھی کرنا ہے۔''

میں اسے اس کے کمرے تک چھوڑ کر جہاں شکیلہ بھی موجود تھی۔ اپنے کمرے میں آگیا۔

☆☆☆

اگلے دن صبح سوشیلا روانہ ہوئی۔ روانگی سے قبل سب نے اسے کھلے دل کے ساتھ الوداع کیا، سوشیلا تھوڑی دیر کے لیے میرے گلے سے بھی لگی تھی۔ میں نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کی پیشانی پر بوسہ بھی دیا۔

''ممبئی پہنچتے ہی اپنی ٹانگ کا زخم کسی اچھے ڈاکٹر کو ضرور دکھا دینا۔''

''ہاں! ویسے اب تو کافی بہتر ہوگئی ہے۔'' سوشیلا نے بھی شاید جدائی کی اس بوجھل بوجھل سی فضا کو کم کرنے کی غرض سے مسکرا کر کہا۔ جواباً میں بھی مسکرا دیا۔ پھر بعد میں سوشیلا نے مجھے بھی آج رات کو اپنے ساتھیوں سمیت بہ خیریت منزل تک پہنچنے کی دعا دی۔

لنگرال کے دو آدمیوں اور ایک عورت کے ساتھ سوشیلا کو موٹر بوٹ میں سوار کرا دیا گیا تھا۔ عورت باربہ تھی، میں نے اس سے خاص طور پر یہ درخواست کی تھی کہ وہ سوشیلا کے ساتھ پورٹ بلیئر تک جائے۔ وہاں سے سوشیلا کو خود ہی ممبئی کی طرف روانہ ہو جانا تھا۔ اس نے مجھے دو کونٹیکٹ نمبرز بھی دیے تھے جو میں نے ذہن نشین کر لیے تھے۔

ہم ساحل کے کنارے آکر کھڑے ہوگئے۔ سوشیلا کی موٹر بوٹ گہرے پانیوں کی طرف روانہ ہوگئی اور وہ اس وقت تک ہاتھ ہلاتی رہی جب تک اسے ساحل پر میں کھڑا نظر آتا رہا۔ بوٹ اوجھل ہوتے ہی میں ایک گہری سانس خارج کر کے پلٹا تو کسی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

''او...... خیر کاکا! ہولے ذرا......'' اول خیر معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی شکیلہ اور کبیل دادا بھی مسکراتے چہروں کے ساتھ کھڑے تھے۔

''اپنا کاکا...... لگتا ہے اس بھارتی حسینہ کے بچھڑنے سے اُداس ہوگیا ہے۔'' کبیل دادا نے بھی مسکرا کر کہا۔ میں یوں ہی اپنا سر جھٹک کر ہنسا۔

اپنے ساتھیوں کو [illegible]ن اور سرور دیکھ کر مجھے بھی دلی سکون ہوا۔

باقی سب اِدھر اُدھر ہو گئے تھے، ساحل پر سمندر کے قریب صرف ہم چاروں ہی کھڑے تھے۔

''ہوتا ہے..... ہوتا ہے ایسا..... وڈے استاد جی!'' اول خیر اپنا سر دھنتے ہوئے کبیل دادا سے بولا۔ اس پر شکیلہ نے البتہ قدرے سنجیدگی سے کہا۔

''جب کوئی بے تعلق اور بے رشتہ سا شخص لمبے عرصے تک ہر آڑے وقت میں ساتھ نبھاتا رہے اور پھر بچھڑ جائے تو اس سے ایک تعلق ایک نامعلوم سا رشتہ سا قائم ہونے لگتا ہے، جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا مگر اس کا بچھڑنا بھی ایک دکھ سے کم نہیں ہوتا۔''

''اچھا جی..... نازکی بیگم! مجھے نہیں پتا تھی یہ بات..... کہ آپ شاعری بھی کرتی ہیں۔'' اول خیر نے عادتاً شکیلہ کو چھیڑا تو وہ اسے گھور کر بولی۔

''تمہیں شاعری کا پتا بھی ہے کہ یہ ہوتی کیا ہے۔ کم از کم موقع محل دیکھ کر ہی بات کر لیا کرو، سارا موڈ خراب کر دیا۔ ہنہ۔''

''او..... سوری نازکی بیگم! مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ اس وقت کسی خاص موڈ میں تھیں۔'' اول خیر باز نہیں آیا۔

''جہنم میں گیا موڈ اور تم.....'' شکیلہ نے غصے سے اسے گھورتے ہوئے پاؤں پٹخا اور پلٹ گئی۔ میں ہنسا تو کبیل دادا نے بھی حلق سے بے اختیار قہقہہ اُگل دیا اور پھر ہم سب عمارت کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

ایک طویل اور جاں گسل مہم کے بعد بالآخر ہمارے روانہ ہونے کی بھی رات آ گئی۔ سوشیلا کو پورٹ بلیئر تک پہنچانے باریہ اور دو ساتھی گئے تھے، وہ سہ پہر تک لوٹ آئے تھے اور باریہ نے میری ہدایات کے مطابق سوشیلا کو وہاں سے ممبئی جانے والی ایک مسافر لانچ میں بٹھا کر روانہ کر دیا تھا اور پھر یہ تینوں واپس لوٹ آئے تھے۔ سوشیلا کی طرف سے تسلی ہوتے ہی میں نے سکون کی سانس لی۔

روانگی سے پہلے ایک بار پھر ہمیں اچھی طرح سے راستہ سمجھا دیا گیا۔ شگراں کے حکم پر ہمیں ایک نقشہ بھی بنا کر تھما دیا گیا تھا۔ ہم نے ماہی گیروں کا بھیس بھرا اور پھر سب کو خدا حافظ کہہ کر لانچ (فشنگ بوٹ) میں سوار ہو گئے۔ یہ عام سی ہی بوٹ تھی، اس میں فقط ایک ہی موٹر تھی۔ جس کی آواز کسی پھٹ پھٹی موٹر سائیکل سے تقریباً ملتی جلتی تھی۔ ہمیں رخصت کرنے کے لیے شگراں اور نتالیہ سمیت باریہ اور نصیر شاہ کے علاوہ قبیلے کے دیگر لوگ بھی..... الوداع کہنے کے لیے ساحل پر موجود تھے، ان کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں۔ رات اپنے جوبن پر تھی اور موسم خوشگوار تھا۔ لانچ پر پہلے ہی ضروری ''سامان'' لادا جا چکا تھا۔ شگراں، نتالیہ اور نصیر شاہ نے بڑی گرم جوشی اور دعاؤں کے ساتھ ہمیں رخصت کیا تھا۔

ذرا ہی دیر بعد لانچ ساحل سے دور ہونے لگی۔ ہم عرشے پر ریلنگ کے قریب کھڑے ساحل کی طرف ہاتھ ہلاتے رہے کیونکہ ساحل پر ابھی تک وہ لوگ موجود تھے۔ مشعلوں کی روشنی سے دور ہوتا ساحل کسی قندیل کی طرح جلتا ہوا نظر آ رہا تھا اور پھر جب ایک نقطے میں تبدیل ہو گیا تو ہم پلٹ کر کیبن میں آ کر بیٹھ گئے۔

لانچ میں ماہی گیری سے متعلق سامان ہی نہیں بلکہ کافی تعداد میں مچھلیاں اور جھینگے بھی پھیلا دیے گئے تھے، جن کی سیلی سیلی بساند پھیلی ہوئی تھی، تاہم کھلے حصے میں رکھنے کے باعث زیادہ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا تھا، ورنہ دماغ کی رگیں ہی پھٹ جاتیں، کیونکہ ہم ایسی ''اشیا'' کے عادی نہ تھے۔ بقول شگراں کے یہ اشیا ''رشوت'' کا کام بھی کرتی تھیں۔ کوسٹ گارڈز والوں سے جان چھڑانے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ مچھلیاں اور جھینگے ان کی کمزوری تھے۔

بہرکیف..... ہم چاروں ہندوستانی مچھیروں کے گیٹ اَپ میں تھے۔ کیلی چیکٹ واسکٹیں پہن رکھی تھیں اور نیچے کھلے گھیر والی میلی شلواریں تھیں، البتہ میں نے چمڑے کی پتلون نما سی کوئی شے چڑھا رکھی تھی، بقول باریہ اور شگراں کے، ہم میں سے کوئی ایک اس گیٹ اَپ میں بھی ہونا ضروری تھا، یہ لباس بھارتی ماہی گیروں کے مکھیا کا ہوتا ہے۔ شکیلہ نے کاٹھیاواڑی انداز کی اودے رنگ میں خوب کس کر ساڑی باندھی تھی۔ اس بھیس میں وہ پکی بھارتی عورت نظر آتی تھی۔ ایک بندیا بھی اس نے اپنی پیشانی پر چسپاں کر دی تھی۔ اس کا انگ انگ کسی ہوئی ساڑی سے پھوٹا پڑ رہا تھا اور قیامت ہی ڈھا رہا تھا، شکیلہ کو اس روپ میں دیکھ کر اول خیر کو اس پر کوئی زوردار پھبتی کسنے کے لیے بےچینی ہونے لگی جو اس کے چہرے سے صاف عیاں ہوتی تھی، مگر میں نے اُسے گھورتے ہوئے اشارے سے باز ہی رکھا تھا، مجھے ڈر تھا کہیں اول خیر کی جملہ بازی سے زچ ہو کر شکیلہ یہ ساڑی اُتار کر کوئی دوسرا لباس نہ پہن لے۔ جبکہ

حالات کا تقاضا تھا کہ ہم چاروں پر اپر کیسٹ اپ میں ہوں تو دال گلنے کی امید ہوتی۔

شکیلہ نے کافی بنائی تھی اور ایک ایک مگ ہمیں تھما کر خود بھی بیٹھ گئی۔ کیبن کے شیشوں والی کھڑکی سے پرے تاریک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اوپر کھلا تاروں بھرا آسمان تھا جس کی ٹمٹماتی روشنی عجیب سا طلسماتی تاثر ابھار رہی تھی۔ چاند بھی دور کہیں جھکا ہوا تھا۔ تھوڑی ٹھنڈ کا احساس ہونے لگا تھا۔

لانچ کو مناسب رفتار پر ایڈ جسٹ کر دیا گیا تھا۔ ابھی ہم بحرِ ہند ہی کی حدود میں تھے اور کسی وقت بھی بھارتی کوسٹ گارڈز سے ہماری ممکنہ مڈ بھیڑ ہو سکتی تھی گویا ابھی ہم ریڈ زون میں ہی تھے، پھر بھی ہم نے جو سمندری راستہ اختیار کر رکھا تھا وہاں بھارت ہی نہیں بلکہ پاکستانی کوسٹ گارڈ کے ٹکراؤ کا بھی امکان کم ہی تھا۔

''ہمیں نہ صرف بھارت بلکہ اپنے ملک کے بھی کسٹمز سے بچ کر ہی اپنی منزل پر پہنچنا ہوگا۔'' وہیل ونڈو کے قریب بیٹھے کمیل دادا نے گرما گرم کافی کا ایک گھونٹ بھر کر کہا۔

''میں تمہاری بات کا مطلب سمجھ رہا ہوں دادا......!'' میں نے کہا۔ ''پاکستانی کوسٹ گارڈ سے اگرچہ ہمیں اپنی جان کا تو کوئی خطرہ نہ ہوگا، مگر ہم بلاوجہ کی لمبی چوڑی تفتیش اور پوچھ تاچھ میں پڑ کر وقت برباد کر بیٹھیں گے۔''

''وقت ہی نہیں بلکہ اچھی خاصی پنچایت میں بھی پڑ جائیں گے۔'' اول خیر نے کہا۔

''اگر ان سے بھی ٹکراؤ ہو گیا تو کیا ہوا......'' شکیلہ کافی کا مگ ہونٹوں سے ہٹا کر بولی۔ ''انہیں اپنی اصلیت بتانے کی کوئی ضرورت نہیں، بس! ماہی گیری والا ہی موقف اختیار رکھیں گے۔''

''ہاں! اس سے ممکن ہے کہ ہمیں زیادہ لمبے چوڑے پوچھ گچھ کے عمل سے نہیں گزرا جائے۔'' کمیل دادا بولا۔ ''کیونکہ دونوں طرف کے ملکوں کی سمندری حدود میں ماہی گیروں کے غلطی سے سرحد پار کرنے کے واقعات عام طور پر رونما ہوتے رہتے ہیں۔''

''بس دوستو! دعا بھی کرو کہ بھارتی کسٹمز سے بچ کر نکل جائیں۔''

''انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔'' شکیلہ نے دعائیہ لہجے میں کہا تو اول خیر نے اپنا خالی مگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کافی اور مل جائے گی؟''

''اتنا معزز بننے کی کیا ضرورت ہے؟'' شکیلہ نے اس کے ہاتھ سے خالی مگ لیتے ہوئے طنزیہ کہا۔ ''صاف کہو، کافی اور چاہیے۔''

''لو...... عزت راس نہ آئی......'' اول خیر چڑ کر بولا۔ ''اب تم ہماری نوکرانی تو ہو نہیں کہ میں تمہیں حکم دینے کے انداز میں کہتا...... 'اے چھوکری! اور کافی لاؤ......''

اول خیر کی اس چوٹ پر، کچن کی طرف بڑھتی ہوئی شکیلہ رک گئی اور غصے سے اس کی طرف پلٹی۔ ''کیا کہا......؟ میں نوکرانی ہوں؟ جاؤ پھر خود ہی کافی لاؤ اپنے لیے...... میں نہیں جاتی۔'' اس نے خالی مگ تختے پر رکھ دیا اور وہیں اسٹول پر بیٹھ گئی۔ اول خیر نے ہتھیلی سے اپنا سر پیٹا اور بولا۔

''دھت تیرے کی...... پیار سے بولو تو مصیبت، ویسے بولو تو وبال......'' پھر ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''اچھا بابا! شکیلہ بیگم صاحبہ! ایک مگ اور کافی لا دو، تو بڑا احسان ہو جائے گا۔''

میں اور کمیل دادا مسکرا رہے تھے۔ شکیلہ منہ بسورتی رہی۔ آخر اول خیر خود ہی اٹھنے لگا تو وہ بولی۔ ''بیٹھے رہو جہاں ہو...... لے آتی ہوں۔'' اس نے مگ اٹھایا اور کچن کی طرف بڑھ گئی۔

''یار، اول خیر! کیوں بے چاری کو اتنا ستاتے ہو...... دیکھو، پھر بھی وہ تمہارا خیال رکھتی ہے اتنی لڑائی کے بعد......'' کمیل دادا اس سے بولا۔

''او خیر...... وڈے استاد جی! میں اسے کہاں ستاتا ہوں، بس یہی ہر وقت نیم چبائے رہتی ہے۔'' اول خیر بولا۔ اتنے میں شکیلہ کافی لے آئی اور مگ اول خیر کو تھما کر اپنی جگہ بیٹھ گئی۔

پھر اس سے پہلے کہ شکیلہ اور اول خیر کے درمیان دوبارہ کوئی نئی بحث چھڑتی، میں نے کہا۔

''میرا خیال ہے ہمیں ایک نظر میپ دیکھ لینا چاہیے...... اس کے بعد قطبی تارے سے مدد لیتے ہیں، پتا چلے کہاں پہنچے ہیں۔''

شکر ال کا دیا ہوا میپ جو ایک کھال پر بنا ہوا تھا، ہم نے درمیان میں ایک اسٹول پر پھیلا دیا۔ کیبن کی چھت پر ہلکے پاور کا بلب لگا ہوا تھا، اسی کی روشنی میں ہم میپ پر جھک گئے۔

ہمیں نارتھ انڈیمان کے اس دور دراز اور گمنام ساحل سے روانہ ہوئے ایک گھنٹا گزر چکا تھا۔ ہم ابھی بحرِ ہند اور بے آف بنگال کے کسی درمیانی سی چینل کے

اریب قریب ہی تھے۔ ہمیں یہ سفر رات بھر جاگ کر کرنا تھا۔ اگرچہ ہم نے باری باری سونے جاگنے کا ارادہ کر رکھا تھا لیکن چونکہ ہم نے دن بھر اس جنگل بستی میں آرام کیا تھا اس لیے سب ہی جاگے ہوئے تھے۔

دو راتیں اور دو دن خیریت سے بیت گئے۔ ہم باری باری سوتے جاگتے تھے۔ لانچ کی رفتار ایک حد سے زیادہ نہیں تھی۔ ہمارے لیے یہ بھی بہت تھی۔ منزل تک فاصلہ طے ہو رہا تھا اور اندازہ تھا کہ ہم بحر ہند سے تین سو سے زائد ناٹیکل میل کا فاصلہ طے کر چکے تھے اور اب بحر ہند اور بحر عرب کے درمیانی چینل پر گامزن تھے۔ خدا کا شکر تھا کہ ابھی تک کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ آئندہ کی بھی خیریت ہی معلوم ہوتی تھی۔

یوں بھی جس سمندری راستے پر ہم گامزن تھے وہ نسبتاً محفوظ تو تھا مگر اس کا راستہ ذرا طویل تھا، اسی طوالت اور حفاظت کے پیش نظر ہم یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ دھر لیے جانے کا خطرہ بالکل ہی نہ تھا، کیونکہ طویل راستہ اختیار کرنے پر ہمیں برما کی بحری حدود کے بالکل قریب سے گزرنا پڑتا اور یوں وہاں بھی مذکورہ ملک کی بحری قوت سے ٹکراؤ کا خطرہ رہتا، تاہم ہم نے اپنی طرف سے یہی کوشش اور احتیاط کر رکھی تھی کہ ان کی سمندری حدود کو "ٹچ" کیے بغیر اپنی منزل کی طرف گامزن رہیں۔

سفر جاری تھا اور لانچ کھلے سمندر میں مناسب رفتار سے اپنی منزل کی جانب بڑھی جا رہی تھی۔ رات اپنے نصف پہر سے کچھ اوپر سرک چکی تھی۔ مستول پر چڑھ کر دوربین سے چاروں اطراف کا جائزہ لینے کی ڈیوٹی میں نے ہی لے رکھی تھی۔ اس مقصد کے لیے میرے پاس ایک سنگل لینس دوربین تھی۔

یہ تیسری رات کا سفر تھا۔ کافی کا دور چلا تو اول خیر کو جانے کیا سوجھی کہ اس نے کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کی بات چھیڑ دی۔ کبیل دادا ایک دک سا رہ گیا۔ اگرچہ اسے اندازہ تو ہوگا ہی کہ جب "بیگم ولا" میں، میں نے کبیل دادا سے اس سلسلے میں بات کی تھی تو ضرور میں نے یہ اتنی بڑی بات کہنے سے پہلے اول خیر اور شکیلہ سے تو مشورہ ضرور ہی کیا ہوگا۔

"اتنے عرصے تک میری اپنے وطن سے دوری اگرچہ ایک نیک مقصد کے لیے تھی مگر اب دل میں شدت کے ساتھ خواہش ابھرتی ہے کہ میرے پر نکل جائیں اور میں اُڑ کر اپنے ملک کی گود میں جا پہنچوں۔"

"او خیر...... کاکا! خود ہمارے دلوں میں بھی یہی آرزو مچل رہی ہے۔" اول خیر بھی ایک گہری سانس خارج کر کے بولا۔ "وطن سے دور رہ کر پتا چلتا ہے کہ اپنا ملک کیسی قدر و قیمت رکھتا ہے۔"

"ہاں یار! یہ تو تُو نے ٹھیک کہا، بس! اب اللہ کرے کہ ہم خیریت سے پہنچ جائیں۔" کبیل دادا نے سر ہلا کر کہا۔ تو اول خیر دزدیدہ نظروں سے کبیل دادا کی طرف دیکھ کر مجھ سے مخاطب ہو کر کھلنڈرے سے لہجے میں بولا۔

"شہزی کاکے! جب تک زندگانی ہے، اس کے بکھیڑے تو چلتے ہی رہیں گے، مگر پاکستان پہنچ کر ہمیں سب سے پہلے ایک اہم فرض سے تو ضرور سبکدوش ہو جانا چاہیے۔ بہت عرصہ ہوا کوئی شہنائی سنے، کھلی آگ میں پکے ہوئے دیگوں کے گرما گرم پلاؤ زردے اور قورمے کھائے ہوئے۔" کہتے ہوئے اس نے پاس بیٹھے کبیل دادا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے آنکھ بھی ماری تو میں بے اختیار مسکرا کر کبیل دادا کی طرف دیکھنے لگا، وہ اس ذکر پر اور مجھے اپنی طرف معنی خیز انداز میں مسکراتے دیکھ کر کچھ بوکھلا سا گیا اور چور سا بننے لگا تو میں نے بھی کھل کر اول خیر کی تائید میں کہہ ڈالا۔

"بات تو تمہاری بری نہیں، میں خود یہی چاہتا ہوں کہ اب کبیل دادا کے سر پر سہرا سج جانا چاہیے۔ خوب دھوم دھام سے اس کا بھی وہیا کریں۔"

"ہم..... میں..... میرے سر پہ سہرا.....؟" کبیل دادا نے اپنی بوکھلاہٹ کا عملی اظہار کیا تو میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تو اور کیا یار.....! زہرہ بانو اور تیرے وہیا کی خواہش میری ہی نہیں بلکہ ان دونوں کی بھی ہے۔"

"یہ دونوں.....؟" کبیل دادا کا چہرہ شرم سے سرخ سا ہونے لگا۔ اس نے شکیلہ اور اول خیر کے مسکراتے چہروں کی طرف چور سی نظروں سے دیکھا۔

"تو اور کیا دادا!" میں نے اس بار متانت سے کہا۔ "جب میں نے تجھ سے یہ بات کہی تھی تو اس کے کچھ ہی دن بعد میں نے زہرہ بانو سے بھی یہ بات کہنا تھی، مگر تقدیر نے مجھے اس کا موقع ہی نہ دیا۔ پر اب....."

"یہ گمبھیر مسئلہ ہے شہزی!" کبیل دادا نے میری بات کاٹی۔ "مجھے ڈر ہے کہ تیرے بات کرنے سے بیگم صاحبہ مجھے گھر بدر اور دربدر نہ کر دے۔"

"میرے خیال میں ایسا نہیں ہوگا دادا!" شکیلہ نے

بی اس موضوع میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ ”ہم نے ایک طویل عرصہ بیگم صاحب کے ساتھ بتایا ہے۔ اُس کے ہر برے وقتوں میں تم ہی کام آتے رہے ہو، ہم تو بعد میں شامل ہوئے ہیں۔ اتنی بات پر وہ... ناراض نہیں ہوں گی۔“

”یہ اتنی سی بات نہیں ہے، شکیلہ!“ کبیل دادا نے اس سے کہا۔ ”تم لوگ بیگم صاحبہ کا وہ معاملہ نہیں سمجھ سکتے جو میں سمجھتا ہوں، میرا خیال ہے، اس موضوع کو دفن ہی کر دو۔“

”ہم سب اُن کا معاملہ اچھی طرح سمجھتے ہیں، وڈے استاد جی!“ اس بار اول خیر نے بھی سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”ان کا جو معاملہ تھا وہ ماضی کا حصہ بن چکا اور میرا خیال ہے کہ بیگم صاحبہ نے بھی اب اتنا عرصہ گزار لینے کے بعد اسے تقدیر کا لکھا تسلیم کر لیا ہے۔ پھر یہ بھی تو دیکھو کہ بیگم صاحبہ سے اتنی بڑی اور اہم بات کرنے والا کون ہے......؟ میں؟ شکیلہ؟ یا کوئی اور......؟ نہیں...... یہ بات اپنا شہزی کا کا کرے گا بیگم صاحبہ سے......“

”میں پھر بھی بیگم صاحبہ کی ناراضگی کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔“ کبیل دادا نے ہولے سے کہا۔ یہ کہتے ہوئے اس کا چہرہ اُداسی کی ایک پُرالم تصویر نظر آنے لگا۔ آفرین تھا اس عاشق پر جس نے اپنی خاموش وفا کا گلا اس وجہ سے گھونٹ رکھا تھا کہ کہیں اس کا محبوب ناراض ہو کے اسے اپنے قدموں سے ہی نہ دھتکار دے اور وہ اپنی اسی خوشی پر ہی راضی تھا کہ وہ جسے حاصل کرنے کی صرف تمنا ہی کر سکتا اور جس کا حصول اس کی نظر میں ناممکنات سے بھی تھا تو کیا ہوا اُس نامراد عاشق کے لیے یہ کیا کم ہے کہ وہ اپنے محبوب کے اتنے قریب تو تھا کہ اظہار کے بعد وہ اس سے دور ہی نہ ہو جائے اور اسی بات کا ڈر اسے کسی بچے کی طرح ہی اب تک خوف زدہ کیے ہوئے تھا۔

”میں سمجھتا ہوں کہ یہ شہزی کے بھی بس کی بات نہ ہو گی۔ میں گھر بدر کر دیا جاؤں گا۔“ کبیل دادا بولا۔

”تمہیں اس بچوں والے خوف سے نجات حاصل کرنا ہو گی کبیل دادا!“ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم مطمئن رہو، ایسا کچھ نہیں ہو گا، ہوا بھی تو ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ میں، شکیلہ اور اول خیر اور سب سے بڑی بات اماں جی...... میں انہیں بھی ساتھ ملا کر ہی بیگم صاحبہ سے بات چھیڑوں گا......“ میں نے اسے حوصلہ دیا۔

کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کے معاملے میں شکیلہ بھی ہماری طرح کم پُرجوش نہ تھی، فوراً بولی۔

”دادا......! شہزی ٹھیک کہتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ بیگم صاحبہ کو اس بات پر شاک پہنچے مگر وہ سب ایک فطری اور عارضی عمل ہو گا اور پھر تم تو بیگم صاحبہ سے محبت بھی کرتے ہو، آخر کب تک تم یوں یک طرفہ بحرِ الفت میں بے مقصد بہتے رہو گے؟“

”واہ......! کیا ادبی اور شاعرانہ لفظ بولا ہے ناز کی بیگم نے...... یک طرفہ بحرِ اُلفت...... واہ۔“

اول خیر کی پھر رگِ ظرافت پھڑکی تو شکیلہ اُسے پُرغیظ نگاہوں سے گھور کر بولی۔

”تم اپنا منہ بند ہی رکھو، دیکھتے نہیں کس قدر سنجیدہ موضوع پر بات ہو رہی ہے اور تمہیں مذاق کی سوجھ رہی ہے۔“

”یار شہزی! میرا تو خیال ہے پہلے ان دلوں کے بارے میں سوچ لیا جائے تو بہتر رہے گا، دونوں آپس میں کچھ زیادہ ہی لڑنے لگے ہیں۔“ کبیل دادا نے ہنستے ہوئے مجھ سے کہا تو میں نے موقع محل جان کر مسکراتے ہوئے شکیلہ اور اول خیر کی طرف دیکھتے ہوئے تائید میں کہا۔

”واقعی کبیل دادا! تم نے خوب مشورہ دیا۔ خدا کرے تمہارا بیگم صاحبہ سے جلد نکاح ہو جائے تو پھر ان دلوں کے فرض سے بھی ساتھ ہی فارغ ہو جائیں۔“

”کیا... میں اور اس لنگور سے شادی کروں گی......؟ میری جوتی ہی چلے گی پھر تو......“

شکیلہ تلملا کر بولی تو اول خیر کو تو جیسے اسے ستانے کا بہانہ ہاتھ آ گیا، جلدی سے بولا۔

”ارے...... رے...... رے، مجھے تو اس چڑیل سے معاف ہی رکھو بھائیو! میں لنڈورا ہی بھلا......“

”اوہو...... بے چارے نے خود کو لنگور سے چوہا بنا لیا...... ویسے یہ خطاب بھی برا نہیں ہے۔“ شکیلہ نے بھی خوب چوٹ کی تو میں نے کبیل دادا سے زچ ہو کر کہا۔

”دیکھ رہے ہو ناں تم دادا......! ان کی مہابھارت...... بھلا ان کی جوڑی چل سکتی ہے؟“

”یہی جوڑی تو چل سکتی ہے۔“ کبیل دادا ہنستے ہوئے بولا۔ ”شہزی! یہ بھی پیار کی ایک قسم ہوتی ہے، مجھے معلوم ہے دونوں کے دلوں میں کیا ہے۔“

میں کبیل دادا کی بات پر چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ میرا اس طرف کبھی دھیان ہی نہیں گیا تھا مگر گھاگ کبیل دادا...... شکیلہ اور اول خیر کی اس طرح کی ”چونچ ماری“ سے بہت پہلے ہی نتیجہ اخذ کر چکا تھا۔

شکیلہ کی چوٹ پر اول خیر پہلی بار اپنا سا منہ لے کر رہ گیا، ورنہ ہمیشہ وہ شکیلہ کو زچ کر دیا کرتا تھا۔
کبیل دادا نے البتہ عابدہ کا موضوع چھیڑ دیا اور بولا۔ "یہ سب باتیں وقت کے ساتھ ہوتی رہیں گی مگر ہمیں ایک اور اہم مسئلے کی طرف بھی توجہ دینا ہوگی۔ وہ حل کیے بغیر بھلا ان سب باتوں کا کیا مزہ آئے گا۔ ہمیں عابدہ بہن کی رہائی کے سلسلے میں پہلے سوچنا ہوگا۔ کیونکہ یہ مسئلہ زیادہ حل طلب ہے۔" اس کی اول خیر اور شکیلہ نے بھی فوراً تائید کی تھی۔

آفرین تھا میرے یاروں پر کہ وہ خود غرض نہیں تھے۔ عابدہ کے معاملے کو وہ اپنی اولین ترجیح دیتے تھے۔ اس کے بغیر باجوں گاجوں اور شہنائیوں کا بھلا کیا مزہ آئے گا۔ لیکن میں بھی اتنا خود غرض نہ تھا کہ اپنے ایک طویل اور گمبھیر مسئلے کے لیے ایسے کام بلاوجہ ہی التوا میں ڈال دیتا جن کا پہلے ہونا ضروری تھا۔

"تم نے عابدہ بہن کی رہائی کے سلسلے میں کیا سوچ رکھا ہے، شہزی......؟" مجھے سوچتا پا کر بالآخر کبیل دادا نے مجھے مخاطب کر کے پوچھا تو میں ایک دکھی دکھی سی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔
"عابدہ کی بازیابی کے لیے میں اپنے طور پر کوشاں تھا اور امریکا میں مقیم ایک مسلم لبنانی خاتون...... آنسہ خالدہ اس سلسلے میں میری خاطر خواہ مدد میں مصروف تھی اور ساتھ ہی میری راہنمائی بھی کر رہی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ عابدہ پر عنقریب امریکا کی ایک دہشت گردی کی عدالت میں مقدمہ چلنے والا ہے، آنسہ خالدہ اس کا کیس لڑنے کے لیے وہاں کے ایک مشہور وکیل کی خدمات بھی حاصل کر چکی تھی۔ اسی نے کہا تھا کہ عابدہ کا کیس جیتنے کے لیے ضروری ہے کہ پاکستان سے عارفہ کو بھیجا جائے، جو کورٹ میں عابدہ کے حق میں صرف اس قدر گواہی دے کہ وہ اس کی ہیلپر بن کر... پاکستان سے امریکا آئی تھی، مگر اس احسان فراموش... عارفہ نے امریکا جانے سے صاف انکار کر دیا تھا بلکہ اس کے لیے وہ بدذات عورت مجھ سے سودے بازی پر اتر آئی، یہ بھی نہ سوچا کہ عابدہ محض اسی کی خاطر ہی وہاں گئی تھی اور مصیبت میں پھنس گئی تھی۔" یہ سب بتاتے ہوئے میرا دل بھر آیا تھا۔ لہجے میں رقت اتر آئی تھی اور آواز ڈبڈبانے لگی تھی۔
"...... مگر پھر کچھ نہ ہو سکا اور...... عابدہ کو بالآخر سزا ہو گئی...... اب بس اللہ ہی اس کا حامی و ناصر ہے...... اُسے امریکا کی ایک خطرناک جیل...... میں جو کیلی فورنیا میں ہے قید کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا، کچھ پتا نہ چل سکا، نہ ہی آنسہ خالدہ کچھ جان سکی کہ عابدہ وہاں کس حال میں ہے۔ خالدہ سے بعد میں دو ایک بار ہی رابطہ ہو سکا، اس کے بعد موقع ہی نہ ملا۔"
میں اتنا بتا کر خاموش ہو گیا۔ اول خیر اور شکیلہ تو کافی حد تک یہ سب جانتے ہی تھے مگر کبیل دادا کو عابدہ سے متعلق کوئی خیر خبر کم ہی تھی۔ اب جو اس نے یہ دردناک کتھا سنی تو اس کا چہرہ اتر کر رہ گیا اور پھر نجانے کیا ہوا کہ اس نے بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کر مجھے گلے لگا لیا اور بولا۔
"یار شہزی! تو تو واقعی الو کا کاکا ہے...... اتنا بڑا دکھ اور اتنا بڑا درد اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہے اور مجھے خبر تک نہیں، اس پر بھی تو اپنے اندر کا زخم دبائے ہوئے میرے سر پہ سہرا سجانے کی باتیں کر رہا ہے...... اور...... اور، تجھے اپنے سے زیادہ یاروں کی خوشیوں کی فکر ہے......! تیرے جیسا ایثار پیشہ اور بے غرض یار تو ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا شہزی! میں تجھے سلام پیش کرتا ہوں......" یہ کہتے ہوئے کبیل دادا نے مجھ سے الگ ہو کر اپنا دایاں ہاتھ پیشانی پر لے جا کر مجھے سلام پیش کیا، میں مسکرا دیا۔
"نہیں شہزی! ہرگز نہیں...... اب پاکستان پہنچتے ہی سب سے پہلے ہم مل کر عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں کوئی جامع اور مربوط پلاننگ کریں گے اور اس نیک دل خاتون آنسہ خالدہ سے بھی فوری طور پر رابطہ کر کے امریکا جانے کا قصد کریں گے۔" کبیل دادا نے آخر میں اپنی جگہ سنبھالتے ہوئے حتمی لہجے میں کہا۔
"میں نے بھی یہی سوچ رکھا ہے دادا!" میں نے کہا۔ "اڈیسہ کمپنی کی ایک برانچ رنگون کے علاوہ امریکی ریاست سان ڈیاگو میں بھی ہے۔ آنسہ خالدہ ہمیں اسپانسر شپ دینے کے لیے تیار ہے۔ رہی سہی کسر اڈیسہ کمپنی کی برانچ آفس سے مدد لے کر پوری کر دی جائے گی۔ آخر وہ میرے نام ہی ہے، میں امریکا روانگی کا حتمی ارادہ کر چکا ہوں لیکن اس سے پہلے تیری اور بیگم صاحبہ......"
"نہیں یار نہیں...... ابھی میرے مسئلے کو رہنے دے، یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔" کبیل دادا نے میری بات کاٹ کر کہا اور پھر شکیلہ اور اول خیر کی طرف دیکھ کر بولا۔
"یار! تم لوگ ہی اسے کچھ سمجھاؤ......"
"وڈے استاد جی بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں

سنہری......!'' اول خیر نے مجھ سے کہا۔

''عابدہ بہن کا مسئلہ حل کرنا ہے سب سے پہلے...... اس کے بعد ہی کچھ اور......'' شکیلہ نے بھی اس کے خیال کی تائید میں یہی کچھ کہا۔

''بڑوں کا فرمان ہے کہ سب سے پہلے وہ کام نمٹاؤ جو تمہارے اختیار میں ہے اور پہلے کرنے کا ہے......''

اچانک ایک آواز پر ہم سب بری طرح ٹھٹکے۔ یہ آواز کیبن کی چھت سے آئی تھی، میں نے فوراً کھڑکی سے سر باہر نکال کر دیکھا اور چونک سا گیا۔ وہ کوئی لمبی چونچ والا پرندہ تھا۔

''سی ایگل۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''شاید کہیں قریب ہی کوئی ٹاپو وغیرہ ہے۔'' میں نے کہا اور نیچے ہو گیا۔ اول خیر بھی اپنی جگہ سے تھوڑا اچک کر کھڑکی کی چھت پر دیکھ رہا تھا۔

''یہ محترم رات کے اس آخری پہر میں شاید اوور ٹائم لگا رہے ہیں۔'' اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کے منہ سے ایک عجیب سی آواز خارج ہوئی۔ جیسے وہ چونکا ہو۔

''کیا ہوا......اول خیر؟''

''روشنی ...... دور سامنے...... ذرا باہر نکل کر دیکھو......'' وہ بولا۔ ہم سب بیک وقت حرکت میں آ گئے اور کیبن سے باہر عرشے میں آ گئے۔ ہمیں دیکھ کر کیبن کی چھت پر بیٹھا ہوا وہ شبینہ طائر...... کلنغ...... کلنغ کی آواز نکالتا ہوا گھبرا کر پرواز کر گیا۔

سنگل لینس دوربین میری پتلون کی بیلٹ میں اڑسی ہوئی تھی۔ اس میں انفرا ریڈ لینس نصب تھا، میں نے اسے لمبا کر کے اپنی ایک آنکھ سے لگا لیا اور روشنی کی سمت دیکھنے لگا۔

وہ کوئی بحری کشتی تھی، جس کا حجم خاصا بڑا تھا۔ ہماری لانچ کے رخ سے ہٹ کر وہ برما کی سمندری حدود کی طرف بڑھ رہی تھی۔ دوربین پرانی ہونے کے باعث مجھے اس بحری کشتی میں کچھ زیادہ دکھائی نہ دے سکا تاہم وہ آنکھ سے ہٹاتے ہوئے ساتھیوں سے تشفی آمیز انداز میں بولا۔

''فکر کی بات نہیں...... کوئی مسافر کشتی ہے۔ جس کا رخ برما کے کسی ساحل کی طرف ہے۔''

''مجھے تو نیند آ رہی ہے۔ میں ذرا آرام کرنا چاہتی ہوں۔'' شکیلہ ایک جماہی لے کر کیبن کی طرف بڑھ گئی۔ کیبن میں ایک دیوار کے ساتھ دو تین ''بنک بیڈ'' نصب تھے۔ وہ ان میں ایک پر جا کر لیٹ گئی۔ نبیل دادا بھی تھکا تھکا سا بڑھ گیا اور اس نے بھی ایک بنک بیڈ سنبھال لیا۔ میں اور اول خیر جاگ رہے تھے اور باتوں میں مصروف رہے، تھوڑی دیر بعد اول خیر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگا۔ میں کھڑکی سے لگی بینچ پر بیٹھا اوپر تاروں بھرے آسمان کو گھورنے لگا اور پھر سمندر کی نرم خو مرطوب ہواؤں نے میرے ذہن پر بھی اپنا اثر چھوڑا تو مجھے بھی نیند آ گئی اور میں کھڑکی کی چوکھٹ پر ہی اپنا چہرہ دھرے سو گیا۔

☆☆☆

ایک تیز آواز پر میری آنکھ یک دم کھلی تھی اور میں بری طرح ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی بڑا سا بھونپو میرے کان کے قریب کر کے کسی نے بجا دیا ہو۔

بھونپو کے بنکارنے پر ہم سب ہی اٹھ بیٹھے تھے اور کیا دیکھتے ہیں ایک مخصوص بناوٹ اور ساخت کی لانچ ہماری لانچ کے بالکل قریب لنگر انداز تھی اور اس پر لگے پھریرے کو دیکھتے ہی میرے اوسان خطا ہو گئے۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ وہ انڈین کوسٹ گارڈز کی لانچ تھی جس پر بھارت کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اس کی ریلنگ سے لگے مخصوص وردیوں میں کچھ مسلح افراد نظر آ رہے تھے۔

صبح ہو چکی تھی اور آسمان پر کہیں کہیں بادل تیر رہے تھے۔ ہماری لانچ کا پھٹ پھٹ ٹائپ انجن شاید رات بھر چلتے رہنے کے باعث ہیٹ اپ ہو کر بند ہو چکا تھا اور لانچ موجوں کے سہارے پر تھی۔

اسی وقت چار پانچ کی تعداد میں مسلح انڈین کسٹمز کے اہلکار ہماری لانچ میں اتر چکے تھے اور کیبن کے باہر ہی کھڑے ہو کر انہوں نے ہم پر اپنی گنز تان لی تھیں اور ہندی اردو میں ہمیں ہاتھ اوپر اٹھائے باہر آنے کی تلقین کر رہے تھے۔ ہم سب نے ان کے حکم کی تعمیل کی اور ہاتھ کھڑے کیے کیبن سے باہر آ گئے۔

اسی وقت ایک بار پھر ان کی لانچ سے بھونپو کے بنکارنے کی آواز ابھری۔

''تم سب ہمارے نشانے پر ہو...... کوئی غلط حرکت کرنے کا سوچنا بھی نہیں۔ اب اگلے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے عرشے پر پیٹ کے بل لیٹ جاؤ اور دونوں ہاتھ اپنی پشت پر باندھ لو...... ترنت......!''

یہاں بھی ہم نے ان کے حکم کی تعمیل کی اور عرشے کے سیلن زدہ اور ٹھنڈے ٹھار فرش پر اسی طرح لیٹ گئے جس طرح کہا گیا تھا۔

اس کے بعد کوئی افسر ٹائپ آدمی مزید چار مسلح

اہلکاروں کی معیت میں اپنی لانچ سے اُتر کر ہماری لانچ پر آیا اور ہمارے قریب کھڑے ہو کر باری باری ہم سب کو گھورنے لگا، ہم نے طے کر رکھا تھا کہ ایسی صورتِ حالات میں ہمیں کیا کرنا تھا۔

پھر اس بھارتی افسر نے شاید اپنے ساتھی اہلکاروں کو کوئی اشارہ کیا تھا۔ کیونکہ اگلے ہی لمحے ان میں سے تین چار اہلکار فوراً حرکت میں آگئے تھے۔

انہیں لانچ کی تلاشی لیتے پا کر میرا دل سینے میں بے طرح دھڑکنے لگا تھا اور دل میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ وہ ہیرا ان کے ہاتھ نہ لگنے پائے۔ باقی اسلحہ ہم نے ایک چھوٹے سے چوبی باکس میں باندھ کر لانچ کے پیندے سے ایک رسی کے ذریعے نیچے گہرے پانی میں جھلا دیا تھا اور اس کا میکنزم کچھ اس طرح سے ترتیب دے رکھا تھا کہ بہ وقتِ ضرورت ایک تختہ ہٹا کر اسے فوراً اوپر بھی کھینچ لیا جاتا۔

تھوڑی دیر بعد وہ لوٹے اور پھر میری سماعتوں نے ایک کو اپنے افسر سے مؤدبانہ انداز میں فقط یہ کہتے سنا۔

''سر..... اکلیئر.....''

''ہم.....'' افسر کے زور سے ہنکاری بھرنے کی آواز ابھری۔ اس کے بعد ہماری بھی لیتے لیتے جامہ تلاشی لی گئی۔ اس کے بعد ہمیں سیدھے کھڑے ہونے کا حکم مل گیا۔

''حجور.....! (حضور) جان کی امان ہو تو عرض کیا جائے۔'' میں نے فوراً اپنے لہجے کو عام ماہی گیروں والے انداز میں سموتے ہوئے کہا تو میں نے دیکھا کہ اس خرانٹ نظر آنے والے بھارتی افسر کی نظریں میری کلائی پر بندھی گھڑی پر جم گئیں۔ گھڑی فقط میں نے ہی پہن رکھی تھی جو میں نے ڈارک کیسل سے حاصل کی تھی۔

''یہ والا ہاتھ آگے کرو اپنا.....'' اس نے مجھے گھورتے ہوئے تحکمانہ کہا، سینے کے پنجرے میں میرا دل جیسے ماہی بے آب کی طرح پھڑک رہا تھا۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہونے والا تھا یا پھر کچھ بھی نہ ہوتا۔ بہر طور..... میں اس کی اس حرکت کا مطلب نہ سمجھ سکا اور پھر جب میں نے اپنی رسٹ واچ والا ہاتھ اس کی جانب کیا تو اس نے میری کلائی پکڑ کر گھڑی کے ڈائل پر نظر ڈالی۔ میری یک ٹک اُلجھی ہوئی مگر بھانپتی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور تب ہی میں نے اس کے چہرے پر تناؤ کی پہلے جیسی کیفیت کو ٹوٹتے پایا۔ وہ کچھ مطمئن ہوا تھا۔ پل کے پل میں اس کی اس حرکت کو سمجھ گیا کہ وہ کیا دیکھنا چاہ رہا تھا۔

''تم لوگ دیکھنے میں تو ماہی ماہی گیر لگتے ہو..... کیا تم غلطی سے پاکستان کی سرحد پار کر کے اِدھر آن گھسے ہو؟''

افسر نے قدرے نرم لہجے میں کہا تو میں اس ہندو بھارتی افسر کی مکاری پر اَش اَش کر اُٹھا تھا۔ اس نے بڑے شاطرانہ انداز میں اندھیرے میں اپنا تیر چلایا تھا تا کہ ہم اس کے نرم لہجے اور اس کے ''سمجھنے'' کو اپنی نجات کی اُمید سمجھ کر فوراً سچ اُگل دیں کہ..... ''ہاں، حجور! آپ نے بالکل ٹھیک کہا لہٰذا اب ہمیں واپس جانے دیا جائے۔''

مگر چالاکی سے یہ سچ اُگلوانے کے بعد یہ ہمیں اپنے ساتھ گرفتار کر کے بھارت کی کسی خوفناک جیل میں ڈال دیتے اور اگلے دن بھارت کا متعصب میڈیا کتے کی طرح پوری دنیا میں ہماری تصاویر دکھا کر بھونک رہا ہوتا کہ ''ہم نے پاکستان کے جاسوسوں کو دھر لیا جو بھارت میں ماہی گیروں کا روپ دھار کر دہشت گردی کرنے آئے تھے۔''

میں نے فوراً کہا۔ ''حجور.....! توبہ..... توبہ..... ہم بھلا پاکستانی ہووے ہیں؟ ہم تو اُدھر پچھم کی اور..... میں ایک مچھیروں کی بستی میں رہوت ہو..... مچھلیاں پکڑ رہے تھے، اعلیٰ نسلی جھینگوں کی تار پھد (تعریف) سن کے ایدھر آوت گئے، ہمرا قصور، ہمیں ما پھ کرو.....'' میں نے مخصوص لہجے میں یہ کہتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

بھارت میں چند نچلے درجے کے غریب ہندوؤں کو بولتے دیکھ کر میں نے یہی لب و لہجہ اپنایا تھا جس کی جھلک میں بھگت گڑھ میں سوشیلا کی ہمسفری و ہم رکابی میں دیکھ چکا تھا، یوں بھی بعض انڈین فلموں میں بھی میں نے کرداروں کو ایسا بولتے سنا تھا۔ نیز ایسی بولیاں میری ٹریننگ کا بھی حصہ رہ چکی تھیں۔ اول خیر اور شکیلہ بھی اس سے آگاہ تھے، البتہ کبیل دادا کا معاملہ اور تھا، تاہم میرا خیال تھا کہ اس کے بولنے کی نوبت کم ہی آتی، مگر کچھ نہ کچھ تو ضرورت کی حد تک وہ بھی بول ہی لیتا۔

میں نے دیکھا اعلیٰ نسل کے جھینگوں کا سن کر اس بھارتی افسر کی چندھی چندھی آنکھوں میں مخصوص چمک اُبھری تھی، ساتھ ہی وہ ہمارے ساتھ کھڑی شکیلہ کو بھی گرسنہ نظروں سے گھورتا جاتا تھا۔

''کیدھر ہیں جھینگے؟''

''وہ ہیں جی، ایک دم تاجا (تازہ) ہیں..... نوش کیجیے.....'' میں نے مؤدب لہجہ اختیار کیا اور اول خیر کو چلا کر مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

اوے رے حیا! صاحب سے بے بیسوں کا بورا لا دے۔'' اول خیر فوراً حرکت میں آیا اور عرشے پر ہی بنے ایک ڈکٹ کی جانب بڑھ گیا اور اندر ہاتھ مار کر جھینگوں سے بھرا بورا کھینچ لایا۔ یہ لوگ خوش ہو گئے..... جاتے سمے ان کے افسر نے کہا۔

''خیال رکھنا اب اس سے آگے مت جانا..... پڑوسی ملک کی حد شروع ہو جاتی ہے، پھنس گئے تو کام سے گئے۔''

''جی جی حجور! کھیال رکھیں گے، بڑے دیالو ہیں آپ جو ہمیں بتا دیا۔''

القصہ کوتاہ، یہ بلا بھی ٹل گئی اور ساتھ ہی ہمیں معلوم بھی ہو گیا کہ ہم پاکستانی حدود سے زیادہ دور نہ تھے۔

اُن کے جانے کے بعد ہم نے خوشی سے پاکستان زندہ باد کے نعرے لگا دیے..... ہم اب ایک بڑے خطرے سے بچ کر نکل چکے تھے۔

تب ہی کبیل دادا نے پوچھا۔

''شہزی! اس بھارتی افسر کی یہ حرکت سمجھ نہ آئی کہ اس نے تمہاری کلائی میں بندھی گھڑی کو کیوں دیکھا تھا؟''

میں اس کے سوال پر اسرار بھرے انداز میں مسکرایا اور جواباً بولا۔

''یہ بہت چالاک افسر تھا، مگر ہم نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ یہ گھڑی دیکھ کر اس میں انڈیا اسٹینڈرڈ ٹائم کا اندازہ کرنا چاہ رہا تھا، یہ تو شکر تھا کہ ہم انڈیا کی سرحد سے ہی پرے تھے اور اس گھڑی میں بھارت کے معیاری وقت کا ہی تعین تھا، اگر پاکستان کے مطابق ہوتا تو ہمیں فوراً دھر لیا جاتا۔ کیونکہ پاکستان کے معیاری وقت سے بھارت کا وقت آدھا گھنٹا آگے ہے..... لہٰذا اب مجھے پاکستان کی حدود میں داخل ہونے سے پہلے اپنی گھڑی میں آدھا گھنٹا پیچھے کر دینا چاہیے، تاکہ اگر ہم پاکستانی کوسٹ گارڈ کے ہتھے چڑھ جائیں تو وہ ہمیں بھارتی نہ سمجھ بیٹھیں۔''

''اوہ..... اتنی باریکی..... کمال ہے۔'' شکیلہ حیرت سے بولی تو اول خیر کی رگ پھڑکی۔

''او خیر..... بی بی! یہ باریکیاں تمہارے موٹے دماغ میں نہیں آسکتیں۔ اسی لیے اب تم بھی ذرا اصل روپ میں آجاؤ اور یہ بندیا اور..... جواسوں پر قیامت..... ہم..... میرا مطلب ہے..... دلوں پہ گھبراہٹ طاری کر دینے والی یہ ساڑی بھی اُتار پھینکو..... پاکستان آنے والا ہے۔'' اول خیر کی اس بات پر میں اور کبیل دادا منہ دبا کر ہنسی روکنے کی ناکام کوشش کرنے لگے کہ اسی وقت شکیلہ اول خیر کو کھا جانے والی نگاہوں سے گھورتی ہوئی اُسے بڑھی۔

''کیا بکواس کی میرے بارے میں تم نے.....؟ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔''

وہ اسے مارنے کو لپکی تو اول خیر فوراً بھاگ کر کبیل دادا کے پیچھے ہو گیا اور بولا۔

''بچاؤ وڈے استاد جی! شادی سے پہلے ہی یہ حال ہے تو بعد میں کیا ہو گا.....''

باز وہ پھر بھی نہ آیا تھا۔ مجبوراً کبیل دادا کو ہی اس کی سفارش کرنا پڑی۔

''جانے دو شکیلہ! اس کی عادت ہے اول فول بکنے کی..... تم جاؤ، اندر لباس رکھا ہے، بدل لو جا کر..... ''

وہ غصے سے اول خیر کو گھورتی ہوئی اور اپنا پاؤں پٹختی کیبن کے عقبی حصے کی طرف چلی گئی۔ میں ہنستا رہا اور کبیل دادا بھی مسکرانے لگا۔

کبیل دادا نے جا کر موٹر کو چیک کیا، وہ دھواں چھوڑنے لگی تھی۔

''اس کی تھوڑی سی اوور ہالنگ کرنا پڑے گی۔'' کبیل دادا نے انجن کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے ہیڈ کھولنا پڑے گا۔''

میں نے کہا۔ ''یار دادا! ہم تو منزل کے قریب پہنچ چکے ہیں، موٹر کو خراب نہیں ہونا چاہیے۔''

''میں کوشش کر رہا ہوں..... شہزی! ذرا اول خیر کو ادھر بھیج دو۔''

میں نے اول خیر کو آواز دی۔ وہ عرشے پر ریلنگ کے پاس کھڑا دوربین آنکھ سے لگائے کھلے پانیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ قریب آ گیا۔ وہ دونوں کام میں جت گئے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے تک موٹر درست کرتے رہے، کبیل دادا کو انجن اور موٹر مرمت کرنے کا خاصا تجربہ تھا۔ لانچ کے اسٹور میں ٹول اور دیگر سامان موجود تھا۔

شکیلہ نسبتاً ڈھنگ کا لباس پہن آئی تو میں نے اسے کچھ کھانے وغیرہ بنانے کا کہا۔

اتنے میں موٹر کے چلنے کی آواز ابھری۔ اضافی ایندھن ڈالا گیا اور لانچ ایک بار پھر منزل کی طرف روانہ ہوئی۔ تب تک شکیلہ جھینگے اور مچھلی فرائی کر چکی تھی۔ اس نے کافی بھی بنائی تھی۔ کھانے کے کچھ خشک ڈبے بھی تھے۔ یہی کچھ کھا پی کر ہم نے پیٹ بھرا۔

لانچ کی روانگی کے بعد ہم نے مقدور بھر اپنا انڈین ملاحوں اور ماہی گیروں والا لباس بدل لیا۔ میرا لباس تو عام

سا ہی تھا، شکیلہ بھی بدل چکی تھی، جبکہ کبیل دادا اور اول خیر نے فقط گیروا رنگ بدل لیا تھا۔

ہم ایک بار پھر میپ پھیلا کر بیٹھ گئے۔ ہم پاکستانی حدود میں داخل ہو چکے تھے اس لیے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اسلحہ سمندر بُرد کر دیا۔ قریب ترین ساحل کیٹی بندر پڑتا تھا اس کے بعد کراچی (کیماڑی) کا ساحل تھا۔ ابھی ہم کیٹی بندر سے چند ہی ناٹیکل میل دور تھے کہ سفید اور نیلے رنگ کی ایک تیز رفتار موٹر بوٹ کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔

ہم ایک دم الرٹ ہو گئے۔ نکاسی کا یہ آخری مرحلہ تھا۔ اگرچہ اب کوئی بڑا خطرہ باقی نہ رہا تھا، مگر ہم کسی لمبی چوڑی تفتیش میں بھی پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ منزل پر پہنچ کر کسی اور کھڑاگ میں پڑ کر بہت سا وقت ضائع ہوتا۔ دل میں تو آئی کہ پاکستانی کوسٹ کو اپنا سیدھے سجاؤ تعارف کروا دوں کہ میرا انجینئرز سے تعلق ہے اور میں ایک کمانڈو ہوں۔ مگر قباحت یہ تھی کہ اس وقت میرے پاس اس طرح کی کسی شناخت کے لیے کوئی تحریری ثبوت نہ تھا۔ پھر یہ رینک مجھے ریاض صاحب نے آنریری طور پر دیا تھا اور اسے کافی حد تک خفیہ بھی رکھا تھا۔ چلو یہ شرط بھی رکھی جاتی تو ابھی کیا معلوم تھا کہ موجودہ وقت میں وہ خود کہاں اور کس پوزیشن میں تھے۔ وہ میری کیا ضمانت دے سکتے تھے؟ جبکہ اس سلسلے میں کبیل دادا نے میرے بھارت آنے کے بعد کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے یہی بتایا تھا کہ وہ طویل رخصتی پر بھیج دیے گئے تھے، ممکن تھا ریٹائر ہو چکے ہوں، اگرچہ آرمی آفیسر کوئی بھی ہو خواہ ریٹائر ہی ہو وہ سول انتظامیہ کے برعکس، اپنے تعلقات برقرار رکھتا ہے۔ لیکن باجود ان سب باتوں کے میں اس لمبے چوڑے بکھیڑوں سے بچنا ہی چاہتا تھا اور کوشاں تھا کہ تھوڑے میں ہی گلوخلاصی ہو جاتی۔

پاکستانی کوسٹ کی وہ بوٹ قریب آ گئی تھی۔ ہم نے عرشے پر مچھلیاں اور جال وغیرہ پھیلا دیے تھے۔ کبیل دادا نے میرے اشارے پر لانچ کا انجن بند کر دیا تھا۔ میں نے شکیلہ کو دانستہ کچن میں بھیج دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ وہاں خود کو کسی کام میں معروف رکھے اور ایک فٹ کا گھونگٹ نکال کر شرمیلی خاتون کا رول پلے کرتی رہے۔

بوٹ ہماری لانچ کے قریب آ کر رک گئی تھی۔ سفید وردی میں ملبوس کوسٹ آفیسر اور اس کے چار پانچ اہلکار ساتھ کھڑے تھے۔ ان میں سے کچھ کے سینوں پر دوربینیں جھول رہی تھیں۔ ایک اہلکار نے اپنے آفیسر کو بھی دوربین دی تھی۔ اپنی بوٹ سے ہماری لانچ کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد ایک دوسرے اہلکار نے اسے میگا فون تھما دیا۔ وہ اسے اپنے منہ کے قریب لے جا کر پکارتے ہوئے بولا۔

"تم تینوں ریلنگ کے پاس آجاؤ...... قریب......"

ہم تینوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور جب قریب آئے تو اس آفیسر نے میگا فون ہٹا کر ہم سے پوچھا۔

"تم لوگ کون ہو اور اس لانچ میں کتنی تعداد میں موجود ہو؟"

میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو منہ کے قریب لے جا کر بھونپو سا بنا کر جواب میں کہا۔

"ہم... کل چار افراد ہیں سرکار......! ماہی گیری کرتے ہیں۔ چوتھی ہماری زنانی ہے وہ اندر کچن میں ہے۔ کہو تو بلا دیں۔"

"اسے باہر بلاؤ۔"

"ری نوراں......! باہر آ...... ابھیجر (آفیسر) آئے ہیں۔" میں نے شکیلہ کو پکارا، اگلے ہی لمحے وہ میری ہدایت کے مطابق ایک فٹ کا گھونگٹ نکالے، شرماتی لجاتی ہوئی باہر نکل کر ہمارے قریب آن کھڑی ہوئی۔

"ہم سیڑھی لگا رہے ہیں، تم سب ایک ایک کر کے

ہماری بوٹ پر آ دیے اور ہاں...... کاغذات اور پرمٹ ساتھ ہیں تو وہ بھی لیتے آؤ......''

''کاجات (کاغذات) تو کوئی نہیں ہمرے پاس سرکار...... ! ہمرے تو کپڑے بھی پورے نہیں ہوتے سرکار! بھلا کاجات کیا ہوں گے۔'' میں نے کہا۔

آفیسر نے کوئی جواب نہ دیا تب تک سیڑھی لگائی جا چکی تھی، ہم چاروں ان کی ہدایت کے مطابق ایک ایک کر کے سیڑھی کے ذریعے ان کی بوٹ میں آ گئے۔

دو اہلکاروں نے گنیں تان لی تھیں۔ ان سب کی چبھتی ہوئی نظریں ہم پر جمی ہوئی تھیں۔ آفیسر نے اچھی طرح ہمارے...... چہروں کا جائزہ لینے کے بعد دو افراد کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ فوراً حرکت میں آئے اور لانچ کی تلاشی میں جت گئے، جبکہ دو اہلکار ہم تینوں کی اچھی طرح جامہ تلاشی لینے میں مصروف ہو گئے۔ مجھے تسلی تھی کہ ہمارے پاس ایسا کوئی غیر قانونی ''سامان'' نہ تھا جو تھا اُسے ہم پہلے ہی سمندر برد کر چکے تھے۔ کاغذات کا معاملہ البتہ اپنی جگہ تھا۔ شکیلہ کی انہوں نے کوئی تلاشی نہیں لی تھی، تاہم ایک اہلکار نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ''گائیگر'' قسم کے ہینڈ چیکر سے اسے دیکھ لیا تھا۔

جب یہ ساری کارروائی ''بہ خیریت'' نمٹ گئی تو آفیسر نے بالکل آخر میں وہی کیا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ کوسٹ گارڈز والے سب سے پہلے یہی چیز چیک کرتے تھے، یعنی میری گھڑی...... اس نے اس کا وقت دیکھا پھر ایک گہری سانس لی۔ کیونکہ میں پہلے ہی اپنی گھڑی کو معیاری پاکستانی وقت کے مطابق ٹائم سیٹ کر چکا تھا۔

اس کے انداز و اطوار سے صاف عیاں ہوتا تھا کہ وہ ہمارے سلسلے میں مطمئن ہے، تاہم کڑک دار لہجے میں بولا۔

''تم لوگ اس طرح کھلے پانیوں میں بغیر کسی پرمٹ اور کاغذات کے کیوں داخل ہوئے؟ کیا نہیں جانتے کہ یہ کتنا بڑا جرم ہے، تم سب کو کسی انکوائری کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔''

''سرکار...... معافی چاہتے ہیں، آج کیٹی بندر سے گھوڑا باڑی تک کوئی شکار ہاتھ نہیں لگا۔'' میں نے ملتجیانہ سے لہجے میں کہا۔ ''لانچ میں ادھر نکل پڑے، شکار تو اعلیٰ درجے کا ہاتھ لگا ہے، پر یہ والی مصیبت بھی گلے پڑ گئی، ماہی چاہتے ہیں سرکار! آپ کا حکم ہو تو آپ کی خدمت میں کچھ پیش کر دیں؟''

آفیسر نے ایک نظر عرشے پر پھیلے ہوئے بورے دیکھے۔ پھر اس کے پاس ہی کھڑے ایک ساتھی اہلکار نے اس کے کان میں جھک کر کچھ کہا پھر وہ مجھ سے تحکمانہ لہجے میں بولا۔

''کیا شکار ہاتھ لگا ہے؟''

''سرکار! مچھلی ہے اور جھینگا ہے۔''

''کیکڑا نہیں ہے؟''

''نہیں سرکار...... ! وہ ابھی ہاتھ نہیں لگا، شاید بھٹ آئی لینڈ جاویں تو مل جائے۔''

''یہ خراب تو نہیں ہوا؟''

''ارے نہیں سرکار! ہمارا آج کا پیشہ تھوڑا ہی ماہی گیری کا...... جدی پشتی پیشہ ہے، آپ بے فکر رہیں، مال پکڑتے ہی ہم اس میں سب سے پہلے نمک مصالحہ لگا دیتے ہیں۔''

''ہمم م...... '' آفیسر نے ہنکارا ابھرا۔

''ٹھیک ہے، مگر آئندہ احتیاط رکھنا...... مال نکال لو، پر زیادہ نہیں تم اپنے لیے بھی رکھ لو، آخر محنت کرتے ہو۔''

مال کے نئے پرانے ہونے پر میں اندر سے ذرا ڈرا بھی تھا۔ اگر یہ لوگ باریک بینی سے چیک کر لیتے تو کیا خبر انہیں اندازہ ہو جاتا کہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں۔

یہ بلا بھی بہ خیریت ٹل گئی۔ ہم نے وہیں سے بابا بھٹ آئی لینڈ اور کیماڑی کا رخ کیا۔ پھر ایک کھاڑی میں پہنچ کر رکے تو ٹھیکے دار اور مزدور گلے کو آن پڑے۔ ہم نے ایک ٹھیکے دار سے بات طے کر کے بچا کھچا مال اور لانچ اونے پونے فروخت کر ڈالی اور وہ رقم سنبھالے ہم بندرگاہ سے باہر آ گئے۔

کراچی میں خوب کڑاکے کی گرمی پڑ رہی تھی۔ تیز دھوپ بھی نکلی ہوئی تھی مگر ہم اندر سے جتنے مطمئن اور مسرور تھے، اس خوشی کے آگے یہ تکلیف کچھ بھی نہیں تھی۔ اپنے وطن کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی بے اختیار جسم و جاں تو کیا روح بھی سرشار ہو گئی تھی۔ اپنوں سے ملنے کی خوشی کا تصور اتنا جاں فزا تھا کہ دل کرتا اُڑ کر بیگم ولا پہنچ جاؤں۔ اپنی ماں جی کو تو میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھولا تھا اور باپ، اس سے تو ملتے ہی بچھڑ گیا تھا۔ میں...... میں جانتا تھا اماں جان مجھے سوتی جاگتی آنکھوں سے ہر وقت اور ہر گھڑی یاد کرتی ہوں گی۔

ایک خوشی یہ بھی تھی کہ میں اپنے ساتھیوں سمیت اپنے ملک کی قیمتی امانت بھی ساتھ لانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ نادر و نایاب بیش قیمت طلسم نور ہیرا میں نے نبیل دادا کے ہی مشورے سے انجن روم میں ایسی جگہ چھپا رکھا تھا جہاں تیل اور آئل کی موٹی تہ جمی رہتی تھی۔ یہی نہیں وہاں ہم

نے..... مچھلیوں کی آلائش بھی پھیلا رکھی تھیں۔ ایسی گندی سی جگہ پر کسی کا دھیان بھی نہ جاتا۔

لانچ اور مال کے روپوں سے ہم نے سب سے پہلے اپنے پہننے کے لیے نئے اور صاف ستھرے جوتے اور کپڑے خریدے۔ باہم مشورے سے ہم نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ ایک دن مکمل آرام کرنے کے بعد ہی ملتان کے لیے روانہ ہوں گے۔

لانچ اور مال بے شک اونے پونے بیچی گئی تھی کیونکہ اس کے کاغذات بھی نہیں تھے، تاہم پھر بھی اتنے پیسے ہو گئے تھے کہ ہم بہ آسانی کرایہ کر کے ملتان پہنچ جاتے۔ تھوڑا مزید حساب کیا گیا تو ہم نے سب سے پہلے ایک عدد اسمارٹ فون بھی خرید لیا اور اس میں ''سپر کارڈ'' ڈاؤن کرنے کے بعد ہم ہوٹل آگئے، وہاں ہم نے ایک ہی بڑا سا ''فیملی روم'' لے لیا۔

بیڈز پر لیٹتے تو ہر کوئی خاصی دیر تک خالی الذہنی کی حالت میں رہا۔ کبیل دادا وغیرہ کا تو اتنا عرصہ انڈیا میں نہیں بیتا تھا مگر میں نے کافی عرصہ بتایا تھا اور جن حالات میں گزرا تھا، وہ میں ہی جانتا ہوں، اب وہ سب ایک فلمی منظر کی طرح میرے پردۂ تصور میں چلتا محسوس ہوتا تھا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ چند پل کے لیے تو مجھے یقین بھی نہیں آتا تھا کہ میں اپنے ساتھیوں اور طلسم نور ہیرے سمیت اپنے ملک میں بہ خیریت و عافیت پہنچ چکا تھا، تاہم میں ذہنی طور پر آئندہ کے متوقع حالات کے لیے بھی خود کو تیار رکھے ہوئے تھا۔ جانتا تھا میں کہ جس طرح حادثاتی طور پر میں انڈیا پہنچایا گیا تھا اس کے بعد سے یہاں کے بہت سے ایسے نازک، خطرناک اور حساس نوعیت کے معاملات اُدھورے رہ گئے تھے۔ اب وہ سب میرے ساتھ کون سا نیا گل کھلانے والے تھے۔ یہ تو آنے والا وقت ہی بتاتا مگر قرائن سے لگتا تھا کہ میرے لیے اب یہاں وہ پہلے والے حالات نہیں رہے تھے۔ ریاض صاحب کا کچھ پتا نہیں تھا۔ میری غیر موجودگی میں میرے دیدہ و نادیدہ دشمنوں نے کتنی قوت پکڑ لی تھی، اس کا اندازہ تو مجھے کبیل دادا کی کہانی سن کر پہلے ہی ہو چکا تھا۔ بالخصوص نوشابہ کے کردار نے میرے ازلی دشمنوں کو ابھارنے اور ان کو بھی جنہیں میں نے انڈر گراؤنڈ ہونے پر مجبور کر دیا تھا، ایک قوت پکڑنے کا سبب بنا تھا۔ یہ کچھ کم خطرناک صورت حال نہ تھی۔

چوہدری ممتاز خان اپنی لاڈلی اور چہیتی بیٹی نوشابہ کی وجہ سے ہی رہا ہوا اور زیر زمین تنظیم اسپیکٹرم کا زونل چیف وزیر جان بھی کیل کانٹوں سے لیس ہو کر ابھر آیا تھا۔ ان سب کے ساتھ مل کر نوشابہ میرے ساتھ ایک نیا محاذ کھڑا کر چکی تھی۔ گو کہ نوشابہ محض چند ہی برس کے فرق سے مجھ سے عمر میں چھوٹی تھی، لیکن لگتا تھا کہ ممتاز خان نے اس کی تربیت دوسرے ہی انداز میں کی تھی۔ بہ قول کبیل دادا کی کہانی کے اس نے قوت پکڑتے ہی اپنا اثر و رسوخ بڑھایا تھا اور پھر بیگم ولا پر وار کیا تھا، جس کے نتیجے میں زہرہ بانو (بیگم صاحبہ) کو خاصا دھچکا پہنچا تھا۔ بلاشبہ نوشابہ، زہرہ بانو کے سامنے ''کل کی چھوکری'' تھی مگر اس کل کی چھوکری نے اپنا حلقہ اثر تیزی سے قائم کیا تھا اور اس میں کیا شک تھا کہ اس کی پشت پناہی کرنے والا وزیر جان جیسا ایک عالمی ڈان تھا۔

کبیل دادا، اول خیر سمیت شکیلہ کا بھی یہی خیال تھا کہ میری لمبے عرصے کی غیر موجودگی سے میرے دشمن خاطر خواہ فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی منتشر طاقتوں کو مجتمع کر کے ایک نئی قوت بن کر ابھرے تھے۔ رہی بات میرے بہی خواہوں کی جن میں ایڈووکیٹ خانم شاہ، زبیر خان (خان جی) کس پوزیشن میں تھے، مجھے ابھی اس کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ میں ان سانپوں کی جوڑی کو بھی نہیں بھولا تھا کہ عارف اور سیٹھ نوید سانچے والا اب تک کیا کیا تارِ عنکبوت بُن چکے ہوں گے، یہ میرے نہیں، میری جانِ جاناں عابدہ کے مجرم تھے۔ میں نے ان کی عیش بھری زندگی کو اپنے سینے کی آتشِ انتقام سے بھسم کرنے کا بھی عہد و ارادہ کر رکھا تھا۔

بہت سے اُدھورے رہ جانے والے حسابات چکتا کرنا تھے مجھے......

ہم بہت تھکے ہوئے تھے بستروں میں گرتے ہی سو گئے۔ جاگے تو رات کی خبر لائے۔ روم سروس سے کچھ منگوا کر کھایا پیا گیا۔ پھر چائے کا دور چلا تو میں نے سیل فون سے زہرہ بانو سے بات کرنی چاہی تاکہ انہیں اپنے آنے کی خوش خبری سنا دوں، کیونکہ وہ بہت فکر مند ہوں گی۔ اباجی کا تو معلوم نہیں مگر اماں جی تو ہوش و حواس میں تھیں، ان کا میری اس طویل اور اچانک غیر متوقع جدائی میں کیا حال ہو رہا ہو گا۔ وہ ماں تھیں میری، اتنے عرصے بعد ملی تھیں اور پھر کچھ ہی عرصہ بعد دوبارہ ماں بیٹا مل کر بچھڑ گئے تھے۔ مگر کبیل دادا نے مجھے بیگم ولا رابطہ کرنے سے منع کر دیا۔ میں نے حیرت اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم شاید بھول رہے ہو، شہزی! میں نے تمہیں بتایا تھا کہ تمہارے اچانک غائب یا چلے جانے سے گیدڑ جیسے دشمن بھی شیر ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنا اثر و رسوخ ہی نہیں بلکہ مجرمانہ ہتھکنڈوں سے بیگم ولا کے مکینوں کی زندگی

شک کرنا شروع کردی تھی۔ جس کے نتیجے میں بے چاری بیگم صاحب تک کو خان جی سے مدد لینے کے لیے جانا پڑا تھا۔ کیونکہ وہ بھی آج کل سیاست میں پوری شد و مد کے ساتھ ''اِن'' رہنے لگے ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے میرا کہ اس وقت دشمنوں کی نظریں ہی نہیں بلکہ سماعتیں بھی بیگم ولا پر لگی ہوں گی اور ممکن ہے فون کالز بھی ٹریس کی جا رہی ہوں۔''

''میں تمہاری بات کا مطلب سمجھ رہا ہوں مگر میں لینڈ لائن پر نہیں بلکہ زہرہ بانو کے سیل فون پر رابطہ کروں گا۔'' میں نے کہا۔

''ایک ہی بات ہے۔'' وہ بولا۔ ''اب ہم اپنی منزل سے کون سا دور ہیں۔ چاہو تو آج رات پنجاب جانے والی کسی لگژری کوچ میں سوار ہو جاتے ہیں اور کل پہنچ جائیں گے۔''

''او...... خیر! شہزی کا کے! استاد جی ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔'' اول خیر بولا۔

''بیگم ولا میں ہم اپنی آمد کو جس قدر خفیہ رکھیں اُتنا ہی ہمارے حق میں بہتر ہوگا۔''

شکیلہ نے میری تائید میں البتہ ان دونوں کی باتوں سے اختلاف کیا، بولی۔

''لیکن...... باوجود اس کے ہمیں بیگم صاحب سے رابطہ ضرور کرنا چاہیے، آخر ان سب کی خیریت اور وہاں کے حالات کا تو اندازہ ہو...... یوں منہ اٹھائے بیگم ولا کا رخ کرنا ایک غیر دانش مندانہ فیصلہ ہوگا۔''

شکیلہ کی بات مجھے معقول لگی تھی، تاہم میں نے جب تائید طلب نظروں سے کپیل دادا کی طرف دیکھا تو وہ چند ثانیے اپنے ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے شہزی! تم رابطہ کرو مگر ابھی یہ مت بتانا کہ ہم اس وقت کہاں ہیں، البتہ بیگم صاحبہ کو تسلی دے دینا تو وہ بھی اصرار نہیں کریں گی۔''

میں زہرہ بانو کو فون کرنے کے فوراً بعد ہی آنسہ خالدہ سے بھی رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ پہلے میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ زہرہ بانو کے سیل فون کا نمبر ملا دیا۔ بیل جاتی رہی مگر کسی نے فون ریسیو نہیں کیا۔

''کیا ہوا......؟'' اول خیر نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

''پتا نہیں کیوں وہ فون نہیں اٹھا رہی ہیں۔'' میں نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا تو شکیلہ بولی۔

''ہو سکتا ہے وہ ان نون نمبر دیکھ کر فون ریسیو نہ کر رہی ہوں، لینڈ لائن پر ہی کر لو۔''

''آخری بار ٹرائی کر کے دیکھتا ہوں۔'' میں نے کہا اور نمبر ری ڈائل کیا۔

دوسری جانب بیل جا رہی تھی اور تب ہی تیسری بیل کے بعد زہرہ بانو کے بجائے کوئی اجنبی مردانہ آواز اُبھری۔

''ہیلو، کون؟'' صاف لگتا تھا کہ دوسری جانب سے مخاطب ہونے والے شخص نے اپنی آواز کو جان بوجھ کر رعب دار بنانے کی کوشش کی تھی۔

''تم کون ہو؟ کیا یہ بیگم صاحب کا سیل نمبر نہیں ہے؟'' میں نے کہا۔ دوسری جانب پل بھر کو خاموشی رہی۔ میرا دل سینے میں بے طرح دھڑک رہا تھا پھر وہی مردانہ آواز اُبھری۔

''یہ انہی کا ہی نمبر ہے مگر آپ کون ہیں؟'' پوچھا گیا۔

مجھے تسلی ہوئی، شکیلہ کا خیال درست ثابت ہوا تھا، ان نون نمبر دیکھ کر شاید زہرہ بانو نے اپنا سیل ساتھی کو تھما دیا تھا۔

''بیگم صاحبہ سے میری بات کراؤ...... انہیں شہزی کے متعلق بتانا ہے۔''

میں نے دانستہ اپنے ''نک نیم'' کا ہی ذکر کرنا مناسب سمجھا تو دوسری جانب اچانک گم صم سی خاموشی چھا گئی مگر اس کا دورانیہ چند پل ہی محیط رہا تھا کہ اگلے ہی لمحے زہرہ بانو کی لڑکھڑاتی آواز اُبھری۔

''کک...... کون......؟ شش...... شہزی کے بارے میں تم کیا بتانا چاہتے ہو......؟''

زہرہ بانو کی آواز سنتے ہی میں نے خود بھی اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے ملامت آمیزی سے کہا۔

''زہرہ بانو...... یہ میں ہی ہوں...... شہزی! پہچان لیا مجھے...... تو آگے بات کی جائے؟'' میرے کہنے کی دیر تھی کہ دوسری جانب جیسے چند ثانیوں کے لیے زہرہ بانو کو سانپ سونگھ گیا مگر پھر جلد ہی وہ بول پڑی تو اس کی آواز میں مجھے ایک جذباتی سا ارتعاش محسوس ہوا۔

''شش...... شہزی! کک...... کیا...... یی یی یہ...... واقعی تم بول رہے ہو......؟'' اس کا انداز تخاطب غیر یقینی سا تھا۔

''میں ہی بول رہا ہوں، کیا اتنے عرصے میں آپ میری آواز بھی نہیں پہچان پا رہی ہیں؟''

''او...... مائی گاڈ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے، کک...... کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں؟''

''ہرگز نہیں، ورنہ آپ اپنے ساتھی سے فون کیوں کر لیتیں؟''

''تت...... کہاں ہو؟ کیسے ہو؟ سب...... باقی ساتھی کہاں ہیں؟ جلدی بتاؤ مجھے۔''

''میں بھی بالکل ٹھیک ہوں اور اللہ کے فضل سے سب

ساتھی بھی ٹھیک ہیں اور میرے ساتھ ہی ہیں۔'' میں نے پُرسکون سے لہجے میں کہا تاکہ وہ بھی خود کو پُرسکون کرلے۔

''تت...... تم لوگ ہو کہاں......؟''

''شش...... کیا فون پر یہ بتانا ضروری ہے؟'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''لل...... لیکن......'' اس کی آواز حلق میں اٹکنے لگی۔

میں فوراً بولا۔

''بس! اتنا سمجھ لو...... ہم خطرے سے نکل آئے ہیں اور کسی بھی وقت بیگم ولا پہنچ رہے ہیں، اب تم سرِدست مجھے مختصراً یہ بتاؤ کہ وہاں کی تازہ صورتِ حال کیسی ہے؟ کیا آجائیں ہم؟''

''ہہ...... ہاں، نن...... نہیں......'' جانے کیوں وہ اٹکنے لگی، پھر جیسے چند ثانیے اپنے حواسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کے بعد بولی تو پہلے کے مقابلے میں اس کا لہجہ نہ صرف محتاط بلکہ سنبھلا ہوا بھی محسوس ہوا۔

''سنو شہزی......''

''میں سن رہا ہوں......'' میں نے دھیان لگائے رکھا۔

''اب فون پر پوری تفصیل تو نہیں ہوسکتی...... لیکن یہ درست ہے کہ تمہارے جانے کے بعد دشمنوں نے نئے سرے سے طاقت پکڑلی ہے، ابھی زیادہ تو وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ پائے ہیں مگر وہ اندر ہی اندر کوئی مضبوط محاذ قائم کرنے میں مصروف ہیں۔ انہوں نے بیگم ولا کی ریکی بھی شروع کر رکھی ہے۔ کون آرہا ہے؟ کون کہاں جارہا ہے، وہ سب نظروں میں رکھے ہوئے ہیں، مگر بات صرف اتنی سی بھی نہیں ہے...... تم سن رہے ہو ناں شہزی......؟''

''بولتی رہیں، میں سن رہا ہوں......'' میں نے تیزی سے کہا۔ میں اس کی آخری بات پر بے چین سا ہوا تھا۔

''لگتا کچھ ایسا ہی ہے کہ بیگم ولا ہمارے دشمنوں کا ایک مشترکہ ''ٹارگیٹڈ پوائنٹ'' بن چکا ہے۔ کچھ اور مشکوک لوگوں کو بھی قریب میں منڈلاتے دیکھا ہے، کچھ لوگ ایسے لوگ جن سے بہ ظاہر ہماری دشمنی کا کوئی تعلق بھی بنتا نظر نہیں آتا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ چوہدری ممتاز یا نوشابہ وغیرہ کے گماشتوں کے علاوہ...... کوئی اور لوگ...... جنہیں پُراسرار کہا جائے......''

''ایگزیکٹلی......! یہی کہنا چاہ رہی تھی میں......'' وہ فوراً بولی۔

''میں سمجھ گیا۔'' میں نے کہتے ہوئے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے، پھر بولا۔

''بس، پھر اب خود کو ذرا سنبھالیں اور تھوڑا سا انتظار کریں۔ زیادہ تفصیل نہیں بیان کرسکتا، آگے آپ سمجھدار ہیں، کیا اب میں فون بند کردوں؟'' میں نے اشارہ دیا۔

''شکر ہے میرے اللہ......! کہ تم اور باقی ساتھی خیریت سے ہو۔'' اس کی دعائیہ آواز اُبھری۔

اس کے بعد میں نے اسے خدا حافظ کہہ دیا۔ دل کو کچھ سکون ملا۔ میں نے ساتھیوں کو بتادیا، اس کے بعد آنسہ خالدہ کا نمبر ملایا۔

آنسہ خالدہ کا نمبر ملاتے ہوئے مجھے یاد آیا تھا کہ آخری بار اس سے میں نے بھارت میں ہی رینا کی سہیلی کے فلیٹ میں...... ٹیلی فونک بات کرنی چاہی تھی کہ بلراج آن کودا تھا مگر مجھے یاد تھا کہ میرا رابطہ ہوگیا تھا اور مجھے دوسری جانب سے آنسہ خالدہ کے بجائے کسی اجنبی خاتون کی آواز سنائی دی تھی، میں چونکے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

بہرحال اب اس سے رابطہ کرتے وقت میرا دل سینے میں زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ وہ مجھے عابدہ سے متعلق کیا ''اَپ ڈیٹ'' دیتی ہے؟...... لیکن یہ کیا...... دوسری جانب سے انگلش میں کسی خاتون کی ریکارڈ شدہ آواز میں بتایا گیا کہ یہ نمبر درست نہیں...... اور بھی بہت کچھ بتایا جارہا تھا، مطلب اس کا ایک ہی تھا۔ یہ نمبر اب کسی کے استعمال میں نہیں رہا تھا یا پھر میرے کونٹیکٹ لسٹ سے بلاک ہوگیا تھا۔ میری کنپٹیوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ دل جیسے اب رک رک کر دھڑکنے لگا تھا۔ ہاتھوں پیروں میں جان ہی نہ رہی تھی۔ یہ کیا ہوا تھا آخر؟ آنسہ خالدہ کا نمبر کیوں بند ہوگیا تھا؟

یہ سن کر میرے تو اوسان ہی خطا ہوگئے اور میرا چہرہ فق ہو کر رہ گیا تھا۔ میرے چہرے کی رنگت بدلتے دیکھ کر تینوں بھی چونکے بغیر نہ رہ سکے تھے۔ میں نے دو تین بار ٹرائی کیا مگر بدستور وہی ریکارڈ شدہ میسج ملتا رہا۔

''کیا ہوا شہزی؟ خیریت تو ہے، تمہارا چہرہ کیوں اچانک اُتر کر رہ گیا ہے؟''

کیل دادا نے پوچھا۔ شکیلہ اور اول خیر بھی میری اس کیفیت کو دیکھ کر پریشان ہوگئے تھے۔ میں نے جب انہیں ٹوٹے ٹوٹے لہجے میں بتایا تو وہ بھی تشویش زدہ سے نظر آنے لگے۔

''آنسہ خالدہ کے ساتھ کچھ ہوا ہے؟'' میں بڑبڑایا۔

''او...... خیر کا کے! پریشان نہ ہو...... کیا خبر اس نے اپنا نمبر تبدیل کرلیا ہو؟'' اول خیر نے کہا۔ یہ ممکن تھا۔ میں

''اگر ایسا ہوتا تو وہ مجھے مطلع کرتی۔''

''کیا ہو گیا ہے یار تجھے؟'' کبیل دادا مسکرا کر بولا۔ ''وہ تجھے کیسے اور کس نمبر پر مطلع کرتی......؟ تیرے پاس اس عرصے میں سیل فون کب رہا؟''

''لیکن زہرہ بانو کا نمبر اس کے پاس تھا...... کم از کم اس پر ضرور اطلاع کرتی، کیا وہ نہیں جانتی تھی کہ میں اس سے عابدہ سے متعلق پل پل کی خبر لیتا رہتا تھا۔''

''او خیر...... کاکے! ابھی بیگم صاحبہ سے بات ہی کتنی ہوئی ہے تیری؟ ہو سکتا ہے آنسہ خالدہ نے انہیں اس سلسلے میں کوئی پیغام دے رکھا ہو۔'' اول خیر نے میرا دلی اور دماغی بوجھ ہلکا کرنا چاہا تو میں بولا۔

''کیسی بات کر رہا ہے یار تو......؟ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ ابھی مجھے ضرور بتاتی۔''

''شہزی! حوصلہ رکھو......'' شکیلہ نے میرا حال دیکھ کر قریب آتے ہوئے میرے شانے پر اپنا ایک ہاتھ دھرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ''تمہاری ابھی بیگم صاحبہ سے باتیں ہی کتنی ہوئی ہیں، صرف چند سیکنڈ؟ وہ اتنے قلیل وقت میں تمہیں کیا بتاتیں، جبکہ تم نے خود ہی انہیں مختصر بات کرنے کا اشارہ بھی دیا، پھر یہ بھی تو دیکھو کیسے حالات میں ہوئی ہیں؟ انہیں یاد نہیں رہا ہوگا۔''

شکیلہ کی بات سے میرے دل کو کافی ڈھارس ہوئی مگر جانے کیا بات تھی کہ پوری طرح تسلی نہ ہو پائی۔ میں بے چین سا ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگا، پھر بھی کچھ نہ سوجھا تو ایک بار پھر احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے زہرہ بانو کے سیل کا نمبر ملا دیا۔ وہ تینوں خاموش کھڑے تھے۔ انہیں یقیناً میری اس دلی کیفیت اور بے قراری کا احساس تھا۔

دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ زہرہ بانو سے میں اسی وقت پوچھ کر اپنی یہ تسلی کر لینا چاہتا تھا۔ ورنہ ملتان پہنچتے پہنچتے مجھے ایک پل کے لیے بھی چین نہ آتا۔

دوسری جانب سے زہرہ بانو نے فوراً میری یہ دوسری کال ریسیو کی تھی۔

''خیریت شہزی؟'' وہ تیزی سے بولی۔

''میری غیر موجودگی میں آنسہ خالدہ کا فون آیا تھا؟'' میں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''ہاں! آیا تو تھا مگر......'' وہ کچھ کہتے کہتے رکی۔

''مگر کیا......؟''

''بات کرنے والی آنسہ خالدہ نہیں تھی۔'' زہرہ بیگم نے کچھ سوچتے ہوئے بتایا۔

''پھر کون تھی وہ......؟'' میری بے چینی فزوں تر ہو رہی تھی۔

''آں......'' وہ کچھ سوچنے لگی۔ ادھر میرا دل تھا کہ جیسے رکے جا رہا تھا۔

''تمہارے جانے کے کچھ روز بعد ہی کی بات تھی...... اسی لیے کچھ بھول رہی ہوں......''

''کیسے بھول رہی ہیں آپ......؟'' میں چڑ سا گیا۔ وجہ میری عابدہ اور آنسہ خالدہ سے متعلق پریشانی ہی تھی۔ ''کیا آپ نہیں جانتیں کہ آنسہ خالدہ ہمارے لیے عابدہ کے حوالے سے کس قدر اہمیت کی حامل خاتون رہی ہیں......؟ آپ کو اس کی ایک ایک بات کو اہمیت دینی چاہیے تھی۔''

''میرے خدا، شہزی پلیز، ناراض مت ہونا...... مجھے یہ سب معلوم ہے، مگر شاید تمہیں اندازہ نہیں کہ...... تمہارے بعد یہاں میں کن عذاب ناک حالات سے دوچار رہی ہوں...... میں بتاتی ہوں، یاد آ رہا ہے، مجھے......'' وہ بڑے رسان سے بولی تھی۔ میں نے بھی ذرا اپنے اندر کے جذباتی پن پر قابو پانے کی کوشش چاہی اور بے اختیار ایک گہری سانس بھی خارج کر کے رہ گیا۔

''فون آنسہ خالدہ اور عابدہ کے حوالے سے ہی آیا تھا۔'' صرف چند ہی سیکنڈوں کے بعد وہ دوبارہ بتانے لگی اور میں سراپا سماعت بن گیا۔

''مگر...... جو خاتون بول رہی تھی۔ وہ کوئی اور اجنبی تھی...... وہ تم سے بات کرنا چاہتی تھی۔ پہلے تو یہی کہتی رہی کہ تمہارے سیل کا نمبر نہیں لگ رہا تھا تو شہزی نے آنسہ خالدہ کو بیگم ونا کا لینڈ لائن نمبر بھی دے رکھا تھا۔ سو بولی...... کہ شہزی کو آنسہ خالدہ کا فقط اتنا پیغام پہنچا سکتی ہو تو دے دینا کہ آنسہ خالدہ......''

زہرہ بانو بولتی جا رہی تھی اور...... میں...... جیسے اپنے آپ میں ہی نہ رہا تھا...... شاید حواسوں کا مختل پڑ جانا اِسے ہی کہتے ہیں...... کہ انسان جہاں کھڑا ہوتا ہے اس کا بھی احساس جاتا رہتا ہے کہ وہ زمین پر ہے یا کہیں اور...... شاید پیروں تلے زمین نکل جانا اِسے ہی کہتے ہیں...... میں کچھ ایسی ہی کیفیات کا شکار ہو رہا تھا اس وقت۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

غلط پیغام

تسکین رضا

چال اور ڈھال کی قیامت خیزی سے انکار ممکن نہیں... مگر کبھی کبھی ایک اتفاقی حادثہ پوری بساط کو لپیٹ دیتا ہے... شاطرانہ انداز میں سوچی گئی چال کا دلچسپ احوال... ایک پیغام نے بازی کا رخ بدل دیا...

اس شاطر کا المیہ جس کا منصوبہ بے داغ تھا

دو نشستوں والی چھوٹی سی کیوٹ کار کنٹری روڈ سے پرے ایک قابلِ دید آبشار سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی لیکن کار کا اندرونی منظر نہ کیوٹ تھا اور نہ ہی قابلِ دید۔ کار کی ڈرائیو سیٹ پر ایک نوجوان عورت موجود تھی۔

اس کا خون آلود سر کار کی کھلی کھڑکی سے باہر ڈھلکا ہوا تھا۔ اس کے کان کے پیچھے گولی کا سوراخ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ سراغ رساں شرمین ہومز گولی کے نشان کا جائزہ لے رہا تھا۔
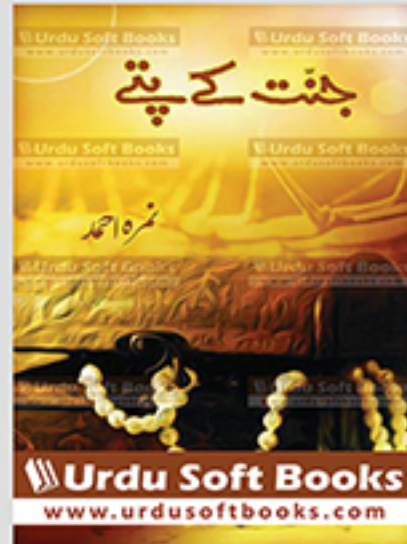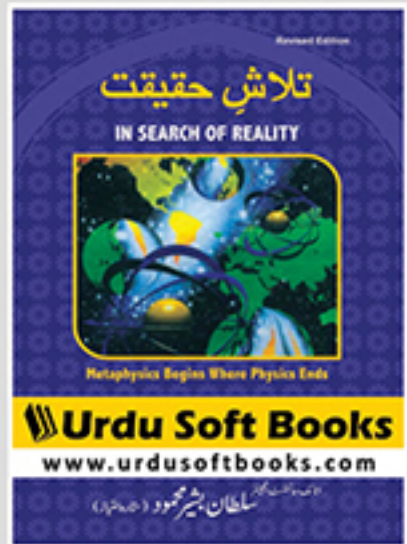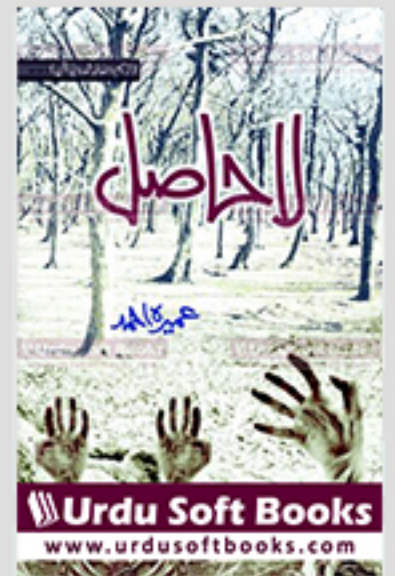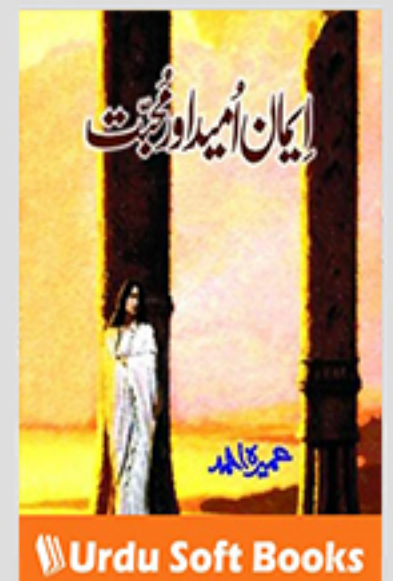
ہے؟" سارجنٹ ولسن نے اونچی آواز میں کہا کیونکہ آبشار کے شور کی وجہ سے اسے اپنی آواز بھی بمشکل سنائی دے رہی تھی۔ "اس عورت نے سڑک سے ایک غلط ٹرن لے لیا تھا اور پھر راستہ بھول کر بھٹکتی ہوئی اِدھر آن پہنچی تھی۔ وہ یہاں رک گئی تھی۔ جب وہ یہاں کار میں بیٹھی ہوئی تھی تو کوئی اس کی کار کی کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس پہنچا، اسے گولی ماردی اور اسے لوٹ کر چلا گیا۔ اور اس وقت ٹھیک دن کے دو بج کر سترہ منٹ ہوئے تھے۔"

سراغ رساں شرمین کے چہرے پر اُلجھن کے تاثرات نمودار ہوگئے پھر اس کی نگاہ اس کھلے ہوئے سیل فون پر چلی گئی جو کار کی کھڑکی کے عین باہر زمین پر پڑا ہوا تھا۔ "وہ اس وقت کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔ تبھی تمہیں ٹائم کا درست پتا چلا ہے؟"

"تقریباً۔" سارجنٹ ولسن نے کہا۔ "اس نے اپنے بھائی کی وائس میل پر ایک پیغام چھوڑا تھا۔ اس کے بھائی نے تین بجے کے قریب اپنے پیغامات چیک کیے تو فوری طور پر پولیس کو فون کر دیا۔ ہمارے لڑکے عورت کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ انہیں مل گئی۔"

"میں وائس میل کا وہ پیغام سننا چاہتا ہوں۔" سراغ رساں شرمین نے کہا۔ "اور اس کے بھائی سے بھی ملنا چاہوں گا۔"

سارجنٹ ولسن اپنے گول مٹول پستہ قد دوست کو کار میں بٹھا کر قصبے سے باہر ایک پُرآسائش بنگلے پر لے گیا۔

مقتولہ کا بھائی جیری گھر پر موجود تھا۔ اس نے انہیں اندر بلا لیا۔ وہ اپنی بہن سے عمر میں چند سال ہی بڑا تھا لیکن رنج والم کے باعث کچھ زیادہ ہی بڑا دکھائی دے رہا تھا۔ سارجنٹ ولسن نے اس سے کہا کہ کیا وہ لوگ اس کا وائس میل کا پیغام سن سکتے ہیں۔ جیری رضامند ہوگیا۔

وائس میل پر پہلے ایک مشینی آواز ابھری۔

"میسج آج دوپہر دو بج کر سترہ منٹ پر موصول ہوا۔"

پھر اس عورت کی آواز ابھری۔ "جیری، میں کوئی بول رہی ہوں۔ مجھے دیر ہو جائے گی۔" آواز کے دوران میں کسی قسم کا خلل یا شور سنائی نہیں دے رہا تھا۔ "میں نے ہاپکنز جنگل کے درمیان سے شارٹ کٹ لیا تھا اور اسی لیے میں راستہ بھٹک گئی ہوں اور ابھی مجھے بہت سے کام کرنا باقی ہیں۔ سو میرا انتظار مت کرنا...... ہولڈ آن۔" کوئی کی آواز بدل گئی۔ "یہ تم کیا کر رہے ہو؟ نہیں...... نہیں۔ ایسا مت کرو......" کے بعد خاموشی چھا گئی۔

"کوئی کار کے پاس آیا اور بس اُسے گولی ماردی؟" سراغ رساں شرمین نے قدرے حیرانی سے کہا اور ریسیور نیچے رکھ دیا۔

مقتولہ کا بھائی جیری ابھی تک صدمے سے چُور تھا۔ "میں اگر حقائق سے بہتر طور پر واقف نہ ہوتا تو یہی کہتا کہ یہ لازمی کوئی کے بوائے فرینڈ کرٹ کی حرکت ہوگی۔"

"ہاں۔" سارجنٹ ولسن نے تائید کی۔ "میرے سراغ رساں دوست کو کرٹ کے بارے میں بتاؤ۔"

جیری، شرمین کی جانب گھوم گیا۔ "وہ ایک ناپسندیدہ اور پریشان کن شخص ہے۔ کوئی تین مرتبہ اس سے تعلقات ختم کر چکی ہے۔ ان کے درمیان جھگڑا ہوا تھا اور وہ اسے دھمکی بھی دے چکا تھا لیکن ہر مرتبہ، جھگڑنے کے بعد کوئی...... اس کے پاس واپس چلی جاتی تھی۔ میں اس کی اس حرکت پر ہمیشہ اس پر ناراض ہوتا اور چیختا چلایا کرتا تھا۔ تم اس گھٹیا آدمی سے پرے ہو جاؤ۔ میں کوئی کو غصے سے یہی تاکید کیا کرتا تھا۔ بالآخر بات کوئی کی سمجھ میں آگئی اور اس نے ہمیشہ کے لیے اس سے ناتا توڑ لیا۔" جیری نے ایک ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اور اب کسی اور نے اسے قتل کر دیا ہے...... اس کی سونے کی انگشتریوں اور چند ڈالرز کے عوض!"

"تمہیں یہ خیال کیوں ہے کہ یہ کام کرٹ نے نہیں کیا ہے؟" سراغ رساں شرمین نے پوچھا۔

"میں تمہیں بتاتا ہوں۔" سارجنٹ ولسن نے کہا اور اسے ساتھ لیے باہر کار کی طرف آگیا۔

وہ دونوں کار میں سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہوگئے اور پندرہ منٹ کے سفر کے بعد سارجنٹ ولسن نے کار ایک ناکارہ سے ٹرالر کے سامنے روک دی جس کے اطراف میں ملبے کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔

"یہ کرٹ کی رہائش گاہ ہے۔ یہاں سے ہاپکنز جنگل کا وہ مقام آدھے گھنٹے سے زیادہ کی ڈرائیو پر ہے جہاں کوئی کی لاش پائی گئی ہے۔ آج سہ پہر برادرز آف مرسی نامی فلاحی کمیونٹی کے لوگ اس علاقے میں عطیات مانگنے نکلے ہوئے تھے۔ اُن کے مذہبی لیڈر نے یہ بات قسم کھا کر بتائی ہے کہ آج ٹھیک دو بج کر تیس منٹ پر اس نے یہاں کرٹ سے بات کی تھی۔ اسے وقت یوں یاد تھا کہ کرٹ نے اسے ٹرالر کے پورچ سے نیچے دھکیل دیا تھا اور نیچے گرتے سے اس کے ہاتھ کی گھڑی ٹوٹ گئی تھی۔"

تھی؟" سراغ رساں شرمین نے پوچھا۔

"ہاں۔"

شرمین ایک لمحے کے لیے کچھ سوچنے لگا، پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ "تمہیں کسی کی بھی جائے واردات سے عدم موجودگی کے بارے میں فکرمند ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے کرائم سین کے لوگ بھی اسی نتیجے پر پہنچیں گے جس نتیجے پر میں ابھی ابھی پہنچا ہوں۔"

"اور تم کس نتیجے پر پہنچے ہو؟" سارجنٹ ولسن نے جاننا چاہا۔

"یہ کہ لاش کو منتقل کیا گیا ہے۔" سراغ رساں شرمین نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟"

"کونی کی موت وہاں واقع نہیں ہوئی جہاں اس کی لاش پائی گئی ہے۔"

"یہ تم کیا بات کر رہے ہو؟" سارجنٹ ولسن نے اپنی خوشی چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ "ہمارے پاس کونی کی ریکارڈ شدہ آواز موجود ہے جس میں وہ کہہ رہی ہے کہ وہ جنگل میں بھٹک گئی ہے۔ پھر اس کے بعد ہی فائر کی آواز آتی ہے۔"

"کونی جھوٹ بول رہی تھی۔ وہ اپنے بھائی کو یہ بتا رہی تھی کہ وہ ہاپکنز کے جنگل میں راستہ بھٹک گئی ہے اور کسی جگہ پر ہے جبکہ حقیقت میں وہ وہاں نہیں تھی۔"

"اسے ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"اس لیے کہ وہ اس وقت کرٹ کے پاس تھی۔ بھلا اسے ایک سیدھی سی بات یعنی اپنی لوکیشن بتانے کے لیے جھوٹ بولنے کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے؟ یاد ہے کہ وہ جب بھی کرٹ کے پاس واپس جاتی تھی تو اس کا بھائی اس کو ڈانٹ ڈپٹ کرتا تھا اور اس پر چیختا چلاتا تھا؟"

"اور تمہیں کس چیز نے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ لاش وہاں منتقل کی گئی ہے؟" سارجنٹ ولسن نے پوچھا۔

"اس لیے کہ وائس میل کے ٹیپ پر آبشار گرنے کی کوئی آواز موجود نہیں۔ جبکہ وہاں آبشار کے شور میں ہم دونوں کی آوازیں دب رہی تھیں اور ہم بمشکل ایک دوسرے کی بات سن رہے تھے۔ اگر کونی اسی مقام پر موجود تھی اور اس نے اپنی کار کا شیشہ نیچے گرایا ہوا تھا پھر جب وہ اپنے بھائی کو وائس میل کر رہی تھی تو اس پر فائر کیا گیا تھا جیسا کہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود بھی ٹیپ میں کوئی بیک گراؤنڈ آواز نہیں!"

سارجنٹ ولسن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میرا اندازہ یہی ہے کہ اپنے بھائی کو فون کرنے سے قبل کونی اور کرٹ کے درمیان حسب معمول جھگڑا ہو رہا تھا۔ جب کرٹ نے یہ سنا کہ وہ وائس میل کے میسج میں اپنے بھائی سے جھوٹ بول رہی ہے تو یقیناً اس کا غصہ عود کر آیا ہوگا اور اس نے کونی کو گولی مار دی ہوگی۔ پھر بعد میں جب برادرز آف مرسی کا وہ مذہبی لیڈر عطیے کے لیے اس کے ٹرالر پر آیا تو کرٹ کو احساس ہوگیا کہ اگر وہ کونی کی لاش اس مقام پر پہنچا دیتا ہے جس کے بارے میں کونی نے اپنے بھائی کو فون پر پیغام دیا تھا کہ وہ بھٹک کر وہاں پہنچ گئی ہے تو اس مقام سے اس کی عدم موجودگی کا ثبوت برادرز آف مرسی کے مذہبی لیڈر کی گواہی ہوگی اور وہ قتل کے الزام سے صاف بچ نکلے گا۔"

"لیکن کرٹ کی یہ چال ہرگز کامیاب نہیں ہوگی۔" سارجنٹ ولسن نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "آؤ چل کر اسے حراست میں لیتے ہیں۔"

پھر وہ دونوں چوکس انداز میں کرٹ کے ناکارہ ٹرالر کی رہائش کی جانب چل دیے۔

ذاتی مسئلہ

سردار سورن سنگھ بیوی کے ہمراہ نیویارک کے اسٹار ہوٹل کی ساتویں منزل پر مقیم تھے۔ رات کے دو بجے انہوں نے ہوٹل کے منیجر کو فون کیا۔ "جلدی میرے کمرے میں آؤ...... میرا بیوی سے سخت جھگڑا ہوا ہے اور وہ خودکشی پر تلی ہوئی ہے......!"

"سر! یہ آپ کا ذاتی مسئلہ ہے۔" منیجر کی غنودہ آواز آئی۔ "آپ خود حل کریں۔ ہوٹل کی انتظامیہ کچھ نہیں کر سکتی!"

"ابے! انتظامیہ کے بچے!" سردار جی نے دانت پیس کر کہا۔ "جلدی آؤ۔ یہ ذاتی نہیں ہوٹل کی دیکھ بھال میں غفلت کا معاملہ ہے۔ کھڑکی کی کنڈیوں میں بری طرح زنگ لگا ہوا ہے...... وہ کسی طرح نہیں کھل رہیں، دیر ہوئی تو کہیں وہ عورت اپنا ارادہ نہ بدل لے!"

پشاور سے سردار سوڈی کی تشویش

چہرہ ساز

محمد یاسر اعوان

چہرے بولتے ہی نہیں بنتے اور بگڑتے بھی ہیں... خوب صورت اور حسین چہرے اس کی کمزوری تھے... وہ چہرہ تراش تھا... اس کی جادوئی انگلیاں اس کمالِ فن سے آشنا تھیں... وہ بدصورت اور مسخ شدہ چہروں کو ایک نئی صورت میں ڈھال دیتا تھا... دیکھنے والے دنگ رہ جاتے تھے... تخلیقی صلاحیتوں نے اس کے کارواں کو رکنے نہ دیا... مگر ایک چہرہ جو اس کی شاندار تخلیق تھا... وہ چہرہ اس کے لیے تخلیقی سفر میں رکاوٹ بننے لگا اور پھر... پوشیدہ اور اسرار کے پردوں میں چھپی ایک کہانی سے کئی کہانیاں جنم لیتی چلی گئیں...

پرانے چہروں کو نئی جلا بخشنے والے چہرہ ساز کی مردم شناسی

''میں پھر سے حسین نظر آنا چاہتی ہوں۔'' جینی چرچل کی آرزو کومل جیسی کوک میں الفاظ کا روپ دھار گئی۔

''پہلے سے کہیں زیادہ حسین نظر آؤ گی۔'' ڈاکٹر میڈاس نے جواب دیا۔

اس کا لہجہ متین، شائستہ اور پختہ یقین کا مظہر تھا۔ جینی کو اس کے لہجے کی متانت اور شائستگی نے احساس دلایا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اسے اپنے ساتھ پیش آنے والے اس

وہ ایک خواتین رسالے نسا، (NISA) کی رپورٹر تھی جو اسم بامسمّیٰ تھا۔ اس روز وہ رسالے کی طرف سے ایک نئے جیٹ طیارے کے متعارف ہونے کی رسم میں کینیڈی ائرپورٹ گئی تھی اور وہاں پہنچ کر ہیروئن بننے کے شوق میں طیارے کے اسکیپ سلائڈ پر چڑھ گئی تھی۔ اس روز ہواؤں میں جنون کے آثار تھے۔ اچانک ایک شوریدہ سر اور گستاخ جھونکا اس سے لپٹ گیا، اس کا توازن بگڑ گیا۔ وہ منہ کے بل پچپن فٹ نیچے تارمک پر آرہی اور پھر...... چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

حادثے کے بعد سے اب تک ایک سال میں تین آپریشنز سے گزرنا پڑا تھا اور پلاسٹک سرجری کا ماہر ڈاکٹر میڈاس، ایک بھیانک خواب کو ڈھیرے ڈھیرے رنگین خواب میں بدلنے کے فن کی بدولت اسے ایک نیا چہرہ، ایک نیا روپ دیتے ہوئے، اس کا نجات دہندہ بن گیا تھا۔ یہ ایک نئے خواب کا آغاز تھا۔

تب وہ ایک بار پھر اسپتال میں پڑی تھی اور اس کا چہرہ ایک بار پھر پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ ڈاکٹر میڈاس اس کا آخری آپریشن مکمل کر چکا تھا اور اس کی پٹیاں کھولنے کی تیاری کر رہا تھا۔ یہ تبدیلی انتہائی ڈرامائی ہوگی۔ وہ ایک بار پھر دنیا والوں کا سامنا کرنے کے قابل ہو سکتی۔ ایک سال کے بعد پہلی مرتبہ جی اٹھتی۔ لوگ کیا کہیں گے؟ پرانے دوست احباب کیا کہیں گے؟ کیا وہ اسے گھور گھور کر دیکھیں گے؟

''تیار ہو؟'' ڈاکٹر میڈاس نے پوچھا اور اس کی پٹیاں کاٹنے لگا۔ جیسے جیسے پٹیاں ڈھیلی پڑ رہی تھیں، ویسے ویسے جینی چرچل کو یوں محسوس ہو رہا تھا گویا اس کی کھوپڑی اور سر کی کھال سانس لینے لگی ہو۔ ''ایک منٹ میں......'' ڈاکٹر میڈاس نے کہا۔ ''اور یہ ایک خوب صورت منظر ہوگا...... بہت ہی خوب صورت۔''

پھر اس نے کچھ کہے بغیر آخری پٹی بھی ہٹا دی۔ جینی کی آنکھیں اچانک برہنہ ہوگئیں۔ اس نے ڈھیرے سے ان کے غلاف کھول دیے۔ ''کیسا ہے؟'' اس نے نرمی سے پوچھا۔

''میں مطمئن ہوں۔'' میڈاس نے جواب دیا۔ خوشی کسی تتلی کی طرح اس کے سینے میں پھڑپھڑانے لگی اور پھر تبسم کی صورت اس کے لبوں پر اتر آئی۔ اچانک چہرے کے کسی پٹھے کے کھنچاؤ نے اسے تکلیف کا احساس دلایا۔ تتلی اڑ گئی، وہ ایک ثانیے کے لیے ساکت ہوگئی پھر ڈھیرے

سے اپنا رخ دستی آئینے کی طرف موڑا، جو میڈاس نے اس کے پہلو میں رکھ دیا تھا۔ اس کا دل بُری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر آئینہ اٹھالیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ہچکچائی اور پھر اسے اپنے سامنے کر کے اس میں اپنے چہرے کا عکس دیکھنے لگی۔ اسے جھرجھری سی آگئی۔ چہرے پر سوجن تھی اور زخم بھی کچے تھے۔ ڈاکٹر میڈاس نے اسے پہلے ہی اس کے بارے میں بتا دیا تھا پھر اس نے غور سے خط و خال کا جائزہ لیا اور اسے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہ ہوئی کہ سوجن اترنے اور زخم بھر جانے کے بعد وہ کیسی لگے گی۔

''میرے خدایا......!'' اس کی سانس سینے ہی میں رک گئی۔ منہ فرطِ حیرت سے کھل گیا۔

''خوش ہو؟'' ڈاکٹر میڈاس نے پوچھا۔

''خوش؟'' وہ مسرت سے تقریباً چیخ پڑی۔ ''یہ میرے تصور سے بڑھ کر ہے۔'' وہ میڈاس کی طرف مڑی۔ ''ایک بار پھر تمہارا شکریہ، بہت بہت شکریہ، ڈاکٹر میڈاس۔''

میڈاس محض اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ وہ اپنے فن سے بخوبی واقف تھا۔

''شاید تمہیں معلوم ہو۔'' وہ بولا۔ ''میں ایسے موقعوں پر اپنے مریضوں کو تنہا چھوڑ دیتا ہوں تاکہ وہ ٹھیک سے اپنے نقوش کا جائزہ لے سکیں۔ تمہیں بھی ابھی بہت جائزہ لینا ہے۔''

جینی اپنے عکس کو بدستور گھورتی رہی۔ وہ ایک بار پھر سوچ رہی تھی کہ دو چار ہفتوں کے بعد وہ کیسی لگے گی۔ ایک انتہائی حسین و جمیل اور پُرکشش دوشیزہ...... یہ شخص ڈاکٹر سے کہیں بڑھ کر تھا۔ یہ ایک فن کار تھا، گوشت اور ہڈیوں کا نقاش تھا، ایک ایسا نقاش جو یکسر نئے نقوش تراش سکتا تھا، ایک نیا روپ تخلیق کر سکتا تھا، ایک نئی صورت عطا کر سکتا تھا۔ وہ چہرہ تراش تھا...... چہرہ ساز تھا۔

☆☆☆

شائیگان اسپتال کے دوسرے حصے میں میڈاس نے اپنے تینوں سیکریٹریز کو ہدایت کی کہ وہ اس کی ہر کال کو ہولڈ کریں اور اپنے دفتر میں داخل ہو کر سیاہ رنگ کی ایک بڑی سی کرسی پر بیٹھ گیا اور کرسی آگے گھسیٹ کر جینی جرچل کی فائل کھول لی۔ اس کے سینے سے ایک گہری سانس خارج ہو گئی۔ اس نے فائل میں سے اس کا اسکیچ نکال لیا جو خود اسی نے بنایا تھا۔ جیسی کہ وہ فائنل سرجری کے بعد نظر آتی۔

[illegible]

”میرے خیال میں ہم کامیاب رہے۔“ چند لمحوں بعد اس نے اپنے سیکریٹریز کو مطلع کیا کہ وہ کیمرے کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ اس نے دنیا بھر کے پلاسٹک سرجنز کے استعمال کے لیے ویڈیو کیسٹ تیار کیے تھے۔ یہی نہیں بلکہ ان میں پلاسٹک سرجری کا مکمل کورس بھی منتقل کر دیا تھا، جو ان کیسٹوں کے ذریعے مکمل کرایا جا سکتا تھا۔ یہ اپنی تشہیر کا سامان کرنے اور اس فن کے عظیم استاد کی حیثیت سے نہایت موثر طریقے سے متعارف کرانے کا ایک طریقہ تھا۔ اس نے ویڈیو کے آلات کو آن کیا، ایک نیا کیسٹ نکالا اور اپنا کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ اپنے دل کی دھڑکن جو کہ تیز ہوتی جا رہی تھی اور اپنی اندرونی پُرجوش کیفیت کو بخوبی محسوس کر سکتا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔

”خواتین و حضرات۔“ وہ کسی تصنع یا بناوٹ کے بغیر گویا ہوا جو عموماً اس کی گفتگو کا خاصہ ہوا کرتی تھی۔ ”ڈاکٹر میڈاس آپ سے مخاطب ہے۔ یہ کیسٹ میرے درس کی قسط کا کوئی حصہ نہیں۔ گو کہ میں اسے سب سے پیچیدہ درس تصور کرتا ہوں، جو میں آپ کو دینے والا ہوں۔ آپ اسے میری موت کے بعد ہی دیکھ سکیں گے۔ دراصل میرا منشا بھی یہی ہے۔ میں مخصوص نوعیت کی کیسٹس تیار کر کے کسی والٹ میں اس ہدایت کے ساتھ محفوظ کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ میرے مرنے کے بعد ہی دیکھے جائیں۔“ اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور اپنی سانس درست کر کے دوبارہ گویا ہوا۔

”میں نے پلاسٹک سرجری کے فن اور سائنس کی ترقی کے لیے بعض مخصوص اقدام کیے ہیں۔ ان میں سے کچھ آپ کو بے سکون کر سکتے ہیں۔ لیکن کسی بھی شعبے میں کسی کام کے آغاز میں دقیانوسی اور فرسودہ طریقۂ کار کو ترک کر کے انقلابی طریقۂ کار اپنایا جا سکتا ہے۔“ اس نے ذرا سستانے کی غرض سے اپنا دایاں ہاتھ پتلون کی جیب میں ٹھونس لیا۔ ”میں آپ کو ایک طبی معجزے کی بابت بتاتا ہوں۔ اس مریضہ کا نام جینی چرچل ہے اور میں یہ پیشگوئی کرتا ہوں کہ اس کا چہرہ، وہ چہرہ، جو میں نے تخلیق کیا ہے پچانوے کے عشرے کا چہرہ ہو گا۔ یہ رسالوں کے سرورق اور فلموں میں جلوہ گر ہو گا۔ مارلن منرو، گریٹا گاربو اور الزبتھ ٹیلر کی طرح اس کی پرستش کی جائے گی۔ اسے آئیڈیل بنایا جائے گا۔ میں نے یہ ثابت کیا ہے کہ ایک پلاسٹک سرجن بھی مائیکل اینجلو کے پائے کا شاہکار تخلیق کر سکتا ہے اور کسی بھی چہرے کو لافانی بنا سکتا ہے۔

☆☆☆

جینی چرچل کی تنہائی کے چند لمحے ہی گزرے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا اور اس کے لب از خود مسکرا دیے۔ کھلے دروازے پر اس کا ایڈیٹر جیکسن کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ”جیکسن، تمہیں دیکھ کر خوشی ہوئی۔“ وہ بولی۔

جیکسن اندر آنے کے بجائے دروازے سے ٹیک لگا کر اسے تکنے لگا۔ وہ چھریرے بدن کا مالک تھا۔ عمر تقریباً چالیس سال کے لگ بھگ ہو گی۔ ایک مقبول فلمسٹار سے مشابہت رکھتا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر تبسم گویا منجمد ہو گیا تھا اور وہ توصیفی انداز میں دھیرے دھیرے اپنا سر ہلائے جا رہا تھا۔ ”بہت خوب!“ یکایک وہ بول پڑا۔ ”بہت ہی خوب...... جواب نہیں۔“

”شکریہ۔“ جینی شرما گئی۔ ”میں نہیں جانتی تھی کہ تم سوجن اور زخموں کے نشانات پر جان دیتے ہو۔“

جیکسن بدستور اپنی جگہ کھڑا رہا۔ ”ہاں میرے جذبات برانگیختہ ہو جاتے ہیں ایمان سے...... کتنا خرچہ ہوا؟“

”اب رہنے بھی دو۔“

”کتنا خرچ ہوا؟“

”تم یہی پوچھنے آئے تھے؟ ابھی میری گردن سے اوپر کی ہر شے کی ڈھنگ، پینٹنگ کی گئی ہے۔ میں نے نیا جنم لیا ہے اور تم خرچے کا پوچھ رہے ہو؟“

”سنا ہے ناروے میں ایک نیا چوکھٹا بنانے کے دس ہزار دس سو دس ڈالر لگتے ہیں۔ تمہارا کتنا خرچہ ہوا؟“

”جیکسن یہ بہت ہی سیریس معاملہ تھا۔“

”تو کیا مفت میں بن گیا؟“

”اندر تو آؤ۔ تم تو مجھے بوکھلائے دے رہے ہو؟“

وہ ہنستا ہوا، دونوں بازو پھیلائے، یوں اکڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا گویا وہ کمرا اسی کا ہو۔ ”تم تو قیامت ڈھا رہی ہو۔“ جیکسن نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بھینچ لیا۔ ”کیا روپ نکالا ہے۔ لو، چاکلیٹ کھاؤ۔“ اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے مٹھی بھر چاکلیٹ نکالے۔

”میں نہیں کھاتی، چاکلیٹ۔“

”اچھا، جیسی تمہاری مرضی۔“ اس نے شانے اچکائے اور چاکلیٹ جیب میں ڈال لیے۔ وہ کسی پہلو سے بھی ایڈیٹر انچیف نہیں لگتا تھا۔ وہ بروشر لائن میں رہتا تھا اور

ٹھیک پانچ بجے دفتر سے گھر روانہ ہو جاتا تھا۔ اسے دفتری اوقات کے بعد صحافت کا شیشہ دستور سخت ناپسند تھا۔ وہ حتی الامکان اس سے گریز کرتا تھا۔ عموماً بس یا زمین دوز ٹرین سے سفر کرتا تھا۔ چاکلیٹ خوب شوق سے کھاتا تھا۔ لباس کے معاملے میں وہ بے حد بدذوق واقع ہوا تھا۔ اس کے سوٹ اترن کے معلوم ہوتے تھے۔ قمیصوں پر کبھی استری نہیں ہوتی تھی۔ جوتے بھیک مانگتے ہوئے لگتے تھے۔ رسالے کے اسٹاف میں سے کچھ لوگ اس سے گھبراتے تھے، لیکن اسے اس کا مکمل شعور تھا کہ قارئین کیا پسند کرتے ہیں اور وہ ان کے معیار پر پورا اترتا تھا۔ جینی اس بات سے بخوبی واقف تھی کہ اسے آنے والے کل کی کوئی فکر نہیں ہوتی تھی۔ وہ اپنی ذات کی طرف سے بالکل بے پروا تھا مگر رسالے کی طرف سے اتنا ہی فکرمند۔ وہ ان لوگوں کے بارے میں سوچتا تھا جو اس کے میگزین کو یا ان مصنوعات کو، جن کے اشتہارات شائع ہوتے تھے، خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔

وہ ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ ’’کہو، یہ لوگ تمہیں اس بیوٹی پارلر سے کب آزاد کر رہے ہیں؟‘‘

’’تقریباً دس دن بعد۔‘‘ جینی نے جواب دیا۔

’’خوب...... ہم جشن منائیں گے۔ پارٹی دیں گے۔ میرے پاس تمہارے لیے بہت کام ہے۔‘‘

’’زبردست۔‘‘ جینی چہکی۔ ’’مجھ سے صبر نہیں ہو رہا۔ تم تو جانتے ہی ہو، مجھے مصروف رہنے کا بہانہ چاہیے۔‘‘

’’میں جانتا ہوں، تم کیا کرو گی۔‘‘ وہ شرارت سے مسکرایا۔ ’’اداریے میں اپنی جگہ کو ڈاکٹر میڈاس کے نام، اپنے محبت ناموں سے بھرتی رہوں گی۔‘‘

’’تمہاری سوچ منفی ہے۔‘‘

’’میری سوچ اور منفی؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو بڑا خوب صورت آئیڈیا ہے۔ اصل میں، میں اس بات سے بہت خوش ہوں کہ میں نے قلم والوں اور کتاب والوں سے رابطہ قائم کر لیا ہے۔‘‘

’’کیا؟‘‘ جینی بھونچکا رہ گئی۔ وہ ایک باصلاحیت اور قابل رپورٹر ضرور تھی لیکن جیکسن نے کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس نے کبھی نوٹس ہی نہیں لیا تھا کہ وہ کیا لکھتی تھی۔ لیکن آج وہ اسے ایک کتاب لکھنے کی دعوت دے رہا تھا۔

’’لوگ دلچسپی لے رہے ہیں، جینی۔‘‘ وہ بولا۔ ’’تمہارے پاس ایک زبردست کہانی ہے۔ صرف ڈاکٹر میڈاس ہی نہیں، اپنی کہانی بھی۔ میں نہیں سمجھتا کہ کہیں اس کا ادراک ہوا ہوگا۔ تم مجھے فون پر سناتی رہی ہو کہ ڈاکٹر میڈاس کتنا عظیم انسان ہے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو۔ ہے نا؟‘‘

’’تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟‘‘ جینی پوچھ بیٹھی۔

’’جب تم اس زنداں سے پیرول پر رہا ہو جاؤ تو میں چاہتا ہوں کہ اپنے تجربات پر مشتمل ایک زبردست قسط اور مضمون رقم کر دو۔ ایک طرح کی رہنما تحریر...... اور اگر دلچسپ ہو تو اسے کتابی شکل میں پیش کرو۔ منی سیریل سے بھی کام چل سکتا ہے۔‘‘

وہ ایک گھنٹے تک اس کے پاس بیٹھا اس سے گپ شپ کرتا رہا اور پھر رخصت ہو گیا۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن اس سے ملنے آتا تھا۔ اگلی دفعہ آیا تو اس کے جسم پر ٹاپ کوٹ، سر پر پندرہ سالہ پرانا ہیٹ جسے صرف دو بار صاف کیا گیا ہوگا، ایک ہاتھ میں بریف کیس اور دوسرے ہاتھ میں گلدستہ تھا۔ اس نے داخل ہونے سے پہلے دروازے پر رک کر دستک دی۔

’’آؤ جیکسن۔‘‘ جینی نے نیویارک ٹائم میگزین ایک طرف رکھتے ہوئے کہا، جس کا وہ مطالعہ کر رہی تھی۔ جیکسن نے اندر داخل ہو کر بریف کیس فرش پر اور گلدستہ میز پر رکھ دیا۔

’’پھول ماحول کو رنگین بنانے میں بہت مددگار ثابت ہوتے ہیں۔‘‘ وہ بولا۔

’’شکریہ۔‘‘ جینی مسکرائی۔ ’’لیکن یہ بات اچھی نہیں ہے کہ تم جب بھی آتے ہو میرے لیے بہت مہنگے پھول لے کر آتے ہو۔‘‘

’’دفتر کے بجٹ سے خریدتا ہوں۔‘‘ اس نے جواب دیا۔

جینی جانتی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے لیکن اسے جھوٹ بولنا ہی تھا۔ وہ دل کی بات کہنے سے ہمیشہ گریز کرتا آیا تھا۔ ’’آج خلافِ معمول بریف کیس اٹھائے پھر رہے ہو۔‘‘ جینی بولی۔ ’’کہیں اس میں بم وغیرہ تو نہیں؟‘‘ اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

’’کہہ نہیں سکتا۔‘‘ اس نے شانے اچکائے۔ ’’ممکن ہے، ہو۔‘‘

جینی نے اسے تجسس بھری نظروں سے دیکھا۔ ’’کیا مطلب؟‘‘

وہ ایک لمحے کے لیے ہچکچایا، پھر ایک گہری سانس

سے کر بولا۔ "میں نے تمہاری کتاب کے لیے ڈاکٹر میڈاس پر تھوڑی بہت ریسرچ کی ہے، معاملہ خاصا دلچسپ ہے۔ واقعی دلچسپ ہے، ممکن ہے تمہاری کتاب کو کوئی انعام وغیرہ بھی مل جائے۔ تمہارا مسیحا 'ڈاکٹر میڈاس' تمہارے تصور سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔"

"تمہارا ایک لفظ بھی میرے پلے نہیں پڑ رہا۔" جینی الجھن آمیز لہجے میں بول پڑی۔ "جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، میڈاس، دنیا کا سب سے معزز پلاسٹک سرجن ہے۔ تم مجھے کیا بتانے کی کوشش کر رہے ہو؟ کیا کوئی غلط بات ہوئی ہے؟"

"مجھے یہ کہنے دو کہ یہ شخص محض ایک انسان ہے۔ خدا نہیں۔" جیکسن نے جواب دیا۔ "میں پھر بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اس نے کچھ ایسے کام کیے ہیں جو کبھی منظرِ عام پر نہ آسکے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے بڑی جدوجہد کے بعد اپنا مقام بنایا ہے، میں اس کی عظمت کو سلام کرتا ہوں۔ اس نے جو کچھ بھی کیا، خود کیا، کسی کا سہارا نہیں لیا اور یہ واقعی اچھا کام کرتا ہے لیکن اس نے نشتر تھامنے کے علاوہ بھی کچھ کیا ہے اور بس، اتنی سی بات ہے۔"

"میں سننا چاہتی ہوں۔"

جیکسن نے مزید ایک لفظ کہے بغیر اپنا بریف کیس فرش سے اٹھا کر گود میں رکھ لیا۔ "آرنی میگلے......!" وہ گویا ہوا۔

"میگلے؟" جینی بیچ میں بول پڑی۔ "یہ میگلے کیا بلا ہے؟"

"میگلے ایک بچے کا نام ہے، جو فلاڈیلفیا میں پروان چڑھا اور پلاسٹک سرجن بن گیا۔ اس کا باپ ایک سبزی فروش تھا۔" جیکسن نے انکشاف کیا۔

"سبزی فروش؟ لیکن سبزی فروش ہونے میں کیا برائی ہے؟" جینی نے کہا۔ "ویسے میں تو یہ سمجھ رہی تھی کہ اس کا تعلق کسی شاہی خاندان سے ہوگا، اس کے اندازِ گفتگو سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔"

"اس کا محل، تین کمروں پر مشتمل ایک اپارٹمنٹ تھا۔ اس کی پوری تعلیم ہی وظیفے پر ہوئی ہے۔ ایک دلچسپ بات بتاؤں۔ اس نے ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ میرا مطلب ہے اسکول میں چند مقابلے آرٹ کے اس نے جیتے تھے اور اسے آرٹ کالج میں داخلہ مل گیا تھا۔ وہاں اس نے مجسمہ سازی شروع کر دی لیکن کامیاب نہ ہو سکا اور ان لوگوں نے اسے نکال باہر کیا۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ ان کے خیال میں وہ اپنا وقت ضائع کر رہا تھا۔ میں نے اپنے ایک صحافی کو اس کے اسکول کے پرانے ساتھیوں کا انٹرویو لینے کے لیے بھیجا تھا۔ ان کے بیان کے مطابق، وہ ایک ناکارہ لڑکا تھا۔ اس کے اندر کوئی صلاحیت نہیں تھی۔ پھر اس نے پانچ سالہ میڈیکل کورس میں داخلہ لے لیا۔ دو سال کالج میں اور تین سال میڈیکل اسکول میں۔ لیکن اس کے باوجود وہ مجسمہ سازی کرتا رہا۔ ایک مرتبہ بالٹی مور میں اس نے فٹ پاتھ پر ہونے والی آرٹ کی نمائش میں اپنے چند شاہکار رکھے۔ ادھر سے گزرنے والے کسی ناقد نے اس کے شاہکاروں کے بارے میں کچھ کہہ دیا جس پر اس نے مشتعل ہو کر اس پر گھونسوں کی بارش کر دی اور جیل کی ہوا کھائی۔"

"اور آج اسی شخص کے ہاتھوں کا ایک ملین ڈالر کا بیمہ ہے۔" جینی بول پڑی۔

"بے شک۔" جیکسن نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اس نے میڈیکل اسکول میں تین سال کی آزمائشی مدت گزاری اور ایک ماہ کے لیے معطل بھی کیا گیا۔ لیکن بالآخر کسی نہ کسی طرح گریجویشن مکمل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر ساؤتھ امریکا میں کہیں پلاسٹک سرجری کی تربیت حاصل کی۔ میری تفتیش کا دامن بس اتنا ہی وسیع ہے۔ میں یہ نہیں جانتا کہ اس نے اپنا نیا نام کیسے اختیار کیا اور عجیب و غریب باتیں کرنی کہاں سے سیکھیں۔"

جینی چرچل نیم دراز ہو گئی۔ وہ جیکسن کی اطلاعات کو ہضم کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن میڈاس کے بارے میں اس کی رائے بدلی نہیں تھی۔ اس نے خود اپنے کیس میں اس شخص کی فنکارانہ صلاحیت اور مہارت دیکھی تھی، تاہم اسے توقع نہیں تھی کہ اس ماہر سرجن کا ماضی ایسا ہوگا۔ یہ سوچتے ہوئے عجیب سا لگ رہا تھا کہ میڈاس درحقیقت آرنی میگلے تھا اور اس کا ماضی اتنا ہنگامہ خیز تھا۔ "یہ سب کچھ بہت دلچسپ ہے، جیکسن۔" وہ بولی۔ "پھر بھی وہ بہت عظیم سرجن ہے۔"

"بے شک۔" جیکسن نے اتفاق کیا۔ "اور یہی شے اسے دلچسپ بناتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس کا انٹرویو لو اور اس کے ماضی سے متعلق اس سے چند سوالات کرو۔ اس کا ماضی بہت عجیب ہے لیکن کسی کے ماضی کا عجیب ہونا خلافِ قانون نہیں۔"

☆☆☆

جینی چرچل دس ستمبر کو اسپتال سے ریلیز کر دی گئی۔ اسپتال کے باہر ٹیکسی پکڑتے ہوئے اس نے غور نہیں کیا کہ سڑک کے اس پار ایک عورت کھڑی تھی جس کے چہرے پر اسے دیکھتے ہی زلزلے کے سے آثار نمودار ہوئے تھے۔ وہ گویا اپنی جگہ شل سی ہو گئی تھی۔ جینی کو گھر پہنچنے کی جلدی تھی اس لیے وہ اس پر دھیان دیے بغیر ٹیکسی پر سوار ہو گئی۔ ''اَتی کولمبس۔'' اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا اور ٹیکسی چل پڑی۔ مشرق کی طرف رواں جینی، اچانک بے اطمینانی کا شکار ہو گئی۔ اس نے سفر کے آغاز میں دائیں عقب نما آئینے میں ایک نگاہ ڈالی تھی اور اپنے پیچھے ایک ٹیکسی کو آتے دیکھا تھا، وہ ٹیکسی اب بھی اس کا تعاقب کر رہی تھی اور اس میں وہ عورت موجود تھی...... لیکن کیوں؟

اپنی منزل پر پہنچ کر اس نے کرایہ ادا کیا اور اتر گئی۔ اچانک وہی ٹیکسی تیزی سے آ کر اس کے پیچھے رک گئی۔ اس کے پہیے چیخ اٹھے۔ اس کا عقبی دروازہ ایک جھٹکے سے پورا کھل گیا۔ تقریباً ساٹھ سال کی ایک عورت اندر سے اچھل کر برآمد ہوئی۔ ''پلیز۔'' وہ جینی کی طرف دیکھ کر چیخی۔ ''مجھ سے مت بھاگو۔''

جینی گھبرا کر اپنی جگہ منجمد ہو گئی۔ کیا یہ کوئی پاگل تھی؟

وہ عورت اس کی جانب لپکی۔ ''اینی...... میری اینی......'' وہ چیخی۔ وہ جینی سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''اینی میری بچی، تم کہاں چلی گئی تھیں؟ تم ہمیں کیوں چھوڑ گئیں؟ تمہارے ڈیڈی...... کیا تم نے ان کے بارے میں کچھ سنا؟''

جینی اپنی جگہ ہکا بکا کھڑی تھی۔

''اینی مجھ سے بات کرو۔'' وہ عورت چیخی۔ اس کی کیفیت ہیجانی تھی۔ ''میں ایک سال سے بھی زیادہ مدت سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ میں اس اسپتال کے باہر تمہارا انتظار کرتی رہی ہوں۔ میں جانتی تھی کہ تم وہاں واپس جاؤ گی، جہاں وہ ہے۔''

معلوم ہوتا تھا، اس عورت کو جینی پر کسی اور کا شبہ ہو گیا ہے۔ جینی نے اسے نرمی سے خود سے جدا کیا۔ ''مادام!'' وہ ملائمت سے بولی۔ ''میرے خیال میں تمہیں کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ پلیز مادام۔''

''ایسی باتیں مت کرو۔'' عورت نے التجا کی۔ ''تم میری اینی ہو۔ مجھ سے مذاق مت کرو۔''

''میں مذاق نہیں کر رہی۔'' جینی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میرا نام جینی چرچل ہے۔''

''نہیں، نہیں۔'' وہ عورت روتے ہوئے چلائی۔ ''کیا میں اپنی بیٹی کو نہیں پہچانتی؟ تم میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہو؟''

''میں اینی نہیں ہوں۔'' جینی نے جواب دیا۔ ''دیکھو...... اچھا سنو، میرے گھر چلو، ہم لابی میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

'خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کرو۔' جینی نے دل میں کہا۔ 'یہ ایک غمزدہ ماں ہے' یہ سوچنے کی کوشش کرو کہ وہ کس قسم کے احساسات سے گزر رہی ہے۔ شاید اسے مجھ پر اپنی بیٹی کا دھوکا ہو رہا ہو یا پھر یہ کسی خوش فہمی میں مبتلا ہے۔ دونوں ہی باتیں ہو سکتی ہیں۔'

''میں تمہیں مایوس کرنا نہیں چاہتی۔'' اس نے عورت سے کہا۔ ''میں یقیناً تمہاری بیٹی اینی سے مشابہ ہوں گی۔ مجھے یقین ہے لیکن میں وہ نہیں ہوں۔ اگر تم میری سنو تو تمہیں ادراک ہو جائے گا کہ میں اس سے بے حد مختلف ہوں۔''

عورت کے چہرے سے خوف جھانکنے لگا۔ ''تم جھوٹ بول رہی ہو۔'' اس نے تیز سرگوشی کی۔ ''تم ذہنی مریض ہو۔ تم جھوٹ بول رہی ہو۔''

''نہیں، میں ہر طرح سے بالکل صحت مند ہوں۔'' جینی نے جواب دیا۔ ''میں جھوٹ نہیں بول رہی۔ میں تمہاری بیٹی کا سراغ لگانے میں تمہاری مدد بھی کروں گی۔''

عورت اسے ایک ٹک تکتی چلی گئی۔ اس کے رویں رویں سے گہرا کرب ٹپکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ''اپنا منہ کھولو۔'' وہ بولی۔

جینی فوراً سمجھ گئی کہ اس کا مقصد کیا تھا۔ اس نے اپنا منہ کھول دیا۔

''اور کھولو۔''

اس نے منہ اور بھی کھول دیا۔

عورت نے آگے بڑھ کر جائزہ لیا اور خوف زدہ نظر آنے لگی۔ ''روشنی کی طرف رخ کرو۔''

جینی نے تعمیل کی۔

عورت نے مزید جائزہ لیا اور پھر گہری مایوسی سے اپنا سر جھکا لیا۔ ''یہ اینی نہیں ہے۔'' وہ خودکلامی کے انداز میں بولی۔ ''میری بیٹی کا ایک نچلا دانت نہیں تھا۔''

جینی نے نرمی سے اس کا بازو تھام لیا۔ اسے اس دکھیاری ماں پر بے حد ترس آ رہا تھا۔ ''میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا۔'' وہ ملائمت سے بولی۔ ''اب تم مجھے اپنی بیٹی کے

بارے میں بتاؤ...... آخر یہ سب کیا ہے؟"

عورت جینی کی جانب مڑی اور اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ وہ بھی تذبذب کا شکار تھی۔ "یہ ایک دردناک کہانی ہے۔" وہ بولی۔

"ہاں ہوگی۔ مجھے یقین ہے۔" جینی نے کہا۔ "کیا تمہاری بیٹی گھر سے بھاگ گئی تھی؟ تم کہہ رہی تھیں کہ تمہیں یقین تھا وہ شایگان اسپتال لوٹے گی، جہاں کوئی کام کرتا ہے۔ کون ہے وہ؟"

عورت نے ایک گہری سانس لی۔ "ڈاکٹر میڈاس۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا؟" جینی کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے سر پر کوئی ہتھوڑا دے مارا ہو۔ "میں سمجھی نہیں۔" جینی کی آواز میں لرزش تھی۔

"وہ ایمی کا پلاسٹک سرجن تھا۔" عورت نے جواب دیا۔ "ایمی کارل کا...... ہم کیلی فورنیا کے مقام پروزک کے رہنے والے ہیں۔ میرا نام جوزا رینڈل ہے۔ تم مجھے اسی نام سے پکار سکتی ہو۔ آج سے دو سال پہلے میری بیٹی کا ایک کار حادثے میں چہرہ بری طرح مسخ ہوگیا تھا۔ اسے کسی معجزے کی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر میڈاس نے نہایت خوبی سے اس کی شکل بالکل بدل دی۔ وہ بے حد حسین ہو گئی۔ ایک منٹ......!" اس نے اپنا پرس کھول لیا اور اندر سے ایک تصویر نکال لی۔

جینی نے تصویر کی طرف دیکھا اور فرطِ حیرت سے اس کا منہ کھل گیا۔ "میرے خدا۔" اس نے ایک الجھی الجھی سی سانس لی۔ "یہ...... یہ......!"

"تم ہو۔" عورت بول پڑی۔

"یہ مجھ سے بے حد مشابہ ہے۔" جینی نے تسلیم کیا۔ "لیکن میں سمجھی نہیں۔ میرا مطلب ہے...... میڈاس میرا بھی سرجن تھا۔ میرے ساتھ بھی حادثہ پیش آیا تھا۔ میرا چہرہ بھی مسخ ہوگیا تھا۔ مجھے بھی اس نے ایک نیا روپ دیا ہے۔ میں سمجھ رہی تھی کہ یہ روپ منفرد ہے لیکن وہ یہ کیا کررہا ہے؟"

"میں بھی یہی جاننا چاہتی ہوں۔" جوزا رینڈل بولی۔

"مجھے ایمی کے بارے میں مزید کچھ بتاؤ۔" جینی چرچل نے اصرار کیا۔

"اس کی سرجری مکمل ہوگئی تھی۔" جوزا نے کہنا شروع کیا۔ "لیکن میڈاس جب بھی لاس اینجلس آتا تھا، ایمی کو اس سے ملنا پڑتا تھا۔ پھر ایک دن...... اس نے مجھے بتایا کہ وہ میڈاس کے بارے میں سب کچھ جان گئی ہے۔ اس کے اپنے ریکارڈ میں کوئی ایسی بات تھی کہ وہ بوکھلا گئی تھی۔ اس نے بتایا کہ ایک شے نے اسے پریشان کررکھا ہے۔"

"کون سی شے؟"

"اس نے یہ نہیں بتایا۔"

"کوئی اشارہ بھی نہیں دیا؟"

"نہیں، لیکن وہ میڈاس سے ملتی رہی اور پھر ایک روز...... وہ غائب ہوگئی۔"

"وہ اچانک غائب ہوگئی؟"

"ہاں، نہایت غیر متوقع طور پر غائب ہوگئی۔" جوزا نے جواب دیا۔ "رات کا وقت تھا۔ وہ دفتر سے کام کر کے نکلی اور پھر کسی کو بھی نظر نہیں آئی۔ اس کی کار ایک پارکنگ لاٹ میں نظر آئی۔ پولیس اس واقعے کی تفتیش کررہی ہے۔"

"مجھے یہ سن کر بے حد افسوس ہوا۔" جینی نے تاسف سے کہا۔

جوزا رینڈل ایک بار پھر سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لینے لگی۔ "وہی روپ، وہی رنگ، وہی جسامت، وہی سراپا۔" وہ یاس انگیز لہجے میں بولی۔ "سب کچھ وہی ہے، بالکل وہی۔"

جینی چرچل کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ کیا وہ ایمی کا دوسرا روپ ہے؟ ڈاکٹر میڈاس نے اسے ایمی کے نقوش کیوں دیے؟ کیا وہ عورتوں کی ڈپلی کیٹ تیار کررہا تھا؟ لیکن کیوں؟ اور پھر ایمی کا کیا بنا؟ اسے کیا حادثہ پیش آیا؟ "میں جانتی ہوں کہ ذہن اس بات کو آسانی سے تسلیم نہیں کرتا۔" وہ بولی۔ "لیکن کیا تمہیں کوئی اندازہ ہے کہ تمہاری بیٹی کو کیا ہوا؟"

"نہیں۔" جوزا رینڈل نے ایک گہری سانس لی۔ "ڈاکٹر میڈاس نے مجھ سے کہا کہ ممکن ہے وہ کہیں بھاگ گئی ہو۔ اس کے بیان کے مطابق، کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعض عورتیں پلاسٹک سرجری کروانے کے بعد ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہتی ہیں لیکن میری ایمی کے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ ہم سے بہت قریب تھی۔ ہمارے ساتھ ہی رہتی تھی۔ ہمارا ایک کنبہ تھا۔ تاہم میں یہ سوچتی رہتی ہوں، ممکن ہے وہ ذہنی الجھن کا شکار ہو گئی ہو۔ جبھی میں یہاں آئی تھی۔"

"اوہ۔" جینی کے منہ سے نکلا۔

"آج اس کی سرجری کی سالگرہ تھی۔" جوزا دوبارہ گویا ہوئی۔ "چنانچہ میں نے سوچا ہوسکتا ہے وہ شایگان

اسپتال آئے، جہاں ڈاکٹر میڈ اس کام کرتا ہے۔ شاید وہ اس سے ملنے کی کوشش کرے۔''

''میں سمجھ رہی ہوں۔''

''شاید تم یہ سوچو کہ میں کوئی دیوانی ہوں۔''

''نہیں، تم ایک بہت ہی اچھی ماں ہو۔'' جینی نے خلوص سے کہا۔ ''لیکن معاملہ گڑبڑ ہے۔ کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہے اور میں اس کا سراغ لگا کر رہوں گی۔''

''میں ہر طرح سے تعاون کروں گی تم سے۔'' جوزا دوبارہ گویا ہوئی۔ ''میں تمہیں اپنی بیٹی ہی کی طرح سمجھتی ہوں۔ تم میرے لیے اپنی ہو۔ کیا تم میرے گھر آؤ گی؟ ''اینی کی ساری چیزیں جوں کی توں پڑی ہیں، ان کی چھان بین کرو۔''

''میں ضرور پروزک آؤں گی۔ اب پلیز ذرا اوپر آؤ۔''

''نہیں، اب میں پروزک جاؤں گی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔ میں اپنا نمبر تمہیں دے دیتی ہوں لیکن جلد از جلد آنے کی کوشش کرنا۔''

''میں تمہارے جذبات کو سمجھ رہی ہوں۔'' جینی نے متانت سے کہا۔ ''پلیز، تم اپنا نمبر چھوڑ جاؤ۔ میں تم سے رابطہ قائم کروں گی۔''

☆☆☆

جوزا ایک ٹیکسی پکڑ کر فوراً رخصت ہوگئی۔ اب جینی نے محسوس کیا کہ یہ سب سن کر اس کے ذہن کو کتنا شدید جھٹکا لگا تھا۔ وہ ماہر سرجن، جسے وہ ایک ہیرو سمجھ رہی تھی، اب اسے کوئی درندہ لگ رہا تھا۔ وہ ایک جعلساز اور دھوکے باز سرجن تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اسے جیکسن سے بات کرنی چاہیے۔ جیکسن فلاڈیلفیا میں تھا لیکن اس سے کسی بھی وقت رابطہ کیا جاسکتا تھا۔ جینی نے اپنے رسالے کی آپریٹر سے رابطہ کیا اور فوراً جیکسن سے بات کرانے کی ہدایت کی۔

''ایک منٹ۔'' آپریٹر نے جواب دیا۔ اس کے صرف تین منٹ بعد اس کے کانوں میں جیکسن کی آواز ٹکرائی۔

''جینی؟'' دوسری طرف ٹریفک کا بہت شور تھا۔ جینی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کسی ٹیلی فون بوتھ سے بول رہا تھا۔

''جیکسن، تمہاری آواز سن کر بہت خوشی ہوئی۔''

''یہ تو خاصی خوش آئند بات ہے۔'' وہ بولا۔ ''سنا ہے کہ معاملے کی نوعیت سنگین ہے، بات کیا ہے؟''

''جیکسن! میرے خیال میں ڈاکٹر میڈ اس نے مجھے ایک دوسری لڑکی کی شکل دے دی ہے۔''

''کیا کہا؟ پھر سے کہنا۔'' جیکسن بولا۔

''غور سے سنو۔'' وہ بولی اور پھر اس نے جوزا رینڈل سے اپنی ملاقات اور اس سے ہونے والی ساری باتیں دہرا دیں۔ ''اس نے مجھے ایک تصویر بھی دکھائی۔ جیکسن، وہ میری تصویر تھی۔''

''یہ تمہارا وہم ہے۔'' جیکسن نے تبصرہ کیا۔

''نہیں، وہم ہرگز نہیں۔ تم کیسی باتیں کر رہے ہو، تصویر خود میں نے دیکھی ہے۔''

''کیا تم ادویات استعمال کر رہی ہو؟''

''نہیں، بالکل نہیں۔''

''ممکن ہے مشابہت ہو۔''

''اگر تم یہاں ہوتے تو ایسی باتیں نہ کرتے۔ میڈ اس نے مجھے ایک دوسری لڑکی کی شکل دے دی ہے۔''

''وہ لڑکی کہاں ہے؟''

''لاپتا ہے۔''

''کیا؟''

''ہاں جیکسن، وہ لڑکی لاپتا ہے۔''

''خدا کی پناہ!'' اس طرح معاملے کی نوعیت اور سنگین ہوجاتی ہے، کیوں؟''

''یہ سب کچھ مجھے کسی دیوانے کا خواب لگ رہا ہے۔ میں نے اس سے پہلے کبھی رپورٹرز کو مشابہت کے چکر میں غلط راہ پر لگتے نہیں دیکھا۔ یا تو ڈاکٹر میڈ اس نے میڈیکل کی تاریخ میں ایک انتہائی دہشت ناک جرم کا ارتکاب کیا ہے یا پھر تم اپنی اہمیت جتانے کے لیے ضرورت سے زیادہ لن ترانیاں کر رہی ہو۔''

''نہیں جیکسن، میں لن ترانیاں نہیں کر رہی۔''

''پھر یہ کوئی کہانی ہوگی۔''

''تم کسی کہانی کے بارے میں سوچ رہے ہو؟'' جینی نے احتجاج کیا۔

''نہ سوچوں تو ایڈیٹر نہیں۔'' وہ بولا۔ ''دیکھو، میں سب سے پہلے تمہارے متعلق سوچتا ہوں لیکن اگر تمہاری باتیں سچ ہیں تو یہ ایک زبردست کہانی ہے۔ میرا مطلب ہے یہ ڈاکٹر، یہ دیوتا سمان ڈاکٹر کثیر تعداد میں چہرے بنا رہا ہے۔''

''ہاں، ہاں، اب میں سمجھ گئی تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ یہ ایک کہانی ہے۔'' جینی نے اتفاق کیا۔ ''اور یہ سچ ہے۔''

سونی، یہ باتیں اب ہمیں بھی بے حد عجیب لگ رہی ہیں لیکن ہم مل کر اس پر کام کریں گے اور اس بات کا سراغ لگالیں گے کہ پس پردہ کیا ہو رہا ہے یا نہیں ہو رہا ہے۔"

"تمہارا بہت بہت شکریہ جیکسن۔" وہ بولی۔

دونوں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ جینی نے جیکسن کے لہجے میں شک کو محسوس کیا تھا لیکن وہ اس شک کا احترام کرتی تھی۔ ممکن ہے، وہ خود غلطی پر ہو۔ یہ ایک ناقابلِ یقین واقعہ تھا اور اس قسم کے واقعات عموماً منظرِ عام پر نہیں آتے۔ جینی کی نظر میں یہ واقعہ ایک کہانی سے بڑھ کر تھا۔ اسے اس واقعے میں اس وقت تک گھسیٹا جاتا رہے گا، جب تک حقیقت کا علم نہیں ہوتا۔

☆☆☆

ڈاکٹر میڈ اس کا دھیان اپنے کام میں نہیں تھا۔ وہ اپنی مریضہ، نیویارک کے ایک اسکول کی پچاس سالہ پرنسپل پر جھکا ہوا تھا جو اپنے نقوش درست کرنا اور چہرے کی جھریاں مٹانا چاہتی تھی۔ لیکن میڈ اس، جینی کے بارے میں سوچ رہا تھا اور زیادہ سے زیادہ اس امر کا قائل ہوتا جا رہا تھا کہ اس کا اور جینی کا مستقبل بہت بُری طرح ایک دوسرے سے اُلجھ کر مربوط ہو گیا ہے۔ اپنے کام سے فارغ ہو کر وہ تیزی سے اپنے دفتر سے ملحق کمرے میں داخل ہو گیا جسے ٹی وی اسٹوڈیو کی سی اہمیت حاصل تھی۔ وہ ایک بار پھر ویڈیو کیسٹ تیار کرنے بیٹھ گیا۔

"خواتین و حضرات۔" اس نے کہنا شروع کیا۔ "اس کیسٹ کی تیاری ذرا دشوار ہوگی۔ پچھلے کچھ عرصے سے میں نے اس کام کا ازسرِنو جائزہ لیا جو میں نے لاس اینجلز کی اپنی کارل پر کیا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اس کی ابتدائی سرجری کی تکمیل کے موقع پر میں کس قدر پُرجوش تھا۔ آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ اس وقت مجھے کتنی دشواریاں پیش آنے لگیں، جب اس کی کھال میری توقع کے مطابق نہیں کھنچی اور بعض عضلات عجیب انداز میں مڑ گئے۔ میں نے اپنے وڈیو کیسٹ کے آخر میں یہ تبصرہ کیا تھا کہ اپنی ناقابلِ قبول ہو گئی تھی۔ اس کا چہرہ اپنی جگہ موجود تھا اور دلکش تھا مگر اس میں خامیاں ہی خامیاں تھیں۔ مجھ پر یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ یہ وہ چہرہ نہیں تھا جسے میں دنیا کے سامنے اپنے فن کے شاہکار کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا، تاہم میں اس چہرے کے خاص خاص نقوش کی ڈپلی کیٹ کرنا چاہتا تھا۔ اس سے میرے لیے بہت سے مسائل کھڑے ہو گئے۔ میں اپنی کا کیا کرتا؟ کیا ایک ہی جیسی شباہت کی دو عورتیں ہو سکتی ہیں؟

"خواتین و حضرات۔" اس کا لہجہ دھیما اور پُراثر ہو گیا۔ "ہم سب جانتے ہیں کہ سائنس کے لیے قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ آئے دن اس کی مثالیں ہماری نظروں سے گزرتی رہتی ہیں۔ نئی ادویات جن سے پریشان کن نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ سرجری کے نئے طریقے، جن کے نقائص دور ہونے تک شرحِ اموات بہت بڑھ جاتی ہے۔ مجھ پر یہ ظاہر ہو چکا تھا کہ میں جو چہرہ بنانا چاہتا تھا، وہ ہر نقص سے پاک، بے عیب اور انتہائی دلکش چہرہ تھا۔ وہ ایک بالکل منفرد چہرہ تھا۔ اس جیسا کوئی اور نہ ہوتا چنانچہ میں نے اپنی کو ختم کرنے کا انتہائی کٹھن لیکن ناگزیر فیصلہ کر لیا تاکہ اس کے چہرے کے نقائص دور کر کے کسی اور عورت کے چہرے پر سجا سکوں۔

میں نے کیلی فورنیا کی پہاڑیوں پر سفر کرنے کے دوران اس کی زندگی کی شمع گل کر دی اور اس طرح وہ سائنس کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کی خاطر قربان کر دی گئی۔ تاہم میں اسے بالکل ہی کھونا نہیں چاہتا تھا، بلکہ اس پر ریسرچ کرنے کے لیے اسے محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ کوئی بھی سرجن ہمیشہ سیکھ سکتا ہے، اپنی خامیوں سے بھی درس لے سکتا ہے۔ سیکھنے کا عمل ساری عمر جاری رہتا ہے۔"

اس موقع پر وہ میز پر رکھے ہوئے ایک چھوٹے سے بکس کی جانب متوجہ ہوا اور اس کے فنکارانہ ہاتھوں نے اس بکس کو آہستہ سے کھول دیا۔ اس کے اندر ایک انسانی کھوپڑی تھی۔ "خواتین و حضرات......" وہ بولا۔ "میں اپنی کارل کو آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔"

☆☆☆

"تم کچھ پیوگی؟" جوز ارینڈل نے جینی سے پوچھا۔

"ہاں، کولڈ ڈرنک۔" وہ ڈرائنگ روم کے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "کوئی سا بھی مشروب ہو۔"

جوزا کمرے سے نکل کر کچن میں چلی گئی۔ جینی ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگی اور پھر اس کی نظریں اپنی کی ایک رنگین تصویر پر مرتکز ہو گئیں۔ یہ پلاسٹک سرجری کے بعد کی تصویر تھی۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی جینی کے رگ و پے میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ پھر اس کی نظر ایک چھوٹے سے میگزین پر پڑی۔ اس کے سرورق پر اپنی کا نیا چہرہ جگمگا رہا تھا۔ کیوں؟ کیا یہ جوزا کا خواب تھا یا خود اپنی کا؟ جوزا نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ اپنی ایک ماڈل بننا چاہتی تھی۔ چند لمحے بعد جوزا جینی کے لیے ایک گلاس مشروب لے کر نمودار

ہوں۔ میں یہ گرین ڈائری لے رہی ہوں۔" جینی نے کہا۔ "کیا تمہاری بیٹی ماڈلنگ کرتی تھی؟"

"نہیں۔" جوزا نے ایک گہری سانس لی۔ اس کے چہرے سے کرب جھانکنے لگا تھا۔ "یہ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں بھی نہیں تھا۔ لیکن اس ڈاکٹر نے اس کی پلاسٹک سرجری کرنے کے بعد اس سے کہا کہ اگر وہ چاہے تو ماڈلنگ کرسکتی ہے اور چاہے تو فلم ایکٹریس بھی بن سکتی ہے۔"

"اب سمجھی۔" جینی کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ اسے یاد آگیا، ڈاکٹر میڈ اس نے اس سے بھی یہی کہا تھا۔ لیکن کیوں؟ کیا یہ محض اپنی تعریف کرانے کا ایک انداز تھا یا کوئی اور بات تھی؟ کوئی ایسی بات جس کا تعلق دوہرے چہرے کی ساخت سے تھا۔

"میں وہ چیزیں دیکھنا چاہتی ہوں جو اینی اپنے پیچھے چھوڑ گئی ہے۔" وہ بولی۔

"میرے ساتھ آؤ۔" جوزا نے کہا اور اسے اینی کے کمرے میں لے گئی جس میں وہ تین چار سال کی عمر سے رہتی تھی۔

خواب گاہ سادگی کا نمونہ تھی۔ دیواریں سفید تھیں۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر سبز دھاری دار پردے تھے۔

"یہ اس کی خواب گاہ ہے۔" جوزا نے کہا۔ "ویسی ہی جیسی وہ چھوڑ گئی تھی۔ میں نے اس کی کسی چیز کو اب تک ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ تم اس کی درازیں کھنگال سکتی ہو۔ سنگھار میز کی پہلی دراز میں سرخ رنگ کا ایک لفافہ ہے۔ میں نے اس میں چند چیزیں بھر دی ہیں۔ مثلاً پرچیاں، خطوط، فون نمبرز اور پیغامات وغیرہ۔ اس کی ڈائری میز پر رکھی ہوئی ہے۔"

"میں بہت احتیاط سے کام لوں گی۔" جینی نے کہا۔

"میں جانتی ہوں۔" جوزا نے کہا۔ "اب تم تنہائی میں اپنا کام کرو۔" وہ کمرے سے نکل گئی۔ جینی کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ ایک سادہ سا کمرا تھا۔ لگتا نہیں تھا کہ وال پوسٹرز میں کوئی پیغام چھپا ہو۔ سنگھار میز پر رکھا ہوا دوستوں کی تصویروں کا فریم بھی سادہ تھا۔ جینی نے سب سے پہلے تلاشی کے لیے وارڈ روب کو چنا۔ لیکن اس میں عام کپڑوں کے سوا کوئی ایسی شے نہیں تھی جو دلچسپی کا باعث بنتی۔ پھر اس نے سرخ رنگ کا وہ لفافہ کھول لیا جس کی نشاندہی جوزا نے کی تھی اور اس کے ہر خط کو پڑھنے لگی جو اس نے ایام تعطیل کے دوران کولوریڈو اور اپنی پلاسٹک سرجری کے بعد شمالی کیلی فورنیا سے گھر بھیجا تھا لیکن اس کے کسی بھی خط یا پوسٹ کارڈ سے اس کی گمشدگی کا کوئی اشارہ نہیں ملتا تھا۔ ان میں بھی ڈاکٹر میڈ اس کا کوئی بھی ذکر نہ تھا۔ مزید کاغذات اور ٹیلی فون پر موصول ہونے والے پیغامات کو کھنگالتے ہوئے جینی اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ ان میں کام کی کوئی چیز نہیں۔ اس نے ان کاغذات کو دوبارہ لفافے میں رکھ دیا۔ پھر اینی کی ننھی سی گرین ڈائری اٹھالی۔ اس کے صفحات پر بے شمار نام، پتے، فون نمبرز اور متبادل فون نمبرز درج تھے۔ یکایک اس کی نظر ایک نام پر الجھ کر رہ گئی۔ وہ صرف دو الفاظ تھے۔ ایک عورت کا نام اور شہر کا نام۔ کیوں؟ اینی کارل جیسی محتاط اور باریک بین لڑکی نے اتنا مبہم حوالہ کیوں دیا تھا؟ پوری ڈائری میں یہ واحد حوالہ تھا جو نامکمل تھا۔ عورت کے نام اور شہر کے نام کے درمیان ایک لکیر تھی۔ محض ایک لکیر 'مختصری'۔ ان کے بارے میں نوٹ کیوں نہیں تھا، ان دو ناموں کا مطلب کیا تھا؟

☆☆☆

جیکسن اپنے ڈرائنگ روم میں قالین پر بیٹھا تھا اور اس کے اردگرد کوئی دو سو سے زیادہ تصویریں بکھری ہوئی تھیں جو فوٹوگرافروں نے اس کے رسالے کے اگلے شمارے کے لیے کھینچی تھیں۔ دس بج کر دس منٹ پر اچانک اس کا فون گنگنا اٹھا۔ اس نے اٹھ کر ریسیور اٹھالیا۔ دوسری طرف سے جینی چرچل کی سریلی آواز گونجی۔ "کیسے ہو جیکسن؟"

"ارے جینی۔" اس نے اپنا محدب عدسہ ڈھیر سے ایک کرسی پر رکھ دیا۔ "جینی کہاں گم ہوگئی ہو؟"

"میں گم ہوگئی ہوں۔" جینی نے ہلٹن ہوٹل میں اپنے بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔

"رات کے دس بجے فون کرنے کا شکریہ۔" جیکسن نے کہا۔ "کوئی خبر؟"

"ایک درخواست ہے۔" جینی بولی۔

"بتاؤ۔"

"اینی کارل کی ڈائری میں مجھے دو نام ملے ہیں جو اس شہر سے تعلق نہیں رکھتے۔ ہوسکتا ہے میں بھٹک گئی ہوں، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ان کا کوئی مفہوم ہو۔"

"وہ نام کیا ہیں؟"

"میری، واشنگٹن۔"

"میری، واشنگٹن؟ اس میں کون سی عجیب بات ہے؟"

"میں یہی معلوم کرنا چاہتی ہوں۔" جینی نے جواب دیا۔ "اس کے اندراج کا کوئی مقصد نظر نہیں آتا۔ میں نے

[illegible] سے پوچھا کہ کیا وہ کسی نام سے کسی فرد کو جانتی ہے جو واشنگٹن میں رہتا یا رہتی ہو؟ اس نے جواب دیا کہ اپنی زندگی میں بھی واشنگٹن نہیں گئی تھی۔

''ممکن ہے، یہ نام کسی ایسے فرد کا ہو جو لاس اینجلس سے واشنگٹن جا رہا ہو۔'' جیکسن نے خیال آرائی کی۔

''ممکن ہے، لیکن اس کا نام ڈائری میں لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ کسی پیڈ پر بھی لکھا جا سکتا تھا۔''

''اچھا خیال ہے۔'' جیکسن نے اتفاق کیا۔ ''ممکن ہے یہ کسی ادارے کا نام ہو اور اس کے جدا جدا حروف کوئی معنی رکھتے ہوں۔''

''میں نے اس پر غور نہیں کیا تھا۔'' جینی بولی۔ ''ہاں یہ ممکن ہے۔''

''یہ بھی ممکن ہے کہ اپنی واشنگٹن میں کسی کو میری روز کا پودا بھیجنا چاہتی ہو۔''

''یہ بہت دور کی بات ہے، جیکسن۔'' جینی نے کہا۔ ''لیکن کون جانے؟ دیکھو میری تم سے گزارش ہے...... کیا تم اس کے بارے میں تھوڑی بہت تفتیش نہیں کر سکتے؟ ممکن ہے پتا چل جائے کہ میری، واشنگٹن سے کیا بتا ہے، اس کا کوئی مفہوم ہے یا نہیں۔ میری خاطر پلیز جیکسن!''

اس کی خاطر تو وہ دریا میں چھلانگ بھی لگا سکتا تھا۔

''میں تمہاری خاطر اس کا پتا چلانے کی کوشش کروں گا۔''

''شکریہ جیکسن! میری۔ واشنگٹن یاد رکھنا۔''

☆☆☆

والٹر قلپ نے اپنی مخصوص دلکش مسکراہٹ کے ساتھ جینی چرچل کا استقبال کیا، جس کے لیے وہ ماہرینِ نفسیات کے حلقے میں مشہور تھا۔ ڈاکٹر میڈ اس نے جینی سے کہا تھا کہ پلاسٹک سرجری کے ہر مریض کو کم سے کم ایک بار کسی ماہرِ نفسیات سے رجوع کرنا چاہیے تاکہ وہ نفسیاتی اعتبار سے اس کے لیے مددگار ہو سکے۔ جینی اسے ضروری نہیں سمجھتی تھی مگر ایک ماہر سرجن کے مشورے کا احترام کرتے ہوئے، اس نے قلپ سے رابطہ کر لیا تھا جس کی میڈ اس نے سفارش کی تھی۔

''اندر آ جاؤ، مس جینی چرچل۔'' والٹر قلپ نے اپنی مترنم آواز میں کہا۔

جینی اندر داخل ہو گئی۔

''بیٹھو۔'' اس نے ایک نشست کی جانب اشارہ کیا۔

جینی بیٹھ گئی۔

''اب۔'' وہ گویا ہوا۔ ''تم سے تمہارے بارے میں کچھ سننا پسند کروں گا۔ شروع ہو جاؤ۔'' وہ ایک چمڑے دار کرسی پر بیٹھ گیا اور اس نے ایک نیلے رنگ کا گدا اپنی گود میں رکھ لیا...... جینی آدھے گھنٹے تک اپنے بارے میں بتاتی رہی۔ قلپ غور سے سنتا رہا۔

''بہت خوب۔'' وہ اچانک بول پڑا۔ ''اب یہ بتاؤ کہ تم کیا چھپا رہی ہو؟'' اس نے دہرایا۔

''کیا؟'' جینی ہونچکا رہ گئی۔

''مجھے بتاؤ، تم کیا چھپا رہی ہو، کیونکہ ہر شخص کچھ نہ کچھ چھپاتا ضرور ہے۔''

جینی کے دماغ میں ایک جنگ شروع ہو گئی۔ 'اسے ڈاکٹر میڈ اس کے بارے میں بتا دو' اس نے سوچا جو کچھ بھی ہے اسے نکال پھینکو۔ دیکھو یہ کیا کہتا ہے۔ اس نے رازداری کی قسم کھائی ہے۔

''ہاں، کیا سوچا؟'' قلپ نے اس کے خیال پر شب خون مارا۔

''میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ بولی۔

''بالکل کرو۔''

''اگر کوئی مریض، اپنے ڈاکٹر کے بارے میں بے اطمینانی کا شکار ہو جائے تو...... کیا وہ اس سلسلے میں تم سے گفتگو کر سکتا ہے؟ تم اس کی سنو گے؟''

والٹر ہنس پڑا۔ ''کیوں نہیں۔'' وہ مسکراتا ہوا بولا۔ ''ہم جانتے ہیں کہ بعض مریضوں کو اپنے ڈاکٹر سے مختلف نوعیت کی شکایات پیدا ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات اس کا سبب نفسیاتی ہوتا ہے، بعض اوقات نہیں ہوتا۔ لیکن کچھ بھی بتاتے ہوئے ہچکچاہٹ سے کام نہیں لینا چاہیے، میں مدد کرنے کی کوشش کروں گا۔''

''لیکن اگر تم ذاتی طور پر اس ڈاکٹر کو جانتے ہو...... تو......؟''

''دیکھو۔'' وہ شائستگی سے بولا۔ ''میں بھی ایک ڈاکٹر ہوں، ہم حلف اٹھاتے ہیں۔ رازداری اس حلف کا ایک حصہ ہے۔ میں تمہارا کہا ہوا ایک لفظ بھی اس وقت تک کسی سے نہیں کہہ سکتا، جب تک تم مجھے اس کی اجازت نہ دو۔ یہ دیواریں تمہاری بات کی رازداری کی امین ہیں اور یہ بہت ٹھوس ہیں۔''

''اگر میں اس ڈاکٹر کے بارے میں کوئی بہت ہی دہشت ناک بات کہنا چاہوں؟''

''کچھ بھی کہہ سکتی ہو، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں سب کچھ سن چکا ہوں۔ میرے بعض ہم پیشہ مقبولیت حاصل نہیں

کر پائے؟ ہم اس بات سے آگاہ ہیں کہ ہم میں اچھے، برے، وحشی، ہر طرح کے ڈاکٹر موجود ہیں۔"

والٹر کی باتوں نے جینی کو قائل کر دیا تھا کہ وہ اس پر بھروسا کرسکتی ہے۔ وہ جیکسن کے علاوہ کسی ایسے شخص سے بات کرنا چاہتی تھی جو طب کے شعبے سے منسلک ہو۔

"ایک عجیب بات ہوئی ہے۔" وہ اچانک ڈرامائی انداز میں بولی۔ "میں ڈاکٹر میڈ اس کی صلاحیتوں کی معترف ہوں۔"

"لیکن تم اسے برداشت نہیں کرسکتیں۔" فلپ ہنسا۔

"یہ بات نہیں، میں اس کا احترام کرتی ہوں۔" وہ ہچکچا کر گویا ہوئی۔ "لیکن مجھے پتا چلا ہے کہ اس نے...... وہ بالکل میری شکل...... میرا مطلب ہے، ہوبہو میری شکل...... پہلے ہی کسی کو دے چکا ہے...... کسی دوسری مریضہ کو......!"

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ جینی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اور کیسے بیان کرے۔ اس نے نگاہ اٹھا کر والٹر فلپ کی جانب دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"میں سمجھا نہیں۔" وہ بولا۔

اور تب جینی نے شروع سے آخر تک سارا ماجرا اسے کہہ سنایا۔ فلپ اپنی جگہ پر بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئی تھیں اور آنکھوں سے تردد جھانکنے لگا تھا۔ اسے شدت سے احساس تھا کہ یہ واقعہ کتنا سنگین تھا اور جینی کس قدر سنجیدہ تھی۔ اس نے جلدی سے پیڈ پر کچھ نوٹ کیا۔

"اور تمہیں سخت تشویش ہے۔" وہ بولا۔ "کیوں کہ کوئی دوسری عورت تم سے مشابہ ہے۔ یہی بات ہے نا؟"

"میں اس بات سے پریشان ہوں کہ ڈاکٹر میڈ اس دو خواتین کو ایک ہی شکل کیسے دے سکتا ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ یہ درست ہے۔ کیا تم ایسا سمجھتے ہو؟"

"میں ہوتا تو کبھی ایسا نہ کرتا۔" فلپ نے متانت سے جواب دیا۔

"اور میں اس لیے بھی پریشان ہوں کہ وہ دوسری خاتون لاپتا ہے۔" جینی نے کہا۔ "وہ اس قسم کی نہیں تھی کہ اچانک لاپتا ہو جاتی اور میرے ذہن میں اور بھی شکوک و شبہات ہیں۔"

"مثلاً کیا؟"

"میں یہ شدت سے محسوس کرتی ہوں کہ ڈاکٹر میڈ اس نے یہی شکل یعنی میری شکل دوسری خواتین کو بھی دے رکھی ہے۔"

"تمہارے پاس اس کا کوئی ثبوت ہے؟"

میں اس کا ثبوت ڈھونڈنے والی ہوں۔" جینی نے جواب دیا۔ "میں اس راہ پر لگ چکی ہوں۔ ڈاکٹر میڈ اس کچھ عجیب کارنامے انجام دیتا پھر رہا ہے۔ یہ کارنامے عجیب سے بھی بدتر ہوسکتے ہیں...... میں فی الحال یہی جانتی ہوں۔"

والٹر فلپ نے ایک گہری سانس لی اور آہستہ آہستہ خارج کی پھر اپنا پیڈ قریب کرلیا۔ "ڈاکٹر میڈ اس نے جو کچھ بھی کیا ہے، میں اس کا دفاع نہیں کروں گا، تمہارا کہنا درست ہے۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں ششدر رہ گیا ہوں۔ واقعی ششدر رہ گیا ہوں۔ یہ وہ ڈاکٹر میڈ اس نہیں ہے، جسے میں جانتا ہوں۔ تم کیا کرنا چاہتی تھیں؟" اس نے پوچھا۔ "میرا مطلب ہے یہاں آنے سے پہلے۔"

"جس طرح دیگر واقعات کو منظر عام پر لاتی ہوں، اس واقعے کو بھی منظر عام پر لاؤں گی۔"

"میں بھی تمہاری جگہ ہوتا تو یہی کرتا۔" فلپ نے کہا۔ "لیکن مجھے یوں تشویش ہے کہ یہ تمہارے ذہنی توازن کو متاثر کرسکتا ہے۔ اس میں غالب آنے کے سارے امکانات موجود ہیں اور یہ غلبہ انسان کو تباہ کر دیتا ہے۔"

"تم مجھے اس سے دست کش ہونے کا مشورہ دے رہے ہو؟"

"ایک طرح سے...... ہاں۔" اس نے جواب دیا۔ "مس جینی چرچل! ڈاکٹر میڈ اس پر الزام لگانے کے لیے تمہارے پاس کافی ثبوت نہیں ہیں۔ تم براہِ راست متاثر نہیں ہوئیں۔ تم اس کے کام سے خوش ہو۔"

"فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔" اس نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

"اگر تم اپنی تفتیش جاری رکھنے کا فیصلہ کر چکی ہو تو مجھے ہر وقت اخلاقی تعاون کے لیے اپنے قریب پاؤ گی۔" والٹر نے اپنا پرائیویٹ نمبر بھی اسے دے دیا اور زور دے کر کہا کہ وہ جس وقت چاہے اسے کال کرسکتی ہے۔

جینی کو یوں محسوس ہوا کہ اسے ایک مخلص دوست مل گیا ہو۔ وہ وہاں سے اٹھی تو ایک نئی خود اعتمادی سے سرشار تھی۔ جیکسن کے پیشہ ورانہ تعاون کے ساتھ ہی اسے والٹر فلپ کا اخلاقی تعاون بھی حاصل ہو گیا تھا۔

☆☆☆

والٹر فلپ اپنی کرسی میں دھنس گیا۔ اس نے جینی کی زبانی جو باتیں سنی تھیں، اس کی سماعت میں گونج رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر بیٹھا غور کرتا رہا۔ پھر اچانک انٹر کام پر استقبالیہ کلرک سے رابطہ کیا۔ "اگلے دو اپائنٹمنٹ منسوخ کر دو۔"

اس نے سہم دیا۔ ''میری طبیعت ٹھیک نہیں۔''

اس کے پندرہ منٹ کے بعد وہ ڈاکٹر میڈاس کی پرتعیش اقامت گاہ کے دروازے پر کھڑا تھا جہاں میڈاس اپنے انتہائی اہم مریضوں کو دیکھتا تھا۔

''فلپ۔'' میڈاس اسے دیکھ چکا تھا۔ وہ چہکا۔ ''اندر آجاؤ۔ آج تو غضب ڈھا رہے ہو۔''

''شکریہ۔'' فلپ اندر داخل ہو گیا۔ ''اور تم ہمیشہ غضب ڈھاتے ہو۔'' میڈاس مسکرایا۔

''ہاں اب بتاؤ معاملہ کیا ہے؟ تم نے فون پر کہا تھا کہ فوراً مجھ سے ملنا چاہتے ہو، کیا کوئی اہم معاملہ ہے؟''

''فیصلہ کن کہہ لو۔'' فلپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں تھی۔

''بیٹھو۔'' میڈاس کا انداز اچانک پیشہ ورانہ ہو گیا۔

''میڈاس آج صبح تمہاری ایک مریضہ میرے پاس آئی تھی۔''

''اوہ؟''

''جینی چرچل۔''

''اوہ ہاں، جینی بڑی شاندار لڑکی ہے۔''

''مجھے یقین ہے میڈاس۔'' فلپ نے گردن ہلائی۔ ''لیکن انٹرویو کے دوران ایک بات سامنے آئی ہے۔''

میڈاس کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں اور وہ سامنے جھک گیا۔ ''کیا وہ نفسیاتی مسائل سے دوچار ہے، فلپ؟''

ماہر نفسیات والٹر فلپ ہچکچایا پھر نگاہ اٹھا کر دیوار پر آویزاں حلف نامے کو دیکھا۔ ''ڈاکٹر میڈاس!'' وہ بولا۔ ''مجھے یہ بات تمہیں بتانی نہیں چاہیے۔''

''لیکن جینی نے تمہیں اس کا استحقاق دے دیا ہے۔'' میڈاس نے کہا۔ ''کیا نہیں دیا؟''

''نہیں۔'' والٹر فلپ نے جواب دیا۔ ''برخلاف اس کے، رازداری پر اصرار کیا ہے اور میں نے اسے یقین دلایا ہے۔'' اس کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمک اٹھے۔ اب وہ زور زور سے سانس لے رہا تھا۔ ''تم نے مجھے ایک دفعہ ایک مقدمے سے بچایا تھا۔'' وہ بولا۔ ''آج میں وہ قرض اتارنا چاہتا ہوں۔''

یکبارگی میڈاس یوں اچھل کر کھڑا ہو گیا گویا کسی بچھو نے اسے ڈنک مار دیا ہو۔

''کک...... کیا...... کیا...... جینی مجھ پر مقدمہ دائر کرنے کا سوچ رہی ہے؟ کیوں؟ آخر کیوں؟ اس کا محرک کیا ہے؟ میں نے اسے نئی زندگی دی ہے فلپ۔'' اس کا انداز نہایت متاثر کن تھا لیکن اسے اپنے سینے کے اندر کوئی چھری سی چلتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔

''بیٹھ جاؤ میڈاس۔'' فلپ نے کہا۔ ''معاملہ اس سے بھی کہیں گمبھیر ہے۔'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ ''میڈاس! کیا تم نے کسی اور کو بھی اس کا چہرہ دیا تھا؟''

میڈاس کی آنکھیں اپنے حلقوں سے ابل پڑیں۔

''کیا بک رہے ہو یار۔'' وہ دہاڑا۔ اس کا لہجہ تذلیل آمیز تھا۔

''میڈاس! میں سمجھتا ہوں کہ اسے پروزک، کیلی فورنیا میں کوئی لڑکی مل گئی ہے۔ فلپ نے کہا۔ ''تمہاری کوئی سابقہ مریضہ۔''

میڈاس کا دل گویا اس کے دماغ میں دھڑکنے لگا۔ اس کے چہرے کی رنگت اڑ گئی تھی۔ وہ اپنی غیر ہوتی ہوئی کیفیت پر قابو پانے کی سخت جدوجہد کرنے لگا۔ یہ ایک وحشت ناک لمحہ تھا۔ ''میں تمہاری بات بالکل نہیں سمجھ سکا۔'' اچانک اس کا لہجہ بالکل پرسکون ہو گیا۔ وہ لمحہ گزر چکا تھا۔

''اس کا دعویٰ ہے کہ کوئی عورت اس سے نیویارک میں ٹکرا گئی تھی اور اسے اپنی بیٹی سمجھ بیٹھی تھی۔ دونوں کی شکلیں ہوبہو مشابہ تھیں اور تم نے اس عورت کی بیٹی کی بھی پلاسٹک سرجری کی تھی مگر اب وہ لڑکی لاپتا ہے۔'' فلپ ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گیا۔

''آ...... آ...... آ......!'' میڈاس کے کھلے منہ سے نکلا۔ مزید کوئی آواز نہ نکل سکی۔ کمرے میں گہرا سناٹا چھا گیا۔ کئی لمحے بیت گئے پھر اس نے والٹر فلپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور ہولے سے شانے اچکائے۔ ''یہ بالکل درست ہے۔'' اس نے نرمی سے کہا۔

''یہ کیا ہے؟'' فلپ بھونچکا رہ گیا۔

''ہاں والٹر۔'' وہ بولا۔ اب اس کے ہونٹوں پر ایک فخریہ مسکراہٹ تھی۔

''لیکن ایک لمحہ پہلے تو تم......''

''صرف سوچ رہا تھا کہ کیا یہ وہی کیس تھا جس کے بارے میں جینی سوچ رہی تھی۔'' اس نے کہا۔ ''بڑے افسوس کی بات ہے...... ہے نا؟ میں نے اس کے لیے اتنا کچھ کیا اور اب وہ مجھ پر شک کر رہی ہے۔ کتنی خودغرض ہے۔ وہ غریب لڑکی لاپتا ہو گئی ہے اور جینی صرف اپنے بارے میں سوچ رہی ہے۔''

''دیکھو میڈاس۔'' فلپ گویا ہوا جو ہمیشہ مسکراتا رہتا تھا آج اس کا چہرہ جیسے پتھر کا ہو گیا تھا۔ ''مجھے اس معاملے کو

اچھی طرح مجھنے دو۔ تم اعتراف کر رہے ہو کہ تم نے اس لڑکی کو ڈیلی کیسٹ شکل دی ہے؟''

میڈ اس اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا اور جیبوں میں ہاتھ ٹھونس کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ''نہیں، نہیں، نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں نے ڈیلی کیسٹ نہیں کہا ہے، فلپ ہمارے طبی آرٹ کی دنیا میں اتنی خلل اندازی ہے کہ بس مت پوچھو۔ میرے ذہن میں کچھ ایسے خاص نقوش تھے جنہیں میں بے عیب بنانا چاہتا تھا۔ میں انہیں بہتر سے بہتر بنانے کے لیے کوشاں تھا، مثلاً ٹھوڑی...... اور میں نے اس ٹھوڑی میں ایک بہت ہی سیکسی گڑھا بھی ڈال دیا تھا۔ تمہیں یہ بات احمقانہ لگے گی لیکن بہت سی عورتوں کے لیے وہ گڑھا چاہِ زنخداں کی شناخت بن جاتا ہے۔ میں نے وہ گڑھا ان دولڑکیوں کو دیا تھا، جینی چرچل اور اپنی کارل کو، جو دو مختلف جگہوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ دوسرے، رخسار کی ہڈیاں جو میرے لیے سب سے بڑا چیلنج بن گئی تھیں لیکن میں نے بعد میں نئی تکنیک اپنائی اور ان دونوں پر استعمال کی۔''

''بہت خوب میڈ اس۔'' ڈاکٹر فلپ توصیفی لہجے میں بولا۔ ''میں تمہیں اس طرح ڈرانے پر بے حد شرمندگی محسوس کر رہا ہوں اور اس بات پر بھی انتہائی شرمندگی محسوس کر رہا ہوں کہ میں نے اپنا عہد توڑ دیا۔''

''دفع کرو، فلپ۔'' میڈ اس نے کہا۔ ''تم نے ایسا کیا تو اس کی معقول وجہ بھی تھی۔ تم میری مدد کرنے کی نیت سے یہاں آئے تھے لیکن یہ بہت ہی حیرت انگیز بات ہے کہ اس عورت نے جینی کو ڈھونڈ نکالا۔ میں حیران ہوں، یہ کیونکر ہوا۔'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ ''پتا ہے تم اس تکنیک کو، جس کا میں نے ذکر کیا ہے، متعدد بار اپناؤ لیکن آخر میں نتیجہ مشابہت کی صورت میں نکلتا ہے۔ چونکہ وہ لڑکی اپنی لاپتا ہے، اس کی ماں کو وہی یاد ہے جو وہ یاد رکھنا چاہتی تھی، دونوں شکلیں مشابہ نہیں ہیں، لیکن میں ان کی الجھن کو سمجھ رہا ہوں۔''

''میڈ اس۔'' فلپ نے کہا۔ ''جینی کہہ رہی تھی کہ تم نے یہی شکل دیگر عورتوں کو بھی دی ہے۔ اسے اس بات کا شبہ ہے۔''

''اچھا؟ واقعی شبہ ہے؟'' میڈ اس نے حیرت کا اظہار کیا۔

''مجھے تو یہ شبے سے زیادہ وہم لگتا ہے۔ وہ وہم کا شکار ہوگئی ہے۔'' فلپ نے کہا۔

''خیر اسے شک کرنے دو۔'' ڈاکٹر میڈ اس نے کہا۔ ''اسے ایسے بہت سے چہرے ملیں گے جو اس سے مشابہ ہوں گے۔ میں نے تین ہزار چہروں کی پلاسٹک سرجری کی ہے۔ ڈاکٹر! تم ان تین ہزار چہروں کو یکجا کرو، جن کی پلاسٹک سرجری ایک ہی سرجن نے کی ہو تو تمہیں ان میں مشابہت ملے گی۔''

''بالکل۔'' ڈاکٹر فلپ نے اتفاق کیا۔ ''میں یہ جانتا ہوں، میں اس سے بات کروں گا، میرے خیال میں وہ پُرسکون ہو جائے گی۔ میں اسے یہ نہیں بتا سکتا کہ میں نے تم سے بات کی ہے۔ میں اس سے یہی کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس معاملے کی تفتیش کی ہے۔ پلاسٹک سرجری میں ریسرچ کی ہے اور یہ کہ اس قسم کی مشابہت عام ہے۔''

''ہاں، اس سے یہی کہو اور یہ سوچنے پر مجبور کرو کہ میں نے اسے ایک نئی زندگی دی ہے۔'' اس کا لہجہ ڈرامائی حد تک تلخ تھا۔ ''اسے یہ سوچنے دو کہ اگر وہ میرے پاس نہ آتی تو اس کی زندگی کیسی ہوتی۔''

☆☆☆

''میں جینی چرچل کو قتل کر دوں گا۔'' وہ اپنے دفتر کے ملحقہ مختصر سے اسٹوڈیو میں ٹیلی ویژن کیمرے کے لینس کو براہ راست گھورتے ہوئے بولا۔

یہ اسٹوڈیو اس کے اسپتال والے اسٹوڈیو جیسا شاندار تو نہ تھا لیکن وہ یہاں بھی ویڈیو کیسٹس تیار کرتا تھا۔

''مجھے اس ضرورت پر افسوس ہے۔'' وہ بولتا رہا۔ ''لیکن ہم ایک بحران کا شکار ہو گئے ہیں، یہ میری زندگی کا بدترین بحران ہے۔ مس جینی نے اس بات کا پتا چلا لیا ہے کہ میں نے اس کی شکل کیلی فورنیا کی ایک لڑکی کو دی تھی۔ کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ آپ لوگ حیران ہوں گے کہ میں یہ سب کچھ کیسٹ میں کیوں ریکارڈ کر رہا ہوں۔ حیران نہ ہوں، یہ کیسٹ آئندہ نسل کے لیے ہے۔ کوئی بھی مجھے سزا نہیں دے سکتا۔ میں نے آپ لوگوں کو اپنے تجربات سے آگاہ کیا ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے آپ لوگوں کو اپنی بالیدگی سے بھی باخبر کرنا چاہیے۔'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ ''میں اس کا مظاہرہ کروں گا کہ ایک ماہر سرجن کس طرح بحران پر قابو پاتا ہے۔ میں بہت بعد میں، مس جینی چرچل کی قسمت کا فیصلہ کرنا چاہتا تھا، جب ہر چیز معمول پر آجاتی۔ لیکن اب وہ اس دوسرے چہرے کے بارے میں جان گئی ہے اور میری قسمت میرے خلاف ہوگئی ہے، لیکن قسمت کو اس کے خلاف بھی ہونا پڑے گا...... اسے ہلاک کر دو۔ اس سے پہلے کہ وہ تباہی پھیلائے، اسے خاموش کر دو، ہمیشہ کے

لیے۔'' اس نے لیمرے کا سوئچ آف کر دیا اور اپنے دفتر میں داخل ہو کر ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا۔ اس کی انگلی شانیگان اسپتال میں اپنے دفتر کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ رابطہ ہونے پر اس کی ایک سیکریٹری نے جواب دیا۔

''گلوریا۔'' وہ ماؤتھ پیس میں بولا۔ ''میں نے مس جینی چرچل کے چہرے پر مزید کام کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ تم جتنی جلدی ہو سکے، اس سے اپائنٹمنٹ لے لو۔ ٹھیک ہے؟''

''بالکل، ڈاکٹر۔''

''اور ہاں گلوریا! نرسنگ کے اس عملے کو ہدایت کر دو جس نے کوئین لیزا کی سرجری کے موقع پر معاونت کی تھی۔ وہ عملہ بہت حاذق تھا۔''

''بہتر ہے میں ہدایت کر دوں گی۔'' سیکریٹری نے جواب دیا۔

میڈا اس نے ریسیور رکھ دیا۔ ''نرس رمی۔'' اس نے زیرلب کہا۔ ''ہاں...... نرس رمی ہی مناسب رہے گی۔ تجربہ کار لیکن زیادہ متاثر کن نہیں۔ وہ ایک عام سی نرس تھی اور بہت سادہ لوح تھی۔ آسانی سے غلطیاں کر بیٹھتی تھی اور آسانی سے شیشے میں اتر آتی تھی۔ تفتیش اور تحقیق کے جھمیلے میں پڑنے کے بجائے خاموشی سے کوئی بھی الزام قبول کر لیتی تھی۔ نرس رمی۔'' اس نے سوچا۔ ''اب وہ ایک نیا کردار ادا کرے گی۔ جینی چرچل کی قاتلہ کا کردار......''

☆☆☆

جینی چرچل بذریعہ ٹرین پہنچ گئی۔ وہ میری کا سراغ لگانا چاہتی تھی۔ ایک رسالے کی نمائندہ ہونے کی بنا پر اسے ایک ہفت روزہ اخبار واشنگٹن ایکسپریس کی فائلیں کھنگالنے کی اجازت مل گئی تھی جو شہر میں ہونے والے واقعات، خصوصاً جرائم کی خبروں کو نہایت اہمیت دیتا تھا۔ اگر میری لاپتا ہوئی تھی تو اس اخبار نے اس کی گمشدگی کی خبر ممکن ہے شائع کی ہو۔ اس کا دفتر گیارہ اسٹریٹ پر واقع تھا اور اس کی لائبریری کمپیوٹرائزڈ تھی۔ اس کے کی بورڈ کو فیڈ کرتے ہی مطلوبہ خبر، تصویر اور تفصیل کے ساتھ ٹی وی اسکرین پر نمودار ہو جاتی تھی۔

جینی نے وہاں پہنچتے ہی اپنا کام شروع کر دیا۔ اس نے ناموں کی فہرست جو کہ خاصی طویل تھی، اٹھائی اور اس میں کسی ایسے فرد کا نام ڈھونڈنے لگی جو میری سے شروع ہوتا ہو۔ اسے دو نام مل گئے۔ اس نے کمپیوٹر کی ہدایات کو پڑھا اور پہلے کیس کو فیڈ کیا۔ اگلے ہی لمحے وہ خبر اسکرین پر آ گئی۔ اس کے مطابق میری شیلسن واشنگٹن کے شمال مغربی علاقے میں رہتی تھی، 5 اکتوبر 1985ء کو لاپتا ہوئی تھی لیکن اس کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی اور اس کی جو تصویر اسکرین پر نمودار ہوئی، وہ جینی سے مشابہ نہیں تھی۔ جینی نے سوچا وہ دوسری میری ہو گی، چنانچہ اس نے دوسرا نام کمپیوٹر کو فیڈ کیا اور خبر اسکرین پر نمودار ہو گئی۔ اس کے مطابق جارج ٹاؤن کپڑوں کے ایک بیوپاری کی بیٹی میری تھامسن، جنوری 1985ء کو لاپتا ہوئی تھی۔ اس خبر کے ساتھ اس کی کوئی تصویر نمودار نہیں ہوئی۔ شاید گھر والے اس کی کوئی تصویر بروقت اخبار کو فراہم کرنے سے قاصر رہے تھے۔ اس خبر کے مطابق میری تھامسن تیس سال کی تھی۔ گویا وہ جینی سے تھوڑی ہی بڑی تھی۔ وہ غیر شادی شدہ تھی اور فلموں میں معمولی نوعیت کے کردار ادا کرتی تھی۔ تاہم اسے امید تھی کہ جلد ہی اسے کوئی بڑا اور اہم رول مل جائے گا۔ جینی کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ شاید اس کا تیر نشانے پر بیٹھا تھا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اس نے اتنی جلدی مطلوبہ کیس کا سراغ لگا لیا۔ مگر مزید معلومات درکار تھیں۔ اسے اس کی تصویر بھی چاہیے تھی اور یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ اس کیس کا کیا رہا۔ اس ضمن میں مزید دو خبریں تھیں۔ ایک کے مطابق پولیس اس واقعے کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہی تھی اور دوسری یہ کہ میری تھامسن کے باپ نے اپنی بیٹی کا سراغ لگانے والے کے لیے بیس ہزار ڈالر کا انعام مقرر کر دیا تھا۔

جینی وہ خبر جلدی جلدی پڑھنے لگی جو پہلے صفحے پر شائع ہوئی تھیں اور صفحہ نمبر پندرہ پر باقی خبر تھی لیکن اس کے علاوہ بھی کوئی چیز تھی، وہ میری تھامسن کی تصویر تھی۔ لیکن جینی سے قطعی مشابہ نہ تھی۔ جینی کا دل ڈوبنے لگا۔ وہاں میری نام کی صرف دو خواتین تھیں۔ جینی کی قسمت نے یاوری نہیں کی تھی۔ وہ چند لمحے پیشتر جتنی پُرامید تھی، اب اتنی ہی مایوسی کا شکار ہو گئی تھی۔ شاید وہ شروع ہی سے غلطی پر تھی۔ اس نے بددلی سے کمپیوٹر کا مانیٹر آف کرنا چاہا لیکن اچانک اس کے پیشہ ورانہ تجسس نے اس کے پہلو میں گدگدی کی۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ وہ تمام گمشدہ افراد کی خبروں کا جائزہ لے؟ اس نے سوچا۔ ہاں اب اسے یہی کرنا چاہیے، ہو سکتا ہے کمپیوٹر کو غلط فیڈ کیا گیا ہو۔ یہ اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف تھا لیکن اس نے اپنے فیصلے پر قائم رہنے کو ترجیح دی۔ وہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک ٹی وی، اسکرین پر نمودار ہونے والی خبروں کو پڑھتی رہی۔ وہ کچھ خبروں کو، جو کہ وحشت آمیز یا غیر متعلق ہوتیں، تیزی سے آگے بڑھا دیتی اور بعض خبروں کو چند لمحوں کے لیے روک لیتی۔ پھر اسکرین پر ایک تراشہ ابھرا۔ لکھا

تھا۔ ''آرچیوز سے ایک عورت لاپتا ہوئی۔'' جینی پڑھنے لگی۔ ''ایک اٹھائیس سالہ عورت گزشتہ شب نیشنل آرچیوز سے واپس اپنے گھر 1515۔آر، اسٹریٹ جاتے ہوئے لاپتا ہوگئی۔ وہ سیاست میں پی ایچ ڈی کر رہی تھی۔ اس کا نام روز، ایم، ٹینا، بتایا جاتا ہے۔ یہ سیاسی محقق تھی جس نے حال ہی میں پلاسٹک سرجری کرائی تھی۔'' جینی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ اپنی پلکیں جھپکانے لگی۔ اس نے گمشدہ عورت کی تصویر دیکھنے کی کوشش کی، لیکن تصویر نہیں تھی۔ وہ ایک بار پھر اس خبر کو پڑھنے لگی۔ کتنی گمشدہ عورتوں نے پلاسٹک سرجری کرائی تھی......؟ اس نے حیرت سے سوچا۔ لیکن یہ نام...... روز، ایم، ٹینا...... کام بنتا نظر نہیں آتا...... کیا واقعی؟ لیکن یہ بیچ کا نام ایم...... اس سے کیا مراد ہے؟ میری؟ میری ٹینا؟ لیکن یہ ضروری تو نہیں ہے کہ ایم سے میری ہی مراد ہو۔ اس سے مراکش، منیلا یا ملائیشیا بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے کمپیوٹر آف کر دیا اور عمارت سے نکل گئی۔

اسے گمشدہ عورتوں کے پتے درکار تھے۔ اس طرح وہ واشنگٹن پولیس ڈپارٹمنٹ کے شعبہ گمشدہ افراد میں پہنچ گئی۔ اسے اس شعبے کے انچارج لیفٹیننٹ ولسن کا چند لمحے انتظار کرنا پڑا۔ وہ اپنے دفتر سے برآمد ہوا تو اس کے جسم پر چاکلیٹی رنگ کا سویلین سوٹ تھا اور اس کی توند نکلی ہوئی تھی۔ گلے میں سرخ ٹائی تھی۔

''لیفٹیننٹ ولسن۔'' اس نے مصافحے کے لیے جینی کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''شعبہ گمشدہ افراد۔''

''جینی چرچل۔'' وہ متانت سے بولی۔ ''رسالے نی۔سا کی ایک رپورٹر۔''

''میں تمہاری کیا خدمت کرسکتا ہوں میڈم رپورٹر۔''

''کیا ہم دفتر میں بیٹھ کر بات نہیں کر سکتے مسٹر ولسن؟'' جینی نے پوچھا۔

''بالکل، بالکل، کیوں نہیں۔ اندر آجاؤ۔'' وہ جلدی سے بول پڑا۔ ''یہ اتنا آرام دہ تو نہیں تاہم آرام سے بات ہوسکتی ہے۔''

دونوں دفتر میں داخل ہوگئے۔ ''بیٹھو۔'' لیفٹیننٹ ولسن نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''تھینک یُو۔'' جینی نے کہا اور بیٹھ گئی۔ ولسن نے بھی اپنی نشست سنبھال لی۔

''میں ایک کیس کا سراغ لگا رہی ہوں۔'' جینی نے کہا۔

''اوہ، اپنے رسالے کے لیے؟'' ولسن نے پوچھا۔

وہ ایک لمحے کے لیے ہچکچائی۔ ''یہ ایک ایسا کیس ہے جو میری ذاتی دلچسپی کا باعث ہے۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن کسی واقعے میں ڈھل جائے گا۔''

''کس قسم کے واقعے میں؟''

''سر دست یہ میں بھی نہیں جانتی۔''

''تم نہیں جانتیں؟ میرا مطلب ہے، کیا یہ کسی گمشدہ فرد کا واقعہ ہے؟''

''اس سے بھی اس کا گہرا تعلق ہوسکتا ہے۔ بشرطیکہ اسے دوسروں سے منتخب کر دیا جائے۔''

اچانک لیفٹیننٹ ولسن کا چہرہ سرد ہوگیا۔ ''تم ان کالم نویسوں میں سے ہو، جنھیں سراغ رسانی کا شوق چرّاتا ہے۔'' وہ بولا۔ ''اور اگر یہی بات ہے تو تم غلط جگہ پر آگئی ہو۔ ہم یہاں کسی شرلاک ہومز کی حوصلہ افزائی کرنے نہیں بیٹھے۔ بات سمجھ میں آگئی؟''

''ہاں، آگئی۔'' جینی نے جواب دیا۔ ''دیکھو میں چند سوالات پوچھنا چاہتی ہوں۔ میں کوئی جعلی رپورٹر نہیں۔ تم میرے باس کو فون کرکے......''

اس نے اپنا ہاتھ لہرایا۔ ''مجھے فون کرنے کی ضرورت نہیں۔'' وہ بول پڑا۔ ''تم شکل وصورت سے رپورٹر لگتی ہو۔ مجھے پسند آئیں، یہ عوامی حکومت ہے اور ہم عوام کے خادم ہیں۔ تمہیں یا کسی کو بھی کچھ پوچھنے اور جاننے کا پورا حق حاصل ہے۔ تفصیل بتاؤ۔''

''اس گمشدہ عورت کا نام روز، ایم، ٹینا ہے۔'' جینی چرچل نے کہا۔

ولسن نے فائلیں کھنگالنی شروع کر دیں۔ جینی کو اپنے جسم کے عضلات تنتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ ''لوٹیکس، لونگ...... یہ مجھے یاد ہے۔'' ولسن بولا۔ ''کانگریس کے ایک ممبر کی بیوی ہے۔ ان کی شادی ناکام ہوگئی...... اور یہ...... یہ وہی ٹینا...... روز، ایم، ٹینا ہے۔'' اس نے ایک بڑی سی فائل انبار میں سے کھینچ کر باہر نکال لی۔

''دیکھنا، اس کے بیچ کے نام سے کیا مراد ہے؟'' جینی جلدی سے بول پڑی۔ ''کیا لکھا ہے؟''

لیفٹیننٹ ایک گہری سانس لے کر دوبارہ بیٹھ گیا اور وہ فائل میز پر رکھ دی۔ ''اب ہم پہلے نام کو دیکھیں گے۔ میرے پاس اس کے کوائف کی شیٹ ہے۔ اوہ، ہاں بیچ کا نام......'' جینی کی سانس سینے میں ہی رک گئی۔

''میری۔'' وہ بولا۔

جینی اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں ہلی۔ ''اپنے

جذبات ظاہر مت کرو!'' اس نے خود سے کہا۔ ''اسے مشکوک مت کرو۔''

''اب...... ''ولسن گویا ہوا۔ ''اس کیس کی نوعیت......

اوہ، ہاں، کیا تمہیں اس کی تصویر چاہیے؟ میرے خیال میں، میں نے ایک تصویر ابھی یہیں دیکھی تھی۔ ہاں یہ رہی۔ اس پر لکھا ہے! حادثے سے پہلے! اوہ جبھی اس نے پلاسٹک سرجری کرائی تھی۔''

''کیا حادثے کے بعد کی بھی کوئی تصویر ہے؟'' جینی پوچھ بیٹھی۔

''میرے خیال میں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''انہی کاغذات میں کہیں ہوگی۔''

وہ کاغذات کھنگالنے لگا اور اسے تصویر مل گئی۔ اس نے اسے کھینچ کر نکال لیا اور اس کی جانب دیکھنے لگا۔ یکا یک وہ اپنا سر جھٹک کر جینی کو گھورنے لگا۔ اس کی آنکھیں سکڑ گئی تھیں اور جینی کے چہرے میں پیوست ہوئی جارہی تھیں۔ اس نے دوبارہ تصویر کا اور پھر جینی کا جائزہ لیا۔ ''خدا کی پناہ!'' وہ چیخ اٹھا۔

''کیا ہوا؟'' جینی نے پوچھا۔

''اوہ خدایا۔ ''آخر تم نے مجھے کیا سمجھا ہے؟''

جینی ششدر رہ گئی۔ ''میں سمجھی نہیں۔''

وہ اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ ''سمجھی نہیں؟ ایں؟ کیا میں یہ نہیں دیکھ سکتا کہ تم اس کی جڑواں بہن ہو؟'' اس نے غصے سے تصویر جینی کی آنکھوں کے سامنے کردی۔ جینی نے تصویر کی طرف دیکھا۔ شاید اسے پہلے ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ تصویر کیسی ہوگی۔ پھر بھی اس پر نگاہ پڑتے ہی اس کے رگ و پے میں سنسنی دوڑ گئی۔ وہ اس سے ہو بہو مشابہ تھی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میری، بالآخر مل گئی تھی۔

''میں اس کی جڑواں بہن نہیں ہوں لیفٹیننٹ؟'' اس نے متانت سے کہا۔

''اوہ واقعی؟'' ولسن نے دیدے گھمائے۔ ''پھر کیا ماجرا ہے؟''

دیکھو لیفٹیننٹ ولسن۔'' جینی تیزی سے بولی۔ ''میں تمہیں تھوڑی دیر میں سارا واقعہ سناؤں گی۔ یہ سمجھ لو کہ ہم دونوں نے پلاسٹک سرجری کرائی تھی اور یہ محض اتفاق ہے کہ ہم دونوں......!''

''ہاں، ہاں۔'' وہ بول پڑا۔ ''میں وہ واقعہ سننا پسند کروں گا۔ یہ تمہارا مسئلہ ہے میرا نہیں، میں اسے کوئی اہمیت......''

''اس وقت۔'' جینی نے مداخلت کی۔ ''میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ میری کے کیس کا کیا بنا؟''

ولسن اسے سر سے پاؤں تک گھورنے لگا۔ وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ جینی بے حد سنجیدہ اور پُرعزم تھی پھر اس نے فائل کھول لی اور گلابی رنگ کا ایک کاغذ نکال لیا۔ اگلے ہی لمحے اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات نمودار ہوئے۔

''کیا ہوا؟'' جینی نے جلدی سے پوچھا۔ وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

''مس جینی چرچل!'' وہ بولا۔ ''میری مرچکی ہے۔''

جینی اپنی نشست میں اور بھی دھنس گئی۔ ''کیسے؟''

''یہاں اس کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ صرف اتنا لکھا ہے کہ اس کی لاش کی باقیات میری لینڈ کی پہاڑی پر جھاڑیوں میں ملی تھیں۔''

''باقیات؟'' جینی کے لہجے میں حیرت تھی۔

لیفٹیننٹ ولسن نے ایک تصویر اس کے سامنے کر دی۔ جینی نے تصویر کی جانب دیکھا اور اس کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔ لاش کا سر غائب تھا۔

☆☆☆

''کہہ دو کہ میں خواب دیکھ رہی ہوں۔'' جینی نے کہا۔ ''ہاں، ہاں، کہہ دو۔'' وہ ابھی ابھی واشنگٹن سے لوٹی تھی اور جیکسن کے کمرے میں تھی۔

''تم خواب نہیں دیکھ رہیں۔'' جیکسن نے جواب دیا۔ اب اسے احساس ہو چلا تھا کہ پلاسٹک سرجری پر کتاب لکھنے کا اس کا آئیڈیا ایک سنگین جرم کی تفتیش میں بدلتا جارہا تھا۔ ''میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم محتاط رہو۔''

''کیوں؟'' جینی نے پوچھا۔ ''کیا میں بہت تیزی دکھا رہی ہوں؟''

''شاید۔'' وہ بولا۔ ''دیکھو جینی، ڈاکٹر میڈ اس شکلوں کے چربے اتارتا ہے۔ تم اس نتیجے پر پہنچ گئی ہو۔ ایمی کارل لاپتا ہے اور روز میری قتل کر دی گئی ہے۔''

''ہاں اور میں سمجھتی ہوں کہ ایمی بھی قتل کر دی گئی ہے۔''

''صحافت میں کوئی چیز فرض نہیں کی جاتی۔''

''خوب، خوب۔'' وہ چہک کر بولی۔ ''شائیگان اسپتال میں اپنی چہرہ سازی کے دوران میں نے وہاں کی انتظامیہ میں چند دوست بنا لیے تھے۔ میں نے ان سے درخواست کی ہے کہ وہ ان دونوں کی سرجری کے شیڈول کو چیک کریں، جن دنوں ایمی کارل لاپتا ہوئی تھی اور میری قتل

ہوئی تھی۔ انہوں نے چیک کر کے مجھے بتایا ہے کہ ان دونوں تاریخوں میں ڈاکٹر میڈاس نیویارک میں نہیں تھا۔ اس کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے کہ وہ کہاں تھا۔ جیکسن، یہ وہ شخص ہے، جو کبھی گالف نہیں کھیلتا اور نہ ہی ایسے کاموں میں اپنا وقت ضائع کرتا ہے۔“

”تم یہ فرض کر رہی ہو کہ وہ ان تاریخوں میں پروزک اور واشنگٹن میں تھا۔“

”دیکھو! میں یہ ثابت نہیں کر سکتی۔ میں یہ بھی ثابت نہیں کر سکتی کہ ایمی مر چکی ہے۔ حالات کی روشنی میں صرف فرض ہی کر سکتی ہوں اور اگر ایمی مر چکی ہے تو اس کے علاوہ اور کون کون لڑکیاں مر چکی ہیں؟ اگر یہ ساری لڑکیاں ڈاکٹر میڈاس کی مریضہ تھیں تو کیا اب میری باری بھی آنے والی ہے؟“

جیکسن کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ اس نے جینی کو پہلے کبھی خوف زدہ نہیں دیکھا تھا۔ کیا ڈاکٹر میڈاس اپنی مریضاؤں کو اغوا اور قتل کر رہا تھا؟ وہ بمشکل ہی اس بات پر یقین کر سکتا تھا۔ ”دیکھو......“ وہ بولا۔ ”بہتر ہے کہ میڈاس سے دور رہو۔“

”اس سے کچھ نہیں ہوگا۔“ جینی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مسئلہ یہ نہیں ہے۔ وہ گرفتار ہونے یا پکڑے جانے کا قطعی خواہش مند نہیں۔ اگر وہ مجھے قتل کرنا چاہے گا تو اس طرح نہیں کرے گا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے۔“

جیکسن نے اپنی ٹانگیں میز پر سے دھپ سے زمین پر رکھ دیں۔ ”جینی۔“ وہ بولا۔ ”میرے خیال میں ہمیں پولیس کے پاس جانا چاہیے۔“

جینی ہچکچائی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اسی نتیجے پر پہنچے گا۔ وہ قانون کو ہاتھ میں لینا ہرگز پسند نہیں کرتا تھا لیکن جینی پولیس کے پاس جانا نہیں چاہتی تھی، تاہم وہ اس معاملے کو نیویارک کے حکام سے کس طرح پوشیدہ رکھ سکتی تھی؟ اسے بہت سی معلومات حاصل ہو چکی تھیں اور اس کا یہ اخلاقی فرض بھی تھا کہ پولیس کو اس سے لاعلم نہ رکھے۔ اب اسے پہلی بار احساس ہوا کہ شاید اس کی جان خطرے میں ہے۔ ”میں انکار نہیں کر سکتی جیکسن۔“ بالآخر اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

”کرنا بھی نہیں چاہیے۔“ جیکسن نے جواب دیا۔

”میں جانتا ہوں، یہ صحافت کی شان کے خلاف ہے لیکن دانشمندی کا تقاضا یہی ہے۔“

”اگر پولیس ہیڈ کوارٹر میں تمہارا کوئی اچھا دوست ہے تو ممکن ہے، اس سے بات کی جا سکے۔“

”ہاں، میرا ایک دوست ہے۔“ جیکسن نے جواب دیا۔ ”اس کا نام مارٹن ہے۔“

☆☆☆

جیکسن نے مرکزی پولیس ہیڈ کوارٹر کے قریب ہی ایک اطالوی ریستوران میں مارٹن سے ملاقات طے کر لی تھی۔ اس کے داخل ہوتے ہی مارٹن نے مزاحیہ انداز میں اسے سیلوٹ کیا۔

”مارٹن!“ وہ اپنی نشست سنبھالنے کے بعد بولا۔

”میرے ایک آدمی کو ایک مسئلہ درپیش ہے۔“

”مسئلے کی نوعیت کیا ہے؟“

”لاشیں۔“

”پوری بات بتاؤ۔“ مارٹن نے برگر سے انصاف کرتے ہوئے کہا۔

”ہماری ایک رائٹر ہے جینی چرچل......!“

”تم نے ایک بار اسے مجھ سے ملوایا تھا۔“

”ہاں، وہی۔ وہ چند ہی لمحوں میں یہاں پہنچنے والی ہے لیکن میں پہلے ہی دو چار باتیں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں۔“ جیکسن نے کہا۔ ”بات دراصل یہ ہے کہ اس نے پلاسٹک سرجری کرائی تھی۔ ایک حادثے میں اس کا چہرہ مسخ ہو گیا تھا۔ شاید تمہیں یقین نہ آئے لیکن وہ سرجن جس نے اس کی پلاسٹک سرجری کی تھی، اس نے دوسری خواتین کو بھی اس کی شکل پہلے ہی دے رکھی تھی۔“

”پھر؟“ مارٹن نے نگاہ اٹھائے بغیر کہا۔

”پھر یہ کہ...... ہم سمجھتے ہیں، یہ ایک غلط بات ہے۔“

”ہمارے پاس غلطیوں کا ایک مردہ خانہ ہے۔“ مارٹن نے بدستور برگر سے انصاف کرتے ہوئے کہا۔

”جہاں تک شکلوں کا چربہ اتارنے کی بات ہے، اسے معمولی بے ضابطگی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور اس کے خلاف مقدمہ دائر کیا جا سکتا ہے۔ میں اس سے متفق ہوں کہ اس سے تمہیں کوئی سروکار نہیں، لیکن جینی اس بات کی تہ تک پہنچنا چاہتی تھی کہ ایسا کیوں ہوا، چنانچہ اس نے دوسری عورتوں کا سراغ لگانا شروع کر دیا......!“

”ہاں، میں سمجھ رہا ہوں۔“

”ان عورتوں میں سے ایک لاپتا ہے اور دوسری قتل ہو گئی ہے۔“

مارٹن نے ہاتھ روک لیا۔ ”یہاں؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں!“ جیکسن نے جواب دیا۔ ”ایک کیلی فورنیا

میں اور دوسری واشنگٹن میں۔"
"میرے علاقے سے باہر ہے۔" مارٹن بولا۔
"ہاں، میں جانتا ہوں مگر وہ سرجن یہاں رہتا ہے۔" جیکسن نے کہا۔ "اور جینی کا خیال ہے کہ اس گمشدگی اور قتل کے پیچھے اسی سرجن کا ہاتھ ہے۔"
"کیوں؟"
"یہ میں نہیں جانتا کہ اس ڈاکٹر کے دماغ میں کیا ہے لیکن یہ ڈاکٹر تین عورتوں کو ایک ہی شکل دیتا ہے۔ عام پلاسٹک سرجن ایسا نہیں کرتے۔"
"تم پلاسٹک سرجری پر عبور رکھتے ہو؟"
"تھوڑا بہت جانتا ہوں...... میں نے معلومات کی ہیں۔"
"وہ کوئی پاگل لگتا ہے۔ اس سے میرا کوئی سروکار نہیں۔"
"ان میں سے اچانک ایک عورت لاپتا ہو جاتی ہے، دوسری قتل کر دی جاتی ہے اور اس کی لاش سربریدہ ہو جاتی ہے، کیا یہ عجیب بات نہیں لگتی کہ ایک ہی پلاسٹک سرجن سے پلاسٹک سرجری کرانے کے بعد دو ہم شکل عورتوں کے ساتھ یہ واقعات پیش آتے ہیں۔"
"اتفاقات کی بنیاد پر کوئی کیس نہیں بنتا، جیکسن۔" مارٹن نے کہا۔ "بہرحال میں اسے چیک کروں گا۔ لاس اینجلس اور واشنگٹن سے رابطہ کروں گا۔ وہاں میرے کچھ دوست ہیں۔"
"مارٹن!" جیکسن بولا۔ "یہ جو میری رائٹر ہے نا، جینی...... میں ایک طرح سے اسے پسند کرتا ہوں اور......!"
"ہاں، ہاں، وہ تو میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔" مارٹن مسکرایا۔ "تم اس کی وجہ سے پریشان اور خوف زدہ ہو کہ کہیں اس کے ساتھ کوئی واقعہ نہ پیش آ جائے۔"
"ہاں یہی بات ہے۔" جیکسن نے تسلیم کیا۔ "اگر اس ڈاکٹر کے بارے میں میرا خیال درست ہے تو جینی کے ساتھ کچھ بھی پیش آ سکتا ہے۔"
"ہم اسے زیرِ نگرانی رکھیں گے۔" مارٹن نے کہا۔ "لیکن تمہیں کچھ زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ ٹھیک ہے، یہ چہروں کا معاملہ کافی دلچسپ لگتا ہے۔ میں نہیں جانتا، یہ پلاسٹک سرجن کرتے کیا ہیں۔ تم مجھے باخبر رکھو اور اپنی اس لڑکی سے کہو کہ کوئی خطرہ مول نہ لے، یا بہتر ہے، ہم دونوں ہی اس سے کہیں گے۔"
اسی وقت جینی چہل ریستوران میں داخل ہوئی اور سیدھی ان کی میز پر آ گئی۔ اس کے اور مارٹن کے درمیان ہیلو، ہائے کا تبادلہ ہوا اور پھر وہ دونوں مطلب پر آ گئے۔
"دیکھو مارٹن!" وہ بولی۔ "کچھ اور عورتیں بھی ہو سکتی ہیں۔"
"اچھا......!" مارٹن نے حیرانی سے کہا۔ "کیا تم ہم سے کچھ چھپا رہی ہو؟"
"نہیں۔" جینی نے جواب دیا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ ڈاکٹر میڈ اس چار شہروں میں پریکٹس کرتا ہے۔ نیویارک، لاس اینجلس، واشنگٹن اور بوسٹن...... میں تین ہم شکل خواتین سے واقف ہوں، جو تین مختلف جگہوں سے تعلق رکھتی ہیں پھر چوتھی کیوں نہیں ہو سکتی؟"
"یہ اچھا سوال ہے۔" مارٹن نے کہا۔
"میرے خیال میں، مجھے چوتھی کا بھی سراغ لگا کر چیک کر لینا چاہیے۔" جینی بولی۔
"تمہیں کوئی اشارہ ملا ہے؟" مارٹن نے پوچھا۔
"نہیں۔" جینی نے جواب دیا۔ "میں تو یہ بھی نہیں جانتی کہ وہ کون ہے یا اس کا کوئی وجود بھی ہے۔"
مارٹن نے کچھ کہنے سے پہلے ایک لمحہ توقف کیا۔ "بوسٹن میں میرے چند دوست ہیں، تم یہ پتا کرو کہ یہ ڈاکٹر میڈ اس بوسٹن میں کہاں پریکٹس کرتا ہے اور کون کون اس کے مریض ہیں پھر میں سب کچھ معلوم کر لوں گا۔" اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ "میرے خیال میں تم اب بھی اس ڈاکٹر کے زیرِ علاج ہو۔"
"ہاں۔" جینی نے جواب دیا۔ "وہ دو دن بعد ہی میری ہلکی سی سرجری کرنے والا ہے۔"
"تمہیں ڈر نہیں لگ رہا۔"
"اوہ نہیں...... اتنے سارے لوگوں کے درمیان؟ وہ اسپتال میں کوئی غلط حرکت نہیں کرے گا۔ بہت چالاک ہے۔ اس کے علاوہ اگر میں نے اس سے کترانے کی کوشش کی تو وہ مشکوک ہو جائے گا۔"
"دوسرا عمدہ خیال ہے۔" مارٹن نے کہا۔ "لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے لیے کسی پرائیویٹ نرس کی خدمات حاصل کر لو۔"
"کیوں؟"
"کیونکہ تمہارا گھر واحد جگہ ہے جہاں تم تنہا ہو گی۔"
جینی نے ایک لمحہ سوچا۔ وہ کسی بھی قسم کی احتیاط کے حق میں نہیں تھی۔ لیکن ایک اعلیٰ درجے کا سراغ رساں اسے

یہ مشورہ دے رہا تھا اور اس کیس میں دلچسپی لیتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ''بہتر ہے۔'' وہ بولی۔ ''میں ایسا ہی کروں گی۔''

☆☆☆

ڈاکٹر میڈ اس بے حد مسرور تھا۔ آج ہی وہ دن تھا۔ وہ اپنے پرائیویٹ دفتر سے نکلا اور شایگان اسپتال کی سمت روانہ ہو گیا۔ لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ وہ جونہی ٹیکسی میں سوار ہوا تھا، سڑک کے دوسری طرف کھڑی ہوئی ایک کار کا انجن اسٹارٹ ہو گیا تھا اور وہ اس کے تعاقب میں چل پڑی تھی پھر اس کار میں موجود آدمی نے ڈرائیونگ سیٹ کے پاس ہی نصب ایک ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا تھا اور ایک نمبر دبایا۔ ''موکل ٹیکسی میں جنوب کی سمت رواں ہے۔ منزل نامعلوم ہے۔'' اس نے ماؤتھ پیس میں کہا۔ وہ سارجنٹ بیلے تھا۔ مارٹن نے اسے ڈاکٹر کی نگرانی کے لیے مقرر کیا تھا لیکن صرف بیلے ہی اس کام پر مامور نہ تھا، بلکہ مارٹن نے مختلف اوقات میں ڈاکٹر کی نگرانی پر مزید تین سراغ رساں تعینات کر دیے تھے۔ اس کے پاس ڈاکٹر کے فون کو ٹیپ کرنے کا عدالتی اجازت نامہ بھی تھا۔

ڈاکٹر میڈ اس اسپتال پہنچ کر ایک بیان تیار کرنے لگا جو اسے پولیس کو دینا تھا اور جس کے مطابق جینی جرچل ایک مہلک غفلت کا شکار ہو کر بے وقت مر گئی تھی۔ ادھر وہ اس تیاری میں مصروف تھا اور ادھر جیکسن اور مارٹن بذریعہ ٹرین بوسٹن روانہ ہو رہے تھے۔

جینی ٹھیک دس بجے اسپتال پہنچی اور ڈاکٹر کی نگرانی پر مامور ایک سراغ رساں کے قریب سے گزرتی ہوئی عمارت میں داخل ہو گئی۔ اسے کوئی علم نہیں تھا کہ وہ کون تھا کیونکہ مارٹن نے اپنے پلان سے متعلق اسے آگاہ نہیں کیا تھا۔

چند لمحے بعد ڈاکٹر میڈ اس نے اس کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ اس وقت اس کے جسم پر سبز رنگ کا سرجیکل گاؤن اور سر پر اسی رنگ کی کیپ تھی۔ گاؤن کے نیچے، اس کی جیب میں ایک چھوٹی سی شیشی تھی جس میں ایک خاص محلول تھا۔ وہ محلول جینی کو ہلاک کر دیتا اور یوں اس کے سارے مسائل کا خاتمہ ہو جاتا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے سرجری سیکشن میں واقع ڈرگ اسٹور کا ایک چکر لگایا۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ ہر روز وہاں کے کئی کئی چکر لگایا کرتا تھا۔ بیشتر ڈاکٹروں کی طرح اس کے پاس بھی اسٹور کی چابی ہوا کرتی تھی۔

بارہ بجے وہ تیزی سے اسٹور میں داخل ہو گیا، ایک کیبنٹ کھولا اور جلدی سے اصلی شیشی کی جگہ وہ زہریلے محلول والی شیشی رکھ دی۔ دونوں ایک جیسی لگتی تھیں۔ ان کا محلول بھی یک رنگ تھا۔ ڈاکٹر میڈ اس چیزوں کی نقل تیار کرنے کا ماہر تھا پھر وہ اسٹور سے نکل کر اطمینان سے ہال سے گزرنے لگا۔ سامنے سے نرس ربی آ رہی تھی۔ وہ رک گیا اور مسکرا کر اسے دیکھنے لگا۔ ''تم کچھ تھکی تھکی سی نظر آ رہی ہو۔'' وہ یہ آواز بلند بولا تاکہ دوسرے ڈاکٹر بھی سن سکیں۔ ''تم نے کہا تھا کہ تمہارے اوپر کوئی ذہنی دباؤ ہے، میں تو بے حد متفکر ہو گیا ہوں۔''

''میں بالکل ٹھیک ہوں ڈاکٹر۔'' ربی نے جواب دیا۔

''تم بہت اچھی ہو۔ میں تمہیں اپنے عملے میں شامل کر کے خوش ہوں۔'' وہ آگے بڑھ گیا لیکن وہ اس ڈاکٹر کو نوٹ کر چکا تھا جس نے ان کی باتیں سنی تھیں، تاکہ بعد میں وہ ڈاکٹر اس کی حمایت میں یہ کہہ سکے کہ اس نے ڈاکٹر میڈ اس کو مس ربی سے یہ کہتے سنا تھا کہ وہ ذہنی دباؤ کا شکار تھی۔

نرس ربی بڑے اعتماد سے اسی ڈرگ اسٹور میں داخل ہوئی اور کیبنٹ کھول کر وہ شیشی اٹھائی جو ڈاکٹر میڈ اس چند ہی منٹ پہلے وہاں رکھ گیا تھا۔ اس نے وہ شیشی اپنے چھوٹے سے طشت میں رکھی اور آپریشن تھیٹر کی سمت گامزن ہو گئی، جہاں جینی جرچل دو گھنٹے سے بھی کم مدت میں چھری تلے آنے والی تھی۔

☆☆☆

''یہ دیکھو۔'' مارٹن نے ایک مقتولہ کی فائل کھنگالتے ہوئے اچانک کہا۔ ''رات کے پچھلے پہر قتل ہوئی تھی اور اس کا سر غائب تھا۔''

وہ اور جیکسن صبح سویرے بوسٹن پہنچے تھے۔ ''ٹھیک ہے۔'' جیکسن نے کسی جوش و خروش کا مظاہرہ کیے بغیر کہا۔ ''ہمیں اور بھی دو عورتوں کی سربریدہ لاشوں کی رپورٹ ملی ہے مگر وہ جینی سے مشابہت نہیں رکھتیں۔''

''ہاں! لیکن میں اس مقتولہ کی بات کر رہا ہوں۔'' مارٹن نے کہا۔

''یہ مقتولہ جینی کی ہم عمر تھی، لیکن اس کی فیملی یا خاندان کے بارے میں کچھ بھی نہیں لکھا ہوا تھا۔ وہ تنہا رہتی تھی، جبھی یہاں اس کی کوئی تصویر بھی نہیں ہے۔ غالباً کسی نے اس کی تصویر نہیں لی۔''

''اس کے بارے میں کیا لکھا ہے؟''

''ٹیلی فون کمپنی میں شعبۂ آپریٹر تھی۔ وہ کمپنی کے لوگوں کو یقیناً جانتی ہوگی۔'' دونوں فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔

پولیس فائل بندی اور مقامی فون کمپنی کے سیکیورٹی آفس سے رابطہ کرنے کے لیے بھاگے، وہ کسی بھی ایسے شخص سے بات کرنا چاہتے تھے جو اس مقتولہ سے واقف ہو جس کی سر بریدہ لاش دریافت ہوئی تھی۔

☆☆☆

ٹھیک ایک بج کر پندرہ منٹ پر نرس رمی اور ایک اردلی، جینی کو اسٹریچر پر لٹا کر آپریشن تھیٹر میں لے جانے لگے۔ جینی نے راستے میں ڈاکٹر میڈاس اور بالائی منزل پر سے جھانکتے ہوئے تقریباً چالیس پچاس مریضوں کو دیکھا اور مسکرانے کی کوشش کی۔ وہ سچ مچ خوف زدہ نہیں تھی۔ اس کا ذہن جیکسن اور مارٹن میں الجھا ہوا تھا جو اس وقت بوسٹن میں تھے۔ پھر اس کی آواز سمع برگوش ہوئی۔ ”خواتین و حضرات!“ وہ اپنے شاگردوں سے مخاطب تھا۔ ”میں بے حد فخر سے ایک شاندار خاتون کو آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ ایک نہایت دلکش مریضہ...... جینی چرچل، میری پسندیدہ ترین مریضاؤں میں شمار ہوتی ہے۔ یہ ایک جریدے نی سا (NISA) کی رپورٹر ہیں۔“

ہر طرف سے داد و تحسین کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ ڈاکٹر میڈاس اپنے شاگرد، ڈاکٹروں کے منہ سے اپنی تعریف سن کر بے حد خوش ہوتا تھا۔

”مس جینی چرچل! آپ کیسا محسوس کر رہی ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”بہت ہی اچھا۔“ جینی نے جواب دیا۔ وہ ان دیگر ڈاکٹرز کی موجودگی میں اور کیا کہہ سکتی تھی۔ کیا یہ کہ ڈاکٹر خطرناک جنونی ہے۔ اسے یہ سوچ کر عجیب لگا، اگر میڈاس کو اس کے خیالات کا علم ہو گیا تو وہ کیا کرے گا۔ ڈاکٹر میڈاس نے دزدیدہ نظروں سے نرس رمی کی طرف دیکھا جو سرجری کے اوزار میز پر ترتیب سے رکھ رہی تھی۔

سارا مسئلہ! ڈاکٹر نے سوچا، چند ہی منٹوں میں ختم ہوا چاہتا ہے۔

☆☆☆

دو بجے جیکسن اور مارٹن، ایک کالج کے طالب علم کو جینی کی تصویر دکھا رہے تھے جس نے کچھ عرصے تک ٹیلی فون کمپنی میں شبینہ آپریٹر کی حیثیت سے کام کیا تھا۔

”ہاں، یہی ہے وہ۔“ طالب علم نے تصویر دیکھ کر کہا۔ ”یہ اولینڈا کی تصویر ہے۔“

”تمہیں پورا یقین ہے کہ یہ اولینڈا ہی ہے؟“ مارٹن نے پوچھا۔

”اس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔“ لڑکے نے جواب دیا۔ ”گاہے گاہے میری اس سے بات ہوتی رہتی تھی۔ وہ اس دنیا میں بالکل تنہا تھی۔ نہ تو اس کی کوئی فیملی تھی اور نہ ہی کوئی دوست یا سہیلی تھی۔“

”جیکسن!“ مارٹن، جیکسن کی جانب مڑا۔ ”یہ پولیس کیس ہے۔“ اس وقت دو بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے۔

☆☆☆

ڈاکٹر میڈاس آپریشن تھیٹر میں اپنے شاگردوں، ملاقاتیوں اور مریضوں کے درمیان گھرا ہوا، جینی کے دائیں کان کی پلاسٹک سرجری کر رہا تھا۔ ساتھ ہی کبھی کبھی نگاہ اٹھا کر رمی کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ ایسے میں اس کی نگاہیں نرس رمی کا جائزہ لے لیتیں۔ ہر کام کو بخیر و خوبی انجام پاتا تھا۔ ”نرس رمی!“ وہ بولا۔ ”ذرا اس ٹانکے کو دیکھنا۔“

”کون سا؟“ نرس رمی نے تصدیق کرنے کے خیال سے پوچھا۔ ”یہ......؟“

ڈاکٹر نے اسے سخت گیر نظروں سے گھور کر دیکھا۔ ”بے شک؟“ اس نے خشونت سے کہا۔ ”اور تم اچھی طرح جانتی ہو۔“ پھر دوسروں کو سنانے کی غرض سے بہ آواز بلند گویا ہوا۔ ”گھر کی فکر چھوڑ کر اپنے کام پر دھیان دو رمی۔“

نرس نے اپنے دفاع میں کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے نظریں جھکالیں۔ ڈاکٹر نے اپنے شاگردوں کو مخاطب کیا۔ ”کیا آپ جانتے ہیں کہ اس مریضہ کے کان کی دوبارہ ساخت کے لیے اس کی پسلی کی ہڈی استعمال کی گئی ہے۔ چند ماہ پہلے یہ کری ہڈی مریضہ کی پسلی سے نکالی گئی تھی، جسے میں نے کان کی شکل دے دی۔ مریضہ کا بایاں کان حادثے میں بچ گیا تھا۔ چنانچہ ہم نے اسی کے مطابق دائیں کان کو ڈیزائن کیا ہے۔“ وہ جانتا تھا کہ مہلک انجکشن تیار تھا اور یہ چند ہی لمحوں کی بات تھی۔

اس نے ایک بار پھر نرس کی طرف دیکھا۔ ”نرس! سرنج تیار کرو۔“

مس رمی نے سرنج بھر لی۔ اب جینی موت سے صرف چند سیکنڈ دور تھی۔

ڈاکٹر نے اپنے ذہن میں اپنے ردِعمل کی ریہرسل کر لی۔ ایمرجنسی، وحشت، ہنگامہ، افراتفری، چیخ و پکار، نرس رمی پر گرجنا، برسنا۔ ”مریضہ کو انجکشن لگا دو۔“ اس نے کہا۔ اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا اور پیشانی پر پسینا پھوٹ پڑا۔ بس، اب چند سیکنڈ اور۔ اس نے سوچا اور اس کی نگاہیں سرنج میں موجود لال رنگ کے محلول اور رمی کی تجربہ کار

انگلیوں پر مرکوز ہو گئیں۔ نرس نے سوئی کی نوک جینی کی جلد پر رکھ دی۔ ''اس سے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔'' وہ بولی۔

جینی نے اپنا رخ ذرا سا دوسری طرف پھیر لیا۔ نرس نے دوبارہ سوئی کی نوک اس کی جلد پر رکھ دی اور دھیرے سے اندر کر دی۔ سرنج کا محلول یکساں رفتار سے چند ہی سیکنڈ میں جینی کے جسم میں اتر گیا۔ ڈاکٹر کی نگاہیں سرنج پر مرکوز تھیں۔ سرنج خالی ہو چکی تھی۔ مس رمی نے سوئی کھینچ لی۔

''انجکشن مکمل ہو گیا۔'' وہ بولی۔

''اس سے زخم کے بھرنے میں مدد ملے گی۔'' ڈاکٹر میڈاس نے بڑھ کر اس جگہ کو دیکھتے ہوئے کہا جہاں انجکشن دیا گیا تھا اور اپنے شاگردوں کی طرف دیکھا۔ انہوں نے یقیناً اس کا جملہ سن لیا تھا۔ وہ انتظار کرنے لگا۔ ایک ہی منٹ میں اس کا جسم اینٹھنے لگے، اس نے سوچا۔ یہ سارے لوگ دیکھیں گے کہ جینی ان کی نگاہوں کے سامنے چل بسے گی۔ وہ اسے جھنجوڑے گا، مدد کے لیے چیخے گا، اس کی جان بچانے کی کوشش کرے گا۔

پچیس سیکنڈ گزر گئے۔ ڈاکٹر کو امید تھی کہ اس کا خاتمہ اذیت ناک نہ ہوگا۔ وہ اب بھی اسے پسند کرتا تھا۔ یہ چہرہ اس کے خوابوں کی تعبیر تھا۔ اس نے اسے بچانوے کے عشرے کا چہرہ قرار دیا تھا۔ مزید تیس سیکنڈ گزر گئے پھر پورا ایک منٹ گزر گیا۔ ڈاکٹر کو خیال گزرا کہ اس نے اس کے عضلات میں خفیف سی اینٹھن دیکھی ہے۔ وہ مزید انتظار کرنے لگا۔ لمحات دھیرے دھیرے گزرتے جا رہے تھے لیکن وہ خفیف سی اینٹھن کسی دورے میں تبدیل نہ ہو سکی۔

کچھ لوگ زیادہ وقت لیتے ہیں۔ اس نے سوچا۔ ''جب مریضہ اپنے کمرے میں بھیج دی جائے گی تو میں آپ لوگوں کو وہاں لے جاؤں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ اس کی نفسیاتی حالت کا مشاہدہ کریں۔'' اس نے اپنے شاگردوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

'اب بھی کچھ نہیں ہوا۔ یہ ہے کیا؟' اس نے سوچا۔ ''خاتون آہن'' پھر دو منٹ اور گزر گئے، کچھ نہیں ہوا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، اب تک تو اسے ہر صورت میں......

''ذرا سوچو! اگر میں نہ ہوتی......'' ڈاکٹر میڈاس کی سماعت سے نرس رمی کی سرگوشی ٹکرائی۔

''معاف کرنا۔'' وہ بول پڑا۔

''ڈاکٹر! آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟''

''ہاں، تم نے ابھی کیا کہا؟''

''اوہ۔ میں آپ کو پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔''

اچانک گویا کسی غیر مرئی شے نے ڈاکٹر کا سینہ جکڑ لیا ہو۔ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ ''یہ کیا کہہ رہی تھی؟'' ''تم نے جو کہا تھا ذرا اسے دہراؤ۔'' وہ سفاک لہجے میں بولا۔ ''شرمانے کی ضرورت نہیں۔''

''وہ دوا، جو ہم نے ابھی استعمال کی تھی۔'' نرس گھبرا کر بولی۔ ''میں وہ دوا لینے سپلائی روم میں گئی تھی......''

''بک بھی چکو۔'' ڈاکٹر کی آواز کسی چابک کے مانند لہرائی۔

نرس ڈاکٹر کے قریب ہو گئی۔ ''جب میں نے وہ شیشی اٹھائی۔'' وہ سرگوشی میں بولی تاکہ جینی نہ سن سکے۔ ''تو میں نے غور کیا کہ اس میں سے بلبلے اٹھ رہے تھے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے سوچا کہ دوا خراب ہو گئی ہے یا ممکن ہے فیکٹری سے ایسی آئی ہو۔ چنانچہ میں دوسری تازہ دوا کی شیشی لے آئی۔''

ڈاکٹر میڈاس اسے ایک ٹک دیکھتا چلا گیا۔ اس کے دل و دماغ پر گویا بجلی گر پڑی تھی، لیکن چہرے پر نمودار ہونے والے زلزلے کے آثار کو اس کے سبز ماسک نے چھپا دیا تھا۔ اس کی سانس سینے میں رک گئی تھی۔ ''خدا کی پناہ!'' وہ گھٹی گھٹی سی مرتعش آواز میں بولا۔ ''تم کمال کی نرس ہو۔ یہ حاضر دماغی، اتنی احتیاط، شکریہ نرس رمی، میں اپنے رویے پر معذرت چاہتا ہوں۔ تم نے مس جینی چرچل کی جان بچالی ہے۔''

''کوئی بات نہیں ڈاکٹر......'' نرس نے انکساری سے کہا۔

ساری منصوبہ بندی، سارا تخمینہ، سب کچھ تباہ ہو گیا تھا اور اس عقابی نظروں والی نرس کے ہاتھوں تباہ ہو گیا تھا۔ جینی زندہ رہے گی۔ اس سے دہشت ناک بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ وہ اب بھی تباہ کن ثابت ہو سکتی تھی۔ وہ اب بھی ڈاکٹر کو اور اس کے طلسماتی کیریئر کو تباہ کر سکتی تھی۔ غصہ اس کے سینے میں کسی اژدہے کے مانند بل کھانے اور پھنکارنے لگا۔ 'اب تم کیا کرو گے؟' اس نے خود سے پوچھا۔ 'اس سے کیسے نجات حاصل کرو گے؟'

پندرہ منٹ بعد جینی کو اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

ٹھیک پانچ منٹ بعد اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے فون کی طرف نظر ڈالی۔ وہ اب بھی اسے دھندلا، دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔ یہ دوا کا اثر تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر

ریسیور اٹھانا چاہا، لیکن وہ [illegible] بالآخر وہ اسے تھامنے اور کان سے لگانے میں کامیاب ہوگئی۔ ''ہیلو۔'' وہ نشیلی آواز میں بولی۔

''کیا پی رکھی ہے؟'' دوسری طرف سے جیکسن کی آواز سنائی دی۔ وہ اس وقت بوسٹن کے لوگان ائرپورٹ پر مارٹن کے ساتھ تھا اور ایک ٹیلی فون بوتھ سے بول رہا تھا۔

''کتنی عجیب بات ہے۔'' جینی نے کہا۔ ''کہ تم مجھ سے ایسی بات کہہ رہے ہو۔ میں نے بھی پی ہے؟ میں تھوڑی دیر قبل ہی آپریشن تھیٹر سے نکلی ہوں۔''

''معاف کرنا۔'' جیکسن ہولے سے ہنسا۔ ''تمہاری آواز ہی اتنی نشیلی ہو رہی ہے کہ مجھ پر بھی نشہ سا چھا رہا ہے۔ تمہارا ڈھانچا کیسا دکھائی دے رہا ہے۔ کہیں اس ڈاکٹر نے اس میں کوئی تبدیلی تو نہیں کر دی؟ اگر ایسا ہوا تو ہماری کہانی کے پرخچے اڑ جائیں گے۔''

''جیکسن! سچی بات تو یہ ہے کہ میں نہیں جانتی کہ میں کیسی نظر آرہی ہوں۔'' وہ بولی۔ ''ابھی انہوں نے مجھے آئینہ فراہم نہیں کیا ہے۔'' اگرچہ اس کے ذہن پر کہر سی چھائی ہوئی تھی پھر بھی اسے یہ ادراک ہوگیا تھا کہ جیکسن، بوسٹن سے فون کر رہا تھا پھر اس کی سماعت سے کسی جیٹ طیارے کے انجن کی آواز ٹکرائی۔ ''تم ائرپورٹ سے بول رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں! لوگان ائرپورٹ سے۔'' جیکسن نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ بولی۔ ''بتاؤ کیا رہا؟''

جیکسن نے ایک گہری سانس لی۔ وہ اسے فون پر کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا مگر اسے بتانا تھا۔ ''ہم نے تم سے مشابہ چوتھی لڑکی کا سراغ لگا لیا۔'' وہ بولا۔

''اور؟'' جینی کا دل بے اختیار دھڑک اٹھا۔

''وہ بھی اسی طریقے سے قتل کی گئی تھی۔'' جیکسن نے انکشاف کیا۔

''میں ..... مجھے ......!'' جینی کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی۔ ''مجھے اس کی توقع تھی۔'' اس نے سرگوشی کی۔ ''کیا مارٹن قائل ہوگیا ہے؟''

''ہاں، ہوگیا۔'' جیکسن نے جواب دیا۔ ''اور اس کا بھی قائل ہوگیا ہے کہ یہ میڈاس کا کام ہے۔ ہم واپس آرہے ہیں۔ کیا پرائیویٹ نرس تمہارے پاس ہے؟''

''وہ کسی بھی لمحے پہنچنے والی ہے۔'' جینی نے بتایا۔ ''جب عام نرسیں چلی جائیں گی تو وہ آجائے گی۔''

اسے اپنے پاس سے ہٹ [illegible] دیا۔ وہ [illegible] لہجے میں بولا۔

''جیکسن، میں تمہیں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ وہ اسپتال میں ایسی کوئی حرکت نہیں کر سکتا۔''

''تم بس محتاط رہو۔'' اس نے نصیحت کی۔

جینی کے لیے یہ بڑی تسلی بخش بات تھی کہ مارٹن اب قائل ہوگیا تھا لیکن اب بھی ایک بڑی رکاوٹ حائل تھی۔ ڈاکٹر کے خلاف ساری شہادتیں واقعاتی تھیں، اس بات کا کیا ثبوت تھا کہ اس نے اپنی مریضاؤں کو ہلاک کیا تھا؟

تین ہم شکل عورتوں میں سے دو مر گئی تھیں اور ایک لاپتا تھی۔ ڈاکٹر میڈاس جنونی ہو سکتا تھا لیکن وہ دھواں اگلتا ہوا پستول کہاں تھا؟ جسے ان ہلاکتوں سے نتھی کیا جا سکتا؟ جینی کا بدترین خدشہ یہ تھا کہ وہ بڑی صفائی سے اپنا دامن بچا لے گا۔

☆☆☆

ماہر نفسیات والٹر فلپ کے فون کی گھنٹی اچانک بج اٹھی۔ آج شام جینی کا اس سے اپائنٹمنٹ تھا۔ فلپ کو امید تھی کہ یہ جینی کا فون نہیں ہوگا اور وہ اپنے اپائنٹمنٹ کو منسوخ نہیں کر رہی ہوگی۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے تاب تھا کہ جینی کس رفتار سے میڈاس کے معاملے میں آگے بڑھ رہی تھی۔

اس نے پہلی گھنٹی پر ہی تڑپ کر ریسیور اٹھا لیا۔ ''ہاں؟''

''ڈیئر فلپ!'' دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''میں میڈاس ہوں...... میں نے اس لیے فون کیا تھا کہ میں جینی چرچل کے کیس کا ازسرِنو جائزہ لے رہا ہوں اور سوچ رہا تھا کہ کیا اس نے تم سے مزید کچھ کہا ہے جو...... مددگار ثابت ہو سکے؟''

''اوہ! نہیں میڈاس!'' والٹر فلپ نے جواب دیا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اب میری طرف سے مشکوک نہیں ہے؟''

''حال میں میری اس سے کچھ زیادہ بات نہیں ہوئی ہے۔'' فلپ نے کہا۔

''وہ جلد ہی تم سے ملنے والی ہے؟'' میڈاس نے پوچھا۔

فلپ نے اس سوال پر غور کیا۔ میڈاس یہ کیوں پوچھ رہا تھا؟ کیا وہ کچھ جانتا تھا؟ ''ہاں آج رات ہماری ملاقات طے ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ وہ میڈاس کو اس ملاقات کے بارے میں بتانا نہیں چاہتا تھا، لیکن وہ جھوٹ بولنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ ممکن ہے جینی نے میڈاس کو کسی وجہ سے اس اپائنٹمنٹ کے

بارے میں بتادیا ہو اور ممکن ہے میڈاس یہ جاننا ہو اور سی اسے آزمارہا ہو؟ پھر وہ اسے مشکوک کیوں بنائے۔

''آج رات؟'' میڈاس نے پوچھا۔

''ہاں، تقریباً آٹھ بجے۔''

''آٹھ بجے؟ اچھا۔'' میڈاس جو معلوم کرنا چاہتا تھا، اسے معلوم ہو گیا تھا۔ ''ڈیئر والٹر فلپ!'' وہ بولا۔ اس کا لہجہ اچانک پُرجوش ہو گیا تھا۔ اس میں بڑی اپنائیت گھل گئی تھی۔ ''میں سوچ رہا تھا، کیا میں سات بجے تمہارے ہاں پہنچ سکتا ہوں؟''

''خیریت تو ہے؟'' فلپ نے کہا۔ ''کوئی مسئلہ آ کھڑا ہوا ہے؟''

''نہیں، کوئی مسئلہ نہیں۔'' میڈاس نے جواب دیا۔ ''میں محض جینی کے کیس کے سلسلے میں تم سے ذاتی طور پر کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

فلپ انکار کر کے اسے اپنا دشمن بنانا نہیں چاہتا تھا۔ ''کیوں نہیں۔'' وہ بولا۔ ''آجانا۔''

دونوں طرف سے سلسلہ منقطع ہو گیا۔ میڈاس کے چہرے پر ایک کشادہ مسکراہٹ تیرنے لگی۔

☆☆☆

وہ ایک ٹیکسی پکڑ کر سات بجے سے کچھ پہلے فلپ کے ہاں پہنچ گیا۔ اسے اس بات کا کوئی علم نہ تھا کہ سراغ رساں اس کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں پہنچ گئے تھے اور کچھ فاصلے پر رک کر بظاہر ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ ان کی نظروں سے میڈاس کی کوئی حرکت پوشیدہ نہیں تھی۔

والٹر فلپ نے مسکراہٹ کے ساتھ اپنے گھر کا دروازہ کھولا۔ ''آجاؤ، میڈاس۔'' اس نے کہا۔ ڈاکٹر میڈاس اندر داخل ہو گیا اور فلپ نے دروازہ بند کر دیا۔

''اس ناخواندہ مہمان کو خوش آمدید کہنے کا شکریہ، والٹر۔'' میڈاس نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں، تمہارا نظام الاوقات میری ہی طرح نہایت سخت ہے لیکن میں جینی کے کیس کے سلسلے میں متفکر تھا۔'' اس نے اپنا کوٹ اتار کر ایک کرسی کی طرف اچھال دیا۔

فلپ کو اس کی یہ حرکت کچھ عجیب سی لگی۔ نفیس اور باوقار ڈاکٹر میڈاس کبھی اپنے کپڑے اس طرح نہیں اچھالتا تھا۔ ''بیٹھو میڈاس!'' فلپ نے ایک مختصر سے لیونگ روم تک اس کی رہنمائی کرنے کے بعد کرسی کی جانب اشارہ کیا۔

''کوئی بات نہیں ڈیئر والٹر۔'' میڈاس نے کہا۔ ''میں ٹیکسی میں بھی بیٹھا ہی ہوا تھا۔ میں ذرا کھڑا رہنا پسند کروں گا۔'' تب فلپ بیٹھ گیا۔

''میں شاید دو مرتبہ یہاں آچکا ہوں۔'' میڈاس نے کہا۔ ''بہت پُرسکون گھر ہے، فلپ.....واقعی بہت شاندار ہے۔''

''شکریہ میڈاس! خود مجھے بھی یہ گھر بے حد پسند ہے۔'' فلپ بولا۔ آج اسے میڈاس کچھ عجیب لگ رہا تھا۔ وہ کبھی اپنے سے کم تر ڈاکٹر کی تعریف نہیں کرتا تھا۔ ''بات کیا تھی؟ میڈاس! یہ جینی کا کیا سلسلہ ہے؟'' اس نے پوچھا۔ اسے یہ سوچ کر حیرت ہو رہی تھی کہ میڈاس نے اپنی مصروفیت ترک کر کے یہاں آنے کی زحمت کیوں کی تھی اور وہ کیا جاننے کے لیے بے قرار تھا۔

میڈاس نے آہستہ سے اپنی جیب سے سیاہ رنگ کا ایک لفافہ نکالا اور اسے کھولنے لگا۔ ''مائی ڈیئر فلپ! یہ جینی کے مشاہدات ہیں، جو شایگان اسپتال میں اس کی حالیہ سرجری کے دوران ایک نرس نے قلمبند کیے ہیں۔'' وہ فلپ کے قریب پہنچ گیا۔ ''یہ رہا، فلپ! ذرا اسے ایک نظر دیکھو۔'' اس نے کاغذات فلپ کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ وہ بغور پڑھنے لگا۔ میڈاس نے دھیرے سے ایک ہاتھ اپنی بغلی جیب میں ڈالا اور پھر وہ ہاتھ بھری ہوئی سرنج سمیت باہر آ گیا۔ والٹر فلپ نے نظر اٹھا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ''میڈاس! کیا یہ رپورٹ درست ہے؟ یہ.....!'' اچانک اس کی نظر میڈاس کے ہاتھ پر پڑ گئی۔ ''میڈاس! یہ کیا.....؟''

میڈاس نے نہایت پھرتی سے سوئی اس کی گردن میں گھسیڑ دی۔ فلپ کے منہ سے ایک آواز بھی نہ نکل سکی۔ اس کی پھٹی پھٹی سی آنکھیں میڈاس پر مرتکز ہو گئی تھیں۔ اس کے حلق سے خرخراہٹ کی سی آواز نکلی اور وہ منہ کے بل فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ ''مجھے افسوس ہے، فلپ!'' میڈاس نے کہا۔ ''لیکن میں سب سے بہتر ڈاکٹر ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہونا چاہیے۔'' پھر اس نے ایک وزنی پیپر ویٹ اٹھا لیا اور فلپ کے سر پر دے مارا، اور اس پر سے انگلیوں کے نشانات صاف کر کے اسے دوبارہ میز پر رکھ دیا۔

اس کے بعد فلپ کی جیبوں کی تلاشی لینے لگا۔ اسے چابیوں کا ایک گچھا فلپ کی جیب سے مل گیا، وہ اسے لے کر ملحقہ کمرے میں چلا گیا اور ہر چابی کو مختلف کیبنٹ پر آزمانے لگا۔ آخر کار ایک چابی ایک کیبنٹ میں لگے ہوئے قفل میں فٹ آ گئی۔ اس نے وہ کیبنٹ کھول لیا۔ اندر ادویات کی چھوٹی بڑی شیشیاں بھری ہوئی تھیں۔ اس نے

ہاتھ اندر ڈال کر قصداً دو چار بوتلیں گرا دیں اور نشہ آور ادویات کی چند بوتلیں نکال کر اپنی جیب میں ٹھونس لیں۔

''ڈکیتی!'' وہ زیرلب بولا۔ اب پولیس رپورٹ ظاہر کرتی کہ کسی نے ڈاکا ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ فلپ نے مدافعت کی اور سر پر لگنے والی ضرب کی تاب نہ لاکر ہلاک ہوگیا۔ ہاں، یہ ممکن تھا۔ میڈاس جانتا تھا کہ ڈپٹی انسپکٹر جنس اس کے جسم پر سوئی کا نشان اور جسمانی نظام میں اس مہلک دوا کا پتا چلالے گا۔ اس نے وہ دوا اس وجہ سے استعمال کی تھی کہ فلپ موقع پر ہی ہلاک ہوجائے، کیونکہ نیویارک میں بے شمار لوگوں کے پاس وہ دوا تھی، جس سے اس نے والٹر فلپ کا کام تمام کیا تھا، پھر کوئی ایک ممتاز پلاسٹک سرجن پر کیوں شبہ کرتا؟

ہر کام بخیر و خوبی انجام پا گیا تھا۔ وہ اطمینان سے فلپ کی مخصوص میز پر جا بیٹھا اور جینی کا انتظار کرنے لگا۔

جینی کو اپنے گھر سے فلپ کے ہاں پہنچنے میں صرف دس منٹ لگے۔ اسے ایک سادہ لباس والا وہاں تک چھوڑنے آیا تھا۔ وہ سیکیورٹی کا آدمی تھا۔ ''میں یہیں تمہارا انتظار کروں گا۔'' وہ کار روک کر بولا۔

''اوہ!'' وہ بولی۔ ''ایسا کرو کہ کسی ریستوران سے کچھ کھا پی کر آجاؤ۔ واپسی نو بجے رکھ لو۔ کیا خیال ہے؟'' سیکیورٹی مین نے شانے اچکائے۔ اگرچہ یہ اس کے اصول کے خلاف تھا لیکن جینی خود نہیں چاہتی تھی کہ وہ باہر کار میں اس کا انتظار کرے تو وہ کیا کرسکتا تھا۔

''بہتر ہے۔'' اس نے کہا اور کار اسٹارٹ کردی۔

جینی زینہ طے کرنے لگی۔ ایسے میں اس نے ایک بات نوٹ کی۔ خلافِ توقع گھر کی ساری کھڑکیوں پر پردے پڑے ہوئے تھے لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ ممکن ہے، والٹر فلپ کسی ایسے مریض کو دیکھ رہا ہو جو خلیے اور رازداری کا متقاضی ہو، اس نے زینہ طے کرنے کے بعد اطلاعی گھنٹی پر انگلی رکھ دی۔

جیکسن دفتر سے نکل ہی رہا تھا کہ معاً فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ''جیکسن!'' وہ ریسیور اٹھا کر ماؤتھ پیس میں بولا۔

''تمہارے لہجے میں ذرا مٹھاس نہیں۔'' دوسری طرف سے مارٹن نے کہا۔

''ہیلو مارٹن۔'' جیکسن گرمجوشی سے بولا۔ ''خیریت تو ہے نا؟''

''ہاں، میں نے تمہیں صرف اس لیے فون کیا ہے کہ بوسٹن کی اس مقتولہ کے جسم پر پایا جانے والا ایک بال ڈاکٹر میڈاس کے بال کا ہم رنگ ہے، کیونکہ ہمارے پاس میڈاس کے بالوں کا کوئی نمونہ تو نہیں ہے لہٰذا یہ صرف مشاہدے کی بات ہے۔''

''میں اس مشاہدے کو تسلیم کرلوں گا۔'' جیکسن نے جواب دیا۔

''رپورٹر کی طرح مت سوچو جیکسن۔'' ڈسٹرکٹ اٹارنی کو یہ ثابت کرنے کے لیے ناکوں چنے چبانے پڑیں گے۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ جینی اس کے بارے میں جاننا چاہے گی، تم اسے فون کرکے بتادو۔''

''وہ گھر میں نہیں ہے۔'' جیکسن نے آگاہ کیا۔ ''آج اس کا اپنے ڈاکٹر والٹر فلپ سے اپائنٹمنٹ تھا۔''

''والٹر فلپ؟'' مارٹن کے لہجے میں حیرت تھی۔

''کیوں، کیا ہوا؟''

''تمہیں پورا یقین ہے کہ وہ وہاں گئی ہے؟''

''ہاں، کیوں؟''

''سنو، مجھے اپنے ایک سراغ رساں سے رپورٹ ملی ہے۔'' مارٹن نے کہا۔ ''میڈاس بھی وہیں گیا ہے۔''

جیکسن سناٹے میں آگیا۔ ''اسے معلوم نہیں ہوگا۔'' چند لمحے بعد وہ بولا، اس کی آواز لرز رہی تھی۔ ''اگر معلوم ہوتا تو وہ کبھی نہ جاتی۔ ممکن ہے، وہ......!''

''میں راکٹ کی طرح وہاں پہنچ رہا ہوں۔'' مارٹن بیچ ہی میں بول پڑا۔ ''تم بھی ٹیکسی پکڑ کر فوراً وہاں پہنچو۔''

''ایک منٹ۔'' جیکسن نے جلدی سے کہا۔ ''تمہارے آدمی ان دونوں کی نگرانی کررہے ہیں۔ تم انہیں خبردار کردو۔''

''ناممکن!'' مارٹن نے جواب دیا۔ ''وہ پرائیویٹ کاروں میں ہیں اور صرف فون پر ہم سے رابطہ قائم کرسکتے ہیں۔ ان کے پاس کوئی ریڈیو نہیں ہے۔ ان سے رابطہ کرنے کی کوئی صورت نہیں۔ ہمارے پاس آلات کی کمی ہے۔''

''آلات کی کمی؟''

''یہ حقیقی زندگی ہے جیکسن۔'' دونوں نے سلسلہ منقطع کردیا اور باہر بھاگے۔

☆☆☆

جینی نے ایک بار پھر اطلاعی گھنٹی بجائی۔ چند سیکنڈ کے بعد اسے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ لیکن وہ آہٹ دروازے کی طرف آنے کے بجائے دور ہوتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔ ''اندر آجاؤ جینی۔'' اندر سے آواز آئی۔ آواز گھٹی گھٹی سی تھی۔ فلپ غالباً عقبی کمرے میں تھا۔

جینی نے ناب گھما کر دروازہ کھول لیا اور اندر قدم رکھا لیکن اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ ''ڈاکٹر فلپ؟''

''آ رہا ہوں۔'' گھٹی گھٹی سی آواز میں جواب ملا۔ غالباً وہ دوسرے کمرے میں اپنے مریض کے پاس تھا۔ جینی بیٹھ گئی اور انتظار کرنے لگی۔ لمحے آہستہ آہستہ گزرتے رہے اور پورا ایک منٹ گزر گیا پھر اس کے عقب میں واقع داخلی گزرگاہ میں قدموں کی آہٹ ابھری۔ ایک دروازہ کھلا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ''ڈاکٹر میڈاس!'' اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

میڈاس تیزی سے اس کے اور باہر کے دروازے کے درمیان حائل ہوگیا۔

''مس جینی! تم سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔'' وہ خوش مزاجی سے بولا۔ ''میں ابھی ڈاکٹر فلپ سے مشورہ کررہا تھا۔''

جینی کے رگ و پے میں سنسناہٹ دوڑ گئی.....

''یہاں؟'' اس نے پوچھا۔

میڈاس نے شانے اچکائے۔ ''ڈاکٹر سے ڈاکٹر ملتے ہی رہتے ہیں۔''

جینی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کا دل بُری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ میڈاس کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتا تھا، بلکہ ڈاکٹرز اس سے ملنے جاتے تھے۔ ''کیا تم میرے بارے میں مشورہ کررہے تھے؟'' اس نے پوچھا۔

''بالکل نہیں۔''

''وہ کہاں ہے؟''

''مس جینی، تم نروس لگ رہی ہو۔''

''ہاں، ڈاکٹر فلپ کہاں ہے؟''

''وہ ایک منٹ میں آیا چاہتا ہے۔''

''بتاؤ تو وہ کہاں ہے؟''

اچانک میڈاس نے پیچھے ہٹ کر باہر کا دروازہ لاک کردیا۔ اب وہ میڈاس سے بھی کسی چابی کے بغیر نہیں کھل سکتا تھا۔

''تم نے یہ کیوں کیا؟'' جینی کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔ اس کے حواس منتشر ہونے لگے۔

''تم اب بھی میرے پیچھے لگی ہوئی ہو، ہے نا جینی؟'' وہ کھل کر سامنے آگیا۔

جینی ایک جھرجھری سی لے کر رہ گئی۔ وہ جان چکا تھا، کسی طرح جان چکا تھا۔ وہ پیچھے ہٹنے لگی۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔

''ڈاکٹر والٹر فلپ کہاں ہے؟''

''وہ علیل ہے۔''

جینی نے ہال میں قدم رکھا اور بائیں جانب نظر دوڑائی۔ ''میرے خدا۔'' اچانک اس کا منہ دہشت سے کھل گیا۔ ''تم نے اس کے ساتھ کیا کیا؟'' وہ چیخی۔ ''تم نے اس کے ساتھ.....؟''

''جینی پلیز، احمقوں جیسی حرکت مت کرو۔'' وہ بولا۔ ''ہم سب کی ضروریات ہیں۔ کیا نہیں ہیں؟ ضروریات کے غلام ہیں ہم سب.......!''

''میرے ساتھ پولیس ہے۔'' بے اختیار جینی کے منہ سے نکل گیا۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ یہ یاد کر کے کانپ گئی کہ اس نے اپنے محافظ کو ریسٹورنٹ بھیج دیا تھا۔

''مجھے یقین ہے کہ میں جو کچھ بھی کروں گا، پولیس اس پر معترض نہیں ہوگی۔'' وہ سفاکی سے بولا۔

'ہوسکتا ہے وہ اب تک ریستوران سے لوٹ آیا ہو۔' جینی نے سنسناتے ہوئے ذہن سے سوچا۔ 'شاید اس کی چھٹی حس اسے خبردار کردے یا وہ شخص چیک کرنے کے لیے اطلاعی گھنٹی بجادے۔'

''میں نے تمہیں حسن بخشا ہے، جینی۔'' وہ ڈرامائی انداز میں بولا۔ ''لازوال حسن..... لیکن یہ تمہارے لیے کافی نہ تھا۔'' وہ دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ ''تم نے میرے فن پر شبہ کیا، تم نے میرے تجربات کا سراغ لگالیا۔''

''ہاں، میں نے سراغ لگالیا۔'' اچانک جینی نے پھر کر چیلنج کرنے کے سے انداز میں کہا۔

''یہ جرأت رندانہ قابلِ ستائش ہے۔'' وہ اس کے قریب پہنچ گیا۔ ''لیکن تمہیں میرا احسان مند ہونا چاہیے تھا۔'' وہ بولا۔ ''جانتی ہو میں کیا کررہا تھا۔ میں ایک بے عیب صورت تخلیق کررہا تھا۔ میں پچانوے کا چہرہ تخلیق کرنا چاہتا تھا، میں ایک عورت کو لافانی بنانا چاہتا تھا۔'' وہ دھیرے دھیرے اس کے قریب پہنچ رہا تھا۔

''ہاں، ہاں، میں بے شک خود کو لافانی بنانا چاہتا تھا اور بنالیے۔ تمہارے ذریعے...... دوسرے چہرے کم تر چہرے تھے۔ لیکن تم...... میرے فن کا کمال تھیں مگر تم میری ممنون نہیں ہوئیں، لہٰذا اب تمہیں بھی وہیں جانا پڑے گا، جہاں دوسری گئی ہیں۔''

جینی بدستور پیچھے ہٹی جارہی تھی۔ اس کے اور میڈاس کے درمیان فلپ کی لاش پڑی تھی۔ وہ فرار ہونے کا راستہ تلاش کررہی تھی، لیکن وہاں کوئی راستہ نہیں تھا۔

"مجھے کیوں مارنا چاہتے ہو؟" اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر انہیں تر کرتے ہوئے پوچھا۔ "میں جو نقصان تمہیں پہنچانا چاہتی تھی، وہ تو پہنچا چکی۔"

"میں نہیں جانتا۔" یکبارگی وہ چیخا۔ "میں تمہیں ہر حال میں قتل کروں گا۔" اچانک اس کا لہجہ دھیما ہو گیا۔ لیکن اس کی باتیں اتنی زہر آلود تھیں کہ جینی اپنی بنیادوں سے ہل گئی۔

"دیکھو تو! یہ کتنا خوب صورت پلان ہے جینی۔" وہ سفاکی سے مسکرایا۔ "تم اور فلپ یہاں بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ پڑوس کا کوئی لڑکا دوائیاں چرانے گھر میں گھس آیا۔ فلپ نے مدافعت کرنے کی کوشش کی۔ لڑکے نے اس کے سر پر پیپر ویٹ سے ضرب لگا کر اسے ہلاک کر دیا۔ پھر اسے خیال آیا کہ واحد عینی شاہد کو بھی ہلاک کر دینا چاہیے...... ایک خوب صورت پلان۔ تمہیں حسن عطا کرنے کا میرا پلان بھی اتنا ہی خوب صورت تھا۔" اس نے آہستہ آہستہ اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک نشتر نکال لیا۔ "اب تم خوب صورت نہیں رہوگی۔" وہ ملائم لہجے میں بولا۔ "وہ لوگ تمہارا تابوت بھی کھولنے کے قابل نہیں رہیں گے۔ جینی! میرا طریقہ وہی پرانا ہوگا۔" اس نے لپک کر نشتر گھمایا۔ جینی تیزی سے گھوم گئی۔ نشتر اس کے چہرے سے صرف چند انچ کے فاصلے سے نکل گیا۔

"میڈاس! وہ لوگ تمہیں پکڑ لیں گے۔" وہ چیخی۔

"وہ سمجھ جائیں گے کہ یہ کس نے کیا ہے۔ پولیس تمہارے بارے میں جانتی ہے۔ میرا ایڈیٹر جانتا ہے۔"

میڈاس نے سنی ان سنی کر دی اور ایک بار پھر اس کی جانب لپکا۔ جینی فرنیچر کے گرد چکر لگانے لگی۔ وہ میڈاس کو خود سے دور رکھنے کے لیے کرسیوں کو الٹتی جا رہی تھی۔ "وہ سمجھ جائیں گے۔" میڈاس ایک لمحے کے لیے رک گیا۔ گویا نشانہ لینا چاہتا ہو پھر اس پر حملہ آور ہوا۔ "اب مزید کوئی حسین صورت نہیں بنے گی۔" وہ چیخا۔

جینی کی نظر بے اختیار میز پر پڑے ہوئے پیپر ویٹ پر چلی گئی۔ میڈاس نے اسی پیپر ویٹ سے فلپ کے سر پر چوٹ لگائی تھی۔

"اپنی شکل کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" وہ چیخی۔ میڈاس کی آنکھوں میں ایک سوال سا لہرایا۔ وہ ایک لمحے کے لیے اپنی جگہ شل ہو گیا۔ جینی نے نہایت سرعت سے وہ وزنی پیپر ویٹ اٹھا کر اس کے منہ پر دے مارا۔

اس کے منہ سے ایک کرب ناک چیخ نکل گئی۔ اس نے اندھوں کی طرح اپنے بازو فضا میں لہرائے۔ نشتر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا، اور وہ شدت تکلیف سے زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ جینی نے لپک کر وہ نشتر فرش سے اٹھا لیا۔

اب اسے صرف روکے رکھو، اس کا ذہن گویا گونج اٹھا۔ صرف روکے رکھو اور مدد کے لیے پکارو۔ اچانک باہر کسی کار کے پہیے چرچرائے، پھر زینے پر بھاگتے قدموں کی آواز سنائی دینے لگی۔ دروازے کی ناب گھمانے کے ساتھ ہی کوئی دروازے پر مکے برسانے لگا۔ میڈاس لڑکھڑاتا ہوا فرش سے اٹھ کھڑا ہوا اور آخری کوشش کے طور پر اس نے جینی پر جھپٹنا چاہا۔ وہ اس سے نشتر چھیننا چاہتا تھا۔ جینی کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ زندگی اور موت کا کھیل تھا۔ اس نے نشتر اس کے سینے میں اتار دیا۔ ایک لمحے کے لیے میڈاس کی آنکھیں پھٹ گئیں اور وہ منہ کے بل کسی کٹے ہوئے درخت کے مانند فرش پر آ رہا۔ جینی غیر یقینی پھٹی پھٹی نظروں سے اسے ایک ٹک گھورتی چلی گئی۔ فرط دہشت سے وہ اپنی جگہ شل ہو گئی تھی۔ میڈاس مر چکا تھا، جو (نعوذ باللہ) خدا بننا چاہتا تھا۔

دروازہ باہر سے اب بھی پیٹا جا رہا تھا۔ وہ چونک کر جیسے ہوش میں آ گئی۔ اس کے چند لمحے بعد، اندر پولیس کی ایک بھاری نفری اِدھر اُدھر حرکت کر رہی تھی۔ جینی کو یہ سب خواب لگ رہا تھا۔ اس کے حواس اب بھی قابو میں نہیں تھے۔ "فکر مت کرو۔" اسے مارٹن کی آواز سنائی دی۔ "تم نے اسے اپنے دفاع میں ہلاک کیا ہے، کوئی مسئلہ نہیں۔"

اس نے جیکسن کا بازو تھام لیا تھا پھر اس نے محسوس کیا کہ جیکسن کے بازو اس کے گرد حمائل ہو گئے تھے اور وہ اس سے کچھ کہے بغیر اسے مجمع میں سے دروازے کی طرف لے جا رہا تھا۔ یکایک وہ ٹھٹک کر ایک قد آدم آئینے میں اپنا عکس دیکھنے لگی۔ آئینہ کسی نہایت خوش جمال دوشیزہ کا عکس پیش کر رہا تھا۔ اس کے پہلو میں جیکسن کا عکس بھی تھا۔ فرط مسرت سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ عکس خود اس کا تھا، جیکسن بھی اس کا تھا اور ایک شاندار مستقبل بانہیں پھیلائے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ مستقبل جو میڈاس کے فن کا ثمر تھا۔

وہ نیویارک کی جگمگاتی رات میں بانہوں میں بانہیں ڈالے ایک سمت روانہ ہو گئے۔ شہر کے اخبارات جلد ہی اس سنسنی خیز سرخی کے ساتھ پریس میں جانے والے تھے۔

"چہرہ ساز کا قتل" لیکن صرف جینی اور جیکسن ہی پورے واقعات سے باخبر تھے۔

بروقت

ایس۔انور

نہ جانے اس دولت میں ایسا کیا سحر ہے جس پر طاری ہوتا ہے...اس کے دل سے ہر جذبہ اور ہر احساس کو فنا کردیتا ہے... ایک تشدد پسند اور جلد باز شخص کی روداد...اس نے نہایت خاموشی سے اپنی کارروائی کاآغاز کیا تھا...

اس باپ کی بے بسی اور لاچاری جس کی بیٹی کو یرغمال بنالیا گیا تھا

ہنری کریگ کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے اور رنگ پھیکا پڑ رہا تھا۔ جب اس نے میز کی دوسری جانب بیٹھے ہوئے ڈاسن کی جانب وہ خط بڑھایا تو اس کے ہاتھ کپکپارہے تھے۔

”یہ مونا کی رائٹنگ ہے۔ اس کے بارے میں کوئی شک نہیں ہے۔“ ہنری کریگ نے رُندھی ہوئی آواز میں بتایا۔ ”میں اسے کہیں بھی پہچان سکتا ہوں۔ ان لوگوں نے اسے اپنی تحویل میں لے رکھا ہے.... یہ یقینا ہوگن گینگ کا کام

ہے۔۔۔ اور انہوں نے اسے رقم کی خاطر یرغمال نہیں بنایا ہے۔" عمر رسیدہ جج نے ایک بے داغ سفید رومال سے اپنی پیشانی پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "وہ مجھ سے چند دستاویزات مانگ رہے ہیں جو کہ میری تحویل میں ہیں۔ وہ دستاویزات جن کے بارے میں یقین ہے کہ وہ انہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج دیں گی۔ لیکن میں وہ دستاویزات انہیں نہیں دے سکتا! اس لیے تمہیں کسی نہ کسی طرح مونا کو بچانا ہوگا، ڈاسن!"

"میرے بس میں جو کچھ بھی ہے وہ میں کر رہا ہوں، جج۔" فیڈرل ایجنٹ بل ڈاسن کے دبلے پتلے چہرے پر تشویش کے آثار نمایاں تھے۔ "لیکن شروعات کے لیے ہمارے پاس کوئی راہ نہیں ہے کچھ بھی نہیں ماسوائے اس کے کہ تم مجھے ان کاغذات کے بارے میں بتاؤ جو تمہاری تحویل میں ہیں۔ شاید ان کی مدد سے کوئی اشارہ مل جائے کہ وہ لوگ مونا کو کہاں لے گئے ہوں گے۔" یہ کہہ کر ڈاسن نے اس خط کو پڑھنا شروع کیا جو جج نے کانپتے ہاتھوں سے اس کی جانب بڑھایا تھا۔ خط کا مضمون یہ تھا:

پوپ ڈیئر!

مجھے اغوا کیا جا چکا ہے اور قیدی بنا کر رکھا ہوا ہے۔ اگر آپ کو میری زندگی عزیز ہے تو پلیز پولیس کو کچھ مت بتایئے گا۔ آپ کو چوبیس گھنٹوں کے اندر وہ دستاویزات تیار رکھنی ہیں جو آپ کی تحویل میں ہیں۔ یہ لوگ بعد میں آپ سے رابطہ کر کے بتائیں گے کہ وہ دستاویزات کہاں پہنچانی ہیں۔ کوئی احمقانہ حرکت مت کیجیے گا۔ یہ لوگ بے حد خطرناک ہیں اور میں بے حد خوف زدہ ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں نے کن کاغذات کا حوالہ دیا ہے۔ آپ کی پیاری بیٹی۔

مون

"مون؟" بل ڈاسن نے خط کا مکمل مطالعہ کرنے کے بعد سر اٹھا کر جج کی طرف دیکھا۔ "کیا تمہاری بیٹی عام طور پر اپنے خطوط میں یہی ادھورے دستخط کرتی ہے؟"

"نہیں۔ وہ ایسا کبھی نہیں کرتی۔" جج ہینری کریگ نے بتایا۔ "اسے اس طرح کے ادھورے ناموں سے چڑ ہوتی ہے۔" وہ ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اور پھر مجھے اس کا پوپ کہہ کر مخاطب کرنا۔۔۔ یہ ایک ایسا لفظ ہے جو اس نے آج سے پہلے کبھی میرے لیے استعمال نہیں کیا۔"

"یہی وہ ہمیں بتانے کی کوشش کر رہی ہے۔" بل ڈاسن نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "پوپ مولیسن اس معاملے میں ملوث ہے۔"

"پوپ مولیسن کون ہے؟" جج ہینری کریگ نے پوچھا۔

"مولیسن ایک ڈاکٹر ہوا کرتا تھا۔ لیکن وہ پاگل ہو گیا تھا۔ اسے ایک وقت کے لیے پاگل خانے میں قید کر دیا گیا تھا لیکن پھر اسے بے ضرر قرار دے کر پاگل خانے سے رہا کر دیا گیا تھا۔ گرین فیلڈز کے ایک قدیم مکان میں رہتا ہے۔ شاید ہوگن گینگ اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہا ہو۔" یہ کہہ کر بل ڈاسن اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں آج شب اس کے گھر جاتا ہوں اور وہاں کا جائزہ لیتا ہوں کہ کیا حقیقی صورتِ حال ہے۔"

"یہ خطرناک ہوگا۔" جج ہینری کریگ نے کہا۔ "ایک آدمی۔۔۔ تنہا!"

"اگر ہم نے وہاں دھاوا بولا تو ہوگن گینگ کو پتا چل جائے گا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔" بل ڈاسن نے کہا۔ "اس لیے بہتر ہوگا کہ اس مرتبہ وقتی طور پر میں یہ کام تنہا سرانجام دوں۔ یہ زیادہ محفوظ ہوگا۔ تمہاری بیٹی کے لیے!"

ہینری کریگ کانپ کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا۔ وہ ڈاسن کو جاتے دیکھتا رہا۔ پھر تھکے ہوئے انداز میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

نصف گھنٹے بعد فیڈرل ایجنٹ بل ڈاسن نے خود کو گرین فیلڈز کے چھوٹے سے گاؤں میں موجود پایا۔ اس نے ریل روڈ اسٹیشن کے ٹکٹ ایجنٹ سے مولیسن کے مکان کی درست لوکیشن معلوم کر لی تھی۔ اس کا مکان اسٹیشن سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا اس لیے بل ڈاسن نے وہاں تک پیدل ہی جانے کا فیصلہ کیا۔

جب وہ گاؤں کی اندھیری سڑک پر مولیسن کے مکان کی جانب جا رہا تھا تو اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ وہ فوراً ہی لپک کر سڑک کے کنارے پر موجود ایک چٹان کی آڑ میں چلا گیا۔

عین اسی لمحے اس کے عقب میں ایک فائر کی آواز گونجی اور اندھیرے میں شعلہ سا لپک گیا۔

بل ڈاسن فوراً ہی زمین پر لیٹ گیا اور لڑھکنیاں کھانے لگا حتیٰ کہ سڑک کے کنارے اُگی جھاڑیوں تک پہنچ گیا۔ پھر اپنے گھٹنوں کے بل اٹھا اور اپنے شولڈر ہولسٹر میں رکھا ہوا ریوالور نکال لیا۔

پھر جونہی اس کی نگاہ اس حرکت کرتے ہوئے سائے

پڑ پڑی۔ جو حرکت پڑ دکھائی دیا تو اس کا آٹومیٹک ریوالور گرج اٹھا۔ اس سائے کے حلق سے ایک درد بھری چیخ بلند ہوئی اور وہ تیزی سے پیچھے کی جانب پلٹ گیا۔

بل ڈاسن نے ایک اور فائر کر دیا۔ لیکن اس کا وہ نامعلوم حریف تیزی سے ریل روڈ اسٹیشن کی جانب اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

''یہ بُرا ہوا!'' بل ڈاسن بڑبڑایا۔ ''وہ لوگ اب میری تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔ مجھے اپنا کام تیزی سے سرانجام دینا ہوگا۔''

ایجنٹ بل ڈاسن نے چند منٹ تک انتظار کیا۔ پھر تیز تیز قدموں سے سڑک پر چلتے ہوئے مولیسن کے مکان کی جانب روانہ ہو گیا۔

مولیسن کے مکان تک پہنچنے کے دوران اُسے کسی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ وہ مکان قدیم اور پتھروں کا بنا ہوا تھا اور سڑک سے خاصے فاصلے پر تھا۔ وہ چاروں طرف سے درختوں سے گھرا ہوا تھا۔

بل ڈاسن نے اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس مکان کی جانب رینگنا شروع کیا۔ نچلی منزل کی ایک کھڑکی میں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے کھڑکی کے پاس پہنچ کر محتاط انداز سے اندر کمرے میں جھانکا۔

اسے کوئی دکھائی نہیں دیا۔

اس نے چوکنا قدموں کے ساتھ پورچ کی سیڑھیاں عبور کیں۔ پھر جب اس نے اندھیرے سے مانوس نظروں سے داخلی دروازے کا جائزہ لیا تو اسے دروازہ نیم وا دکھائی دیا۔

اسی لمحے اسے مکان کے اندر سے ایک باریک ہسٹریائی چیخ سنائی دی۔ بل ڈاسن بے حس و حرکت کھڑا رہ گیا۔ اس نے اپنی پوری توجہ سننے پر مرکوز کر لی۔

پھر رات کے سناٹے میں وہی چیخ ایک بار پھر گونجی۔

بل ڈاسن نے فوراً ہی اپنا آٹومیٹک ریوالور نکال لیا اور ہال میں داخل ہو گیا۔ نچلے ہال وے کے آخری کنارے ایک بند دروازہ دکھائی دیا۔ اتنے میں وہی چیخ تیسری مرتبہ ابھری۔

بل ڈاسن کو یقین ہو گیا کہ چیخ اس بند دروازے کے پیچھے سے ابھری ہے۔

وہ دبے پاؤں خاموشی کے ساتھ اس بند دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے دروازے کو ہلکے سے دھکا دیا اور جھانک کر اندر کا جائزہ لینے لگا۔

وہ کمرا بظاہر ایک لیبارٹری تھی۔ وہاں ایک میز پر ٹیسٹ ٹیوبز، بوتلیں اور جار دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے برابر میں ایک بھورے بالوں والا ایک دراز قامت شخص موجود تھا جس نے نیلے رنگ کا ایک ڈھیلا ڈھالا لمبا کرتہ پہنا ہوا تھا۔

اس شخص کے مقابل سنہری زلفوں والی ایک خوب صورت لڑکی موجود تھی جس نے زرد رنگ کا ایوننگ گاؤن پہن رکھا تھا۔ وہ لڑکی سیدھی پشت والی ایک کرسی سے بندھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے منڈلا رہے تھے۔ اس کی پھٹی ہوئی آنکھیں تیزاب کی اس چھوٹی گول شیشی پر جمی ہوئی تھیں جو اس دراز قامت شخص نے اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی۔

''نہیں، نہیں۔'' لڑکی گھگیا رہی تھی۔ ''پلیز ڈاکٹر مولیسن تیزاب عمر بھر کے لیے مجھے بدشکل بنا دے گا۔''

''بالکل ایسا ہی ہوگا۔'' ڈاکٹر مولیسن کی آواز درشت اور لہجہ خالمانہ تھا۔ ''میرا بالکل یہی کرنے کا ارادہ ہے۔ میں نے تمہارے بازو پر تیزاب کا جو ایک قطرہ ٹپکایا ہے اس نے تمہیں احساس دلا دیا ہوگا کہ یہ اصلی تیزاب ہی ہے اور یہ تمہیں جلد ہی جھلسا دے گا۔''

''لیکن میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میرے ڈیڈی نے وہ دستاویزات کہاں چھپائی ہوئی ہیں۔'' مونا نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''اس کے علاوہ کیا تم نے مجھ سے وہ خط نہیں لکھوایا تھا جس میں، میں نے ڈیڈی سے کہا ہے کہ وہ تمام متعلقہ کاغذات تمہارے حوالے کر دیں اور بقیہ کچھ بھی......؟''

''ہاں، مجھے معلوم ہے۔'' مولیسن نے کہا۔ ''یہ ہوگن کا آئیڈیا تھا لیکن میں کسی قسم کا کوئی چانس نہیں لینا چاہتا۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ تم جانتی ہو کہ تمہارے باپ کا وہ خفیہ سیف کہاں پر ہے جس میں وہ کاغذات چھپا کر رکھے گئے ہیں۔ جب تیزاب تمہارے چہرے کو مسخ کرنا شروع کرے گا...... تو پھر تمہاری زبان کھل جائے گی اور تم سب کچھ بتا دو گی۔''

پھر جونہی ڈاکٹر مولیسن نے تیزاب کی شیشی بلند کی تاکہ تیزاب کے چند قطرے لڑکی کے چہرے پر ٹپک جائیں تو ایجنٹ بل ڈاسن نے جو دروازے پر کھڑا ہوا یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہا تھا، اپنے ریوالور سے فائر کر دیا۔

گولی ڈاکٹر مولیسن کے بازو میں لگی اور وہ گولی لگتے ہی پیچھے کی جانب گھوم گیا۔ ساتھ ہی اس کی نگاہ بل ڈاسن پر پڑی جو کمرے میں چھلانگ لگا رہا تھا۔ تیزاب کی شیشی مولیسن کے ہاتھ سے نکل کر ہوا میں اچھلی اور دیوار سے

بل ڈاسن نے ایک طرف چھلانگ لگاتے ہوئے خود کو تیزاب سے بچایا جو اَب ہر طرف پھیل گیا تھا۔ پھر جب اس نے دیکھا کہ ڈاکٹر کا ہاتھ اپنی گن نکالنے کے لیے اس کی جیب کی جانب بڑھ رہا ہے تو اس نے ایک اور فائر کر دیا۔

اس مرتبہ گولی نے ڈاکٹر مولیسن کے دل کو نشانہ بنایا تھا۔ وہ بے سدھ فرش پر لڑھک گیا۔

بل ڈاسن لڑکی کی جانب بڑھا۔ اُس نے میز پر سے ایک آلۂ جراحی اٹھایا اور ان رسیوں کو کاٹنے لگا جن کی مدد سے لڑکی کو کرسی سے باندھا ہوا تھا۔ لڑکی کمزوری کے باعث مشکل سے کھڑی ہوئی۔ بل ڈاسن دروازے کی سمت گھوم گیا۔

اتنے میں ہال کی جانب سے دوڑتے قدموں اور پُرجوش انداز میں تیز تیز بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ بل ڈاسن سمجھ گیا کہ ہوگن گینگ کے لوگ یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔

بل ڈاسن لڑکی کی جانب گھوم گیا۔ ''تم کھڑکی سے باہر کود جاؤ۔''

مونا نے ایک لمحے کے لیے بھی کوئی ہچکچاہٹ نہیں دکھائی۔ وہ کھڑکی کی جانب لپکی اور اس کے پٹ کھولنے کے بعد دہلیز پر چڑھ کر باہر کی جانب کود گئی۔

بل ڈاسن لیبارٹری کے دروازے کی جانب لپکا اور اسے ایک جھٹکے کے ساتھ بند کر دیا۔ اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ دروازے میں اندر کی جانب ایک بھاری کھٹکا لگا ہوا تھا۔ اس نے وہ ہیوی بولٹ ساکٹ میں داخل کر دیا۔

بل ڈاسن کے پیچھے ہٹتے ہی دروازے پر گولیوں کی ایک بوچھاڑ پڑی۔ اس نے تیزی سے کمرے میں نظریں دوڑائیں۔ کمرے کے ایک گوشے میں پرانے اخبارات کا ایک ڈھیر دکھائی دیا۔ اس نے فوراً ہی دیا سلائی جلائی اور اخبارات کو آگ لگا دی۔ جونہی اخبارات نے آگ پکڑ لی، بل ڈاسن نے خود بھی کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دی۔

اُسے دروازے پر ضربوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ اسے احساس ہو چکا تھا کہ ہوگن گینگ کے لوگ کسی بھی وقت دروازہ توڑنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

مونا مکان کے عقب میں اندھیرے میں اس کا انتظار کر رہی تھی۔

''آؤ!'' بل ڈاسن نے مونا کا بازو اپنی گرفت میں لیتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں تیزی سے دوڑتے ہوئے یہاں سے دور نکلنا ہوگا۔''

پھر وہ دونوں سڑک کی جانب دوڑنے لگے۔

ابھی وہ سڑک تک بھی نہیں پہنچے تھے کہ مکان کی جانب سے ایک کان پھاڑ دینے والا زوردار دھماکا سنائی دیا۔

''مجھے یقین تھا کہ جب آگ اُن کیمیکلز تک پہنچے گی جو لیبارٹری میں موجود تھے تو دھماکا ہو جائے گا۔'' بل ڈاسن نے کہا۔ ''اور مجھے امید ہے کہ پورا گینگ وہاں اندر موجود ہوگا جب دھماکا ہوا۔''

پھر وہ رک گئے۔

مکان کی جانب اب مکمل خاموشی تھی۔

''وہ ہمارا تعاقب کرتے دکھائی نہیں دے رہے۔'' مونا نے کہا۔ ''کیا تمہارے خیال میں......''

''......کہ وہ تمام کے تمام ہلاک ہو گئے ہیں؟ خدا بہتر جانتا ہے۔ تم یہیں ٹھہرو۔ میں صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے واپس جا رہا ہوں۔'' بل ڈاسن نے کہا۔

پھر جب وہ مکان کی جانب پلٹا تو اسے دور سڑک پر گرین فیلڈز کے باشندوں کا غول دکھائی دیا جو دھماکے کی آواز سن کر جائے وقوعہ کی جانب لپک رہا تھا۔ وہ بے حد جوش و خروش میں تھے۔ بل ڈاسن کو احساس تھا کہ مقامی پولیس بھی اُن کے ہمراہ ہوگی۔

وہ تیزی سے دوڑتا ہوا واپس مولیسن کے مکان تک آ گیا۔ اس نے تباہ شدہ لیبارٹری میں جھانکا۔

وہاں چار افراد دکھائی دیے۔ اُن میں سے تین مر چکے تھے اور ان کے چہرے مسخ ہو چکے تھے۔ البتہ چوتھا زندہ تھا اور اپنا ٹوٹا ہوا بازو تھامے کراہ رہا تھا۔

بل ڈاسن نے اُسے پہچان لیا۔ وہ کرخت چہرے والا گینگ لیڈر ہوگن تھا۔

اس نے بھی بل ڈاسن کو پہچان لیا تھا۔ وہ غرایا۔ ''تم نے آخر ہمیں آن لیا۔ تم صرف ایک فیڈرل ایجنٹ......''

''درست!'' بل ڈاسن نے جواب دیا۔ ''ہم میں سے ہر ایک فیڈرل ایجنٹ تم جیسے چوہوں کے غول کے لیے اکیلا ہی کافی ہے۔'' پھر اس نے گینگ لیڈر کو اپنے آٹومیٹک ریوالور کی زد میں لے لیا اور مقامی پولیس کے پہنچنے کا انتظار کرنے لگا۔

وہ ایک کچا مکان تھا۔

مکان کیا، صرف دو کمرے تھے۔ ایک صحن، ایک باورچی خانہ، ایک غسل خانہ۔ بس اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔

ایک کمرے میں اس کی رہائش تھی اور دوسرا کمرا اس کے بیٹے نورو کا تھا۔ جو شہر سے واپس آنے والا تھا۔ ویسے اسے شہر گئے ہوئے پانچ برس گزر چکے تھے۔ اس دوران وہ اپنے باپ کو پیسے بھیجتا رہا تھا۔ شاید اسے کوئی اچھی نوکری مل گئی تھی۔

کرم دین ان پیسوں میں سے بہت کم خرچ کیا کرتا، باقی پیسے وہ سنبھال کر اپنے گھر میں ہی رکھتا تھا۔ نورو کی شادی کے لیے۔ اس نے گاؤں کی ایک لڑکی بھی دیکھ رکھی تھی، حمیدہ۔

گاؤں کا فاصلہ اس کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بس دو کھیت عبور کرنے کے بعد گاؤں کے چھوٹے موٹے مکانات شروع ہو جاتے تھے۔ ان کے درمیان ایک چھوٹا سا بازار تھا۔ جہاں گاؤں والوں کو ان کی ضروریات کی سب چیزیں مل جاتی تھیں۔

کرم دین کے پاس اتنے پیسے ہوتے تھے کہ وہ اگر چاہتا تو ہفتے بھر کا راشن لے آتا لیکن اسے روزانہ بازار جانا اس لیے اچھا لگتا تھا کہ اس طرح سیر بھی ہو جاتی اور گاؤں والوں سے ملاقاتیں بھی ہو جاتیں۔ دین محمد پنساری، نواز

احساس شکست و رنج سے چور تھی داماں کی بے خودی و تشنگی

قیمتی چیزوں کی حفاظت انسان اپنی جان سے بڑھ کر کرتا ہے... مگر جب جیتے جاگتے... سانس لیتے... ہنستے بولتے انسان کی جان لینے کا وقت آتا ہے تو سوچنے کے لیے چند پل بھی میسر نہیں ہوتے... فیصلے اور زندگی کے ابہام میں ڈوبی ایک عبرت ساماں تحریر...

مرگِ ناگہاں

منظر امام

وڈ ہیئر کٹنگ سیلون رکھا ہوا تھا۔

پہلے اس کی دکان کا کوئی نام نہیں تھا۔ بس سب فیض محمد کی دکان کہا کرتے۔ لیکن جب سے وہ سفر سے واپس آیا، اس نے اپنی دکان کا نام ہالی وڈ ہیئر کٹنگ سیلون رکھ لیا تھا۔

ایک چائے کا ہوٹل بھی تھا۔ جس کو ایک ریٹائر پہلوان بنے چلایا کرتا۔ بے چارہ بنے اب اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ اس کو پہلوان کہنا بھی فنِ پہلوانی کی توہین تھا لیکن وہ اسی نام سے جانا جاتا تھا۔

ان کے علاوہ بھی بہت سے تھے۔ کرم دین سب سے دعا سلام کرتا ہوا پہلوان کے ہوٹل میں آ کر بیٹھ جاتا۔ یہاں اوروں سے بھی ملاقاتیں ہو جاتیں اور تازہ تازہ خبریں بھی سننے کو مل جاتیں۔

یہ خبریں گاؤں کی بھی ہوتیں اور گاؤں کے باہر کی بھی۔ ان دنوں پورے گاؤں میں صرف ایک خبر کا چرچا تھا اور وہ تھا، طوفان کا۔ طوفان ایک ڈاکو کا نام تھا۔ اس نے اپنا ایک گروہ بنا رکھا تھا۔ وہ گروہ آس پاس کے کئی علاقوں میں اپنی کارروائیاں کر چکا تھا۔

آج فلاں زمیندار کو لوٹ لیا۔ آج فلاں زمیندار کو مار دیا۔ فلاں دکان والے سے سب کچھ چھین لیا، وغیرہ وغیرہ۔

ڈاکوؤں کی خبریں تو اسی قسم کی ہوتی ہیں۔ پولیس اب تک اسے پکڑنے میں ناکام رہی تھی۔ وہ ذرا سی دیر کے لیے آتا اور اپنی کارروائی مکمل کر کے فرار ہو جاتا اسی لیے اس کا نام طوفان رکھ دیا گیا تھا بلکہ وہ خود کو بھی طوفان ہی کہتا تھا۔

اس کی کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کسی نے اس کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ وہ نقاب میں رہتا۔ دیکھنے والوں کو اس کی صرف دو خونخوار آنکھیں ہی دکھائی دیتیں جن میں گہری سرخی ہوا کرتی۔

آج بھی پہلوان کے ہوٹل میں اس کے حوالے سے ایک خبر تھی۔ اس نے حاجی پور کے زمیندار کو مار مار کر زخمی کر دیا تھا۔ اس بے چارے کو اسپتال روانہ کرنا پڑا تھا۔

طوفان کے لیے حکومت نے انعام بھی مقرر کر رکھا تھا۔ پورے پانچ لاکھ۔ زندہ یا مردہ۔ حکومت اور پولیس والے اس دردِسر سے نجات چاہتے تھے۔

کرم دین اس خبر کو سن کر پریشان ہو گیا۔ حاجی پور دور ہی کتنا تھا۔ یہی سات آٹھ کوس۔ اس کے قدم حاجی پور

تھی۔

کرم دین کا بیٹا نورو ہر مہینے پیسے بھیجا کرتا، ان میں سے وہ بہت سے روپے بچا کر اپنے ہی گھر میں رکھ لیتا تھا اب تک لاکھ سوا لاکھ کے قریب روپے جمع ہو چکے تھے۔

اس قصبے میں کوئی بینک بھی نہیں تھا۔ جہاں وہ اپنے پیسے رکھ سکتا اور ویسے بھی وہ اس زمانے کا تھا جب بینکوں وغیرہ پر زیادہ بھروسا نہیں کیا جاتا تھا۔ پیسے اگر ہیں تو اپنے گھر میں ہوں، پتا نہیں کس وقت کیا ضرورت پڑ جائے۔ اب بینک دوڑتے پھرو۔ چیک لکھواؤ، لائن میں کھڑے رہو، پھر پیسے وصول کرو، ان جھنجٹوں سے تو بہتر تھا کہ پیسے اپنے ہی پاس ہوں۔ جب چاہا نکال کر خرچ کر لیا۔

"کرم دین چاچا، ذرا طوفان سے ہوشیار رہنا۔"
ہوٹل میں بیٹھے ہوئے ماسٹر جی کے بیٹے نے آواز لگائی۔

"فکر مت کر پتر، میرے پاس بندوق ہے۔ آنے دو طوفان کو دیکھ لوں گا۔ مار کر ڈال دوں گا سالے کو۔"

کرم دین نے اپنے اچھے زمانے میں ایک بندوق خرید کر رکھ ڈالی تھی۔ اس کی ضرورت اس لیے بھی تھی کہ اس کا مکان ذرا الگ ہٹ کر تھا وہاں زیادہ تر سناٹے کا راج رہتا تھا۔

وہ اپنی بندوق اور گولیوں کی اس طرح دیکھ بھال کیا کرتا جیسے نئی نویلی دلہنوں کی کی جاتی ہے۔ روزانہ نالیوں کی صفائی ہوتی۔ اس میں گولیاں بھر کر دیکھا جاتا۔

اس کے پاس کرنے کے لیے اور کوئی کام بھی نہیں رہ گیا تھا۔ بیوی کی موت کے بعد اس نے اپنا سارا دھیان اپنے بیٹے نورو پر لگا دیا تھا۔ وہی اس کی مصروفیت تھا، اس کا مشغلہ تھا۔

قصبے میں ایک ہی سرکاری اسکول تھا۔ کرم دین نے نورو کو اسی اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ یہ بھی اس کے لیے صبح کا ایک مشغلہ تھا۔ وہ نورو کو اپنے ساتھ لے جا کر اسکول پہنچا دیتا اور واپسی میں اسے ساتھ لے آتا۔ نورو کبھی کبھی ناراض بھی ہو جاتا تھا۔ "ابا! میرے کسی دوست کا ابا اس کے ساتھ نہیں آتا ہے، تم بھی مت آیا کرو۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ ہنستا کھیلتا ہوا گھر آ جایا کروں گا۔"

کرم دین نے اس کی اجازت دے دی تھی لیکن اس کا دل نہیں مانتا تھا۔ وہ دور دور سے نورو کو اسکول کے گیٹ میں داخل ہوتے دیکھ لیا کرتا پھر گاؤں کے دوستوں کے پاس چلا جاتا۔

اس دنیا میں نورو کے سوا اس کا اور کوئی تھا بھی نہیں۔

[illegible] باپ بیٹے
ہوتے تھے اور ایک دوسرے کے لیے محبتیں تھیں۔ ایک دوسرے کا خیال تھا۔
اگر کرم دین کے سر میں درد بھی ہوتا تو نورو تڑپ کر رہ جاتا۔ اس کا سر دبایا کرتا۔ بالوں میں مالش کرتا رہتا اور یہی حال کرم دین کا تھا۔ اگر نورو کو ذرا بھی چوٹ لگتی تھی تو خود اس کا حال بُرا ہو جاتا۔ ان ہی محبتوں میں دن گزرتے گئے اور نورو بڑا ہوتا گیا۔

گاؤں کا اسکول صرف آٹھویں تک تھا۔ آٹھویں کے بعد شہر جانا پڑتا تھا۔ کرم دین کا دل نہیں مانتا تھا کہ نورو اتنی دور چلا جائے۔ خود نورو بھی لکھنے پڑھنے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔

کرم دین نے اسے گاؤں میں ایک چھوٹی سی دکان کھلوا دی تھی۔ جہاں ضرورت کی چھوٹی موٹی چیزیں مل جایا کرتیں بس کسی طرح گزارا ہو ہی جاتا تھا۔

لیکن نورو کے ارادے کچھ اور تھے۔ وہ شہر جا کر قسمت آزمائی کرنا چاہتا تھا۔ اس کے کسی دوست نے کہا تھا کہ وہ اگر شہر آ جائے تو اس کے لیے اچھی سی نوکری کا بندوبست کر دے گا۔

[illegible]
ہونے لگی۔ وہ یہ کیسے برداشت کر پاتا۔ وہ تو ایک پل کے لیے بھی اسے خود سے جدا نہیں کر پاتا تھا اور اب وہ شہر جا کر رہنے کی بات کر رہا تھا۔
کرم دین کے دوست فیض محمد نائی نے اسے سمجھایا۔
''یار، کیا ہوا ہے تجھے؟ لڑکا کڑیل جوان ہو چکا ہے۔ اب کیا زندگی بھر اسے سینے سے لگائے رکھے گا، جانے دے اس کو۔''

''بھائی، یہ تو سوچ اس نے شہر کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ نہ جانے وہاں کیسے حالات ہوں؟''
''تو تو پاگل ہو گیا ہے۔ دیکھ خالہ زینب کو۔ وہ تو عورت ذات تھی نا، اس کے باوجود اس نے بیٹے کو شہر بھیج دیا۔ بیٹے نے شہر جا کر کمائی کی اور پھر ماں کو بھی بلا لیا۔ اس طرح کی کتنی مثالیں ہیں۔ ایک تو اور تیرا بیٹا ہی انوکھے نہیں ہیں، جانے دے اس کو۔''
ایک تو خود نورو کی ضد، پھر گاؤں کے دوستوں کے کہنے پر اس نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر نورو کو ہزار طرح کی نصیحتوں کے ساتھ شہر روانہ کر ہی دیا۔
کئی ہفتے نورو کے بغیر وحشت میں گزر گئے۔ اسے

[illegible] تھا کہ وہ دن بھر کیا
کرے۔ کہاں جائے۔ کس کے پاس جائے۔

پھر آہستہ آہستہ اس کو نورو کے بغیر رہنے کی عادت پڑتی چلی گئی۔ جب تین مہینوں کے بعد نورو نے اسے پہلی بار پیسے بھیجے تو اسے یقین آگیا کہ اس کا نورو اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا ہے۔

ایک بار گاؤں کا ایک آدمی شہر گیا۔ اس نے وہاں نورو سے بھی ملاقات کی۔ اس نے واپس آ کر کرم دین کو بتایا۔ ”ارے بھائی، تیرا بیٹا تو وہاں بہت ٹھاٹ میں ہے، کہہ رہا تھا کہ میں یہاں ایک فلیٹ لینے کے چکر میں ہوں۔ بس فلیٹ ہو جائے تو ابا کو بھی بلا لوں گا۔“

”اور اس کی صحت کیسی ہے؟“ کرم دین نے پوچھا۔

”ارے ماشاءاللہ۔ وہ تو شہزادہ ہوتا جا رہا ہے۔“

”خیر میرا بیٹا تو پہلے سے شہزادہ ہے۔“ کرم دین کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔

ایک بار کرم دین نے گاؤں سے شہر جانے والے ایک شخص کے ہاتھوں بہت سا گڑ بھی بھجوا دیا تھا۔ گاؤں کے گڑ کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ شہروں میں تو سفید گڑ ملتا ہے۔ کیمیکل والا۔

نورو بہت شوق سے گڑ کھایا کرتا تھا۔ اس آدمی نے واپس آ کر کرم دین کو بتایا تھا کہ نورو وہاں بہت مزے میں ہے اور اس نے ایک موٹر سائیکل بھی خرید لی ہے۔

کرم دین نے اس خوشی میں گاؤں کے دوستوں کو مٹھائی بھی کھلائی تھی۔ سب ہی خوش تھے۔

”دیکھا، میں نے مشورہ دیا تھا نا کہ اسے شہر بھیج دے۔“ فیض محمد نے اپنی بات یاد دلائی۔ ”کیا یہاں رہ کر موٹر سائیکل خرید سکتا تھا۔“

”نہیں بھائی، کبھی نہیں۔“ اس نے کہا۔ ”اور اب تو میں بھی اس کے بغیر رہنے کا عادی ہوتا جا رہا ہوں۔“

اسی دوران کرم دین نے حمیدہ کے باپ سے حمیدہ اور نورو کی شادی کی بات بھی کر لی۔ نورو اور حمیدہ ایک ساتھ ہی بڑے ہوئے تھے۔ حمیدہ کا باپ ایک چھوٹا موٹا کاروباری تھا۔ اس نے آٹے کی ایک چکی لگا رکھی تھی۔ جہاں دن بھر گندم کی پسائی ہوتی رہتی اور آٹا نکلتا رہتا۔

گاؤں کے سب ہی لوگ اپنا اپنا گندم اس کے پاس لے جاتے تھے۔ اس کی بیٹی حمیدہ، کرم دین کو بہت پسند تھی۔ وہ جب کرم دین کو انکل انکل کہہ کر سلام کیا کرتی تو اسے بہت خوشی ہوتی۔ اسی لیے اس نے نورو کے لیے گاؤں

بھری زمینوں میں سے حمیدہ کا انتخاب کیا تھا۔ [illegible]

بہت خوب صورت فضا تھی اس گاؤں کی۔ سیدھے سادے لوگ، سیدھی سادی زندگی، کوئی ہلچل نہیں۔ کوئی طوفان نہیں لیکن اب ایک طوفان کی دہشت نے پورے گاؤں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

ویسے تو اس طوفان کا رخ ابھی تک اس گاؤں کی طرف نہیں ہوا تھا لیکن کیا بھروسا تھا۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ کرم دین نے اپنے جمع کیے ہوئے پیسوں کو ٹین کے ایک چھوٹے سے ڈبے میں بھر کر اپنے صحن میں دبا دیا تھا اور اوپر مٹی ڈال کر زمین برابر کر دی تھی۔

اس کو یہی خیال لگا رہتا کہ اگر طوفان اس طرف آ نکلا اور اس نے وہ دو لاکھ روپے حاصل کر لیے تو پھر وہ نورو کی شادی دھوم دھام سے کیسے کر سکے گا۔

ان پیسوں نے اس کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ وہ رات کے وقت دو تین بار اٹھ کر اپنی بندوق لے کر چھت پر جا کر چاروں طرف اپنی طاقت ور ٹارچ کی روشنی گھما کر دیکھ لیا کرتا۔

گھر کے آس پاس جھاڑیاں تھیں۔ جھاڑیوں کے پیچھے کھیتوں کا سلسلہ تھا۔ کوئی بھی کھیتوں اور جھاڑیوں میں چھپ چھپا کر اس کے گھر میں بہ آسانی داخل ہو سکتا تھا۔

اس رات چاند پوری طرح روشن تھا۔ جب وہ معمول کے مطابق بندوق لے کر چھت پر آ گیا۔ چاندنی تو دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

اس کی نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں بلکہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ سب کچھ معمول کے مطابق ہی تھا۔ وہ مطمئن ہو کر نیچے اترنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اچانک کوئی دکھائی دے گیا۔

کوئی شخص جو اس کے مکان کی طرف چلا آ رہا تھا اور اس آدمی کے پیچھے کچھ اور لوگ تھے۔ جو کھیتوں اور جھاڑیوں کے درمیان راستہ بناتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔

کرم دین نے ان کے ہاتھوں میں بندوقیں دیکھ لی تھیں۔ شاید طوفان کا پورا گروہ اس کے مکان کی طرف چلا آ رہا تھا۔

کرم دین پسینے میں نہا گیا۔ اس کے بدن پر کپکپی طاری تھی۔ آگے والا آدمی گھر کے بہت قریب آ چکا تھا۔ کسی وقت بھی، کسی بھی لمحے وہ سب اس کے مکان میں داخل ہو جاتے۔ پھر سب کچھ ختم ہو جاتا۔ اس کی جمع پونجی اس کے

ہاتھ سے نکل جاتی۔ وہ اپنے نورو کی شادی نہیں کر پاتا۔ حمیدہ اس کی بہو نہیں بن پاتی۔ اس کے ذہن میں خیالات کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ اس نے اپنی بندوق اٹھالی۔ آنے والا گھر کے قریب بہت قریب پہنچ چکا تھا۔

کرم دین کا نشانہ ابھی بھی بہت اچھا تھا۔ اس نے اپنی بندوق اٹھائی، دو گولیاں ایک ساتھ چلیں اور آگے والا ایک بھیانک چیخ کے ساتھ ایک طرف الٹ گیا۔

اس کے ساتھ ہی اس کے پیچھے آنے والے جھاڑیوں میں دبک گئے تھے۔ پھر سناٹا، گہرا سناٹا۔ کرم دین سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا۔

اس نے اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا تھا۔

باہر سناٹا تھا۔ پھر بہت سے لوگوں کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی باہر کے دروازے پر زور زور سے دستک ہونے لگی۔ اب اس کے سامنے دو ہی راستے تھے یا تو اسی طرح کمرے میں بند رہے یا پھر دروازہ کھول دے۔

وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے دروازہ نہیں کھولا پھر بھی وہ لوگ اندر آہی جائیں گے۔ وہ سب اس ڈاکو کے ساتھی معلوم ہو رہے تھے۔ ان کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا؟

اس نے بندوق پر اپنی گرفت مضبوط کی اور آہستہ آہستہ دروازے تک پہنچ گیا۔ دستک کی شدت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

''کون ہے؟'' اس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''پولیس۔'' باہر سے آواز آئی۔ ''دروازہ کھولو۔''

پولیس ہی ہو سکتی تھی اگر ڈاکو ہوتے تو دروازے پر دستک دینے کی کوشش نہیں کرتے۔ دروازہ توڑ کر یا دیوار پھلانگ کر اندر آ چکے ہوتے۔

اس نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے پولیس والے ہی تھے۔ ان کو دیکھ کر اس کی جان میں جان آ گئی تھی۔

''گولی تم نے چلائی تھی؟'' آگے والے نے پوچھا۔

وہ خاموش رہا۔ سوچتا رہا کہ اسے کیا جواب دینا چاہیے۔

''ڈرو نہیں، بتا دو۔'' دوسرے نے کہا۔ ''تم نے ایک بہت بڑا کام کیا ہے چاچا۔ ہم تو اسے زندہ پکڑنا چاہتے تھے۔ لیکن تم نے اسے ٹھکانے لگا دیا۔ چلو جو ہوا، اچھا ہی ہوا۔''

''کون تھا وہ؟'' اس نے پوچھا۔

''طوفان۔'' اسے بتایا گیا۔ ''نام سنا ہے اس کا، چاچا وہ ہمارے لیے سر کا درد بن گیا تھا۔ آج وہ اس علاقے میں دیکھا گیا۔ ہم اسے زندہ گرفتار کرنا چاہتے تھے لیکن تم نے اسے ٹھکانے لگا دیا۔''

''مبارک ہو چاچا، انعام کی رقم تم کو مل جائے گی۔'' ایک پولیس والے نے کہا۔

''چلو، چاچا اپنے شکار کی لاش تو دیکھ لو۔''

کرم دین ان کے ساتھ ہو گیا۔ گھر کی دیوار کے ساتھ ہی لاش پڑی تھی۔ کچھ پولیس والے لاش کے پاس ہی کھڑے تھے۔ کرم دین لاش کو ایک نظر دیکھ کر تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔

''شاہ صاحب۔'' ایک پولیس والے نے اپنے افسر کو مخاطب کیا۔ ''ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ بندہ آج اس طرف اکیلا کیسے آنکلا۔ یہ تو اپنے بندوں کے بغیر سفر ہی نہیں کرتا۔''

''اس کی وجہ میں بتا سکتا ہوں۔'' کرم دین بول پڑا۔

''ہاں چاچا، تم ہی بتاؤ۔'' انسپکٹر نے کہا۔

''وجہ یہ ہے کہ ایک بیٹا اپنے باپ کی طرف آ رہا تھا اس لیے اکیلا آیا تھا۔'' کرم دین نے بتایا۔

''کیا مطلب؟'' وہ سب ہی چونک پڑے تھے۔

''ہاں، یہ میرا بیٹا ہے نورو۔ میں نے تو اسے کام کرنے کے لیے شہر بھیجا تھا۔ یہ طوفان کب بنا، کیوں بنا، کس نے بنایا اس کو۔ میں یہ سب کچھ نہیں جانتا۔ مجھے تو بس اتنا معلوم ہے کہ میرے سامنے ایک لاش پڑی ہوئی ہے، جس کو میں نے اپنے ہاتھوں سے مارا ہے۔ پہلے یہ میرا بیٹا تھا۔ میرا نورو تھا لیکن طوفان بننے کے بعد یہ صرف ایک ڈاکو ہے۔ اور یہ ایک ڈاکو کی لاش ہے۔ جاؤ لے جاؤ اس کو۔ جہاں جی چاہے دفن کر دو۔ میرا اس سے اب کوئی واسطہ نہیں رہا۔''

کرم دین اب رونے لگا تھا۔ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ پولیس والے خاموش کھڑے تھے۔ کرم دین سب کو چھوڑ کر اپنے گھر واپس آ گیا۔

اس نے مٹی ہٹائی۔ زمین میں گڑھا کھودا اور وہ بکس نکال لیا۔ جس میں اس نے نورو کے بھیجے ہوئے پیسے جمع کر رکھے تھے۔ اس نے سسکیوں کے درمیان ان نوٹوں کو پھاڑنا شروع کر دیا۔

ہوائیں بھی اس وقت کراہتی اور بین کرتی ہوئی گزر رہی تھیں۔

منصوبہ ساز

محمد فاروق انجم

کہا جاتا ہے کہ صلاحیتیں انسان کے دکھوں... اس کی اذیتوں اور غربت کی دین ہوتی ہیں... بدنصیبی اور رنج و غم کے موسم میں صلاحیت کسی خود رو پودے کے مانند جڑ پکڑتی ہے... رفتہ رفتہ وہ کسی تناور درخت کی صورت اختیار کرلیتی ہے... غربت و افلاس زدہ ماحول میں پرورش پانے والے ایک ذہن ساز خیال اندیش نوجوان کی کتھا... وہ باصلاحیت تھا... اور اپنی خوبیوں سے واقف تھا... مگر انتظار کی گھڑیاں اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھیں... دولت مند بننے کا خوب اس کے حواسوں پر چھا چکا تھا... تعبیرِ خواب کے لیے اس نے وہ راہ اختیار کی... جو مختصر تو تھی مگر قدم قدم پر خاردار رکاوٹیں کھڑی تھیں...

نئی نسل کے لیے سبق آموز کہانی جو شارٹ کٹ کی تلاش میں اپنی منزل کھو دیتی ہے...... سرورق کی زہریلی کہانی

تیز موسلا دھار بارش، گرجتے بادل اور کڑکتی بجلی رات کو اور بھی خوفناک کررہی تھی۔ نیم روشن کمرے کی کھڑکی کے پاس ظفر بیگ کھوئے سے انداز میں کھڑا برستے ہوئے پانی کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن اس کی سوچوں کے گھوڑے کہیں اور تھے اور نگاہوں میں برستے پانی کے بجائے کسی اور کی ہی شکل تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر اس کے عقب میں تیس سال کا ایک نوجوان چپ چاپ کھڑا تھا۔ دیوار پر لگی گھڑی رات کے پونے بارہ بجے کا پیام دے رہی تھی۔

ظفر بیگ کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ تھی۔ اس کے سر کے بالوں میں سفیدی زیادہ تھی اور چہرے پر گھنی چھوٹی مونچھیں تھیں۔ اس کی توند باہر نکلی ہوئی تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ کوئی اسے دیکھ کر فربہ کہہ سکے۔ وہ شہر کا معروف کاروباری شخص تھا۔ وہ تین ماہ کے لیے اپنے کاروبار کے سلسلے میں سنگاپور گیا ہوا تھا۔ اس کا اکلوتا بیٹا سنگاپور کے آفس میں بیٹھتا تھا۔ تین ماہ کے بعد جب ظفر بیگ واپس آیا تو اُسے بتایا گیا کہ حساب کتاب میں گڑبڑ ہے۔

ظفر بیگ نے فوراً تحقیق شروع کی تو حساب کتاب میں نہ صرف گڑبڑ دکھائی دی بلکہ کم از کم سوا کروڑ روپے کا غبن بھی سامنے آگیا۔ ظفر بیگ تو دم بخود رہ گیا۔ اس کی غیر موجودگی میں محض تین ماہ کے اندر کمپنی سے سوا کروڑ روپے نکل گئے تھے۔

گڑبڑ کے عیاں ہوتے ہی ظفر نے یہ تحقیق شروع کردی کہ اس غبن میں کون کون ملوث ہے۔ جب ثبوت سمیت ایک نام سامنے آیا تو وہ ایک ہفتے کی چھٹی پر تھا۔

ظفر بیگ سب کچھ برداشت کرسکتا تھا لیکن خیانت سے اُسے نفرت تھی۔ اس نے پیسہ محنت سے کمایا تھا۔ وہ ایک عام آدمی سے خاص آدمی بنا تھا اس لیے اسے اپنے ایک ایک پیسے کی قدر تھی۔ وہ دل کا جتنا بھی اچھا تھا لیکن اس خیانت پر وہ بہت سیخ پا تھا۔

ظفر نے نگاہیں باہر سے ہٹا کر اپنے پیچھے کھڑے نوجوان جس کا نام ساجد تھا، اس کی طرف دیکھا اور متانت سے پوچھا۔

"اس کی چھٹی کب ختم ہورہی ہے؟"

"پرسوں وہ آفس میں ہوگا سر۔" ساجد نے بتایا۔ وہ، ظفر کے انتہائی قریب تھا۔ ظفر بیگ اس پر بہت اعتماد کرتا تھا اور ایک طرح سے وہ اس کا راز دار بھی تھا۔ ظفر بیگ کے اعتماد کو ساجد نے کبھی خفیف سی ٹھیس بھی نہیں پہنچائی تھی۔ وہ اپنا کام انتہائی ایمان داری سے کررہا تھا اور ظفر اس سے خوش تھا۔

"سب کچھ صاف اور واضح ہوچکا ہے۔ ہم نے یہ

چھان بین انتہائی خفیہ انداز میں کی ہے کہ کسی کو کانوں کان بھی خبر نہیں ہوئی اور ہم نتیجے تک پہنچ گئے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کے خلاف ایف آئی آر کٹوا کر اسے گرفتار کرادوں۔'' ظفر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جیسا آپ مناسب سمجھیں سر...... ویسے وہ میرے مسلسل رابطے میں ہے۔ اگر آپ برا نہ منائیں تو ایک بات کہوں سر۔'' ساجد نے کچھ سوچنے کے بعد بات کی۔

''مجھے معلوم ہے کہ تم معقول اور اچھی بات کرتے ہو، مجھے تم پر اعتماد ہے۔ جو کہنا چاہتے ہو، کہہ دو۔'' ظفر بولا۔

''وہ اس بات سے بالکل بے خبر ہے کہ اس کا فراڈ ہم پر کھل چکا ہے۔ ایک کل ہی تو چھٹی ہے۔ وہ دن اسے انجوائے کر لینے دیں۔ پرسوں وہ آفس آجائے گا تو ہم اسے یہیں سے گرفتار کرا دیں گے، ویسے بھی کل اتوار ہے۔'' اپنی بات کہنے کے بعد ساجد نے سوالیہ نگاہوں سے ظفر بیگ کی طرف دیکھا۔

ظفر سوچنے کے بعد بولا۔ ''اس نے ایسا کام تو نہیں کیا کہ ہم اسے مہلت دیں اگر وہ ایک دن اور خوشی منا لے تو اس میں حرج بھی کوئی نہیں ہے۔ پھر اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہونا ہے اور وہ تب ہی باہر آئے گا جب وہ ہماری لوٹی ہوئی رقم واپس کرے گا۔ ایک دن کی اسے اور چھوٹ دے دیتا ہوں۔ تب تک میں اس کے خلاف ایف آئی آر کٹوا دیتا ہوں۔''

''میں نے یہ تجویز صرف اس لیے آپ کو دی ہے کہ خوشی کا سماں ہے اور اس کے گھر والے آج کے ہی دن غم میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ شاید میں نے یہ بات اپنے نرم دل ہونے کی وجہ سے کر دی ہے۔'' ساجد نے کہا۔

''مجھے تمہاری بات پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تم میرے سب سے قابلِ اعتماد ساتھی ہو۔ ہم دونوں نے مل کر اس غبن کے بارے میں تحقیق کی ہے۔ بس تم اس پر نظر رکھنا۔ میں کل اس کے خلاف ایف آئی آر لکھوا دوں گا اور جونہی وہ آفس میں آئے گا میں اسے گرفتار کرا دوں گا۔''

''اس پر میری مسلسل نظر بھی ہے اور کسی نہ کسی بہانے میں اس سے رابطہ بھی کر لیتا ہوں۔'' ساجد نے کہا۔

ظفر نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور پھر کہا۔ ''بارش ہلکی ہو گئی ہے۔ ہم چلتے ہیں۔ آجاؤ میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں۔''

ظفر بیگ نے کرسی کی پشت پر رکھا کوٹ اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے ساجد تھا۔

☆......☆......☆

دن قبل عرفان کی شادی ہوئی تھی۔ وہ اپنی نئی نویلی دلہن نادیہ کے ساتھ خوشگوار باتوں میں مصروف تھا۔ دونوں آپس میں کزن تھے۔ نادیہ کے والدین غریب لوگ تھے اور دوسرے شہر میں رہائش پذیر تھے۔ نادیہ کی ان گنت خواہشات تھیں جن کے وہ اکثر خواب دیکھتی رہتی تھی۔ عرفان بھی اس کا ایک خواب تھا جس کی تعبیر اسے مل چکی تھی اور وہ اپنی شادی پر بہت خوش تھی۔

''جانتی ہو، میں نے کبھی تمہارے سوا کسی دوسری لڑکی کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔'' عرفان اسے بتا رہا تھا۔ ''میں تمہارے ہی خواب دیکھتا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ کب گھر والے میری شادی کی بات چھیڑتے ہیں اور کب میں ان کو تمہارے بارے میں آگاہ کرتا ہوں۔''

''اور مجھے تو ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں آپ کی شادی کہیں اور نہ ہو جائے۔'' نادیہ مسکرائی۔

''میں نے تمہیں یقین دلایا تھا کہ شادی ہوگی تو صرف تم سے۔'' عرفان نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''مجھے آپ کی بات کا یقین تھا لیکن یہ بھی ڈر تھا کہ ہم غریب ہیں اور آپ لوگ ہم سے اچھے ہیں۔ کہیں یہ فرق ہماری محبت کو روند نہ دے۔'' نادیہ نے کہا۔

''ہم بھی کوئی امیر زادے نہیں ہیں بس اتنا فرق ہے کہ تم بن ماں باپ کی بیٹی ہو، تمہیں چچا نے پالا تھا اور وہ غریب محنت کش ہے۔ یہ بات میرے گھر والوں نے اور میں نے کبھی نہیں سوچی تھی۔'' عرفان بولا۔

نادیہ مسکرائی۔ ''آپ کو پا کر میں بے حد خوش ہوں۔''

''جانتی ہو مجھے تم میں سب سے اچھی بات کیا لگتی ہے؟'' عرفان نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ بتائیں؟ کیا بات اچھی لگتی ہے؟'' نادیہ نے پوچھا۔

''تم بہت بہادر ہو، باہمت ہو اور اپنے خوابوں کو پانا جانتی ہو۔ مجھے تو اس دن بڑی حیرت ہوئی تھی جب مجھے پتا چلا تھا کہ تمہارے گھر میں چور گھس آیا تھا اور تم نے اسے پکڑ کر اس کی ٹھکائی کر دی تھی۔''

اس کی بات سن کر نادیہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ ''میں ڈرپوک نہیں ہوں۔''

''مانتا ہوں کہ تم ڈرپوک نہیں ہو۔'' عرفان بھی ہنسا۔

اسی وقت عرفان کے فون میں حرکت ہوئی۔ اس نے بیل بند کی ہوئی تھی اور سرسراہٹ نے عرفان کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ اس کے فون کی اسکرین پر ایک میسج عیاں

''کس کا میسج ہے؟'' جب عرفان میسج پڑھ کر مسکرا رہا تھا تو نادیہ نے پوچھا۔

عرفان مسکراتا ہوا نادیہ کے پاس بیٹھ گیا اور بولا۔ ''دوست کوئی نہ کوئی پھلجھڑی چھوڑتے رہتے ہیں۔''

عرفان کچھ دیر تک نادیہ کی طرف محبت پاش نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر بولا۔ ''نادیہ ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ ہر حال میں اور ہر لمحہ ساتھ دینے کا وعدہ کیا ہے۔''

''بالکل کیا ہے اور میں اس وعدے پر زندگی کی آخری سانس تک قائم رہوں گی۔'' نادیہ کے لہجے میں مضبوطی تھی۔

''ہم نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ اگر ہم میں سے کوئی یہ کہے گا کہ رات ہے تو دوسرا یہ نہیں دیکھے گا کہ دن کو رات کہا جا رہا ہے بلکہ وہ اسی وقت اس کی تائید کرے گا۔''

''مجھے یاد ہے۔''

''زندگی میں تو ہم ہمیشہ ساتھ ساتھ ہیں لیکن اب تمہیں ایک اور معاملے میں بھی میرا ساتھ دینا ہوگا۔''

''میں آپ کے ہر معاملے میں آپ کے ساتھ ہوں۔'' نادیہ نے عرفان کا ہاتھ تھام لیا۔

''ہم زندگی کے ہر لمحے ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے۔ کبھی جدا نہیں ہوں گے۔'' عرفان کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔

☆......☆......☆

دونوں نے صبح تقریباً گیارہ بجے ناشتا کیا اور اس کے بعد عرفان اپنی نئی نویلی دلہن کو لے کر شہر کی سیر کے لیے نکل گیا۔ عام تعطیل تھی اس لیے سڑکوں پر کم اور پارکوں میں رش زیادہ تھا۔ دونوں پہلے شہر کے بڑے پارک چلے گئے، وہاں انہوں نے ڈھیر ساری باتیں کیں اور خوب کھایا پیا، اس کے بعد وہ عجائب گھر میں گئے، وہاں سے وہ ایک شاپنگ مال چلے گئے اور دیر تک ونڈو شاپنگ کرتے رہے۔

شام کے سائے گہرے ہو گئے تھے جب عرفان اور نادیہ پیدل ہی شہر کے پل پر چل رہے تھے۔ اس پل کے نیچے دریا بہہ رہا تھا۔ نیچے دریا میں پانی خوب تھا۔ پل کے دائیں بائیں جنگلا تھا اور پل کی لائٹس روشن ہو چکی تھیں۔ پل پر ٹریفک کا انتشار بھی نہیں تھا۔

اچانک عرفان نے اپنا موبائل فون نکالا۔ ''یہاں ایک اچھی سی تصویر ہوگی۔''

''یہاں کہاں؟'' نادیہ نے متلاشی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا۔

''دیکھنا کیسی زبردست سیلفی آتی ہے۔'' عرفان نے دائیں بائیں دیکھ کر تسلی کی اور جنگلے کے اوپر چڑھ گیا۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟" نادیہ پریشان ہو کر بولی۔

"ایک یادگار سیلفی کے لیے زبردست سی جگہ کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔" عرفان نے جنگلے کے اوپر اپنا توازن ٹھیک سے رکھتے ہوئے کہا۔ وہ جنگلے کے اوپر کھڑا تھا۔

"آپ جلدی سے نیچے اتریں۔ آپ خطرناک کام کر رہے ہیں۔" نادیہ پریشان تھی۔

"بس ایک منٹ۔" عرفان نے کہتے ہوئے اپنا موبائل نکال کر سیدھا کیا اور سیلفی کا پوز بنا لیا۔

"عرفان مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ پلیز آپ نیچے اتریں۔" نادیہ ایک بار پھر بولی۔ نادیہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ کچھ لوگ جو سائیکل پر اس جگہ سے گزر رہے تھے۔ وہ ایک طرف رک کر ان کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

"میں کونسا کے ٹو پہاڑی کے اوپر چڑھ گیا ہوں۔" عرفان کہہ کر ہنسا۔

عرفان نے اپنے موبائل فون کو پکڑ کر اپنا بازو آگے کر لیا تھا اور وہ اپنی سیلفی لینے کے لیے بالکل تیار تھا۔ اچانک سیلفی کا پوز لیتے ہوئے عرفان کا پیر پھسلا اور وہ ایک دم سے نیچے دریا کی طرف گرا۔

"عرفان......!" نادیہ چلائی۔

"بچاؤ......!" عرفان بھی خوف سے چیخا لیکن وہ سرعت سے نیچے گیا اور پانی میں ایک دھماکا سا ہوا اور عرفان دریا میں گر گیا۔

"عرفان......عرفان......!" نادیہ اس جنگلے کو پکڑ کر رونے کے انداز میں چیخی۔ لوگ بھی اس جگہ جمع ہو گئے تھے۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے کچھ ٹھیک سے دکھائی بھی نہیں دے رہا تھا۔ اچانک عرفان اوپر ابھرا اور اپنے دونوں بازو مدد کے لیے لہرائے اور پھر وہ نیچے چلا گیا۔

"کوئی عرفان کو بچائے......" نادیہ روتے ہوئے چلا رہی تھی۔

کسی نے فوراً فون کرنا شروع کر دیا تھا اور بہت سے لوگ نیچے دیکھ رہے تھے۔ عرفان دو چار بار اوپر کی طرف اٹھتا اور پھر وہ نیچے چلا جاتا اور پھر جیسے وہ جگہ ساکت سی ہو گئی ہو جہاں عرفان گرا تھا۔

"عرفان...... عرفان......" نادیہ کے چلانے کی آواز دور تک جا رہی تھی۔ نادیہ کی آنکھیں غم سے بند ہونے لگی تھیں اور وہ گرنے ہی والی تھی کہ اچانک ایک خاتون نے نادیہ کو پیچھے سے پکڑ لیا۔

☆......☆......☆

عرفان کو سیلفی بناتے ہوئے دریا میں گرے ڈھائی گھنٹے ہو گئے تھے۔ اس جگہ پولیس، اور ریسکیو کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ انہیں اس جگہ آنے میں آدھا گھنٹا لگا تھا۔

تیراک دریا میں کود گئے تھے اور عرفان کی تلاش شروع کر دی تھی۔ پل کے اوپر لوگوں کا ہجوم کھڑا تھا جسے پولیس والے بار بار پیچھے کر رہے تھے، لیکن ہر ایک کی نگاہ دریا کی طرف تھی۔

نادیہ کو ہوش آ چکا تھا اور وہ ایک طرف کھڑی رو رہی تھی۔ اس نے اپنے گھر والوں کو اطلاع کر دی تھی اور عرفان کے والدین بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ سب امید بھری نگاہوں سے ان لوگوں کی طرف دیکھ رہے تھے جو عرفان کو تلاش کر رہے تھے۔ ایک مقامی چینل کا نمائندہ عرفان کے ڈوبنے کی بار بار خبر دے رہا تھا۔

پوری کوشش کے باوجود عرفان کا سراغ نہیں ملا تھا۔

انسپکٹر نعمان بھی اس جگہ موجود تھا۔ وہ دراز قد اور چالیس سال کی عمر کا آدمی تھا۔ وہ ایک اور معاملے سے ابھی آدھا گھنٹا قبل اس جگہ پہنچا تھا اور آتے ہی اس نے ساری رپورٹ لی تھی۔

انسپکٹر نعمان جنگلے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور نیچے دیکھنے لگا۔ روشنی کا معقول انتظام کیا گیا تھا اور عرفان کو تلاش کرنے والے تیراک اب باہر نکل آئے تھے۔

"کہیں نہیں ملا...... پانی کا بہاؤ بھی ہے۔ لگتا ہے کہ وہ آگے بہہ گیا ہے۔" ایک نے بلند آواز سے کہا۔

"سیلفی کے لیے اسے یہی جگہ ملی تھی۔ نئی دلہن کے سامنے ہیرو بن رہا تھا۔ بے وقوف......" انسپکٹر نعمان بڑبڑایا۔

نادیہ کو جب پتا چلا کہ وہ لوگ عرفان کو تلاش کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں تو وہ رونے لگی۔ اس کے والدین کے چہرے بھی اترے ہوئے تھے اور وہ غم کی تصویر بنے ہوئے تھے۔

ریسکیو اپنا کام پوری ذمے داری سے ختم کر چکی تھی اور اب سب اپنی اپنی رپورٹ لکھ رہے تھے۔ اس جگہ کھڑے لوگ بھی اب لاش نہ ملنے پر اپنی اپنی دانست کے مطابق تبصرے کر رہے تھے، سب کی ایک ہی رائے تھی کہ دریا کا بہاؤ تیز تھا اس لیے اس کی لاش بہاؤ کے ساتھ ہی کہیں بہہ گئی ہے۔

انسپکٹر نعمان نے ایک نظر عرفان کے والدین کی طرف

دیکھا اور ان کے پاس چلا گیا۔ انسپکٹر نعمان کے ساتھ ہر وقت ایک پولیس والا جس کا نام ناصر تھا، وہ رہتا تھا۔ انسپکٹر نعمان کو اسے ساتھ رکھنے کے دو فائدے تھے۔ ایک یہ کہ وہ ہر واردات کے موقع پر جلدی سے معلومات لے کر انسپکٹر نعمان کو بتا دیتا تھا جس کی وجہ سے انسپکٹر نعمان کو موٹی موٹی باتوں کا پتا چل جاتا تھا اور اس کا وقت ضائع نہیں ہوتا تھا۔ دوسرا فائدہ یہ تھا کہ ناصر کو یہ پتا ہوتا تھا کہ انسپکٹر نعمان کو کس وقت سگریٹ کی طلب ہو رہی ہے، اس لیے وہ فوراً سگریٹ سلگاتا، دو کش خود لیتا اور باقی کا سگریٹ بڑی ہوشیاری سے انسپکٹر نعمان کو دے دیتا تھا۔ دونوں کا ہی ایک دوسرے کے بغیر گزارہ نہیں تھا۔

ناصر نے آتے ہی عرفان کے لواحقین کے بارے میں معلومات لے لی تھی کہ کون کون اس جگہ موجود ہے اور یہ حادثہ کیسے پیش آیا تھا۔ جب انسپکٹر نعمان ارد گرد کا جائزہ لے رہا تھا تو اس وقت ناصر سب کچھ جاننے کے بعد انسپکٹر نعمان کو بتا رہا تھا۔

''آپ نے اپنے شوہر کو روکا نہیں کہ وہ ایسا کام نہ کرے۔'' انسپکٹر نعمان نے نادیہ کے پاس جا کر پوچھا۔

''روکا تھا، کہنے لگے ایک سیلفی لینی ہے بس۔'' نادیہ نے روتے ہوئے بتایا۔

''اب دریا کی مچھلیاں اُسے اپنے دسترخوان پر سجا کر سیلفیاں لے رہی ہوں گی۔'' انسپکٹر نعمان کے منہ سے ایسے جملے زیرِ لب نکل جاتے تھے۔ پھر وہ بولا۔ ''پتا نہیں لوگ کیوں نہیں سمجھتے اور وہ کچھ بھی کرنے کے لیے سب کچھ کر گزرتے ہیں۔''

''انسپکٹر صاحب میں آپ کے سامنے اپنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ آپ عرفان کو تلاش کریں۔'' نادیہ نے اپنے ہاتھ جوڑ دیے۔

''جو اس کام میں ماہر تھے انہوں نے ہر طرح کوشش کی ہے۔ چھ افراد اس کی تلاش میں دریا میں اترے تھے لیکن وہ نہیں ملا۔ پانی کا بہاؤ آج زیادہ ہے۔ اس کے نہ ملنے کی یہی ایک وجہ ہے۔'' انسپکٹر نعمان نے کہا۔

''آپ عرفان کو تلاش کریں۔ خدا کے لیے اُسے تلاش کریں ورنہ میں بھی اسی دریا میں کود جاؤں گی۔'' نادیہ چلانے لگی۔ عرفان کی ماں نے نادیہ کو پکڑا ہوا تھا۔

''آپ گھر جائیں، ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی تلاش کے لیے مزید کیا ہو سکتا ہے۔'' انسپکٹر نعمان کہہ کر اپنی گاڑی کی طرف چلا گیا۔

''اب کیا کرنا ہے سر؟'' ناصر نے پوچھا۔

''تمہیں تیرنا آتا ہے؟'' اچانک انسپکٹر نعمان نے پوچھا۔

''بالکل بھی نہیں سر۔'' ناصر نے جلدی سے نفی میں گردن ہلائی۔

''اگر تمہیں تیرنا آتا ہے تو دریا میں کود کر اُسے تلاش کرنے کی ایک کوشش تم کر لو ورنہ چلتے ہیں۔''

ناصر نے جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھول دیا اور انسپکٹر نعمان گاڑی میں بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد خراماں خراماں اس جگہ رش ختم ہونے لگا تھا۔ اور پھر نادیہ بھی روتی چلاتی، عرفان کے والدین کے ساتھ اس جگہ سے چلی آئی۔

☆......☆......☆

ظفر بیگ اپنے دوستوں کے ساتھ شہر کے ایک بڑے ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں ڈنر کر رہا تھا۔ اپنے دوستوں کے ساتھ باتوں اور قہقہوں کی پھلجھڑیاں بھی چھوٹ رہی تھیں۔

ظفر ڈنر سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اچانک اس کے موبائل فون پر بیل ہونے لگی۔ اس نے فون کان سے لگایا تو دوسری طرف سے ساجد کی آواز آئی۔

''ایک بیڈ نیوز ہے سر۔''

''کیا ہوا؟''

''عرفان دریا میں ڈوب گیا ہے۔''

''کیا......؟'' ظفر کی حیران کن آواز سرگوشی میں دب گئی۔

''وہ اپنی بیوی کے ساتھ تھا۔ عرفان پل کے جنگلے پر چڑھ کر سیلفی لے رہا تھا تو اس کا پیر پھسل گیا اور وہ دریا میں گر کر ڈوب گیا۔'' ساجد نے مزید بتایا۔

''لاش مل گئی ہے۔'' ظفر پریشان ہو گیا تھا۔

''آج پانی کا بہاؤ زیادہ تھا۔ پوری کوشش کے باوجود بھی اس کی لاش نہیں مل سکی۔ ریسکیو والوں کا کہنا ہے کہ اس کی لاش پانی کے بہاؤ میں بہہ گئی ہے۔'' ساجد نے کہا۔

''یہ تو بہت برا ہو گیا ہے۔'' ظفر نے اپنے دوستوں سے معذرت کی اور فون سنتا ہوا ایک طرف چل پڑا۔ ''تم اس وقت کہاں ہو؟''

''جیسے ہی یہ خبر ٹی وی پر آئی تھی میں اسی وقت پل پر پہنچ گیا تھا۔ اس وقت بھی میں اسی جگہ کھڑا ہوں جبکہ باقی سب لوگ جا چکے ہیں۔'' ساجد نے بتایا۔

''تم اس جگہ رکو، میں آ رہا ہوں۔'' ظفر نے فون بند کیا

اور تیزی سے اپنی کار کی طرف بھاگا۔
ظفر طوفانی انداز میں کار چلاتا ہوا پل پر پہنچ گیا۔
ساجد پل کے جنگلے کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا۔ ظفر نے اپنی کار ایک طرف کھڑی کی اور ساجد کے پاس چلا گیا۔ ساجد باس کو دیکھتے ہی سیدھا کھڑا ہو گیا تھا۔
ساجد بتانے لگا کہ عرفان اس جگہ کھڑا ہو کر سیلفی بنا رہا تھا کہ پاؤں پھسلا اور وہ نیچے جا گرا۔ دریا کا بہاؤ آج کچھ زیادہ ہی ہے، یقیناً وہ اس بہاؤ کے ساتھ بہہ گیا ہے۔ پولیس اور ریسکیو نے اپنی اپنی رپورٹ میں یہی لکھا ہے۔
"یہ علاقہ انسپکٹر نعمان کا ہے۔ وہ آیا تھا؟" ظفر نے پوچھا۔
"جی ہاں وہی آئے تھے۔" ساجد نے بتایا۔
ظفر نے اردگرد کا جائزہ لیا اور تاسف بھرے انداز میں بولا۔ "یہ تو بہت بُرا ہوا۔ اس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی، ہم نے ایک دن کی مہلت دے دی تھی کہ کل وہ آفس آئے گا تو گرفتار کرا دوں گا۔ وہ میری کمپنی کا ہیڈ اکاؤنٹنٹ تھا اور اس نے سوا کروڑ روپے کا فراڈ کیا تھا۔"
"عرفان کے ساتھ ہماری رقم بھی ڈوب گئی سر۔" ساجد بولا۔
"بہت برا ہوا ہے بہت برا ہوا۔ مجھے اپنے پیسے کا زیادہ افسوس ہے جو اس نے فراڈ سے میری کمپنی سے نکال لیا تھا۔" ظفر بیگ کے جسم میں اضطراب تھا۔
"میری تحقیق کے مطابق عرفان کا کوئی بینک اکاؤنٹ نہیں ہے۔ سوائے ایک کے..... اس برانچ میں وہ اپنی تنخواہ کا چیک جمع کراتا تھا۔ اس اکاؤنٹ میں ساڑھے پانچ ہزار روپے ہیں۔" ساجد نے کہا۔
"تم نے پتا کرلیا ہے کیا؟"
"سر اس برانچ میں کیونکہ میرے ایک عزیز ہیں اُن سے معلومات لی تھی۔" ساجد بولا۔
"میری رقم عرفان نے کہیں سنبھال کر رکھی ہوگی ..... اس کے گھر والوں کے پاس ہو، ممکن ہے۔" ظفر بیگ نے سوچتے ہوئے کہا۔
"ہوسکتا ہے کہ رقم اس کے گھر والوں کے پاس ہو، یا پھر ان کو علم ہو کہ عرفان نے رقم کہاں رکھی ہے۔" ساجد بولا۔
"اس کے باپ سے بات کریں۔" ظفر بیگ نے اس کی طرف دیکھا۔
"میرا خیال ہے کہ اس کے باپ سے بات کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ ہم خاموشی سے جائزہ لیتے ہیں۔ اس کا باپ بیماری کی وجہ سے کوئی کام نہیں کرتا ہے، عرفان کا ایک بھائی پرائیویٹ نوکری کرتا ہے۔ اگر ایک دو ماہ میں ان کے حالات بدلتے دکھائی دیے تو سمجھ لیں کہ رقم اس کے گھر والوں کے پاس ہے۔ اور اگر ان کے حالات اسی طرح رہے تو پھر عرفان نے وہ رقم جہاں رکھی تھی اسی جگہ محفوظ ہے اور اس کے گھر والے اس سے بے خبر ہیں۔" ساجد نے کہا۔
"اتنی بڑی رقم اس نے کہاں رکھی ہوگی؟ اس کے مرنے کے بعد ہم اسے کیسے تلاش کریں گے؟" ظفر سوچنے لگا۔
"عرفان کا گھر کے اخراجات اُٹھانے میں اہم کردار تھا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے گھر والوں کو بہت فرق پڑے گا۔ اس لیے اگر وہ رقم اس کے گھر والوں کے پاس ہوئی تو وہ اسے نکالنے میں زیادہ دن کا انتظار نہیں کریں گے۔" ساجد نے اپنا خیال عیاں کیا۔
"تم ٹھیک سوچ رہے ہو۔ اس طرح چند دنوں میں سب کچھ سامنے آجائے گا۔" ظفر بیگ نے کہا اور اپنی کار کی طرف چلا گیا۔ گاڑی کے پاس پہنچ کر اس نے کہا۔ "ہم دونوں کل عرفان کے گھر تعزیت کے لیے چلیں گے۔"
"اوکے سر۔"
ظفر اپنی کار میں جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ عرفان نے سوا کروڑ کی بڑی رقم کا بڑی ہوشیاری سے غبن کیا تھا۔ یہ غبن ان تین ماہ کے دوران ہوا تھا جب وہ سنگاپور میں مقیم تھا۔ وہ رقم یقیناً اس کے پاس محفوظ ہوگی۔ وہ رقم اس نے کہاں رکھی ہوگی، ظفر بیگ کے لیے یہ جاننا اور اپنی رقم کو حاصل کرنا بہت اہم تھا۔

☆......☆......☆

دوسرے دن ظفر بیگ اور ساجد تعزیت کے لیے عرفان کے گھر میں موجود تھے۔ عرفان کا گھر ایسے محلے میں تھا جہاں زیادہ تر چھوٹے چھوٹے مکانات تھے۔ ظفر کا گھر بھی چھوٹا اور عام سا تھا۔
عرفان کا باپ بہت پریشان تھا۔ اس سے بات کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ظفر بار بار عرفان کے باپ کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ ضعیف اور بیمار شخص تھا۔ اس کو بار بار کھانسی شروع ہوجاتی تھی۔ ظفر کی ملاقات عرفان کے چھوٹے بھائی سے بھی ہوئی تھی۔ وہ اتنا پڑھا لکھا نہیں تھا۔
تعزیت کے بعد ظفر اور ساجد اس گھر سے باہر آ گئے اور اپنی کار کی طرف جاتے ہوئے ظفر نے کہا۔

ان کے گھر کے حالات اچھے نہیں ہے۔

''سر میں نے آپ کو بتایا تھا کہ گھر کے آدھے سے زیادہ اخراجات عرفان کے ذمے تھے۔''

''اس صورت میں وہ جلد ہی رقم نکال لیں گے۔ اگر تو وہ ان کے پاس ہوئی.....''

''بس چند دن کی بات ہے سر۔''

''تم اُن پر نظر رکھو اور پھر ہم دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے۔ میں اپنی ایک پائی بھی چھوڑنے کو تیار نہیں ہوں۔'' ظفر کہہ کر اپنی کار میں بیٹھ گیا۔

اس جگہ سے وہ سیدھا انسپکٹر نعمان کے پاس چلا گیا۔ انسپکٹر نعمان کے ساتھ اس کے پرانے مراسم تھے۔ انسپکٹر نعمان کا باپ اور ظفر بے تکلف دوست تھے۔ انسپکٹر نعمان، ظفر کو انکل کہتا تھا۔

انسپکٹر نعمان ابھی اپنے کمرے سے نکلنے ہی والا تھا کہ ظفر کے آنے کی وجہ سے رک گیا۔

''مجھے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' ظفر بیگ نے کچھ دیر بیٹھنے کے بعد کہا۔

''جی ضرور.....'' انسپکٹر نعمان اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''عرفان میرے آفس میں کام کرتا تھا۔'' ظفر نے کہنا شروع کیا۔

''وہ عرفان جو سیلفی کے چکر میں دریا کے سپرد ہو گیا.....'' انسپکٹر نعمان نے کہا۔

''میں اسی عرفان کی بات کر رہا ہوں۔ ہم ابھی اس کے گھر سے ہو کر آ رہے ہیں۔ اب اُس کی تلاش مزید ہو گی یا پھر یہ کیس بند ہو چکا ہے؟'' ظفر بیگ نے پوچھا۔

''فی الحال تو بند ہو چکا ہے۔ کیونکہ اس کی لاش ملی نہیں جبکہ غوطہ خور ڈھائی، تین گھنٹے تک اس کی تلاش میں رہے ......لیکن کسی کو کوئی کامیابی نہیں مل سکی۔ تیز بہاؤ کی وجہ سے اس کی لاش بہہ گئی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ اس کے ملنے کی امید نہیں ہے۔'' ظفر بیگ نے اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر جما دیں۔

''فی الحال تو یہی کہا جا سکتا ہے۔'' انسپکٹر نعمان نے کندھے اچکائے۔

ظفر بیگ سوچنے لگا کہ وہ انسپکٹر نعمان سے عرفان کے کیے ہوئے غبن کے بارے میں بات کرے، یا پھر ابھی چپ رہے کیونکہ ظفر نے عرفان کے خلاف جس پولیس

تھانے میں ایف آئی آر درج کرائی تھی، اس کی حدود والے تھی۔ عرفان کے دریا میں گرنے کی رپورٹ اب انسپکٹر نعمان کے تھانے میں درج تھی۔

ظفر نے سوچا کہ وہ فی الحال چپ رہے اور وقت آنے پر اگر ضرورت پڑی تو وہ انسپکٹر نعمان سے ذکر کر دے گا۔

ظفر کو چپ دیکھ کر انسپکٹر نعمان نے پوچھا۔ ''آپ کچھ کہنا چاہتے تھے؟''

''اب سوچ رہا ہوں کہ پھر کسی دن بات کروں گا۔ ابھی میں چلتا ہوں۔'' ظفر اُٹھ کھڑا ہوا۔

☆......☆......☆

اس واقعے کو ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ اس ایک ہفتے میں ساجد کی نگاہیں عرفان کے گھر کی طرف ہی مرکوز رہی تھیں۔ وہ ایک ایک چیز کی خبر ظفر کو دے رہا تھا۔ پچھلے دن عرفان کا باپ، ظفر کے آفس آ گیا تھا۔

اس نے درخواست پیش کی تھی کہ عرفان کے جو واجبات ہیں وہ انہیں دے دیے جائیں، انہیں پیسوں کی اشد ضرورت ہے۔

ظفر نے عرفان کے باقی واجبات کا چیک بنا کر عرفان کے باپ کے سامنے رکھ دیا — وہ واجبات اتنے زیادہ نہیں تھے کہ ان کے لیے آسانی پیدا ہو سکتی کیونکہ عرفان اپنی شادی کے لیے پیسے لے چکا تھا۔ چیک لینے کے بعد عرفان کے باپ نے استدعا کی۔

''میرا دوسرا بیٹا ایف اے پاس ہے اور وہ جس جگہ نوکری کرتا ہے وہاں سے دس ہزار روپے تنخواہ لیتا ہے۔ اگر آپ اسے اپنے پاس نوکری پر رکھ لیں اور وہ عرفان کی جگہ کام کرنا شروع کر دے تو ہمارے گھر کے اخراجات پورے ہوتے رہیں گے۔''

ظفر نے بات سننے کے بعد کہا۔ ''عرفان زیادہ پڑھا لکھا تھا۔ اسے اس کی قابلیت کے مطابق نوکری اور تنخواہ دی تھی۔ بہر حال میں سوچوں گا کہ میں اس کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔''

''شکریہ جی۔'' عرفان کے باپ نے کہا اور اُٹھ کر چلا گیا۔

اُس کے جانے کے بعد ظفر بیگ سوچتا رہا اور پھر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ عرفان نے جو غبن کیا تھا، اس کی خبر اس نے اپنے گھر والوں کو بھی نہیں ہونے دی تھی۔ جانے وہ رقم اس نے کہاں رکھی تھی۔ ظفر نے اپنے آپ سے کہا کہ 'بہتر ہے ظفر بیگ اب تم بھی یہ فائل بند کر دو...... جو ہونا تھا وہ ہو گیا

ہے...... آنے والے دنوں میں اس گھرانے کی جو رپورٹ ساجد دے گا، پھر سوچ لوں گا کہ کیا کرنا ہے۔

☆......☆......☆

اس بات کو مزید پندرہ دن گزر گئے تھے اور ان پندرہ دنوں کی جو رپورٹ ساجد نے ظفر بیگ کو پیش کی تھی، اس کے مطابق گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے عرفان کے باپ نے گھر کے کمرے میں چھوٹی سی کریانے کی دکان بنائی تھی اور وہ بیماری کی حالت میں بھی کام کرنے لگا تھا۔ عرفان کی بیوی لوگوں کے کپڑے سینے لگی تھی۔

ظفر کو اب یقین ہو گیا تھا کہ عرفان نے جو رقم غبن کی تھی وہ اس کے گھر والوں کے پاس نہیں ہے۔ اس نے اس معاملے کو ختم کر دیا اور اپنے سوا کروڑ روپے کے نقصان کو حلق سے نیچے اتار کر کام میں مصروف ہو گیا۔

اسی شام کو ظفر بیگ آفس سے واپس آیا تو جونہی وہ گاڑی سے باہر نکلا، اس نے دیکھا کہ چوکیدار کی کرسی کے پاس ایک اور کرسی پڑی تھی اور اس پر ایک اجنبی نوجوان براجمان تھا۔

''یہ تمہارا مہمان ہے؟'' ظفر بیگ نے پوچھا۔

چوکیدار جو کہ گیٹ بند کر چکا تھا، وہ جلدی سے ظفر بیگ کی طرف لپکا اور بولا۔ ''یہ میرا دوست ہے اور میرے شہر کا ہے، یہاں نوکری کرتا ہے۔ آج ملنے کے لیے آیا ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' ظفر کہہ کر جانے کے لیے بڑھا۔

''صاحب۔'' چوکیدار نے مخاطب کیا۔

ظفر نے رک کر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''صاحب اس دن آپ اس جگہ کھڑے فون پر بات کرتے ہوئے کسی کو بتا رہے تھے کہ دریا میں ڈوبنے والا عرفان آپ کی کمپنی میں کام کرتا تھا۔ میرے دوست کا نام اسلم ہے۔ ہم باتیں کر رہے تھے تو اچانک عرفان کا ذکر ہوا تو اسلم نے اس کے بارے میں ایک عجیب بات بتائی ہے مجھے۔'' چوکیدار نے کہا۔

''کیا بتایا ہے؟'' ظفر کے چہرے پر حیرت ابھری۔

''وہ آپ اس سے خود بات کر لیں۔'' چوکیدار نے کہنے کے بعد اپنے دوست اسلم کو آواز دے کر اپنے پاس بلا لیا۔ اسلم نے آتے ہی سلام کیا اور پھر بولا۔

''میں واٹر ورلڈ میں تیراکی سکھاتا ہوں۔ پچھلے دنوں عرفان سیلفی بناتے ہوئے دریا میں گر کر ڈوب گیا تھا۔ مجھے اس پر بہت حیرت ہوئی کہ وہ ڈوب کیسے گیا۔''

''کیوں وہ نہیں ڈوب سکتا تھا؟''

''عرفان کو ڈوبنا تو نہیں چاہیے تھا۔''

''کیوں نہیں ڈوبنا چاہیے تھا؟ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' ظفر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیونکہ عرفان بہت اچھا تیراک تھا۔'' اچانک اسلم نے انکشاف کیا تو ظفر بیگ دم بخود اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''کیا مطلب......؟ عرفان بہت اچھا تیراک تھا؟'' ظفر کے چہرے پر حیرت برسنے لگی۔

''جی ہاں صاحب...... اس نے کالج کے زمانے میں تیراکی سیکھی تھی۔ تین ماہ پہلے وہ میرے پاس آیا تھا اور تیراکی کی مشقیں کرنے لگا تھا۔ وہ پانی میں بہت دیر تک سانس روک کر رہتا تھا۔ اس لیے مجھے بہت حیرانی ہے کہ وہ دریا میں ڈوب کیسے گیا۔''

ظفر کو اس کی باتیں سن کر حیرت ہو رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ وہی سن رہا ہے جو اسے اسلم بتا رہا تھا۔

''کیا تم واقعی یہ سب سچ کہہ رہے ہو؟''

''میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔'' اسلم نے کہا۔ ''لیکن مجھے یہاں پتا چلا کہ وہ آپ کی کمپنی میں کام کرتا تھا جبکہ مجھے اس نے کچھ اور بتایا تھا۔''

''اس نے کیا بتایا تھا؟''

''اس نے بتایا کہ اس کا اپنا کاروبار ہے اور وہ پرانے ٹائر فروخت کرتا ہے۔ ایک دن میں نے اسے ڈراپ بھی کیا تھا دراصل اس دن وہ اپنی بائیک پر نہیں آیا تھا۔ میں گھر جا رہا تھا تو اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اسے ٹائر مارکیٹ میں چھوڑ دوں جو میرے راستے میں تھی۔ میں نے اسے ٹائر مارکیٹ میں بھی چھوڑا تھا۔'' اسلم نے بتایا۔

''جانتے ہو کہ وہ کس دکان پر گیا تھا؟''

''میں نے مارکیٹ میں چھوڑ دیا تھا، آگے وہ کہاں گیا تھا مجھے نہیں معلوم۔'' اس نے بتایا۔ ''آپ لوگ کہہ رہے ہو کہ وہ آپ کے پاس کام کرتا تھا جبکہ اس نے کہا تھا کہ وہ پرانے ٹائروں کا اپنا ذاتی کاروبار کرتا ہے۔''

اس کی بات سن کر ظفر بیگ بھی سوچنے لگا۔ اسلم کے انکشاف نے ظفر کو مضطرب کر دیا تھا۔ ایک نئی بات سامنے آ گئی تھی۔ ''یہ سب باتیں تم پولیس انسپکٹر کے سامنے بتا سکتے ہو؟'' ظفر نے جلدی سے کہا۔

''پولیس انسپکٹر کے سامنے کیوں؟'' اسلم گھبرا گیا۔

''تم ابھی میرے ساتھ چلو اور یہ سب انسپکٹر کو بتاؤ۔ آؤ میرے ساتھ۔ تم گھبراؤ نہیں...... بس تم کو بتانا

ہے۔'' ظفر بیگ کے جسم میں جیسے جان سی آگئی تھی۔ اسلم گھبرائے سے انداز میں چوکیدار کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ چوکیدار نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں حوصلہ دیا اور اسلم جانے کو تیار ہو گیا۔

ظفر بیگ اسی وقت اسلم کو لے کر انسپکٹر نعمان کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے راستے میں ہی انسپکٹر نعمان کو فون کر دیا تھا۔ اس وقت انسپکٹر نعمان پولیس اسٹیشن سے نکل چکا تھا اور اپنے گھر میں تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں انسپکٹر نعمان کے کمرے میں بیٹھے تھے اور اسلم وہ سب باتیں اُسے بتا چکا تھا جو عرفان کے بارے میں اس نے ظفر بیگ کو بتائی تھیں۔

''یہ تو بڑا حیران کن انکشاف ہے۔ تم مجھے اسی عرفان کے بارے میں یہ سب بتا رہے ہو ناں جو ان کی کمپنی میں کام کرتا تھا اور سیلفی بناتے ہوئے دریا میں گر کر ڈوب گیا تھا؟'' انسپکٹر نعمان نے ایک بار پھر تصدیق کی۔

''میں اسی عرفان کے بارے میں بتا رہا ہوں جو اس دن دریا میں گر کر ڈوب گیا تھا، لیکن وہ پرانے ٹائروں کا کاروبار کرتا تھا۔'' اسلم نے پُریقین لہجے میں کہا۔

''اب تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ دریا میں گر کر ڈوبنے والا وہی عرفان تھا جو تمہارے پاس تیراکی سیکھتا تھا؟''

''کیونکہ اُس کی اخبار میں تصویر بھی چھپی تھی۔''

''تصویر سے تم نے پہچان لیا تھا؟''

''جی بالکل......''

''اگر وہ اچھا تیراک تھا تو پھر وہ ڈوب کیسے گیا؟''

''یہ تو مجھے نہیں پتا کہ وہ کیسے ڈوب گیا لیکن مجھے پتا ہے کہ وہ بہت اچھا تیراک تھا۔'' اسلم نے کہا۔ ''وہ ڈوب نہیں سکتا۔ وہ تین ماہ سے میرے پاس آ رہا تھا اور روزانہ پریکٹس کرتا تھا۔''

انسپکٹر نعمان نے کہا۔ ''ٹھیک ہے مجھے تمہاری دوبارہ ضرورت پڑی تو میں تم سے رابطہ کر لوں گا۔'' انسپکٹر نعمان نے اس کا فون نمبر اور پتا نوٹ کر لیا تھا۔

ظفر بیگ نے اسی وقت اسلم کو باہر جانے کا کہا اور ایف آئی آر کی کاپی نکال کر انسپکٹر نعمان کے سامنے رکھ دی۔ انسپکٹر نعمان نے وہ رپورٹ پڑھی اور پھر بولا۔

''اس نے آپ کی کمپنی سے تقریباً سوا کروڑ روپے کا غبن کیا تھا؟''

''ہاں۔''

انسپکٹر نعمان نے پوچھا۔ ''آپ کو یقین ہے کہ یہ کام اسی کا ہے؟''

''میرے پاس پورے ثبوت ہیں۔''

''وہ کہاں ہیں؟''

''وہ صبح آپ کے پاس پہنچ جائیں گے۔''

انسپکٹر نعمان سوچتے ہوئے بولا۔ ''اگر اس نے سوا کروڑ کا غبن کیا تھا تو پھر رقم ہڑپ کرنے کا پورا پلان بھی کیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ اس نے جو کچھ بھی کیا وہ بڑی منصوبہ بندی سے کیا تھا۔ وہ دریا میں گرا اور تیرتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ بظاہر وہ سب کی نظروں میں مر چکا ہے لیکن کہیں زندہ ہے۔''

''ہاں بالکل......یہی میں سوچ رہا ہوں۔'' ظفر نے کہہ کر اچانک کہا۔ ''لیکن اس کے مرنے کے بعد......یا یہ کہہ لیں کہ اس کے غائب ہونے کے بعد اس کے گھر والوں کے حالات خراب چل رہے ہیں۔ اس کا بوڑھا باپ گھر کے اخراجات کے لیے کریانے کی دوکان کھول کر بیٹھا ہے۔ چھوٹا بھائی معمولی تنخواہ پر کام کر رہا ہے۔ اس کی بیوی اسی گھر میں بیٹھی ہے اور محلے داروں کے کپڑے سینے لگی ہے۔''

''آپ کو یہ سب کیسے پتا ہے؟''

''میں نے اُن پر مسلسل نظر رکھی ہوئی ہے۔''

''اس کے گھر والوں کے اگر یہ حالات ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ اس نے اس واردات میں اپنے گھر والوں کو شامل نہیں کیا ہوا۔ وہ پیسوں کے ساتھ اپنے گھر والوں سے بھی جان چھڑا کر کہیں فرار ہو گیا ہے۔''

''ہو سکتا ہے۔''

''لیکن......یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ دریا میں واقعی ڈوب گیا ہو۔ اگر عرفان زندہ ہوتا تو وہ اپنے گھر والوں کو اور پھر نئی نویلی دلہن کو اس طرح سے نظر انداز نہ کرتا۔'' انسپکٹر نعمان نے کہا۔

''اسی الجھن نے تو مجھے پریشان کر دیا ہے ہے۔'' ظفر بیگ نے کہا۔

''ایک بات تو ہے کہ اگر اس نے یہ سب کچھ ایک منصوبے کے تحت کیا ہے تو اس نے اسلم کو جھوٹ کہا تھا کہ وہ پرانے ٹائروں کا کاروبار کرتا ہے تاکہ اس کی شناخت خفیہ رہے، بہرحال میں اس کی پوری تحقیق کرتا ہوں۔ اور پوری کوشش کرتا ہوں کہ اگر عرفان زندہ ہو تو اسے تلاش کر کے آپ کے سامنے لا سکوں۔'' ایک لمحہ سوچنے کے بعد انسپکٹر نعمان نے مصمم ارادے سے کہا۔ اور ظفر بیگ کے چہرے پر امید و یاس کے تاثرات پہلی بار واضح ہوئے۔

"کوشش نہیں کرنی...... مجھے عرفان چاہیے اور آپ ایسا کر سکتے ہو۔" ظفر بیگ نے زور دیا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ میں اسے چیلنج سمجھ کر تلاش کروں گا...... اگر وہ زندہ ہوا تو میں اسے ضرور تلاش کرلوں گا۔" انسپکٹر نعمان نے کہا۔

"اور اگر وہ واقعی ڈوب کر مر گیا ہے تو تم مجھے میرے سوا کروڑ روپے تلاش کر کے دو گے۔ اس نے وہ رقم کہیں نہ کہیں چھپائی ہوگی۔"

"میں پوری کوشش کروں گا۔" انسپکٹر نعمان نے کہا۔

☆......☆......☆

انسپکٹر نعمان اسی رات بغیر وردی کے عرفان کے محلے میں پہنچ گیا اور عرفان کے باپ کی چھوٹی سی کریانے کی دکان پر جا کر بولا۔ "چچا سگریٹ ملیں گے۔"

"کونسا دوں۔" عرفان کے باپ نے سامنے رکھی سگریٹ کے مختلف برانڈز کی ڈبیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ سگریٹ دیکھنے کے بہانے انسپکٹر نعمان نے پوری دکان کا جائزہ لے لیا اور اندازہ کرنے کی کوشش کی کہ اس دکان میں کتنی مالیت کا سامان موجود ہے۔ عرفان کے باپ کی اس دوکان میں زیادہ مالیت کا سامان نہیں تھا۔

"کوئی سا بھی دے دیں۔ سب پی لیتا ہوں۔" انسپکٹر نعمان نے کہا اور عرفان کے باپ نے ایک ڈبیا سے سگریٹ نکال کر اسے دے دیا۔ انسپکٹر نعمان نے سگریٹ کی قیمت دے کر سگریٹ سلگایا اور منہ سے دھواں نکالتے ہوئے پوچھا۔

"چچا آپ کا بیٹا دریا میں ڈوبا تھا؟"

"ہاں وہ میرا بیٹا تھا۔" عرفان کے باپ کے چہرے پر کرب نمایاں ہو گیا۔ انسپکٹر نعمان اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔

"میں یہاں آتا رہتا ہوں۔ اگلی گلی میں میرا دوست رہتا ہے۔ یہاں پہلے تو یہ دکان نہیں تھی۔"

"عرفان کے جانے کے بعد دکان بنائی ہے۔ گھر کا خرچہ بھی چلانا ہے۔ ایک چھوٹا بیٹا ہے اور اس کی تنخواہ اتنی زیادہ نہیں ہے۔ اس بیماری میں مجھے کام کرنا پڑ رہا ہے۔" عرفان کا باپ مغموم ہو گیا۔

"کل میں اپنے دوست کے پاس بیٹھا تھا تو وہ مجھے بتا رہا تھا کہ آپ کے بیٹے کی شادی کو ابھی چند دن ہوئے۔"

"تین دن ہوئے تھے شادی کو۔" عرفان کے باپ کا چہرہ اور بھی غمگین ہو گیا۔

"عرفان کی بیوی تو بہت غمزدہ ہوگی۔"

"اب اس دہلیز پہ غموں کے سوا ہے ہی کیا۔" عرفان کے باپ نے کہہ کر رومال سے اپنی آنکھیں صاف کیں۔

"اچھا چچا خدا آپ سب کو صبر دے۔" انسپکٹر نعمان کہہ کر چلا گیا۔ وہ جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ اگر عرفان نے غبن کے بعد ڈوبنے کا ڈراما رچایا ہے تو اس کے گھر والوں کو اس ڈرامے کا علم نہیں ہے۔ کیونکہ عرفان کے باپ کی ہر بات میں غم جھلکتا تھا۔

انسپکٹر نعمان نے سوچا، عرفان نے اگر اتنا بڑا غبن کیا تھا تو محض اپنے لیے کیا تھا؟ وہ دولت سمیٹ کر اپنے والدین، بہن بھائی اور نئی نویلی بیوی کو بھی بھول گیا؟ وہ اتنا ہی سنگدل ہے، یا پھر وہ واقعی ڈوب گیا تھا۔ یا اسلم کو اس کی شکل کا دھوکا ہوا تھا؟ ہوسکتا ہے کہ عرفان نے سوچا ہو کہ وہ روپے کے ساتھ اپنی نئی دنیا بسا لے گا اور اسے نئی بیوی بھی مل جائے گی۔

انسپکٹر نعمان کے ذہن میں مختلف سوالات تھے۔ لیکن کسی سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ اچانک انسپکٹر نعمان چلتے چلتے رک گیا۔ وہ واپس مڑا اور عرفان کے باپ کی دکان پر پہنچ گیا۔

"سگریٹ کی ڈبیا دے دو چچا۔"

عرفان کے باپ نے سگریٹ کی ڈبیا اُٹھا کر انسپکٹر نعمان کو دے دی۔ انسپکٹر نعمان نے پیسے دیئے اور وہاں سے چلا گیا۔ ایک سایہ تھا جو انسپکٹر نعمان کے پیچھے اُس وقت سے چل رہا تھا جب وہ اس محلے میں داخل ہوا تھا۔

☆......☆......☆

ظفر بیگ اپنی ساری اُمیدیں ختم کر چکا تھا لیکن اسلم کے ملنے سے وہ ایک بار پھر پرجوش ہو گیا تھا۔ انسپکٹر نعمان کی صلاحیتوں پر اسے بھروسا تھا۔ اس نے ایک بار پھر وہ تمام کاغذات بغور دیکھے تھے جن سے ثابت ہوتا تھا کہ عرفان نے اس کمپنی میں کس طرح سے فراڈ کیا تھا۔ ظفر بیگ ان کاغذات کو انسپکٹر نعمان کے سامنے پیش کرنے سے قبل اپنی پوری تسلی کر لینا چاہتا تھا۔

اس وقت اس کے سامنے ساجد کھڑا تھا اور وہ بتا رہا تھا۔ "آپ کے کہنے پر، میں نے اس رات انسپکٹر نعمان کا پیچھا کیا تھا۔ وہ عرفان کے باپ کے پاس کچھ دیر کھڑے ہوئے تھے اور پھر چلے گئے تھے، کچھ آگے جا کر وہ واپس آئے اور دکان سے سگریٹ کی ڈبیا لے کر چلے گئے

تھے۔“

”وہ دوبارہ کیوں آیا تھا؟ کیا اُس نے کچھ دیکھا تھا؟“ ظفر بیگ نے فائل بند کرتے ہوئے پوچھا۔

”اس کا بہتر جواب تو انسپکٹر نعمان صاحب ہی دے سکتے ہیں۔“ ساجد بولا۔

”انسپکٹر نعمان کو کیا نظر آیا تھا کہ وہ دوبارہ اس کی دکان پر آیا تھا۔“ ظفر بیگ سوچنے لگا۔ اس کی سوچ کا محور اسی جگہ منجمد ہو گیا تھا۔

”یہ اب اُن کو ہی پتا ہو گا سر۔“ ساجد نے ایک بار پھر وہی جواب دیا۔

”میں نے تم کو اپنی تسلی کے لیے بھیجا تھا کہ مجھے پتا چلے کہ انسپکٹر نعمان نے میری اس بات کو سنجیدہ بھی لیا ہے کہ نہیں۔ اچھا کیا کہ وہ اس کام میں لگ گیا ہے۔ اب مجھے یقین ہے کہ وہ یہ کیس بہت جلدی حل کر لے گا۔“ ظفر کو کچھ تسلی ہو گئی تھی۔

”سر میں نے ایک دن کی چھٹی کے لیے کہا تھا آپ کو۔“ ساجد نے کچھ توقف کے بعد اپنی بات کی۔

”ہاں...... مجھے یاد ہے...... تم چلے جانا۔ لیکن چھٹی صرف ایک دن کی ہی ہو...... تم میرے قریبی آدمی ہو۔ جو کام تم کر سکتے ہو وہ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا ہے اس لیے تمہارے بغیر میرا گزارا نہیں ہے۔“

”سر پرسوں آفس میں ہوں گا۔“ ساجد مسکرایا۔

”پرسوں ایک اہم میٹنگ ہے، میں اس میٹنگ میں موجود ہوں گا سر۔“

”ٹھیک ہے اب تم جاؤ۔“ ظفر بیگ نے کہا۔ ساجد اپنی کرسی پر جا کر کام میں مصروف ہو گیا۔

آفس ٹائم کے بعد ساجد سیدھا اپنے گھر چلا گیا۔ وہ ایک محلے میں چھوٹے سے کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔ اس کے گھر والے دور دراز کے ایک شہر میں رہائش پذیر تھے، وہ نوکری کی وجہ سے اس شہر میں مقیم تھا۔

ساجد دو دن کے لیے شہر سے باہر جا رہا تھا۔ اس نے صبح ہی اپنا بیگ تیار کر لیا تھا۔ اس میں دو جوڑے کپڑے اور ضرورت کی کچھ چیزیں تھیں۔

ساجد نے نہانے کے بعد کپڑے بدلے، فریج سے دودھ نکال کر ایک گلاس پیا اور چاروں طرف ایک نظر دوڑا کر وقت دیکھا، رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ اس نے اپنا بیگ اُٹھا کر کندھے سے لٹکایا اور باہر نکل کر دروازے کو اچھی طرح سے مقفل کر دیا اور اس کی چابی ہمسائے کا دروازہ بجا کر اُسے دے دی۔

ساجد سیدھا ریلوے اسٹیشن پہنچا... جس ٹرین میں اسے سفر کرنا تھا وہ جانے کو بالکل تیار تھی۔ ساجد نے عجلت میں ٹکٹ لیا اور بھاگتا ہوا ٹرین کی طرف بھاگا، ٹرین رینگنے لگی تھی۔ وہ بھاگ کر ٹرین میں سوار ہوا اور نمبر دیکھتا ہوا اپنی سیٹ کو تلاش کرنے لگا۔ ایک سیٹ پر وہ بیٹھ گیا۔

ٹرین میں زیادہ رش نہیں تھا۔ اسے حیرت تھی کہ ٹرین وقت پر کیسے چل پڑی تھی۔ اس کی دانست میں تو تھا کہ ٹرین کم از کم ایک گھنٹا تو لیٹ ہو گی۔

چار گھنٹے طویل سفر کے بعد ساجد ایک پلیٹ فام پر اتر گیا۔ وہاں سے نکل کر وہ ایک بس میں سوار ہوا اور ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت کے بعد ایک چھوٹا سا قصبہ آ گیا۔ بس سے اتر کر وہ پیدل ہی ایک طرف چل پڑا۔ رات کے سوا دو بجے کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ کچھ دور جا کر رکا اور اس نے اپنی جیب سے موبائل فون نکال کر ایک کال کی اور رابطہ ہوتے ہی بولا۔

”میں آ گیا ہوں...... اسی جگہ کھڑا ہوں جہاں آپ نے کہا تھا......“ پھر وہ خاموشی سے دوسری طرف کی آواز سننے لگا اور فون بند کر کے اس نے موبائل جیب میں رکھ لیا۔

ساجد ایک طرف چلنے لگا۔ اسے جو نشانیاں بتائی تھیں وہ ان کو دیکھ بھی رہا تھا۔ پھر وہ ایک تنگ گلی میں چلا گیا۔ گلی سنسان تھی۔

وہ ایک مکان کے سامنے رک گیا اور اس نے ہلکی سی دستک دی۔ تھوڑی دیر کے بعد اندر سے کسی نے سوراخ سے جھانکا اور پھر دروازہ کھل گیا۔

”السلام علیکم۔“ ساجد اندر جاتے ہوئے بولا۔

”وعلیکم السلام۔“ دروازہ کھولنے والے نے اس کے سلام کا جواب دیا۔ وہ پچاس سال کی عمر کا ایک صحت مند شخص تھا۔ اس کے سر کے بال لمبے اور سیدھے تھے جو اس کے کندھوں تک لٹک رہے تھے۔ اس کے چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں۔ جونہی ساجد اندر آیا اس نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ اسے لے کر ایک کمرے میں چلا گیا وہاں ایک اور آدمی موجود تھا۔ وہ ساجد سے گلے ملا اور ساجد نے بیگ ایک طرف رکھا اور کرسی پر اطمینان سے بیٹھ گیا۔

”کھانا کھایا ہے۔“ اس آدمی نے پوچھا۔

”راستے میں کھا لیا تھا۔ بس ایک اچھی سی چائے بنوا لو...... پھر بات کرتے ہیں۔“ ساجد نے کہا اور وہ آدمی باہر چلا گیا۔

☆......☆......☆

انسپکٹر نعمان کو ظفر بیگ نے عرفان کے بارے میں وہ تمام ثبوت مہیا کر دیے تھے جس سے ثابت ہوتا تھا کہ اس نے تقریباً سوا کروڑ روپے کا غبن کیا ہے۔ انسپکٹر نعمان ایک ایک کاغذ کو بغور دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے وہ کاغذات ایک طرف رکھ دیے۔ اس کے سامنے ظفر بیگ براجمان تھا۔

''میں عرفان کے باپ سے ملا ہوں۔ وہ مجبوری کی زندگی گزار رہا ہے۔ میں نے اپنے طور پر جو تفتیش کی ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرفان نے اگر یہ غبن کیا ہے اور دریا میں ڈوبنے کا اس کا محض ایک ڈراما تھا تو وہ اتنے پیسوں کے لیے اپنے گھر والوں کو چھوڑ کر کہیں روپوش ہے۔ اس کے گھر والوں کے حالات مخدوش ہیں اور اس کی نئی بیوی محلے داروں کے کپڑے سی رہی ہے۔''

''میری بھی یہی معلومات ہیں۔''

''عرفان سنگ دل ہے، یا وہ واقعی ڈوب گیا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ عرفان نے آپ کی کمپنی میں کوئی فراڈ کیا ہی نہ ہو۔''

''سب ثبوت تمہارے سامنے ہیں۔''

''ہوسکتا ہے کہ یہ فراڈ کسی اور نے کیا ہو اور اس فراڈ کا رخ عرفان کی طرف موڑ دیا ہو۔'' انسپکٹر نعمان نے ایک نیا نقطہ اٹھا دیا تھا۔

''میرے پاس جو ثبوت جمع ہیں، ان سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ غبن عرفان نے ہی کیا تھا۔'' ظفر بیگ نے اپنی بات پر زور دیا۔

''ہوسکتا ہے کہ ایسا ہی ہو، میں نے اپنا ایک خیال ظاہر کیا تھا۔'' انسپکٹر نعمان نے کہا۔

''تم جب عرفان کے باپ کی دکان پر سگریٹ پینے کے بہانے گئے تھے تو پھر واپس کیوں آئے تھے...... تم کو کیا نظر آیا تھا۔'' ظفر بیگ کے منہ سے ایک دم سے نکل گیا۔ جب بات پوری ہوگئی تو ظفر بیگ کو احساس ہوا کہ اس نے یہ کیا کہہ دیا ہے، جبکہ انسپکٹر نعمان سوالیہ نگاہوں سے ظفر بیگ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''آپ کو یہ کیسے پتا ہے؟''

تیر کمان سے نکل چکا تھا اس لیے ظفر کو بتانا پڑا۔

''میرے حکم پر ساجد نے تمہارا پیچھا کیا تھا۔ تم جانتے ہو کہ جب تک میں آنکھوں سے دیکھ نہ لوں، مجھے تسلی نہیں ہوتی اور پھر میں اپنی رقم کے لیے بہت پریشان ہوں۔'' ظفر بیگ نے اٹکتے ہوئے بات مکمل کی۔

''یہ ساجد کون ہے؟'' انسپکٹر نعمان نے اچانک پوچھا۔

''میری کمپنی میں کام کرتا ہے۔ میرا پُراعتماد ملازم ہے جو میرے سارے کام کرتا ہے۔ اسی نے مجھے بتایا تھا کہ عرفان کمپنی میں غبن کر رہا ہے۔ اسی نے ثبوت جمع کیے تھے۔'' ظفر بیگ نے بتایا۔

''اس سے پہلے آپ نے مجھے اس کے بارے میں نہیں بتایا۔'' انسپکٹر نعمان بولا۔

''کبھی ذکر ہی نہیں ہوا تھا۔''

''آپ کو ذکر کرنا چاہیے تھا، اب کہاں ہے وہ؟''

''وہ دو دن کی چھٹی پر ہے۔ اس کے خاندان میں شادی ہے۔'' ظفر نے بتایا۔ انسپکٹر نعمان نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر بولا۔

''جیسے ہی ساجد واپس آئے میری اس سے ملاقات ضرور کرائیں۔'' انسپکٹر نعمان نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' ظفر بیگ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''بہر حال آپ فکر نہیں کریں۔ میں اس کیس کی حقیقت کو جلدی آپ کے سامنے لانے کی کوشش کروں گا۔'' کچھ توقف کے بعد انسپکٹر نعمان نے کہا۔ ''مجھے آپ سے تھوڑی سی معلومات درکار ہیں۔''

''پوچھو، کیا پوچھنا چاہتے ہو؟'' ظفر بیگ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

انسپکٹر نعمان نے اپنی جیب سے پاکٹ سائز ڈائری اور پنسل نکالی اور ظفر بیگ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆......☆......☆

چائے کا گرم کپ پینے کے بعد ساجد نے اپنے سامنے بیٹھے دونوں آدمیوں کی طرف دیکھا۔ ان میں سے ایک کا نام شیر خان اور دوسرے کا نام شرافت تھا۔ شیر خان اور شرافت کی عمر جرائم میں گزری تھی۔ وہ پیسے لے کر کسی کا بھی جائز، ناجائز کام کرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ ان کے سر پر کئی کیس تھے لیکن وہ پولیس سے پوشیدہ تھے، یا کچھ اور چکر تھا کہ وہ ابھی تک پکڑے نہیں گئے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ دونوں ہر واردات کے بعد اپنا حلیہ اور ٹھکانا بدل لیتے تھے۔ وہ ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل ہو جاتے تھے۔ اور پھر ان کی پولیس میں بھی خوب علیک سلیک تھی۔

شیر خان اور ساجد تین سال پہلے ملے تھے۔ شیر خان کے پیچھے پولیس لگی ہوئی تھی اور وہ زخمی حالت میں تھا۔ ساجد نے اسے اپنے گھر میں پناہ دے دی تھی اور اس کا علاج بھی کرایا تھا۔ دونوں میں دوستی ہوگئی اور شیر خان کہتا تھا کہ اس

نے اس کے سر پر احسان کا بہت بڑا پہاڑ رکھ دیا ہے۔

تین سالوں میں ان کا کسی نہ کسی طرح رابطہ ضرور رہا تھا۔ چار روز قبل شیر خان اور شرافت ایک دوسرے شہر میں مقیم تھے لیکن ساجد نے شیر خان کو فون کر کے کہا تھا کہ ایک بڑا کام کرنا ہے اس لیے فوراً اس قصبے میں کسی جگہ چلے جاؤ۔ شرافت کے ایک دوست کا مکان اس قصبے میں تھا اس لیے وہ دونوں اس جگہ پہنچ گئے۔ اب ساجد بھی وہاں موجود تھا۔

''میرا خیال ہے اب کام کی بات کر لی جائے۔'' ساجد نے کہا۔

''ہم اسی انتظار میں ہیں۔'' شیر خان بولا۔

ساجد نے کہنا شروع کیا۔ ''میں جس کمپنی میں کام کرتا ہوں۔ اس کمپنی میں ایک لڑکا عرفان بھی کام کرتا تھا۔ عرفان پیسہ بنانے کے چکر میں تھا اور اس نے ہیرا پھیری شروع کر دی۔ میں نے اس کی ہیرا پھیری پکڑ لی۔ وہ میری منت ساجت کرنے لگا کہ میں اس کا وہ راز باس کو نہ بتاؤں۔ میں نے اس شرط پر باس کو نہ بتانے کا وعدہ کیا کہ وہ جس ماہرانہ انداز میں ہیرا پھیری کر رہا ہے وہ اسے جاری رکھے اور کمپنی میں ایک بڑا غبن کرے جس کا میں ففٹی پرسنٹ کا حصے دار ہوں گا۔'' ساجد کہنے کے بعد رکا اور اس نے مسکرا کر دونوں کی طرف دیکھا۔ ساجد کا مکار چہرہ عجیب سے انداز میں مسکرا رہا تھا۔

''پھر......'' شیر خان نے مزید جاننا چاہا۔

''وہ تیار ہو گیا۔ باس سنگاپور گیا ہوا تھا اور اس دوران عرفان نے ایسا ہیر پھیر کیا کہ کمپنی سے اچھا خاصا روپیہ سمیٹ لیا۔ جب کام ہو گیا تو میں نے اس سے کہا کہ اب کیا کرنا ہے، باس آنے والا ہے۔ وہ حساب کتاب چیک کرے گا۔ بے شک تم نے ماہرانہ انداز میں ہیر پھیر کیا ہے لیکن کوئی سرا باس کے ہاتھ آ گیا تو وہ تم کو پکڑ سکتا ہے۔'' ساجد بتاتے ہوئے مسکرا بھی رہا تھا۔ وہ دونوں اس کی طرف بغور دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد ساجد پھر بولا۔

''عرفان نے کہا کہ باس کے ہاتھ غبن کا کوئی سرا نہیں آئے گا۔ عرفان بلاشبہ حساب کتاب کا ماہر تھا۔ اس نے ایسا کام کیا تھا کہ اس بات کا سراغ لگانا مشکل تھا۔ باس یہ تو سوچ سکتا تھا کہ کمپنی میں سے سرمائے کی کمی آ گئی ہے لیکن وہ اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا تھا کہ روپیہ گیا کہاں!!''

ساجد نے اپنا پہلو بدلا اور بولا۔ ''کام بڑی ہوشیاری سے ہوا تھا۔ رقم تین ماہ تک نکلتی رہی اور پھر اسے ایک بڑی پلاسٹک کی تھیلی میں پیک کر کے اس کے ارد گرد ٹیپ اچھی طرح سے لپیٹ دی۔ اس کے بعد اس روپے کو گتے کے مضبوط کارٹن میں رکھ کر اسے بند کیا، پھر پلاسٹک کے بیگ میں ڈالا اور ارد گرد اچھی طرح سے ٹیپ لپیٹ دی اور وہ کارٹن اس نے ایک جگہ محفوظ کر دیا۔''

''کہاں محفوظ کر دیا؟'' شیر خان نے پوچھا۔

''اس غبن میں، میں اس کے ساتھ شامل تھا۔ ہم دونوں میں کوئی چیز بھی پوشیدہ نہیں تھی۔ وہ کارٹن کہیں چھپانے کے بعد وہ مجھے بتانے والا تھا کہ اس نے وہ کہاں رکھا ہے کہ مارکیٹ سے ایک پارٹی کا فون باس کو چلا گیا اور اس نے بتایا کہ اس کے پاس جو بل اور مال آیا ہے، اس میں کچھ فرق ہے۔ اس جگہ عرفان سے غلطی ہو گئی تھی۔ باس نے فوراً مجھے فون کیا اور میں نے دیکھا کہ عرفان سے واقعی ایک بڑی غلطی ہو گئی تھی۔ عرفان کی لاکھ ہوشیاری اس غلطی کے آگے ریت کا ڈھیر ثابت ہوئی تھی۔ عرفان کی شادی تھی اس نے مجھ سے کہا کہ تم باس کے سامنے اپنا اعتبار مت خراب کرو اور اس بل کی تحقیق کر کے باس کو آگاہ کر دو اور اس فراڈ کا رخ کسی بھی طرف موڑ دینا۔ میں نے ایسا ہی کیا لیکن اچانک باس آ گیا اور جانچ پڑتال شروع ہو گئی۔''

ساجد کہہ کر رک گیا۔ اس نے دونوں کی طرف دیکھا اور جو اس کی طرف توجہ مبذول کیے۔ اس کی باتیں سن رہے تھے۔ وہ پھر بولا۔

''باس بھی حساب کتاب کا کچا نہیں ہے۔ اس نے ایسی تحقیق شروع کی کہ ایک کے بعد ایک سلسلہ جڑنے لگا۔ میں سمجھتا تھا کہ عرفان نے بڑی ہوشیاری سے کام کیا ہے لیکن باس کی باریک بین نظر نے اس کی ساری ہوشیاری اُڑا کر رکھ دی اور میں مجبور ہو گیا کہ باس کا ساتھ دوں اور مجھے موقع ہی نہیں ملا کہ اس غبن کا میں کسی اور طرف رخ موڑ سکوں کیونکہ باس انتہائی باریک بین اور ذہین شخص ہے وہ خود بخود عرفان کی طرف پہنچ گیا اور سوا کروڑ روپے کا غبن سامنے آ گیا۔''

''اوہ...... سوا کروڑ روپے کا غبن......'' شرافت کے منہ سے نکلا۔

''میں لمحہ بہ لمحہ عرفان کو خبر دیتا رہا اور یہ بھی بتا دیا کہ تمہارے نام کی ایف آئی آر کٹ چکی ہے اور تم جیسے ہی پرسوں آفس آؤ گے تو پکڑے جاؤ گے۔ تم کوئی انتظام بھی کر لو اور مجھے یہ بھی بتا دو کہ وہ رقم کہاں رکھی ہے۔''

''پھر اس نے بتایا۔'' شیر خان نے یکدم سوال کیا۔

"وہ بڑا چالاک نکلا۔ میرا خیال ہے کہ وہ بھانپ گیا تھا کہ اب اس کے گرد گھیرا تنگ ہوجائے گا۔ مجھ سے کہا کہ کل بتاؤں گا وہ پیسہ کہاں رکھا ہے۔ اور دوسرے دن وہ دریا میں ڈوب گیا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ وہ سوا کروڑ روپیہ کہاں ہے اس کا راز بھی اپنے ساتھ ہی لے گیا۔" شرافت نے کہا۔

ساجد نے دونوں کی طرف باری باری دیکھا اور پُراسرار انداز میں بولا۔ "عرفان کو جاننے کا جتنا مجھے موقع ملا ہے، اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ بہت بڑا منصوبہ ساز ہے۔ عرفان کا یہ بھی ایک منصوبہ تھا کہ وہ اچھا تیراک ہے۔ وہ دریا میں گرا اور دوسری طرف جا نکلا اور اس شہر سے فرار ہوگیا۔"

"کیا واقعی......؟" دونوں بیک وقت چونکے۔

"ہاں واقعی۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے رابطہ نہیں کرے گا لیکن اس نے مجھ سے رابطہ کیا اور اپنی خیریت کے بارے میں مجھے آگاہ بھی کیا اور مجھے یقین دلایا کہ وہ مجھے میرا حصہ دے گا۔ ہمارا خیال تھا کہ معاملہ دب جائے گا۔ اس کی موت کے ساتھ سب کچھ ختم ہوجائے گا لیکن اسلم نے آکر کام خراب کردیا اور اس نے بتادیا کہ وہ تو تیراک تھا اور اس کے پاس پریکٹس بھی کرتا رہا تھا۔ اور اب اس کی تلاش میں انسپکٹر نعمان بھی نکل کھڑا ہوا ہے۔"

"اب عرفان کہاں ہے؟" شیر خان نے پوچھا۔

"عرفان اسی قصبے میں ہے۔" ساجد نے بتایا۔

"آپ کے رابطے میں ہے؟" شیر خان نے اگلا سوال کیا۔

"وہ میرے مسلسل رابطے میں ہے۔ اُسے یہ پتا ہے کہ میں یہاں پہنچ چکا ہوں۔ سفر کے دوران ہمارے درمیان باتیں ہوتی رہی ہیں۔ جب بس اس قصبے میں رکی تو میں نے سب سے پہلے اسے اطلاع دی کہ میں پہنچ چکا ہوں۔ اور اسے کہا کہ اس وقت قصبہ سنسان ہے۔ جو جگہ تم نے بتائی ہے وہ تلاش کرنے میں مجھے دقت ہوگی اس لیے میں بس اسٹینڈ پر چائے وغیرہ پی کر وقت گزاروں گا اور سورج طلوع ہوتے ہی تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

"تمہارے کہنے پر ہم یہاں پہنچ گئے ہیں۔ اب بتاؤ کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔" شیر خان بولا۔

ساجد کا چہرہ پُراسرار سا ہوگیا تھا۔ "سب جانتے ہیں کہ دنیا کی نظر میں عرفان دریا میں ڈوب کر مر چکا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جیسے ہی وہ مجھے بتائے کہ اس نے وہ رقم کہاں چھپائی ہے میں عرفان کو تم لوگوں کے حوالے کردوں اور پھر وہ رقم اس جگہ سے نکال کر تم سے کہوں کہ عرفان کو لمبی نیند سُلا کر اس جھوٹی خبر کو سچ ثابت کردو۔"

"اس کام کے لیے ہم حاضر ہیں۔" شرافت نے کہا۔

"اس کام کے لیے میں تم دونوں کو بیس لاکھ روپے دوں گا۔" ساجد نے کہا۔

دونوں کی باچھیں کھل اٹھی تھیں۔ "ہمیں منظور ہے۔"

"کل میں عرفان سے ملنے جارہا ہوں۔ وہ کیا کہتا ہے، اس کے بعد میں تم دونوں سے رابطہ کروں گا، تب تک تم دونوں اسی جگہ رہو گے۔ اگر اس نے مجھے بتادیا کہ رقم کہاں ہے تو ٹھیک ہے۔ وہ رقم وہاں سے نکالوں گا اور تم دونوں کو کال کروں گا کہ اسے ماردو۔ تم دونوں اس کا قصہ ختم کردینا اور اگر اس نے مجھے پیسے کا نہ بتایا تو پھر اسے کیسے منانا ہے یہ تم جانو اور تم لوگوں کا کام جانے۔ مجھے یہ معلومات ملنی چاہیے کہ اس نے پیسہ کہاں رکھا ہے۔"

"ہمارے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔ ہم یہ کام آسانی سے کردیں گے۔" شیر خان نے کہا۔

"پھر یہ ڈیل بیس لاکھ روپے میں طے ہے؟"

"بالکل طے ہے۔" دونوں بولے اور تینوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

ساجد کے چہرے پر مکارانہ سی مسکراہٹ طاری تھی اور وہ اپنے آپ سے کہنے لگا۔ "معاملہ سوا کروڑ کا نہیں ڈھائی کروڑ کا ہے۔ عرفان نے ڈھائی کروڑ کا غبن کیا تھا۔ باس کے ہاتھ سوا کروڑ کے ثبوت آئے تھے...... اب سب مجھے ملنا چاہیے کیونکہ عرفان تو ڈوب کے مر چکا ہے۔"

ساجد سوچتے ہوئے اپنے دل میں ہنستا رہا۔

☆......☆......☆

دوسرے دن کا سورج جیسے ہی طلوع ہوا ساجد اس مکان سے باہر نکلا اور ایک طرف چل دیا۔

وہاں سے وہ ایک تانگے پر سوار ہوگیا۔ تانگے پر سوار ہوکر وہ اس آبادی سے کچھ دور ایک اور جگہ پہنچ گیا۔ ساجد ... دو دن کی چھٹی پر تھا اس لیے ہر حال میں اسے رات تک یہ قصبہ چھوڑنا تھا، اس لیے وہ چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد اپنا کام مکمل کرکے واپس شہر چلا جائے۔

ساجد تانگے سے اتر کر ایک طرف چل دیا۔ اس نے جیب سے ایک پرچی نکال لی تھی جس پر ایک پتا لکھا ہوا تھا۔ اس نے ایک آدمی سے اس پتے کے بارے میں دریافت کیا اور ایک گلی میں چلا گیا۔

گلی میں جا کر ساجد نے اپنے فون سے کال کی اور رابطہ ہوتے ہی اس نے پوچھا۔
''میں اس گلی میں کھڑا ہوں۔''
''اس گلی میں ایک مکان ایسا ہے جس کا دروازہ مکمل سبز رنگ کا ہے۔ وہاں آجاؤ۔'' دوسری طرف سے آواز آئی اور رابطہ ختم ہو گیا۔
ساجد گلی میں چلتے ہوئے سبز رنگ کے دروازے کو تلاش کرنے لگا۔ ایک مکان کا دروازے پر سبز رنگ کیا ہوا تھا۔ اس نے رک کر وہ دروازہ بجایا۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا تو اندر سے ایک شخص نمودار ہوا جس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی اور اس نے نظر کا چشمہ لگایا ہوا تھا۔ اس شخص نے سوالیہ نگاہوں سے ساجد کی طرف دیکھا۔
''جی فرمایئے؟''
''جی مجھے عرفان سے ملنا ہے۔'' ساجد نے جھجکتے ہوئے دھیمے لہجے میں بات کی۔
''کون عرفان؟'' اس شخص نے حیرت سے پوچھا۔
''عرفان جو اس جگہ رہتا ہے۔'' ساجد بولا۔
''یہاں کوئی عرفان نہیں رہتا۔ یہ گھر تو میرا ہے۔ میں یہاں رہتا ہوں۔'' اس شخص نے جواب دیا۔
ساجد نے پریشان ہو کر پتا بتایا تو وہ بولا۔ ''پتا ٹھیک ہے اسی جگہ کا ہے لیکن یہاں میں اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ رہتا ہوں۔ میرے تو کسی بچے کا نام بھی عرفان نہیں ہے۔''
''پتا اس جگہ کا ہے...... میری اس سے ابھی بات ہوئی تھی اور اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اس جگہ رہتا ہے۔'' ساجد پریشان ہو گیا۔
''یہاں کوئی عرفان نہیں رہتا۔ چاہو تو اس گلی کے ایک ایک بندے سے پوچھ لو، دس سال سے میں اسی گھر میں رہ رہا ہوں۔'' وہ شخص کہہ کر اندر چلا گیا اور اس نے دروازہ بند کر دیا۔
ساجد دم بخود بند دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ عرفان نے اسے یہی پتا بتایا تھا، جب وہ شہر سے روانہ ہونے لگا تھا تو اس نے فون کر کے پوچھا تھا کہ وہ کب نکل رہا ہے، پھر اس کا ہر آدھے گھنٹے کے بعد فون آتا تھا اور وہ پوچھتا تھا کہ وہ کہاں تک پہنچ گیا ہے، جب وہ بس سے اتر کر قصبے میں اترا تھا تو بھی عرفان نے اس سے فون کر کے پوچھا تھا کہ وہ قصبے میں پہنچ گیا ہے اور ساجد نے بتایا تھا کہ وہ ابھی بس سے اترا ہے اور پھر ساجد نے کہا تھا کہ وہ صبح کا سورج طلوع ہوتے ہی اس کے پاس پہنچ جائے گا۔ رات کے اندھیرے میں اس کے گھر تک پہنچنا اس کے لیے مشکل ہوگا کیونکہ اس وقت سب اپنے اپنے گھروں میں سو رہے ہوں گے اور وہ اجنبی کسی سے پوچھے بغیر اس گھر تک نہیں پہنچ پائے گا۔ عرفان نے دوسری طرف سے کہا تھا کہ وہ خود باہر نہیں نکل سکتا اس لیے مناسب یہی ہے کہ وہ سورج نکلنے کا انتظار کر لے، اور اب جب وہ اس کے بتائے ہوئے پتے پر موجود تھا تو وہ شخص کہہ رہا تھا کہ عرفان اس گھر میں نہیں رہتا ہے۔
ساجد نے ایک بار پھر دروازہ بجایا اور وہ شخص پھر باہر آ گیا۔
''میری ابھی اس سے بات ہوئی تھی...... اس نے مجھے یہی کا پتا بتایا تھا...... بہرحال آپ ایک منٹ کے لیے رکیں میں ابھی اسے کال کرتا ہوں اور آپ اس سے اچھی طرح سے سمجھ لیں کہ وہ کونسا پتا بتاتا ہے تاکہ میں وہاں پہنچ جاؤں۔''
ساجد اپنے فون سے عرفان کا وہ نمبر ملانے لگا جو صرف اس کے پاس تھا جبکہ وہ شخص اس کے سامنے اکتائے ہوئے انداز میں کھڑا تھا۔
ساجد نے نمبر ملا کر فون کان کو لگا لیا۔ بیل گئی تو اس شخص کی جیب میں موجود فون بھی بجنے لگا۔ اس شخص نے جیب سے فون نکال کر آن کیا اور کان کو لگاتے ہی ہیلو کہا تو ساجد چونک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ اس نے فون بند کر دیا۔
''بیل آپ کو چلی گئی ہے؟''
''یہ نمبر آپ کا ہے......؟'' وہ بھی چونکا۔ ''میرا نمبر کس نے دیا ہے آپ کو؟''
''یہ نمبر تو میرے دوست عرفان کا ہے۔''
''بھائی یہ تو میرا نمبر ہے۔ آپ کے دوست کا نمبر کہاں سے آ گیا۔ ویسے آپ ہو کون اور یہ کیا ڈراما لگا رکھا ہے آپ نے؟'' وہ شخص اس کو گھورتے ہوئے بولا تو ساجد گھبرا گیا۔ کیونکہ اس کی آواز بلند ہو گئی تھی۔
''شاید مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔'' ساجد نے صورت حال کا جائزہ لیا تو اس گلی سے نکلنے کا سوچا اور چل دیا۔ وہ شخص اندر چلا گیا۔
ساجد ششدر سوچ رہا تھا کہ ماجرا کیا ہے؟ عرفان کا اس کے ساتھ مسلسل رابطہ تھا۔ جب سے اس نے دریا میں گرنے کا ڈراما کیا تھا اور دریا سے نکل کر اس قصبے میں پہنچا تھا وہ ایک ایک خبر ساجد کو دے رہا تھا اور ساجد اس جگہ کی خبر

اُسے پہنچا رہا تھا۔

عجیب بات تھی کہ ابھی ابھی اس سے بات ہوئی تھی اور اب اچانک وہ غائب ہو گیا تھا اور جس نمبر پر اس کا رابطہ ہوتا تھا، وہ نمبر بھی اس شخص کے پاس تھا۔ ساجد الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔

ساجد حیرت کے سمندر میں غوطہ زن گلی سے باہر نکلا اور تانگے میں بیٹھ کر واپس اس مکان میں پہنچ گیا جہاں اس کے دو آدمی مقیم تھے۔

ساجد نے اُن کو سارا قصہ سنایا اور پریشان ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ اس حیران کن بات کو سن کر وہ دونوں بھی متحیر ساجد کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔

''ماجرا کیا ہے......؟'' سوچتے سوچتے ساجد بڑبڑایا۔

''یہ کیسے ممکن ہے کہ ابھی اس سے فون پر بات ہو اور وہ فون میری نظروں کے سامنے کسی دوسرے آدمی کی جیب میں بجے......''

''میری سمجھ میں ایک ہی بات آتی ہے۔'' شیر خان نے سوچتے ہوئے کہا۔

''وہ کیا......؟''

''کسی وجہ سے وہ بھاگ گیا ہے یا پھر وہ ضرورت سے بھی زیادہ ہوشیار ہے۔''

''وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ ہم دونوں نے وہ کام مل کر کیا ہے۔ ہم ایک دوسرے کے راز داں ہیں۔ میرا مسلسل اس سے رابطہ تھا لیکن وہ نمبر اس شخص کے پاس ہے، یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔''

''ایک بار پھر اُسے فون کرو۔''

ساجد نے سوچ کر ایک بار پھر وہی نمبر ملایا تو دوسری طرف سے اسی شخص کی آواز آئی۔ ''جی کون......؟''

''عرفان سے بات کرنی ہے۔''

''تم وہی ہو جو ابھی میرے پاس آئے تھے؟ تم چاہتے کیا ہو اور کون ہو؟'' اس شخص نے غصے سے کہا تو ساجد نے فون بند کر دیا۔

''عرفان نے مجھے بلایا تاکہ وہ میرا حصہ مجھے دے کر خود کسی محفوظ شہر میں جا کر نئی زندگی کا آغاز کر سکے......اور اب اچانک وہ خود ہی غائب ہو گیا ہے۔'' ساجد کی پریشانی دو چند تھی۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' شیر خان نے پوچھا۔

''میرے ساتھ چلو اور اس آدمی کو اٹھا کر پوچھو کہ عرفان کہاں ہے۔'' ساجد کھڑا ہو گیا۔

''دن دہاڑے اُٹھانا مناسب نہیں ہے۔'' شرافت نے کہا۔

''میں اس کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہوں جیسے ہی وہ باہر نکلے تم دونوں اندر گھس جانا اور اس کے گھر میں باندھ کر اس سے پوچھنا......حقیقت یہی شخص بتائے گا۔'' ساجد نے کہا اور وہ دونوں اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

☆......☆......☆

جب وہ تینوں اسی مکان کے دروازے پر پہنچے تو چونک گئے کیونکہ دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ ساجد کبھی دروازے کو اور کبھی اپنے دونوں آدمیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''یہاں تو تالا پڑا ہوا ہے۔'' شیر خان نے کہا۔

''یہاں رکنا مناسب نہیں ہے، واپس چلتے ہیں۔'' شرافت بولا۔ ساجد نے اس کی بات پر فوراً عمل کیا اور وہ تینوں واپس اپنے مکان میں آ گئے۔

ساجد کے تن بدن میں بجلی دوڑ رہی تھی۔ اسے ایک ہی خیال آ رہا تھا کہ عرفان نے اس کے ساتھ مل کر غبن کیا اور اب وہ سارا مال خود ہڑپ کر جانا چاہتا ہے۔ وہ اس سے رابطے میں رہا تھا اور ایک ایک چیز کی رپورٹ لیتا رہا تھا۔ اب اس نے دھوکا دیا تھا؟ یا کچھ اور معاملہ ہے؟ سوچ سوچ کے ساجد کا تو سر چکرانے لگا تھا۔

اس نے شیر خان اور اس کے ساتھی کی طرف دیکھا اور پھر اپنے موبائل پر عرفان کی تصویر نکال کر ان دونوں کی نگاہوں کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔

''اسے اچھی طرح دیکھ لو......یہ عرفان ہے۔ مجھے ہر قیمت پر واپس جانا ہے اور صبح آفس پہنچنا ہے اس لیے تم دونوں اسے یہاں تلاش کرو اور جیسے ہی وہ ملتا ہے، اسے اُٹھا کر اپنے پاس لے آؤ اور مجھے اطلاع کرو۔''

''بے فکر ہو جاؤ۔ اس کی تصویر آنکھوں میں محفوظ ہو گئی ہے۔'' شیر خان نے کہا۔

ساجد نے وقت دیکھا۔ اسے بس میں بیٹھ کر شہر پہنچنا تھا اور پھر اس جگہ سے ٹرین پکڑ کر اپنے شہر کی طرف جانا تھا۔ ٹرین کا وقت دن چار بجے تھا اس لیے وہ اس جگہ مزید نہیں رک سکتا تھا۔ اسے افسوس اس بات کا تھا کہ جس مقصد کے لیے وہ یہاں آیا تھا، وہ پورا نہیں ہوا تھا بلکہ ایک نئی الجھن کے ساتھ اسے واپس جانا پڑے گا۔

☆......☆......☆

ساجد کو مایوس اور ناچار بس کی طرف جانا پڑا تھا۔ اس

نے شیر خان کو جاتے ہوئے بھی اچھی طرح سے ہدایت کر دی تھی۔

ساجد کی دانست میں تھا کہ دونوں نے مل کر غبن کیا تھا اور اب وعدے کے مطابق عرفان اس کو اس کا حصہ دے دے گا لیکن عرفان نے عجیب کھیل کھیلا تھا۔ آخری لمحے تک وہ اس کے ساتھ رابطے میں رہا اور جب ملاقات کا وقت آیا تو نہ وہ جگہ تھی جس کے بارے میں اسے عرفان نے بتایا تھا اور نہ ہی وہ موبائل نمبر اس کے پاس تھا۔ ساجد پر حیرت کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔

ساجد ان ہی باتوں کے بارے میں سوچتا ہوا بس اسٹینڈ پہنچا اور بس میں سوار ہو کر شہر پہنچ گیا، وہاں سے اس نے ریلوے اسٹیشن کا رخ کیا اور ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔

ٹرین ایک گھنٹے کی تاخیر سے پہنچی اور وہ فوراً ڈبے میں سوار ہو کر اپنی سیٹ پر براجمان ہو گیا۔ ٹرین میں کوئی خاص رش نہیں تھا۔ ایک ڈبے میں خال خال مسافر بیٹھے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ٹرین رینگنے لگی اور پھر رفتار پکڑ کر دوڑنے لگی۔ سارے راستے ساجد کی سوچ کا محور محض عرفان تھا۔

رات کا اندھیرا چھا گیا تھا۔ ساجد کا شہر قریب آ رہا تھا۔ چند کلو میٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا پلیٹ فارم آ رہا تھا وہاں ٹرین محض دس منٹ کے لیے رکتی تھی اور پھر چل پڑتی تھی۔

ساجد کی سیٹ کے ارد گرد کوئی بھی نہیں تھا۔ اس ڈبے میں مسافروں کی تعداد کچھ بڑھ گئی تھی لیکن وہ سب مسافر بکھر کر براجمان تھے۔

اچانک کوئی چلتا ہوا اس کے قریب آیا اور اس کے جھکے ہوئے سر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ساجد کا سر کیونکہ جھکا ہوا تھا اور وہ ابھی تک عرفان کی سوچوں میں مستغرق تھا۔ اس کی نظر آنے والے کے پیروں پر پڑی تو وہ کوئی لڑکی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ سر اوپر کیا تو سامنے ایک خوبصورت لڑکی کھڑی تھی۔ اس نے سبز رنگ کا سوٹ زیب تن کیا تھا، ابھرے ہونٹوں پر سرخ لپ اسٹک تھی اور بالوں کو پیچھے کی طرف لے جا کر اس کی چٹیا۔۔۔ باندھی ہوئی تھی۔ جونہی ساجد کی نگاہ اس کے چہرے پر پڑی لڑکی نے اپنی بڑی اور شہادت کی انگلی کو ایک ساتھ ملا کر سیدھا کیا اور پھر اس کا رخ ساجد کی طرف ایسے کر دیا جیسے وہ انگلیاں نہ ہوں بلکہ اس کے ہاتھ میں پستول ہو اور اس نے ساجد کا نشانہ لے لیا ہو۔

پھر ایک دم سے وہ لڑکی مسکرائی اور اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔

''عرفان نہیں ملا......؟'' اچانک لڑکی نے پوچھا تو ساجد چونکا۔ وہ پہلے ہی اس تذبذب میں تھا کہ وہ لڑکی کون ہے۔ اور اب جو اچانک اس نے عرفان کے بارے میں سوال کیا تو اس کی حیرت دو چند ہو گئی تھی۔

''کون عرفان؟'' ساجد نے الٹا اس سے سوال کر دیا۔

''وہ عرفان جس سے ملنے تم اس قصبے میں پہنچے تھے۔'' لڑکی کا لہجہ پُر اعتماد اور دھیما تھا۔

''شاید آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی ہے مسٹر ساجد۔'' لڑکی نے ایک دم سے ساجد کا نام لیا تو وہ ششدر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ میرا بھی نام جانتی ہے۔ ساجد نے سوچا۔

''کون ہو تم؟''

''ان فضول باتوں کے بجائے مطلب کی بات کرو۔ مجھے اگلے اسٹیشن پر اترنا ہے۔ اور وہ اسٹیشن بھاگتا ہوا آ رہا ہے۔'' لڑکی نے کہا۔ ''عرفان نے تم کو اس قصبے میں بلایا تھا اور پھر نہیں ملا......''

''تم عرفان کو کیسے جانتی ہو؟''

''میں تم کو بھی جانتی ہوں۔ ابھی میں نے تمہارا نام لیا تھا۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ تم دونوں نے مل کر کمپنی میں ڈھائی کروڑ کا غبن کیا تھا۔''

ساجد نے تھوک نگل کر اپنا گلا تر کیا اور بائیں طرف دیکھا۔

لڑکی بولی۔ ''گھبراؤ نہیں آس پاس کوئی نہیں ہے۔ اور پھر میرا لہجہ بھی دھیما ہے۔''

''میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم کون ہو۔ اور یہ سب کیسے جانتی ہو؟'' ساجد نے ایک بار پھر اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور اسے لگا کہ وہ اس سے قبل اس لڑکی کو کہیں دیکھ چکا ہے، یا پھر اس کی اس سے ملاقات ہو چکی ہے۔

''عرفان نے وہ غبن تمہارے ساتھ مل کر کیا اور تمہارے ساتھ رابطے میں رہا اور تمہیں حصہ دینے کے لیے اس جگہ بلا کر خود غائب ہو گیا۔''

ساجد اس کا چہرہ سوالیہ نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ وہ پھر بولی۔

''دراصل جو تمہارے رابطے میں تھا، وہ عرفان نہیں تھا۔''

''تو کون تھا......'' ساجد نے بے ساختہ پوچھا۔

''وہ جو کوئی بھی تھا، وہ سب جانتا ہے۔ لیکن عرفان نہیں

تھا۔" لڑکی نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"پھر وہ کون تھا؟"

"یہ نہیں پتا...... کیونکہ عرفان ڈوب کر مر چکا ہے۔"

"وہ نہیں مر سکتا۔ وہ تیراک ہے۔"

"وہ دریا میں اُلجھ گیا تھا۔ اس کا پیر کہیں پھنس گیا تھا اور وہ زیادہ دیر پانی میں سانس نہیں روک سکا اور مر گیا۔" لڑکی نے بتایا۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"کیونکہ میں نے اس کی لاش کو خود دیکھا تھا۔"

"تم جھوٹ بولتی ہو۔ اگر اس کی لاش ملتی تو پولیس کے علم میں ہوتا۔" ساجد بلا تامل بولا۔

"تم نہیں جانتے کہ عرفان ہمارے گروہ کا آدمی تھا۔ اس نے جو کچھ کیا تھا، وہ ہمارے کہنے پر کیا تھا۔ اور ہم نے اسے دریا میں خود تلاش کیا تھا۔ اس کی لاش میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ کمپنی میں غبن کے لیے ہمارے کہنے پر عرفان نے تمہارا بھی استعمال کیا تھا۔ ہم مسلسل تم پر بھی نظر رکھے ہوئے تھے۔ لیکن اب مسئلہ یہ ہے کہ عرفان مر گیا ہے اور اس نے وہ ڈھائی کروڑ روپیہ کہاں رکھا ہے اس کا علم ہمیں بھی نہیں ہے۔" لڑکی بولتی جارہی تھی اور ساجد دم بخود اس کی طرف دیکھے جارہا تھا۔ اس کے سامنے یہ نیا انکشاف تھا۔ ایسا انکشاف تھا کہ جس کے بارے میں اسے کبھی شک بھی نہیں گزرا تھا۔

اس کا مطلب تھا کہ عرفان اس گروہ کا حصہ تھا۔ اور وہ محض ایک ٹشو پیپر تھا پھر اچانک وہ چونکا۔

"کہیں آپ لوگوں نے تو مجھے نہیں یہاں بلایا تھا؟"

لڑکی اس کا سوال سن کر مسکرائی اور پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ ٹرین کی رفتار آہستہ ہوگئی تھی۔ اس شہر کا پلیٹ فارم قریب آرہا تھا۔ لڑکی بولی۔ "دراصل ہم نے تمہارے ساتھ یہ لمبا چوڑا کھیل اس لیے کھیلا تھا تاکہ تم سے یہ دریافت کرسکیں کہ عرفان نے وہ رقم کہاں رکھی ہے لیکن اس بارے میں تو تم بھی نہیں جانتے ورنہ تم ان دو آدمیوں کو کیوں بلاتے۔"

"کون سے دو آدمی۔" ساجد کو لگا جیسے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

"جب تم شہر سے نکلے تھے تو اس وقت سے لے کر قصبے تک پہنچنے تک، تم پر ہماری نظر تھی۔ تم بس سے اتر کر کہاں گئے تھے کن سے ملے تھے، ہمارے علم میں تھا۔" لڑکی کہہ رہی تھی اور ساجد ششدر اس کی طرف دیکھے جارہا تھا۔

لڑکی پھر بولی۔ "بس اتنا خیال رہے کہ تم کسی کے آگے اپنی زبان مت کھولنا۔ ورنہ مارے جاؤ گے اور اسے بھول کر اپنے کام کی طرف دھیان دو۔ سمجھو کہ کچھ نہیں ہوا ہے۔ عرفان نے جو رقم کہیں چھپائی ہے، وہ ہم خود ڈھونڈ لیں گے۔" ساجد چپ سنتا رہا۔

کچھ دیر کے بعد لڑکی اپنی جگہ سے اٹھی اور بولی۔ "تم سے ایک اور ضروری بات کرنی ہے۔"

"کیا بات کرنی ہے؟" ساجد چونکا۔

"میرے ساتھ آجاؤ۔" لڑکی کہہ کر ایک طرف چل دی۔ اس کے پیچھے ساجد بھی چل پڑا تھا۔ لڑکی ٹرین کے ڈبے کے دروازے میں کھڑی ہوکر باہر دیکھنے لگی تھی۔ سامنے اندھیرا تھا اور ٹرین کی رفتار کم تھی۔

"کیا بات ہے۔"

"وہ دیکھو سامنے......" لڑکی نے ایک طرف ہوکر سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ پلیٹ فارم کی حدود شروع ہوگئی تھی اور اینٹوں کے بنے ہوئے اونچے فرش کے ساتھ ٹرین چل رہی تھی۔

سامنے دیکھنے کے لیے ساجد آگے ہوا تو اچانک ایک دم سے لڑکی نے ساجد کو باہر کی طرف دھکا دے دیا۔ ساجد کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ نیچے گرتے ہی قلابازیاں کھانے لگا۔ اس کا سر پھٹ چکا تھا اور جسم پر بھی زخم آئے تھے۔ قلابازیاں کھاتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور فرش پر ٹانگیں بچھا کر بیٹھ گیا۔ اس کا ایک ہاتھ سر پر تھا اور خون سے اس کے کپڑے سرخ ہو رہے تھے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا تھا پھر وہ بے ہوش ہوکر فرش پر ہی گر گیا۔

☆......☆......☆

ساجد کو جب ہوش آیا تو اس نے خالی خالی آنکھوں سے دائیں بائیں دیکھا۔ وہ اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ کے ایک بستر پر تھا۔ دائیں بائیں مریض بستروں پر لیٹے ہوئے تھے اور تقریباً خاموشی تھی کیونکہ رات کا آخری پہر تھا اس لیے کوئی سو رہا تھا تو کوئی لیٹا ہوا تھا۔ ایک طرف اسٹاف کی بڑی سی میز لگی ہوئی تھی جس کے پیچھے ایک موٹی سی نرس بیٹھی اپنے موبائل فون میں مگن تھی۔

ساجد کو سب کچھ یاد آنے لگا کہ وہ کیسے ٹرین سے گرا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو دیکھا تو اس کے کپڑے خون آلود تھے، سر اور بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ ایک دم سے اٹھا

اور اس نے چاروں طرف متلاشی نگاہوں سے دیکھا۔ دیوار پر لگے کلاک پر اس کی نظر رک گئی۔ سوا چار کا وقت تھا۔

ساجد اپنی جگہ سے اُٹھا اور نرس کی طرف بڑھا۔

"سسٹر میں ٹھیک ہوں اور مجھے جانا ہے۔"

ایک دم نرس چونکی اور اس نے ساجد کی طرف دیکھا۔

"آپ ٹرین سے گر کر زخمی ہو گئے تھے، ایک آدمی آپ کو یہاں لایا تھا۔"

"اب میں جانا چاہتا ہوں۔"

"ایک منٹ رک جائیں میں ڈاکٹر کو بتا دوں۔" نرس نے موبائل فون اپنے سفید کوٹ کی جیب میں ڈالا اور ایک فائل اُٹھا کر پوچھا۔ "کیا نام ہے آپ کا......؟"

"ساجد......" اس نے بتایا۔

نرس نے اس پر اس کا نام لکھا اور ایمرجنسی وارڈ سے باہر چلی گئی۔ ساجد مضطرب سا کھڑا رہا۔ وہ جلدی سے اس جگہ سے جانا چاہتا تھا۔ اسے ہر حال میں آفس پہنچنا تھا...... گیارہ بجے ایک اہم میٹنگ تھی اور اس میٹنگ میں اس کی موجودگی بہت ضروری تھی۔ اگر عرفان اسے مل جاتا اور اس کا حصہ اسے دے دیتا تو شاید وہ اتنی ذمّے داری سے اس میٹنگ کے بارے میں نہ سوچتا۔

آفس جانے کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ وہ باس کو کسی شک میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ چھٹی لے کر وقت پر آفس نہیں پہنچا۔

تھوڑی دیر کے بعد نرس واپس آ گئی اور اس نے اسپتال کی پرچی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ دوائیں لکھ دی ہیں۔ وقت پر لے لیں۔ نہیں لیں گے تو درد ہوگا۔"

ساجد نے پرچی لے کر پینٹ کی جیب سے اپنا پرس نکالا اور وہ پرچی اس کے اندر رکھ لی۔ وہ شکر بھی کر رہا تھا کہ اس حالت میں اس کا پرس جیب کے اندر موجود تھا۔ اس نے سوچا کہ اسے یہاں تک لانے والا کوئی نیک دل انسان تھا۔

ساجد کی ٹانگوں پر بھی خراشیں آئی تھیں اس لیے وہ تقریباً لنگڑاتا ہوا خارجی دروازے کی طرف جا رہا تھا۔

ساجد کا جسم درد میں مبتلا تھا۔ وہ رکشے میں بیٹھ کر بس اسٹینڈ تک پہنچا، وہاں سے وہ بس میں سوار ہوا۔ دن کا سورج اپنی آنکھ کھول چکا تھا جب ساجد اپنے شہر میں پہنچ گیا تھا۔

ساجد کا جسم درد سے چُور تھا۔ اس کا سر بھی چکرا رہا تھا۔ کئی بار ایسا لگا کہ وہ ابھی گر جائے گا۔

وہ ٹیکسی کی طرف جاتے ہوئے اچانک گرنے لگا تو پاس سے گزرتے ہوئے ایک شخص نے اسے تھام لیا۔

"آپ ٹھیک ہیں جناب۔" راہ گیر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی میں ٹھیک ہوں۔" ساجد نے کہا اور ٹیکسی کی طرف دیکھ کر اُسے کو آواز دی۔ ٹیکسی قریب آ گئی اور ساجد اس میں سوار ہو کر چلا گیا۔

☆......☆......☆

جب ساجد آفس پہنچا تو...... ظفر بیگ ابھی نہیں پہنچا تھا۔ سر پر پٹی بندھی دیکھ کر آفس میں کام کرنے والے ہر ایک نے اس کی خیریت دریافت کی تو ساجد نے سب کو ایک ہی جواب دیا کہ وہ کل رات بائیک سے گر گیا تھا۔

ساجد نے گھر جاتے ہی تھوڑی دیر آرام کیا تھا اور پھر منہ ہاتھ دھو کر اور کپڑے بدل کر آفس آ گیا تھا...... اس نے ڈاکٹر کی لکھی ہوئی دوائیں ابھی نہیں لی تھیں۔ اس لیے اس کے جسم میں درد اور بھی شدت اختیار کر گیا تھا۔

آفس پہنچ کر اس نے پرس کے...... اندر سے ڈاکٹر کی لکھی ہوئی پرچی نکالی اور ملازم کو دے کر میڈیکل اسٹور بھیج دیا۔ اسی اثنا میں ظفر بیگ نے اپنے سیکریٹری کو فون کر کے پوچھا کہ ساجد آ گیا ہے۔ اس کے جواب پر ظفر نے فون بند کر دیا۔

ساجد نے چائے اور بسکٹ منگوا لیے تھے اور وہ ناشتا کرنے لگا تھا، اسی اثنا میں ملازم دوائیں لے کر آ گیا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر ساجد نے ڈاکٹر کی لکھی ہوئی پرچی پر دیکھنا شروع کیا کہ کونسی دوائی کیسے کھانی ہے۔ اسی وقت ظفر بیگ بھی آ گیا اور اس نے متحیّر لہجے میں پوچھا۔

"یہ کیا ہو گیا ہے...... خیریت تو ہے؟"

ظفر بیگ کی آواز سن کر وہ ایک دم سے چونکا اور اس نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ اس کے سامنے ظفر بیگ اور انسپکٹر نعمان کھڑے تھے۔

ساجد اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ "سر رات واپس آیا تو بائیک پر گھر جا رہا تھا کہ بائیک سلپ ہو گئی، جس کی وجہ سے چوٹیں آ گئیں۔"

"تم بائیک پر گئے تھے؟"

"نہیں سر گیا تو بس میں تھا، لیکن بائیک اسٹینڈ پر کھڑی کر دی تھی۔ تا کہ آنے جانے میں آسانی رہے۔" ساجد نے بتایا۔

"یہ انسپکٹر نعمان ہیں۔ تم سے ملنا چاہتے تھے، عرفان کا

کیس یہی ڈیل کر رہے ہیں۔'' ظفر بیگ نے انسپکٹر نعمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تعارف کرایا۔

ساجد اندر سے گھبرایا ہوا تھا اور اس کی کوشش تھی کہ اس کی گھبراہٹ اس کے چہرے سے مترشح نہ ہو۔

''لگتا ہے میڈیسن ابھی منگوائی ہے۔'' انسپکٹر نعمان نے اس کے ایک ہاتھ میں پکڑی گولیوں کا پیکٹ اور دوسرے ہاتھ میں ڈاکٹر کا لکھا نسخہ دیکھ کر پوچھا۔

''رات ڈاکٹر نے انجکشن لگایا تھا۔ سوچا کہ دوا صبح کھالوں گا اس لیے ابھی منگوائی ہے۔'' ساجد نے بتایا۔

''آپ کی موٹر سائیکل کہاں سلپ ہوئی تھی؟'' انسپکٹر نعمان نے پوچھا۔

''وہ..... گھر کے پاس ہی سلپ ہوئی تھی۔'' ساجد نے جواب دیا۔

''ابھی بھی آپ اسی موٹر سائیکل پر آفس آئے ہیں؟'' انسپکٹر نعمان نے دریافت کیا۔

''نہیں میں رکشے میں آیا ہوں۔'' ساجد نے جلدی سے پُراعتماد لہجے میں جھوٹ بولا۔

''آپ کی بائیک کا نمبر کیا ہے؟''

''سر آپ مجھ سے اتنی تفتیش کیوں کر رہے ہیں؟'' ساجد نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔

''میں ایسے ہی پوچھ رہا ہوں۔'' انسپکٹر نعمان نے کہا۔

''کیا نمبر ہے آپ کی بائیک کا.....'' انسپکٹر نعمان نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

مجبوراً ساجد کو اپنی بائیک کا نمبر بتانا ہی پڑا۔ انسپکٹر نعمان نے اس کا بتایا ہوا نمبر ایک کاغذ پر لکھ لیا۔

''عرفان کے ساتھ کیسی دوستی تھی آپ کی؟''

''جیسی ایک کولیگ کی دوسرے کولیگ سے ہوتی ہے۔'' ساجد نے گول مول سا جواب دینے کی کوشش کی۔

''بہت گہری..... یا پھر علیک سلیک.....؟''

''بس علیک سلیک اور کام کی حد تک۔'' ساجد نے بتایا۔

''آپ اس کی شادی میں شریک ہوئے تھے؟''

''جی گیا تھا۔''

''پھر تو اچھی دوستی ہوئی ..... اس نے آپ کو اپنی شادی پر بلایا تھا۔'' انسپکٹر نعمان نے کہا۔

''اس نے سارے اسٹاف کو بلایا تھا۔''

''وہ اس کمپنی میں اتنا بڑا غبن کر رہا تھا اور آپ اس کے غبن سے کیسے بے خبر رہے، جبکہ ایک ایک حساب آپ کی نظر میں ہوتا ہے؟'' انسپکٹر نعمان نے پوچھا۔

''وہ بہت شاطر اور زیرک تھا۔ وہ جو کچھ کر رہا تھا، اس نے اپنے سائے کو بھی خبر نہیں ہونے دی تھی۔''

''آپ کو پتا ہے کہ وہ اچھا تیراک تھا۔''

''مجھے اس کا بات کا علم نہیں ہے۔'' سوال سن کر ایک لمحے کے لیے تو ساجد کا دل کانپا لیکن اس نے جواب دینے میں کمزوری نہیں دکھائی۔

''وہ ڈوب کیسے گیا؟''

''مجھے کیا پتا۔'' ساجد نے جواب دینے کے بعد ایک بار پھر مسکرانے کی ناکام سی کوشش کی۔

''عرفان کے مرنے کے بعد اس کے گھر والوں کے حالات بہت خراب ہو گئے ہیں۔ کبھی اس کے گھر جانے کا اتفاق ہوا؟''

''بس تعزیت کے لیے گیا تھا..... باس کے ساتھ۔'' ساجد نے ایک نظر ظفر بیگ کی طرف دیکھا۔

''ٹھیک ہے آپ کام کریں..... بلکہ اس حالت میں آرام کریں تو زیادہ بہتر ہے۔'' انسپکٹر نعمان نے کہا اور ظفر بیگ کے ساتھ جانے لگا تو عقب سے ساجد نے کہا۔

''سر..... اگر آپ اجازت دیں تو میں آج چھٹی کرلوں۔''

''اگر تم جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ..... کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تم آرام کرو ہم کل میٹنگ کرلیں گے۔''

''شکریہ سر۔'' ساجد نے جلدی جلدی سے اپنا سامان سمیٹا اور جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا۔

ساجد اس عمارت سے باہر نکلا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر تسلی کرنے کے بعد موٹر سائیکل اسٹینڈ کی طرف بڑھا اور جلدی سے اپنی بائیک نکال کر اس جگہ سے نکل گیا۔

ساجد جس سڑک پر جا رہا تھا وہاں زیادہ رش نہیں تھا۔ اس نے بائیک کی رفتار آہستہ کی اور پھر ایک دم سے ریس دے کر بائیک سے اچھل کر نیچے اتر گیا اور اس کی..... بائیک کمان سے نکلے تیر کی طرح آگے کی طرف گئی اور سڑک پر گرتے ہی وہ پھسلتے ہوئے دور تک چلی گئی۔

بائیک کی کچھ چیزیں ٹوٹ گئی تھیں۔ ٹنکی میں بھی چھوٹا سا گڑھا پڑ گیا تھا۔ ساجد بائیک کے پاس گیا اور اسے اٹھا کر اس نے ایک نظر بائیک کی طرف دیکھا اور اس پر سوار ہو کر کک ماری اور اپنے مکان کی طرف چلا گیا۔

☆.......☆.......☆

ساجد کو اب اس بات کا اطمینان ہو گیا تھا کہ اگر انسپکٹر نعمان نے اس کی موٹر سائیکل دیکھی بھی تو اس کا ابہام دور ہو جائے گا اور موٹر سائیکل کی حالت دیکھ کر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ساجد واقعی موٹر سائیکل سے پھسل کر گر گیا تھا۔

اب ساجد کو اس بات کی فکر تھی کہ اسے ایک پائی بھی نہیں ملی تھی اور وہ شاید انسپکٹر نعمان کی نظر میں مشکوک بھی ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس کے سوالات اس بات کی طرف واضح اشارہ تھے۔

ساجد کو یہ بھی ڈر تھا کہ اگر انسپکٹر نعمان نے اس پر مزید تفتیش کی تو ہو سکتا ہے کہ وہ ڈر اور خوف کے باعث سب کچھ بیان کر دے۔

ساجد نے اب یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ کسی بھی طرح سے اس بات کا کھوج لگائے گا کہ عرفان نے وہ رقم کہاں رکھی۔ ساجد جانتا تھا کہ عرفان نے اپنے گھر کے کسی فرد کو بھی اپنے منصوبے کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اس نے ایک دن ساجد کو آگاہ کیا تھا کہ وہ چھپ کر چپ چاپ کسی دوسرے ملک فرار ہونے کی تیاری میں ہے۔ جیسے ہی وہ ملک سے باہر جائے گا۔ وہ اپنی بیوی کو بلالے گا اور پھر اپنی بیوی کے ذریعے سے اپنے والدین کو سارے منصوبے سے آگاہ کر کے انہیں اطمینان دلا دے گا کہ وہ اپنا کام چپ چاپ کرتے رہیں۔ ان کو ہر ماہ ایک معقول خرچہ ملتا رہے گا۔

لیکن ساجد اُلجھا ہوا تھا کہ اس لڑکی کے بقول عرفان ان کے لیے کام کر رہا تھا۔ عرفان کے مرنے کے بعد وہ یقینا اس پیسے کی تلاش میں ہوں گے کہ عرفان نے رقم کہاں چھپائی ہے۔ لڑکی نے واضح پیغام دے دیا تھا کہ وہ اب اس پیسے کے بارے میں سوچنا بند کر دے ورنہ مارا جائے گا۔

ساجد کمرے میں مضطرب ٹہل رہا تھا۔ اچانک اس کے قدم رک گئے اور وہ حیرت سے سوچنے لگا۔ جو لڑکی اسے ٹرین میں ملی تھی اسے دیکھ کر اسے شک تھا کہ اس نے اس لڑکی کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ اب اچانک اسے یاد آیا تھا کہ اس لڑکی کی مشابہت عرفان کی بیوی سے ملتی تھی۔

عرفان کے ولیمے میں اچانک اس نے عرفان کی بیوی کو ایک نظر دیکھا تھا۔ ساجد سوچنے لگا کہ ٹرین میں ملنے والی لڑکی عرفان کی بیوی جیسی تھی کہ وہ عرفان کی بیوی ہی تھی؟

وہ اس معاملے پر غور و فکر کرنے لگا۔ ساجد کیونکہ عرفان کے باپ سے کئی بار مل چکا تھا اور دونوں میں اچھی علیک سلیک تھی اس لیے ساجد نے فوراً عرفان کے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔

ساجد باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا اور جونہی اس نے دروازہ کھولا، وہ ٹھٹک کر رک گیا کیونکہ سامنے انسپکٹر نعمان کھڑا تھا۔ انسپکٹر نعمان کا ہاتھ ڈور بیل کی طرف بڑھا ہوا تھا۔ اچانک دروازہ کھلنے پر وہ ساجد کی طرف دیکھنے لگا۔ انسپکٹر نعمان نے پولیس کی وردی نہیں پہنی تھی اور اس کے ساتھ ناصر بھی تھا۔

''ابھی تو میں نے بیل دی ہی نہیں...... اشارے سے بیل بج جاتی ہے؟'' انسپکٹر نعمان نے مسکرا کر کہا۔

''مجھے لگا تھا کہ کوئی دروازے پر ہے۔'' ساجد نے جلدی سے کہا۔

''آپ کا اندازہ تو بہت زبردست ہے۔'' انسپکٹر نعمان نے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے کیا؟'' ساجد نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔

''اگر آپ دس منٹ دینا چاہیں تو کام کی بات ہو سکتی ہے۔'' انسپکٹر نعمان نے کہا۔

''آپ اندر آ جائیں۔'' ساجد نے دروازہ چھوڑ دیا۔ انسپکٹر نعمان اور ناصر اندر چلے گئے اور اس نے دروازہ بند کر دیا۔

''باہر آپ کی بائیک کھڑی ہے۔ میں نے اس کا جائزہ لیا ہے۔ آپ کی بائیک کو کافی نقصان پہنچا ہے۔ یہاں کس جگہ آپ پھسلے تھے؟'' انسپکٹر نعمان نے پوچھا۔

''یہاں قریب ہی سڑک پر۔''

''لیکن مجھے نہیں لگتا کہ آپ یہاں کہیں قریب پھسلے تھے۔'' انسپکٹر نعمان نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''میں اب آپ کو کیسے یقین دلا سکتا ہوں۔''

''اور اگر میں آپ کو یقین دلا دوں کہ آپ یہاں کہیں قریب نہیں گرے تھے تو آپ میری بات کو مان جائیں گے ناں؟'' انسپکٹر نعمان نے متانت سے کہا۔ ساجد کے چہرے پر گھبراہٹ عیاں ہو گئی تھی اور وہ آنکھیں چرانے لگا تھا۔

''پتا نہیں آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟''

''جب آپ آفس میں میڈیسن دیکھ رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ جس سرکاری اسپتال کی پرچی آپ کے ہاتھ میں تھی وہ اس شہر کی نہیں تھی۔'' انسپکٹر نعمان کے اس انکشاف نے ساجد کو بری طرح سے چونکا دیا تھا اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اس کی سانس بھی کچھ تیز ہو گئی تھی۔

''دیکھو اب وقت ضائع مت کرنا اور مجھے سب کچھ صاف صاف بتا دو۔ تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا اور تم اس شہر

میں کیا کر رہے تھے۔"

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ پرچی اسی شہر کے سرکاری اسپتال کی تھی۔" ساجد نے خوفزدہ آواز میں کہا۔

"پولیس والا ہوں۔ محنت کرنے کا عادی ہوں۔ میں نے ایک نظر میں وہ پرچی تمہارے ہاتھ میں دیکھ لی تھی۔ نہیں تو ایسا کرو کہ وہ پرچی ابھی نکالو اور اس پر لکھا اس شہر کا نام پڑھو......"

"وہ پرچی اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔" ساجد نے کہتے ہوئے اپنی جیبوں کو ٹٹولا اور غیر ارادی طور پر اپنا پرس نکال لیا۔ انسپکٹر نعمان نے نرمی سے اس کے ہاتھ سے پرس لیا اور پرس سے پرچی نکال کر کھولی اور اس کے سامنے کر دی تھی۔

ساجد نے اس بات پر تو غور بھی نہیں کیا تھا۔ انسپکٹر نعمان کی تیز نظروں سے اس پرچی پر لکھا ہوا اس شہر کا نام نہیں بچ سکا تھا جہاں ساجد کو حادثہ پیش آیا تھا۔ اس کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے اور اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ وہ اب پھنس چکا ہے۔ وہ عرفان کا ساتھ دینے کے باوجود بھی تہی دست ہی رہ گیا تھا اور اب اُسے جیل دکھائی دینے لگی تھی۔

"میں سب کچھ بتا دیتا ہوں۔" ساجد مریل سے انداز میں بولا اور پھر اس نے کمپنی میں فراڈ کرنے کے لیے عرفان کا جس طرح سے ساتھ دیا تھا اور انہوں نے جو منصوبہ بندی کی تھی اور اس قصبے میں جانے سے واپسی تک کے سارے واقعات بتا دیے۔ انسپکٹر نعمان اس کی بات غور سے سنتا رہا۔

"منصوبہ تو اس نے خوب بنایا تھا۔ اب تم کہتے ہو کہ تمہارا اس کے ساتھ اس قصبے میں پہنچنے تک رابطہ رہا تھا اور پھر وہ نہیں ملا اور جب تم واپس آئے تو ٹرین میں ایک لڑکی ملی جس نے بتایا کہ وہ ایک گینگ سے تعلق رکھتی ہے اور اسی کے کہنے پر عرفان نے کمپنی میں فراڈ کیا تھا لیکن وہ دریا میں گرتے ہی کہیں پھنس گیا اور زیادہ دیر سانس نہ روکنے کی وجہ سے وہ مر گیا اور انہوں نے خود اس کی لاش نکالی تھی اور تم یہ بھی کہتے ہو تم کو یہ خیال اب آیا تھا کہ وہ لڑکی عرفان کی بیوی جیسی تھی۔"

"جی بالکل......"

"عرفان زندہ ہے، یا مر گیا ہے......سب سے بڑی تو یہ الجھن ہے۔" انسپکٹر نعمان سوچتے ہوئے بولا۔

"میں تو یہ سوچتے ہوئے چکرا گیا ہوں۔" ساجد نے کہا۔

"مجھے اب یہ پتا کرنا ہے کہ وہ زندہ ہے تو کہاں ہے۔ اور اگر مر گیا ہے تو فراڈ کی ہوئی رقم کہاں چھپائی ہوئی ہے۔" انسپکٹر نعمان بولا۔ "اور حیران کن بات یہ بھی ہے کہ تمہیں عرفان بن کر قصبے میں کیوں بلایا تھا۔ اس کی کیا وجہ تھی؟"

"میری تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔" ساجد بُری طرح سے الجھا ہوا تھا۔

"میں تم کو عرفان کا ساتھ دینے کے جرم میں گرفتار نہیں کر رہا۔ حقیقت تک پہنچنے کے لیے ابھی تم میرا ساتھ دو گے؟"

"جی میں حاضر ہوں۔"

"تم ابھی میرے ساتھ عرفان کے گھر چلو۔ ہم اُس کی بیوی سے ملتے ہیں۔ اور غور سے دیکھنا کہ وہ وہی لڑکی تھی جو تمہیں ٹرین میں ملی تھی۔"

"جی بالکل غور کروں گا۔" ساجد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆......☆......☆

انسپکٹر نعمان اور ساجد جب اس محلے میں پہنچے جہاں عرفان کا گھر تھا تو اس گھر کے دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔

"یہ لوگ کہاں چلے گئے۔" ساجد نے متحیر نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا۔

انسپکٹر نعمان نے ہمسائے کے گھر کا دروازہ بجایا تو تھوڑی دیر کے بعد اندر سے ایک نوجوان باہر نکلا۔

"آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ لوگ کہاں گئے ہیں؟" انسپکٹر نعمان نے پوچھا۔

"یہ چلے گئے ہیں۔" نوجوان نے جواب دیا۔

"کہاں چلے گئے ہیں؟" انسپکٹر نعمان نے اگلا سوال کیا۔

"بتا رہے تھے کہ گاؤں جا رہے ہیں۔ وہاں ان کا اپنا گھر ہے۔ یہ گھر کرائے پر تھا۔ کرایہ نہ دینے کی وجہ سے مالک مکان نے مکان خالی کرا لیا تھا۔" نوجوان نے تفصیل بتائی۔

"یہ تو ان کا ذاتی گھر تھا۔" ساجد جلدی سے بولا۔

"مالک مکان بتا رہا تھا کہ اس نے یہ گھر بہت پہلے خرید لیا تھا اور اب وہ اسی گھر میں کرائے دار کی حیثیت سے رہتے تھے۔" نوجوان کہہ کر ان کا منہ دیکھنے لگا جیسے وہ پوچھ رہا ہو کہ آپ لوگوں کے سوال جواب ختم ہو گئے ہوں تو میں

جاؤں۔
انسپکٹر نعمان نے اسے جانے کا اشارہ کیا اور ساجد کے ساتھ ایک طرف کھڑا ہو گیا۔
"تم کو معلوم ہے کہ ان کا گاؤں کونسا ہے۔"
ساجد سوچنے لگا اور پھر بولا۔ "ہاں یاد آیا ایک دن عرفان نے اپنے گاؤں کا ذکر کیا تھا۔ اس کے گاؤں کا نام سلطان پور ہے اور وہاں عرفان کا دادا مستری کے نام سے مشہور تھا کیونکہ وہ ٹریکٹر ٹرالی ٹھیک کرنے کا کام کرتا تھا اور اس کام کا وہ بہت بڑا مستری تھا۔ گاؤں والے ایسا بولتے تھے۔"
انسپکٹر نعمان کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر وہ اس کے ساتھ اس جگہ سے چلا گیا۔

☆......☆......☆

انسپکٹر نعمان کے لیے عرفان کا زندہ یا مردہ سراغ لگانا چیلنج بن گیا تھا۔ اب اس کا ایک ہی مقصد تھا کہ وہ جلد از جلد عرفان کی اصلیت کو سامنے لے آئے۔ اس کے لیے اب یہ کیس بہت دلچسپ ہو گیا تھا۔
ساجد کو انسپکٹر نعمان نے کہہ دیا تھا کہ وہ کہیں فرار ہونے کی کوشش نہ کرے ورنہ وہ زندگی بھر پچھتائے گا۔ ساجد کو جانے کیوں لگ رہا تھا کہ انسپکٹر نعمان کا اس کے ساتھ رویہ نرم ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس کا باس بھی اسے معاف کر دے۔
انسپکٹر نعمان سیدھا اس دریا کے پل پر ٹھیک اس جگہ چلا گیا جہاں عرفان کا پیر پھسلا تھا اور وہ دریا میں گر گیا تھا۔ اس جگہ کا جائزہ لینے کے بعد وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھا تو ناصر نے پوچھا۔
"اب کدھر کا ارادہ ہے سر۔"
"دریا کے اُس پار جا کر جانا چاہتا ہوں۔" انسپکٹر نعمان نے بتایا۔
دونوں گاڑی میں بیٹھ کر اس جانب چلے گئے۔ وہ دریا کی دوسری طرف کا حصہ تھا جس کے ساتھ ساتھ بہت سی جھگیاں تھیں۔
اپنی گاڑی سے نکل کر انسپکٹر نعمان ابھی جائزہ لے رہا تھا کہ ایک میلا سا آدمی اس کے پاس آ کر بولا۔
"کیا چاہیے جناب......"
"کیا ملتا ہے یہاں؟" انسپکٹر نعمان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
"کچھ بھی نہیں...... میں ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔" اس شخص نے جونہی انسپکٹر نعمان کا چہرہ دیکھا وہ چونک گیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے سامنے کون کھڑا ہے۔
"ایک بات بتاؤ۔"
"جی پوچھیں۔"
"کچھ دن پہلے اس پل سے ایک نوجوان سیلفی بناتے ہوئے نیچے گر گیا تھا......"
"جی جی مجھے پتا ہے۔"
"اس دن دریا سے نکلتے ہوئے تم نے کسی کو دیکھا تھا؟" انسپکٹر نعمان نے پوچھا۔
"میں نے دیکھا کہ ایک نوجوان اچانک پانی سے نمودار ہوا اور باہر نکلتے ہی اس طرف بھاگ نکلا۔" اس نے بتایا۔
"کس طرف بھاگا تھا؟" انسپکٹر نعمان نے پوچھا۔
"اس طرف بھاگا تھا۔ اور درختوں میں گم ہو گیا تھا۔" اس شخص نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ٹھیک اسی وقت ایک موٹا اور بھدا سا آدمی ان کی طرف بڑھا جو کچھ فاصلے پر ان کی باتیں سن رہا تھا۔
"وہ نوجوان اس طرف بھاگا ضرور تھا لیکن جونہی وہ ایک درخت کے پاس رکا اسی وقت ایک سانپ نے اسے ڈس لیا تھا۔" بھدے آدمی نے عجیب انکشاف کر دیا تھا۔
"اسے سانپ نے ڈس لیا تھا؟ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟" انسپکٹر نعمان فوراً اس کی طرف متوجہ ہوا۔
"میں قریب بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ وہ پانی میں بھیگا ہوا تھا اور لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ اچانک ایک زہریلا سانپ آیا اور اسے ڈس لیا اور وہ اسی جگہ تڑپنے لگا۔ میں اس کی طرف بھاگا۔ سانپ اس جگہ سے جا چکا تھا۔ وہ میرے سامنے تڑپ رہا تھا اور مجھے کہنے لگا کہ میں اسے کسی طرح سے اسپتال لے جاؤں۔"
"پھر تم اسپتال لے کر گئے؟"
"میں ابھی سوچ رہا تھا کہ کیا کروں اس نے اپنا پرس نکالا اور میری طرف بڑھایا اور کہا کہ میں یہ سارے پیسے رکھ لوں اور اسے اسپتال پہنچا دوں۔ میں نے پرس لیا۔ اندر سے بہت سے روپے نکالے اور پرس ایک طرف پھینک کر اسے اپنے کندھے پر اٹھایا اور ابھی کچھ دور ہی چلا تھا کہ وہ مر گیا۔"
"مر گیا تھا......؟" انسپکٹر نعمان نے اس کی طرف متحیر نظروں سے دیکھا۔
"جی وہ مر گیا تھا۔"

پھراس کی لاش کا تم نے کیا کیا؟‘‘

’’میں سوچتا رہا کہ کیا کروں۔ اسی جگہ پھینک دوں لیکن پھر میں گھوم کر دوسری طرف گیا اور اس کی لاش دریا میں پھینک دی۔‘‘ اس شخص نے بتایا۔

’’تم یہ سب سچ کہہ رہے ہو؟‘‘ انسپکٹر نعمان نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

’’مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔‘‘

’’جس جگہ اُسے سانپ نے ڈسا تھا، میں وہ جگہ دیکھنا چاہتا ہوں۔‘‘ انسپکٹر نعمان نے کہا تو وہ شخص انہیں اپنے ساتھ لے کر ایک طرف چل پڑا۔ سامنے درختوں کے جھنڈ تھے۔ کچھ آگے جا کر وہ متلاشی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھتا ایک درخت کے پاس رک گیا۔

’’اس جگہ اُسے سانپ نے ڈسا تھا۔‘‘ اس شخص نے ایک طرف اشارہ کیا۔

انسپکٹر نعمان اس جگہ کو غور سے دیکھنے لگا۔ اسے خون کے سوکھے ہوئے قطرے بھی دکھائی دیے۔ اچانک وہ شخص بولا۔

’’یہ دیکھیں۔ اُس کا پرس ابھی بھی اس جگہ موجود ہے جو میں نے خالی کر کے پھینکا تھا۔‘‘ انسپکٹر نعمان نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا تو وہ شخص کچھ دور کھڑا تھا۔ اس جگہ کچھ جھاڑیاں تھیں۔ انسپکٹر نعمان نے وہاں جا کر دیکھا تو ایک پرس پڑا تھا جس پر مٹی کی تہ جمی ہوئی تھی۔

’’اسے اُٹھا کر مجھے دو۔‘‘ انسپکٹر نعمان نے کہا تو اس شخص نے وہ پرس اُٹھا کر انسپکٹر نعمان کی طرف بڑھا دیا۔

’’جب اس نے اس پرس کو اپنی جیب سے نکالا تھا تو یہ پلاسٹک کی تھیلی میں لپٹا ہوا تھا۔‘‘

انسپکٹر نعمان نے پرس کھول کر دیکھا وہ خالی تھا۔ البتہ عرفان کی تصویر اس میں لگی ہوئی تھی۔ اس نے وہ پرس اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

انسپکٹر نعمان اب مزید اُلجھ گیا تھا۔ ساجد کے ساتھ اس کا رابطہ رہا تھا اور ٹرین میں ملنے والی لڑکی نے کہا تھا کہ عرفان پانی میں ڈوب کر مر گیا تھا اور اس شخص نے ایک دوسری کہانی سنا کر کہانی کا رخ ہی بدل دیا تھا۔

پھر اچانک انسپکٹر نعمان نے پرس اپنی جیب سے نکال کر عرفان کی تصویر اس شخص کی نظروں کے سامنے کی جس نے بتایا تھا کہ اس نے دریا سے ایک نوجوان کو نکلتے دیکھا تھا۔

’’تم نے اس نوجوان کو دیکھا تھا؟‘‘

اس نے تصویر کی طرف دیکھا اور بولا۔ ’’بالکل یہی تھا...... بالکل یہی تھا۔ میں نے خود دیکھا تھا۔‘‘

اس کا پُراعتماد لہجہ انسپکٹر نعمان کے لیے کوئی ابہام پیدا نہیں کر رہا تھا۔ ان دو آدمیوں کی گواہی سے انسپکٹر نعمان کو یقین ہو رہا تھا کہ یہ دونوں سچ کہہ رہے ہیں۔

’’پرس میں کم از کم کتنے روپے تھے؟‘‘ انسپکٹر نعمان نے پوچھا۔

وہ آدمی کچھ ہچکچایا اور پھر بولا۔ ’’بیس ہزار روپے تھے۔‘‘

’’چلو چلتے ہیں۔‘‘ انسپکٹر نعمان نے سر ہلایا اور ان کے ساتھ اس جگہ سے چل پڑا اور اسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے پہلا آدمی ملا تھا۔

’’وہ نوجوان دریا سے نکل رہا تھا تو تمہارے علاوہ کسی اور نے بھی اُسے دیکھا تھا؟‘‘

’’پتا نہیں جناب...... ہم یہاں بہت کچھ دیکھنے کے باوجود بھی چپ رہتے ہیں ...... اور بھول جاتے ہیں۔‘‘ وہ آدمی بولا۔

’’تم دونوں اسی جگہ رہتے ہو؟‘‘ انسپکٹر نعمان نے پوچھا تو دونوں نے اثبات میں سر ہلا دیے۔ انسپکٹر نعمان نے دونوں کے نام پوچھے ...... پہلے شخص کا نام اکرم اور دوسرے کا منیر تھا۔ انسپکٹر نعمان اس جگہ سے چلا گیا۔

☆......☆......☆

گاڑی میں بیٹھ کر انسپکٹر نعمان کچھ سوچنے لگا۔ ایک بار پھر اس نے پرس جیب سے نکال کر دیکھا۔ اچانک پرس کی ایک اندرونی چھوٹی سی جیب میں اسے کچھ محسوس ہوا۔ اس نے وہاں دیکھا تو اندر سے ایک تہ کیا ہوا کاغذ نکالا۔ اندر ایک معروف کمپنی کا بس کا ٹکٹ تھا۔ بکنگ اسی دن کی تھی اور بس کی روانگی کا وقت رات ایک بجے تھا اور شہر کا نام بھی لکھا ہوا تھا۔

انسپکٹر نعمان نے سوچا کہ اس کا مطلب ہے کہ عرفان اس جگہ سے نکل کر اس شہر میں جانا چاہتا تھا۔ اور جس گاؤں کا ساجد نے بتایا تھا وہ بھی اسی شہر کے قریب تھا۔

’’اب کدھر کے ارادے ہیں سر؟‘‘ ناصر نے پوچھا۔

’’گاؤں چلتے ہیں اور وہاں اُن سے ملتے ہیں۔‘‘ انسپکٹر نعمان نے کہا۔

’’ابھی چلیں گے سر۔‘‘

’’ایک گھنٹے کا سفر ہے۔ جائیں گے اور واپس آجائیں گے۔‘‘ انسپکٹر نعمان نے کہتے ہی گاڑی گیئر میں ڈال دی۔

ایک عرصے کے بعد وہ اس گاؤں میں داخل ہو چکے تھے۔ عرفان کے دادا کو بھی جانتے تھے کیونکہ وہ مستری کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے مرنے کے بعد بھی لوگ اس کے کام کی وجہ سے یاد رکھے ہوئے تھے۔ اس لیے انسپکٹر نعمان کو اس آبائی مکان تک پہنچنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی تھی۔

گھر کے دروازے کے باہر ہی چارپائی پر عرفان کا باپ بیٹھا تھا۔ انسپکٹر نعمان اور ناصر باہر نکلے تو انہیں دیکھ کر وہ ان کی طرف دیکھنے لگا۔

''السلام علیکم...... میری آپ سے پہلے بھی ملاقات ہو چکی ہے۔ میں آپ کی دکان پر آیا تھا۔''

انسپکٹر نعمان کی بات سن کر عرفان کے باپ نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور پھر کہا۔ ''ہاں مجھے یاد آ گیا ہے۔''

''مجھے کچھ باتیں پوچھنی ہیں۔'' انسپکٹر نعمان نے کہا۔

''جی پوچھیں۔''

''عرفان کے ساتھ کون کون لوگ ملتے تھے؟'' انسپکٹر نعمان نے پوچھا۔

''میرے گھر اُس سے ملنے کوئی نہیں آتا تھا۔'' عرفان کے باپ نے بتایا۔

''میں عرفان کی بیوی سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''وہ اپنے میکے گئی ہوئی ہے۔'' عرفان کے باپ نے بتایا۔

''کب آئے گی واپس۔''

''شاید ایک ہفتہ لگ جائے۔'' عرفان کے باپ نے کہا۔

''اس کا میکا کس شہر میں ہے؟'' انسپکٹر نعمان نے پوچھا۔

''وہ ملتان میں رہتے ہیں۔''

''وہ تو اس جگہ سے کافی دور ہے۔'' انسپکٹر نعمان نے کہا۔ ''گھر میں اور کون کون رہتا ہے؟''

''عرفان کی ماں اور اس کا چھوٹا بھائی ہے۔'' عرفان کے باپ نے جواب دیا۔

''میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''وہ دونوں گھر میں نہیں ہیں۔ ہمارے عزیزوں میں شادی ہے وہ وہاں گئے ہیں۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔ مجھے گھر کی تلاشی لینے میں آسانی رہے گی۔'' انسپکٹر نعمان گھر کی طرف بڑھا۔

''آپ میرے گھر کی تلاشی کیوں لینا چاہتے ہیں؟'' عرفان کے باپ نے جلدی سے پوچھا۔

''ابھی بتاتا ہوں۔'' انسپکٹر نعمان کہہ کر گھر کے دروازے تک پہنچ گیا اور اندر چلا گیا۔

وہ کشادہ گھر تھا اور درمیان میں صحن اور اردگرد کمرے تھے۔ انسپکٹر نعمان نے ایک ایک کمرے میں جا کر دیکھا۔ اس گھر میں ضرورت کا ہی سامان تھا، کوئی فالتو چیز دکھائی نہیں دی تھی۔ انسپکٹر نعمان نے چاروں طرف دیکھا اور وہ باہر آ گیا۔ ناصر اسی جگہ کھڑا تھا۔

''چلو چلتے ہیں۔'' انسپکٹر نعمان نے چلتے ہوئے ناصر سے کہا اور وہ بھی اس کے پیچھے گاڑی کی طرف چل پڑا۔ ایک دم انسپکٹر نعمان رک گیا اور زمین کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہیں کسی چیز کا تعاقب کر رہی تھیں۔ پھر وہ گھوما اور عرفان کے باپ سے بولا۔

''کل عرفان کی بیوی کو میرے پاس پولیس اسٹیشن میں لے کر آ جائیں۔ اگر آپ نہیں لے کر آ سکتے تو عرفان کے بھائی کے ساتھ بھیج دیں۔''

''آپ اُسے کیوں بلا رہے ہیں؟''

''کیونکہ میرے پاس عرفان کی اہم خبر ہے۔''

''کیا وہ مل گیا ہے؟ میرا بیٹا زندہ ہے۔'' عرفان کا باپ جلدی سے بولا۔

''اس بارے میں کل عرفان کی بیوی کو بتاؤں گا۔ میں کل گیارہ بجے اُس کا انتظار کروں گا۔'' انسپکٹر نعمان نے کہا اور اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ ناصر کے بیٹھتے ہی کار آگے بڑھ گئی۔

''سر واقعی عرفان کی کوئی خبر ہے؟'' ناصر نے پوچھا۔

''یہاں آنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ میرا خیال تھا کہ عرفان کی بیوی ملے گی تو کچھ سوال جواب ہوں گے۔'' انسپکٹر نعمان نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے کہا۔

''اس کے گھر سے کچھ ملا سر؟''

''اس گھر سے کیا ملنا تھا۔ میں تو یہ دیکھنے گیا تھا کہ عرفان کا باپ سچ بول رہا ہے یا جھوٹ۔'' انسپکٹر نعمان نے کہا۔

''مجھے منیر کی بات میں سچائی نظر آتی ہے۔ عرفان کو واقعی سانپ نے ڈس لیا ہوگا اور اس کا پرس بھی آپ کی جیب میں ہے۔'' ناصر نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''ابھی مجھے کچھ اور بھی دیکھنا ہے۔'' انسپکٹر نعمان نے معنی خیز انداز میں کہا اور کار کی رفتار تیز کر دی۔

☆......☆......☆

انسپکٹر نعمان اکیلا ہی اچانک اس گھر کے دروازے پر پہنچ گیا جہاں عرفان اور اس کے والدین رہتے تھے۔ دروازہ پر تالا نہیں تھا۔ انسپکٹر نعمان نے دروازے پر دستک دی تو تھوڑی دیر کے بعد اندر سے آواز آئی۔

''کون ہے؟''

''عرفان کا دوست ہوں۔''

''کون عرفان؟''

''جو اس گھر میں رہتا تھا اور دریا میں ڈوب گیا تھا۔ اس کی ایک امانت واپس کرنی تھی۔'' انسپکٹر نعمان نے کہا۔

''کیسی امانت ہے۔'' اندر سے آواز آئی۔

''اگر آپ دروازہ نہیں کھولنا چاہتے تو میں کل صبح آجاؤں گا۔'' انسپکٹر نعمان کہہ کر چپ کھڑا رہا۔ اندر سے کوئی آواز نہیں آئی اور انسپکٹر نعمان ایک طرف چل پڑا۔ وہ آگے جا کر کھڑا ہو گیا اور دیکھنے لگا کہ دروازہ کھلتا ہے کہ نہیں لیکن دروازہ نہیں کھلا۔

انسپکٹر نعمان کے موبائل فون پر اچانک سرسراہٹ ہوئی تو اس نے اپنا موبائل فون نکال کر دیکھا۔ ایک میسج تھا۔ اسے پڑھتے ہی انسپکٹر نعمان تیزی سے بھاگا۔

انسپکٹر نعمان محلے سے باہر نکلا اور ایک طرف کھڑی اپنی کار میں بیٹھ کر ساجد کے مکان کے باہر پہنچ گیا۔ ابھی وہ کار سے باہر نکل ہی رہا تھا کہ ساجد کے مکان کا دروازہ کھلا اور اندر سے کوئی باہر نکلا۔ اس نے ایک دم انسپکٹر نعمان کی کار کی طرف دیکھا اور ایک طرف دوڑ لگا دی۔

انسپکٹر نعمان بھی اس کے پیچھے بھاگا۔ آگے بھاگنے والا شخص تیز نہیں بھاگ سکا تھا اور انسپکٹر نعمان اس کے سر پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے ایک دم سے جست لگائی اور اس شخص کو لیتا ہوا نیچے جا پڑا۔

اس شخص نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن انسپکٹر نعمان کی گرفت مضبوط تھی۔ انسپکٹر نعمان نے اپنا پستول نکال کر اس کے کان کے سوراخ پر رکھ کر سرگوشی کی۔

''اب حرکت کی تو میری انگلی کی حرکت تمہاری جان نکال دے گی۔''

انسپکٹر نعمان کا کہنا تھا کہ اس نے اپنی مزاحمت بند کر دی۔ انسپکٹر نعمان نے فون کر کے اپنے اہلکاروں کو بلا لیا۔

وہ شخص گرفتار ہو چکا تھا اور اُسے اپنے اہلکاروں کے حوالے کر کے انسپکٹر نعمان جلدی سے ساجد کے مکان میں

نے اس کی طرف دیکھتے ہی کہا۔

''میں نے کہا تھا کہ تم کو مارنے کی کوشش کی جائے گی۔''

''آپ نے ٹھیک کہا تھا۔'' وہ بولا۔

''کیا ہوا تھا...... مجھے تفصیل سے بتاؤ۔''

''آپ کے کہنے کے مطابق میں اپنے بیڈ روم میں نہیں سوتا تھا۔ میں اسٹور میں لیٹا ہوا تھا کہ مجھے لگا کہ جیسے کوئی دروازہ کھول رہا ہے۔ میں ابھی باہر نکلا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک آدمی اندر آ گیا۔ میں بھاگ کر اسٹور میں چلا گیا اور دروازہ اندر سے بند کر کے آپ کو میسج کر دیا۔''

''شکر کرو کہ تم بچ گئے اور میں بھی جلدی پہنچ گیا۔''

''وہ کون تھا سر جو مجھے مارنے کے لیے آیا تھا؟'' ساجد نے پوچھا۔

اس کا سوال سن کر انسپکٹر نعمان مسکرایا اور بولا۔ ''اب تم اطمینان سے سو جاؤ...... اب کچھ نہیں ہوگا۔ صبح گیارہ بجے پولیس اسٹیشن پہنچ جانا۔ عرفان کی بیوی آرہی ہے۔ اُسے دیکھ کر بتانا کہ وہ وہی ہے جو تمہیں ٹرین میں ملی تھی۔''

انسپکٹر نعمان کہہ کر باہر آ گیا اور اپنی کار میں بیٹھ کر چلا گیا۔

☆......☆......☆

انسپکٹر نعمان ابھی پولیس اسٹیشن نہیں پہنچا تھا کہ اُسے اپنے اہلکار کا فون آ گیا۔ ''سر ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔''

''کیا ہوا ہے۔''

''جسے ہم ابھی گرفتار کر کے لائے تھے اور لاک اَپ میں بند کیا تھا، اس نے کچھ کھا کر خودکشی کر لی ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔'' انسپکٹر نعمان نے حیرت سے کہا اور گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔

لاک اَپ میں اس شخص کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ انسپکٹر نعمان نے اس کی لاش کا جائزہ لیا اور پوچھا۔

''یہ کیسے ہوا؟''

''ہم اسے لا رہے تھے کہ اس کی حالت خراب ہو گئی۔ ہم نے کہا کہ یہ ڈراما کر رہا ہے۔ ہم نے اسے گاڑی سے نکالا اور لاک اَپ میں بند کر دیا اور یہ مر گیا۔'' اس نے بتایا۔

''گاڑی میں کون کون تھا۔''

''ہم چاروں ہی تھے سر۔ راستے میں ہمیں ناصر ملا تھا، وہ بھی یہاں تک ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا۔ اور کوئی نہیں تھا۔''

"ناصر کہاں سے آرہا تھا؟"
"وہ ڈیوٹی کے بعد اپنے دوست کی طرف چلا گیا تھا اور واپس آرہا تھا کہ ہمیں سڑک کنارے کھڑا مل گیا۔"
"یہاں وہ کیا کرنے آرہا تھا؟"
"سر وہ اوپر سوتا ہے۔"
"ہاں....." انسپکٹر نعمان نے جلدی سے کہا۔ اور پھر بولا۔
"یہ بُرا ہوا کہ وہ مرگیا۔ اس سے بہت کچھ پتا چل سکتا تھا۔"
"اب کیا کریں۔"
"کارروائی کرواور اس کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دو۔" انسپکٹر نعمان نے کہا اور وہ اہلکار چلا گیا۔ انسپکٹر نعمان کرسی پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔ اسے اس شخص کے مرنے پر افسوس ہورہا تھا کیونکہ وہ اس کیس کے اختتام تک پہنچنے کے لیے بہت اہم ثابت ہوسکتا تھا۔
انسپکٹر نعمان بہت سی باتوں پر غور کرنے لگا۔ پھر اس نے کاغذ اور پنسل لی اور کچھ لکیریں کھینچنے لگا۔ وہ ایک دم سے چونکا اور اس نے فوراً ناصر کو بلالیا۔
"سوئے تو نہیں تھے؟"
"بستر پر لیٹا تھا۔"
"تیار ہو جاؤ ابھی چلنا ہے۔"
"کہاں جانا ہے؟"
"تم جلدی سے آجاؤ میں گاڑی میں بتاتا ہوں۔ ایک اہم بات میرے دماغ میں آئی ہے۔ جلدی کرو۔" انسپکٹر نعمان نے کہا اور ... باہر نکل گیا۔
تھوڑی دیر کے بعد دونوں گاڑی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جاتے ہوئے ناصر نے پھر سوال کیا۔ "جانا کہاں ہے سر؟"
"تم جانتے ہو کہ ساجد کو قتل کرنے کی کوشش کیوں کی گئی تھی۔" اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے انسپکٹر نعمان نے پوچھا۔
"میں نہیں جانتا سر۔"
"وہ میری توجہ ہٹانا چاہتے تھے۔ اُسے قتل کرتے ہوئے وہ کچھ ایسے ثبوت چھوڑ دینا چاہتے تھے جس سے مجھے یہ لگتا کہ اسے ظفر بیگ نے قتل کرایا ہے۔" انسپکٹر نعمان نے بتایا۔
"ایسا کون کرنا چاہتا تھا؟ کیا وہ عرفان......؟"
"یہ کام عرفان کا نہیں ہے۔ عرفان مرچکا ہے۔ اب یہ کچھ اور لوگ ہیں جو عرفان کا وہ پیسہ حاصل کرنے کی کوشش کررہے ہیں جو اس نے فراڈ سے سمیٹا تھا۔" انسپکٹر نعمان نے بتایا۔
"وہ پیسہ کہاں ہوسکتا ہے؟"
"میرے خیال میں اس کا علم عرفان کے علاوہ بھی کسی کو ہے۔" انسپکٹر نعمان نے سوچتے ہوئے کہا۔
"وہ کون ہوسکتا ہے؟" ناصر نے دریافت کیا۔
"اس کا مجھے بھی نہیں پتا۔ یہ میرا اٹکل ہے۔" انسپکٹر نعمان کہا۔ اس دوران کار اس محلے کے پاس پہنچ گئی تھی جہاں عرفان کا گھر تھا۔ ناصر نے دیکھا تو پوچھنا چاہا لیکن انسپکٹر نعمان نے فوراً اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ اور اپنا موبائل فون نکال کر ایک کال ملائی اور فون کان کو لگالیا اور پھر برا سامنہ بنا کر بولا۔
"کم بخت بیلنس ہی ختم ہوگیا...... ذرا فون دینا۔" انسپکٹر نعمان نے کہہ کر اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا اور ناصر نے اپنے ہاتھ میں پکڑا فون اس کی طرف بڑھا دیا۔
فون لے کر انسپکٹر نعمان نے کال ملائی اور فون کان سے لگالیا۔ شاید بیل جارہی تھی اور انسپکٹر نعمان نے ناصر کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ دونوں گاڑی سے باہر نکلے اور گلی کی طرف چلے گئے۔
"فون نہیں اُٹھا رہا۔" انسپکٹر نعمان نے فون کان سے الگ کرکے کہا۔
دونوں گلی میں چلے گئے تھے۔ اور پھر اس مکان کے سامنے پہنچ گئے جہاں عرفان کے والدین رہتے تھے۔
انسپکٹر نعمان نے آہستہ سے کہا۔ "میں دروازے پر دستک دیتا ہوں۔ اندر سے کوئی پوچھے تو کہنا کہ میں ناصر ہوں۔"
ناصر نے انسپکٹر نعمان کا چہرہ دیکھا اور چپ رہا۔ انسپکٹر نعمان نے دروازے کو بجایا اور ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ ناصر نے دوبارہ انسپکٹر نعمان کے چہرے کی طرف دیکھا۔
کچھ دیر کے بعد اندر سے ایک مردانہ آواز آئی۔
"کون ہے......؟"
ناصر نے کچھ کہنے سے قبل انسپکٹر نعمان کی طرف دیکھا اور انسپکٹر نعمان نے بولنے کا اشارہ کیا۔
"میں ناصر ہوں۔" ناصر نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ کھلا اور انسپکٹر نعمان نے پلک جھپکتے ناصر کی گردن کو پکڑ کر زور سے اس آدمی کی طرف دھکا دیا اور ناصر اسی قوت سے دروازے میں کھڑے آدمی کے ساتھ ٹکرایا اور دونوں ایک دوسرے کے اوپر فرش پر جا پڑے۔ اس کے ساتھ ہی انسپکٹر نعمان نے پستول نکال کر اس آدمی پر تان لیا۔

☆......☆......☆

رات کے ڈھائی بج رہے تھے اور ظفر بیگ پولیس اسٹیشن میں انسپکٹر نعمان کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پاس ہی ساجد بھی بیٹھا تھا جبکہ لیڈی اہلکار کے ساتھ ایک برقع پوش خاتون کھڑی تھی۔ انسپکٹر نعمان اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔

''انکل جی میں نے آپ کا کیس حل کر دیا ہے۔'' انسپکٹر نعمان نے کہا۔

''میں تو جاننے کے لیے بے چین ہوں، مجھے بتاؤ کہ عرفان ملا...... میرے پیسوں کا کیا ہوا؟'' ظفر بیگ نے جلدی سے کہا۔

''عرفان ایک منصوبہ ساز نوجوان تھا۔''

''تھا......؟'' ظفر بیگ نے 'تھا' پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''کیا وہ مر گیا ہے؟''

''آپ میری بات پوری سن لیں۔'' انسپکٹر نعمان نے کہا۔ ''عرفان نے آپ کی کمپنی میں فراڈ کیا اور سوا کروڑ کا نہیں بلکہ تین کروڑ کا فراڈ کیا تھا۔''

''تین کروڑ کا......؟ لیکن ہم تو سوا کروڑ کا سراغ لگا سکے تھے۔'' ظفر بیگ کا چہرہ حیرت میں ڈوب گیا تھا اور اس نے ایک نظر ساجد کی طرف بھی دیکھا تھا۔ ساجد کے لیے خود یہ بات حیران کن تھی۔ اس کی دانست میں تو ڈھائی کروڑ کا فراڈ تھا۔

''عرفان نے جو کچھ بھی کیا تھا، بڑی ہوشیاری سے کیا تھا۔ اس نے منصوبہ بنایا تھا کہ وہ دریا میں گرے گا اور دوسری طرف سے نکل کر فرار ہو جائے گا۔ سب کی نظروں میں وہ مردہ قرار پا جائے گا اور معاملہ ٹھنڈا ہوتے ہی وہ... اپنی فیملی کو کہیں اور لے جائے گا۔ لیکن اسلم نے اس کا کھیل بگاڑ دیا۔''

ظفر بیگ بولا۔ ''وہ بندہ بڑے وقت پر ملا تھا۔''

''عرفان نے سب کچھ منصوبہ بندی میں شامل کر لیا تھا لیکن اسلم کو نظر انداز کر دیا تھا۔ ورنہ وہ اسلم کو بھی ٹھکانے لگا کر ہی دریا میں کودتا۔ بہرحال جب ٹھنڈے ہوتے معاملے میں اسلم آ گیا اور اس نے بتا دیا کہ عرفان تیراک ہے تو سب کچھ تیزی سے بدل گیا۔ اس فراڈ میں ساجد بھی اس کے ساتھ شامل تھا۔''

جونہی انسپکٹر نعمان نے یہ کہا ظفر بیگ نے حیرت سے چونک کر ساجد کی طرف دیکھا اور ساجد نے گردن جھکا لی۔

انسپکٹر نعمان نے کہا۔ ''ساجد کا عرفان سے رابطہ تھا۔ ساجد اسے ایک ایک خبر دے رہا تھا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ لیکن اس نے عرفان کو یہ نہیں بتایا کہ اسلم کی بھی انٹری ہو گئی ہے اور کیس کا پانسا پلٹ لیا ہے۔ اس نے ساجد کو اپنے پاس بلایا لیکن ساجد کو پتا نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کوئی اور بھی سفر کر رہا ہے جو عرفان کو ساجد کے بارے میں خبر دے رہا تھا۔ اسی نے بتایا کہ ساجد ایک مکان میں گیا ہے جہاں اس نے دو آدمیوں کو بلایا ہوا ہے تاکہ وہ عرفان کا کام تمام کر سکیں۔ یہ جان کر عرفان اس سے ملا ہی نہیں اور اسے دھوکا دے کر واپس بھیج دیا اور ٹرین سے نیچے بھی گرا دیا تاکہ یہ ڈر جائے اور اس کی ہڈی پسلی ٹوٹ جائے اور ساجد کئی دن تک بیڈ پر چلا جائے لیکن اس کی کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی اور ساجد اپنے آپ کو بچانے کے لیے آفس بھی پہنچ گیا۔''

جونہی انسپکٹر نعمان چپ ہوا ظفر بیگ نے پوچھا۔ ''عرفان کہاں ہے۔ کیا اس برقع میں عرفان ہے؟؟''

''عرفان کہاں ہے...... یا کہیں ہے بھی کہ نہیں یہ میں بعد میں بتاتا ہوں۔'' انسپکٹر نعمان نے کہا۔ ''میری تحقیق آگے بڑھی تو میں دریا کے پار چلا گیا جہاں جھگیاں ہیں۔ وہاں مجھے ایک آدمی ملا جس نے عرفان کو دیکھا تھا لیکن ایک دوسرے آدمی نے بتایا کہ عرفان کو سانپ نے ڈس لیا تھا اور وہ مر چکا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ مر چکا ہے۔'' ظفر بیگ بولا۔

''میں عرفان کے گھر گیا تو پتا چلا کہ وہ چلے گئے ہیں۔ میں نے اس گاؤں میں جانے کا پروگرام بنایا تو مجھے وہاں کوئی نہیں ملا۔ مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میری ہر بات آگے تک کیسے پہنچ جاتی ہے اور میرے کچھ کرنے سے پہلے وہاں کے حالات ہی بدل جاتے ہیں۔ جب میں گاؤں گیا تو عرفان کا باپ وہاں بیٹھا تھا۔ لیکن میں نے زمین پر دیکھا کہ گاڑی کے ٹائروں کے نشانات تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ اس جگہ عرفان کے باپ کو میرے جانے سے پہلے ہی پہنچا کر بٹھایا گیا تھا۔''

''انہیں کیسے پتا چلا تھا کہ آپ وہاں جا رہے ہیں۔ اور پھر عرفان کے باپ کو کہاں سے لے کر گئے تھے؟'' ظفر بیگ نے پھر سوال کیا۔

اس گاؤں سے آدھے گھنٹے کی مسافت پر ایک شہر ہے، عرفان کا باپ اس جگہ تھا اور میرے جانے سے پہلے عرفان کے باپ کو یہ بتا کر وہاں بٹھا دیا تھا کہ اسے کیا کیا کہنا ہے۔'' انسپکٹر نعمان نے بتایا۔

''ایسا کون کر رہا تھا؟''

''یہی نہیں بلکہ میری ایک ایک بات آگے تک پہنچ رہی تھی۔ میں کیا کہہ رہا ہوں، کیا کرنے جا رہا ہوں، میں کیا

سوچ رہا ہوں۔ سب کچھ آگے پہنچ رہا تھا۔ اور میں اس بارے میں سوچ کر حیران ہوئے جا رہا تھا۔" انسپکٹر نعمان نے کہا۔

"یہ کیسے ہو رہا تھا۔" ظفر بیگ کو جاننے کی بے چینی تھی۔

"ساجد کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ میری توجہ اس معاملے سے ہٹے اور وہ لوگ نکل سکیں۔ میں نے ساجد کو آگاہ کر دیا تھا کہ تمہیں مارنے کی کوشش کی جائے گی، اس نے عین وقت پر مجھے میسج کر دیا اور میں وہاں پہنچ گیا۔ اور اسے گرفتار کر لیا لیکن اسے راستے میں ہی زہر دے کر مار دیا گیا۔"

"راستے میں کس نے زہر دیا تھا؟" ظفر بیگ پھر بولا۔

"میں نے غور کیا تو میں اس نتیجے تک پہنچا کہ ناصر راستے میں ملا تھا اور اس نے بڑی ہوشیاری سے اسے زہر کا ٹیکا لگا دیا تھا۔ کیونکہ ناصر میرے ساتھ رہتا تھا اور انہوں نے ناصر کو خرید لیا تھا۔ اور ناصر سب کچھ آگے بتاتا تھا بلکہ میرے ساتھ بات کرتے ہوئے وہ کال ملا کر میری باتیں آگے سناتا تھا۔" انسپکٹر نعمان نے انکشاف کیا۔

"اوہ......؟" ظفر بیگ کے حیرت سے ہونٹ سیٹی بجانے کی شکل اختیار کر گئے تھے۔

"پھر میں ناصر کے ساتھ عرفان کے گھر گیا تو یہ مجھ سے راستے میں پوچھتا رہا اور میری باتیں آگے سناتا رہا۔ میں نے یہ نہیں بتایا کہ میں جا کہاں رہا ہوں۔ اس لیے میں عرفان کے گھر پہنچ گیا۔ دروازہ ناصر کی آواز پر کھلا، اور میں نے ان پر قابو کر لیا۔ کیونکہ میرے ساتھ پولیس تھی جس کا علم ناصر کو بھی نہیں تھا۔"

"عرفان کہاں ہے اور میرا پیسہ کہاں ہے؟" ظفر بیگ نے پوچھا۔

"جس شخص نے عرفان کو دریا سے نکلتے دیکھا تھا اس نے سچ بتایا تھا۔ لیکن اچانک جو دوسرا شخص آیا تو اس نے کہانی کا رخ ہی بدل دیا تھا کیونکہ وہ عرفان کا زر خرید تھا۔ اور اس کی جھگی بھی اسی جگہ تھی اور وہ اس جگہ کا طاقتور شخص تھا۔ ناصر نے کیونکہ میری آمد کے بارے میں بتا دیا تھا اس لیے میرے جانے سے پہلے اس آدمی کو بتا دیا تھا کہ کیا کہنا ہے اور مٹی لگا کر عرفان کا پرس بھی اس جگہ پھینک دیا تھا۔ اس طرح وہ لوگ میری سوچ کو بدلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔"

"پھر تم... ان تک کیسے پہنچے......" ظفر بیگ نے پوچھا۔

"جب میں گاؤں والے گھر میں پہنچا اور اندر دیکھا تو وہاں تصویروں کے فریم لگے ہوئے تھے جو کسی اور لوگوں کے تھے۔ میں جان گیا کہ یہ رہائش ان لوگوں کی ہے، عرفان کے باپ کو صرف وہاں بٹھایا گیا تھا۔ میرا شک تھا کہ عرفان کی بیوی اور ماں اسی گھر میں ہے اور جب میں ناصر کے ساتھ وہاں پہنچا تو عرفان کی بیوی اور ماں اسی گھر میں موجود تھیں۔" انسپکٹر نعمان نے کہنے کے بعد اشارہ کیا تو لیڈی اہلکار نے برقع پوش کا برقع ہٹایا تو وہ عرفان کی بیوی تھی۔

ساجد دیکھتے ہی بولا۔ "یہ تو مجھے ٹرین میں ملی تھی اور اسی نے مجھے دھکا دیا تھا۔"

"عرفان نے جو فراڈ کیا تھا اس کے بارے میں اسے سب پتا تھا اور یہ اس کے ہر ڈرامے میں شامل تھی۔ اس کے بعد عرفان کی ماں اور بھائی کو پتا چلا تھا البتہ عرفان کا باپ اس سے بے خبر تھا۔ تاکہ اس کے آنسو ہمیں سچائی تک پہنچنے ہی نہ دیں۔"

"اب یہ بتا دو کہ میرا پیسہ اور عرفان کہاں ہے؟" ظفر بیگ نے پوچھا۔

"عرفان کو جب اس شخص نے دریا سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تو وہ سامنے کی طرف بھاگا۔ وہاں اس کی ملاقات منیر سے ہو گئی اور منیر نے اسے پکڑ لیا تھا۔ عرفان نے منیر کو لالچ دیا اور وہ اس کے ساتھ شامل ہو گیا۔ جیسا عرفان کہتا رہا وہ کرتا رہا اور اس نے عرفان کو جھگیوں میں پناہ بھی دے دی اور اب وہ اسی جگہ سے منیر کے ساتھ گرفتار بھی ہو چکا ہے۔" انسپکٹر نعمان نے بتایا۔

"اور میری رقم؟"

"عرفان نے جو منصوبہ بنایا تھا وہ ٹھیک تھا اس میں وہ کامیاب بھی ہو جاتا اگر اسلم آپ کو نہ ملتا۔ رہی بات اس رقم کی...... وہ رقم عرفان کی بیوی کے پاس تھی۔ اسی گھر میں جس گدے پر بیٹھ کر یہ لوگوں کے کپڑے سیتی تھی اس گدے میں آپ کی رقم تھی۔" انسپکٹر نعمان نے بتایا تو ظفر بیگ نے جلدی سے کہا۔

"جس طرح عرفان نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے بندے استعمال کیے تھے مجھے نہیں لگتا کہ رقم پوری ہو گی۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ عرفان نے پیسہ پانی کی طرح بہایا تھا، اب کتنا خرچ کیا اور کتنا بچا ہے یہ آپ خود گن لیجیے گا۔ میں نے ساری حقیقت سے پردہ اٹھا دیا ہے۔" انسپکٹر نعمان کہہ کر مسکرا دیا اور اپنے دائیں جانب دیکھا۔ اس کی دانست میں تھا کہ ہمیشہ کی طرح ناصر اس جگہ کھڑا ہو گا اور کیس بیان کرنے کے بعد وہ فوراً سگریٹ سلگا کر اسے دے دے گا، لیکن اس جگہ ناصر نہیں تھا۔

زنِ آہن

روبینہ رشید

بعض اوقات لمحے بھر کی خطا صدیوں کی سزا بن جاتی ہے... انسان کی حرص اور جارحانہ مزاج... اب معاشرے کا ناقابلِ فہم دستور بنتا جارہا ہے... مزاجوں کی شوریدہ سری ہو یا سرد مہری... سفاکیت کا مظاہرہ ہو یا انسانیت کی بات... کیا یہ سب صرف عورت تک محدود ہے... وہ عورت جو زندگی کی روح ہے... مگر درندہ صفت محض کھلونے اور کھیل میں کچھ زیادہ فرق نہیں رکھتے... عورت اور اس کی ذات سے وابستہ تلخ و ترش حقائق سے پردہ اٹھاتی ایک پُراثر داستان... زندگی کے لیے جدوجہد کرنے والوں کے عزم کی عکاس... پل پل سنگین اور غمگین مرحلے آتے رہے... اور اس کے مضبوط ارادوں کو ضربات لگاتے رہے... مگر زنِ آہن کے تقاضے کہیں بھی متزلزل نہ ہو سکے...

سڑک مسلسل جام تھی۔

سگنل فری شاہراہ ہونے کے باوجود ٹریفک چیونٹی کی چال چل رہا تھا۔ جناح اسپتال کی طرف مڑ کر نانے قدرے سکون کی سانس لی۔ رش تو یہاں بھی بہت تھا۔ سڑک کے ایک جانب اوور ہیڈ برج اور دوسری جانب آدھی سڑک تک پارکنگ نے راستہ تنگ کر رکھا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ سڑک پر گٹر کے پانی کے تالاب سے بن گئے تھے۔ ان سے بچ کر چلنے کی کوشش ٹریفک جام کی ایک اور وجہ بن رہی تھی۔ کئی بڑے اسپتالوں کی قربت کی وجہ سے لوگوں کا ایک بڑا رش پیدل سفر میں تھا جس کی وجہ سے گاڑی رینگنے پر مجبور تھی۔ اطمینان کی صرف ایک ہی وجہ تھی اور وہ یہ کہ منزل کے قریب ہوں۔ اس کا دفتر اب قریب ہی تھا۔ گرمی یوں بھی مزاج پوچھے لے رہی تھی۔ گاڑی کا اے سی بھی صبح سے ٹھیک کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ قدرے جھنجلائی ہوئی تھی۔

گاڑی اب اس کے دفتر کی سڑک پر مڑی۔

’’لو، آج یہاں بھی ٹریفک جام ہو گیا۔‘‘ وہ حیرت اور غصے کے ملے جلے انداز میں بولی۔

’’نہیں میڈم...... اِدھر کچھ اور مسئلہ لگ رہا ہے۔‘‘ ڈرائیور امتیاز گاڑی کو حتی الامکان حد تک آگے لے جاتے ہوئے بولا۔

’’اب یہاں کیا مسئلہ ہو گیا ہے؟‘‘ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کھڑکی سے باہر گھورا۔

اس کے سامنے جو منظر تھا، وہ کم از کم اس کے لیے تو ناقابلِ یقین تھا۔

اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

آنکھیں گویا پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

اس نے سن گلاسز اتارے اور غور سے ایک بار پھر باہر دیکھا۔

ایسا نہیں تھا کہ اسے شہر یا ملک کے حالات کا علم نہ ہو مگر اس کے باوجود جو کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا

سنسنی خیز اور اعصاب شکن

کہانی کے دلچسپ حقائق

تھا، اس نے ایک لمحے کو اسے بھونچکا سا کر دیا تھا۔

سڑک پر ایک مضبوط کاٹھی کا درمیانی قامت کا مرد موجود تھا۔ اس کی عمر پینتیس اڑتیس کے اردگرد ہوگی، اس کی رنگت صاف بلکہ اچھی خاصی بہتر شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے صاف ستھرا کلف دار شلوار قمیص پہن رکھا تھا، سر پر پگڑی تھی۔ اس کے ساتھ ایک اٹھائیس انتیس سال کی خوب صورت گوری چٹی خاتون تھی۔ پھول دار شلوار قمیص پر اس نے کڑھائی والی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ حیرت کی وجہ ان کا سڑک پر کھڑا ہونا یا ان کا حلیہ نہیں تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہیں اسی بارونق سڑک پر نسا کے دیکھتے ہی دیکھتے اس شخص نے عورت کے منہ پر تھپڑ رسید کیا تھا۔ عورت چوٹ کی وجہ سے منہ پر ہاتھ رکھ کر دہری سی ہوگی، اس کے تاثرات میں درد تکلیف اور خوف تو نمایاں تھا مگر حیرت یا صدمے کا کوئی گزر نہیں تھا جیسے جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے لیے وہ معمول کی بات ہو اور وہ اس کی عادی ہو۔ اس کے جھکنے پر مرد نے اس

دیا۔

اس سے زیادہ برداشت کرنا نسا کے بس میں نہیں تھا۔

''روکو گاڑی۔'' اس نے چلا کر ڈرائیور کو رینگتی ہوئی گاڑی روکنے کا حکم دیا اور سنسناتی ہوئی باہر نکل گئی۔

''میڈم...... رک جائیں میڈم......'' امتیاز کی سنسناتی آواز کو یکسر نظر انداز کر کے وہ غصے میں بھری ہوئی ان دونوں کے سامنے جا پہنچی۔ مرد اب عورت کا بازو موڑے گالیوں کی برسات کر رہا تھا۔

''اے...... یہ کیا کر رہے ہو تم......؟ چھوڑو اس کا ہاتھ، شرم نہیں آتی تم کو......؟'' نسا غرائی۔

''او میڈم جی......'' اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

''یہ تمہارا معاملہ نہیں ہے، تم اپنے راستے پر جاؤ۔'' جواب حسبِ توقع سخت اکھڑ انداز میں ملا تھا۔

''اس کا بازو چھوڑو...... اس طرح تم کسی کو کس طرح مار سکتے ہو؟'' وہ بہت غصے میں تھی۔

''تم کو سنائی نہیں دیتا۔'' وہ اب کے غرایا، البتہ یہ ضرور ہوا تھا کہ اس نے عورت کا بازو چھوڑ دیا تھا۔

''میڈم...... مجھے بچا لیں...... مجھے اس کے ساتھ نہیں رہنا...... نہیں جانا ہے اس کے ساتھ...... یہ بہت برا ہے...... بہت مارتا ہے مجھے۔'' عورت کو کوئی ہمدرد ملا تو وہ تڑپ گئی تھی۔ وہ نسا کے پیروں کو پکڑ کر بولی۔

''تجھے تو میں ابھی ٹھیک کرتا ہوں۔'' وہ گالی دے کر اس سے بولا پھر نسا کی طرف مڑا۔

''آخری بار بول رہا ہوں تم اپنا کام کرو...... تم کو ایک بار کی بات سمجھ نہیں آتی یا کوئی سبق چاہیے، یہ ہمارا گھر کا معاملہ ہے، تم اس میں دخل نہیں دو اور چلتی پھرتی نظر آؤ۔ یہ گاڑی ماڑی اور فیشن ایبل کپڑے کا روب ہم پر ڈالنے کی کوشش نہیں کرو ورنہ بہت پچھتانا پڑے گا۔'' وہ دھمکی آمیز انداز میں بولا۔

''واہ...... بہت خوب، اب تم مجھے بھی دھمکیاں دے رہے ہو اور اس سے بھی زیادہ شاباش آپ لوگوں کو ہے۔'' نسا نے مڑ کر فٹ پاتھ پر بیٹھے رکشا ڈرائیور، جمع ہوئے لوگوں اور دکان داروں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''ایک لچا لفنگا اس بری طرح ایک عورت کو مار رہا ہے اور آپ سب تماشا دیکھ رہے ہیں؟''

''میڈم۔'' ایک نے کہا۔ ''ان کے گھر کا معاملہ ہے...... بس اس لیے چپ رہے ورنہ تو منہ توڑ دیتے اس

ایک ڈرے والا پھٹ کر بولا۔

”کوئی بھی معاملہ ہو، اس کا حق کسی کو نہیں ہے۔“

”بہت بول رہی ہو میڈم...... مجھے کوئی گیا گزرا مت سمجھو، برباد کردوں گا تم کو اور تجھے بھی......“ وہ گالی دے کر رکشے والے سے بولا۔

”یہ بہت بڑا اسور ما ہے، اسے پکڑیے آپ لوگ، میں پولیس کو بلا رہی ہوں۔ وہ ہی پتا کرے گی کہ یہ کتنا بڑا آدمی ہے۔“ نسا دانت پیس کر بولی۔ وہ عورت اس کی پشت پر چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”کیا بکواس کیے جا رہی ہے...... وہ میری بیوی ہے میں جانوں اور وہ...... چل تو اِدھر......“ وہ عورت کا بازو کھینچنے کی کوشش کرتا ہوا بولا۔

”خبردار، اس کو ہاتھ مت لگانا۔“ نسا زور سے بولی۔

”آپ لوگ اِسے پکڑیں۔“ نسا نے موبائل پر تھانے سے رابطہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کی دخل اندازی پر جہاں وہ مرد لال پیلا ہو گیا تھا وہیں اس عورت کو تھوڑی سی ہمت مل گئی تھی۔ وہاں موجود افراد بھی گویا متاثر ہو گئے تھے اور سب اسے لعن طعن کر رہے تھے۔ وہ لوگوں میں پھنس گیا تھا جبکہ نسا اس عورت کو لے کر گاڑی کی طرف آ گئی تھی۔

”تجھے تو میں ٹھیک کر دوں گا۔ تجھ جیسی حرافہ عورتیں بہت دیکھی ہیں میں نے...... دوسروں کے معاملات میں گھسنے کا بہت شوق ہے تجھے...... مجھے سمجھ کیا رہی ہے تو؟ بہت پچھتائے گی۔ بہت پچھتائے گی۔“ وہ چلا رہا تھا۔ ”اور تو...... کس سے پوچھ کر اس کے ساتھ چل پڑی...... ماں ہے وہ تیری؟ اور تو کیا سمجھتی ہے؟ کیا کر سکتی ہے یہ؟ تو گھر تو چل...... تیری ہڈیاں سرمہ نہ کر دیں تو میرا بھی نام نہیں۔“

وہ بھیڑ سے بمشکل نکل کر چیل کی طرح اپنی بیوی پر جھپٹا۔ لوگوں کے پکڑتے پکڑتے بھی اس نے اس کے بال پکڑ لیے تھے۔ عورت کے سر سے چادر اتر گئی اور وہ زمین پر گر پڑی۔ ڈرائیور امتیاز اس دوران نسا کے آگے آ گیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ وہ پاگل میڈم کو نقصان نہ پہنچائے۔ نسا اتنی دیر میں تھانے میں بات کر چکی تھی اور اس کے حساب سے پولیس موبائل کسی بھی لمحے پہنچ سکتی تھی۔ عورت اب زمین پر بیٹھی رو رہی تھی۔ اس آدمی کو لوگوں نے گھسیٹ کر اس سے دور کر دیا تھا اور اس کی دھنائی شروع ہو گئی تھی۔ یوں بھی روزگار، بجلی، پانی اور بدترین رویوں کے ستائے لوگوں کو اپنی فرسٹریشن اور غصہ نکالنے کے لیے بہانہ درکار ہوتا ہے۔ معاشرے میں بڑھتے ہوئے عدم برداشت، لڑائی جھگڑے کی بہت بڑی وجہ یہی ہے۔

نسا نے زمین پر بیٹھی روتی ہوئی عورت کو سہارا دے کر اٹھایا۔ اتنے میں موبائل بھی آ گئی اور لمحے بھر میں اسے موبائل میں ڈال دیا گیا۔ اس کے کلف دار کپڑے پھٹ چکے تھے۔ چہرے پر تھپڑوں کے نشانات تھے، پگڑی غائب ہو گئی تھی۔

وقت کا پہیا لمحے بھر میں الٹا گھوم کر اسے نشانِ عبرت بنا گیا تھا۔

☆☆☆

”نسا جی آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے، ایسے لوگوں کو قرار واقعی سزا ملنی چاہیے لیکن میرا مشورہ یہ ہے کہ یہ ان کا گھریلو معاملہ ہے، میاں بیوی کو مشورہ کر لینے دیں۔ شاید ان کی مصالحت ہو جائے۔“ انسپکٹر بولا۔

”دیکھ لیں اکرم صاحب، یہ جس قسم کا آدمی ہے۔ یہ اس کے ساتھ بہت برا سلوک کرے گا، معاملہ میرا نہیں ہے، میں اس عورت کو بچانا چاہتی ہوں۔ یوں بھی سرِراہ وہ جو کچھ کر رہا تھا، وہ ہر لحاظ سے قانوناً غلط اور قابلِ دست اندازی پولیس ہے پھر اس نے مجھے بھی دھمکیاں دی تھیں۔“

”ٹھیک ہے میڈم، مجھے ایس پی صاحب نے بھی فون کر کے کہا ہے جیسا آپ کہیں گی ہم اس کی ایف آئی آر کاٹ دیں گے پھر بھی ایک بار اس کی بیوی سے پوچھ لیں کہ وہ کیا چاہتی ہے؟“

نسا اس عورت کی طرف مڑی، وہ پیچھے بینچ پر سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ نسا کو یاد آیا کہ اس کو اب تک اس عورت کا نام تک معلوم نہیں ہے۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”روزینہ......“ اس نے دھیرے سے کہا۔

”تم کیا چاہتی ہو، تمہارے شوہر کی رپورٹ کریں یا تم اس کے ساتھ یہ معاملہ یہیں طے کرنا چاہتی ہو؟“ نسا نے پوچھا۔

”میں...... میں اس کے ساتھ نہیں جانا چاہتی میڈم۔“ وہ چند لمحے اسے دیکھتے رہنے کے بعد بولی۔

”مسئلہ اس وقت یہ نہیں کہ اس کے ساتھ رہنا ہے کہ نہیں...... کیا تم اس سے صلح کرو گی یا رپورٹ کرو گی پولیس میں......؟“

”تھانے میں......“ وہ گویا لرز کر بولی۔ ”اگر میں اس کی شکایت کروں تو پھر کیا ہوگا؟“

”وہ یہاں بند رہے گا، مقدمہ چلے گا اور اس کو سزا ہو

کی۔ نسا نے شادی سے پہا۔

"مگر پھر وہ مجھ سے اس کا بدلہ لے گا۔" وہ ڈر رہی تھی۔

"یہ فیصلہ تمہیں خود کرنا ہے روزینہ، اب بھی تو تمہارا برا حال ہے ہو سکتا ہے کہ وہ سدھر جائے یا کم از کم ڈرے...... دوسری صورت میں انہیں اس کو چھوڑنا پڑے گا۔" نسا کے جملوں پر اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا پھر چند لمحوں بعد وہ بولی۔

"میں شکایت کروں گی، اس کو سزا ملنی چاہیے۔ آپ ان لوگوں سے کہیں کہ اس کو خوب ماریں......" اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں، چہرے پر خوف تو تھا ہی غصے نے بھی اپنے رنگ بکھیرے تھے۔

کاغذی کارروائی سے فراغت میں انہیں ایک گھنٹا لگ گیا تھا۔

"تم کو کہاں جانا ہے؟" نسا نے گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے روزینہ سے پوچھا۔

"میں......؟ میں کہاں جاؤں؟" اس نے بے بسی سے گویا خود سے سوال کیا۔

"میرا مطلب ہے کہ کوئی رشتے دار، ماں باپ، کوئی تو ہوگا نا؟"

"ماں ہے جی، پر وہ تو گاؤں میں ہے۔ یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ شادی کر کے آئی ہوں۔ تین سال پہلے۔"

"یہ تمہارا شوہر...... کیا یہ بھی تمہارا رشتے دار ہے؟" نسا نے کار میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کرتا کیا ہے؟"

"جی بی بی، برادری کا ہے، پر یہ بہت برا آدمی ہے۔ مار پیٹ، نشہ، عورت کا چکر اور بھی بہت سے عجیب کام کرتا ہے یہ۔" وہ قدرے رازداری سے بولی۔ "پیچھے دور کے علاقے سے اس کے خوفناک دوست بھی آتے ہیں، مجھے اس سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

"تو تم نے تین سالوں میں اپنی ماں کو اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟"

"نہیں بی بی، نہیں بتا پائی۔ میں تو گاؤں ابھی صرف ایک بار گئی ہوں اپنے آدمی کی ماں کی موت پر...... اور اس وقت ماں بیمار تھی۔ یوں بھی وہ کہتی ہے کہ جو بھی شہباز خان کہے، مجھے اسی طرح کرنا چاہیے۔" وہ اداسی سے بولی۔ "شروع میں مار پیٹ کا بتایا تھا تو ماں نے کہا تھا کہ ایسا سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس سے عورت جنتی ہو جاتی ہے پر شہباز خان کا غصہ بہت خراب ہے، آج بھی ذرا سی بات پر یہ سب ہو گیا ہے۔ سڑک پر مجھے ایک آدمی بالکل اپنے ماموں جیسا لگا تھا تو میں نے اسے پکارا اور اس نے جواب دیا۔ وہ رونے لگ گئی۔

"بس اتنی سی بات......" نسا نے افسوس سے کندھے اچکائے۔ "اچھا اب تم چپ ہو جاؤ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے پاس فی الحال کوئی ٹھکانا نہیں ہے؟" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

اگلا ایک گھنٹا خاصا مصروف گزرا تھا۔ اس نے روزینہ کو امتیاز کی جاننے والی سلائی کرنے والی ایک عورت کے گھر پے انگ گیسٹ کے طور پر ٹھہرایا تھا اور اسے کچھ پیسے دے دیے تھے اور پھر دفتر کے لیے روانہ ہوئی تھی۔ امتیاز گاڑی چلا رہا تھا۔ نسا نے سر سیٹ کی پشت پر رکھ دیا اور آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

نسا کا پورا نام زیب النسا تھا۔

اس کی پیدائش پر دادی نے بڑی محبت سے اسے اپنی ماں کا نام دیا تھا۔

نسا کراچی میں ایک بین الاقوامی این جی او کی نمائندہ تھی۔ اس نے سوشل ورک میں پی ایچ ڈی کیا تھا اور خواتین کے ساتھ سلوک اور ان کی بہتری کے لیے کام اس کا خاص موضوع تھا۔

لوگوں کے مسائل اور ان کے حل سے دلچسپی اس کے خون میں شامل تھی۔ اس کے دادا اور ڈیڈ فوج میں رہے تھے۔ اعلیٰ عہدوں کے باوجود اس نے انہیں ہمیشہ دوسروں کے کام آتے دیکھا۔ اس کی دادی حکیم تھیں اور وہ علاقے کی عورتوں کا مفت علاج کرتی تھیں۔ امی اگرچہ ہاؤس وائف تھیں مگر وہ بچوں کو پڑھایا کرتیں۔ وہ دو بہن بھائی تھے نسا اور تیمور۔ مگر ان کا گھر اردگرد کے غریب بچوں سے بھرا رہتا تھا۔ ان کی رہائش اسلام آباد میں تھی اور ان کا گاؤں وہاں سے صرف ڈھائی گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ نسا شادی سے قبل ہر ماہ گاؤں ضرور جاتی اور گاؤں کی عورتوں کی کونسلنگ کیا کرتی۔

شادی کے بعد وہ کراچی منتقل ہو گئی تھی۔ صفدر اس کی پھوپی کا بیٹا تھا۔ وہ لوگ سالوں سے کراچی میں رہائش پذیر تھے۔

نسا کو اسلام آباد بہت پسند تھا مگر صفدر بھی اسے اچھا لگتا تھا۔ امی اور ڈیڈ نے اس کی پسند دیکھتے ہوئے صفدر کے پلڑے میں اپنی رضامندی ڈال دی تھی جس کے بعد منگنی اور شادی ہو کر وہ یہاں آ بسی تھی۔

اب تو اسے کراچی آئے آٹھ سال گزر چکے تھے۔ اس دوران پھوپی اور پھوپا ایک کے بعد ایک چل بسے تھے اور صفدر اور وہ اکیلے رہ گئے تھے۔ پھوپا اسے بہت چاہتی تھیں مگر شادی کے تین سال بعد سے ہی انہیں اس سے ایک بڑی شکایت ہوگئی تھی کہ وہ ان کے لیے پوتا یا پوتی کا تحفہ نہیں دے پائی تھی۔ اکلوتے بیٹے کی اولاد کی تمنا نے بالآخر انہیں پھوپی سے ساس بنا دیا تھا۔ صفدر خود ڈاکٹر تھا اس کے اور نسا کے تمام ٹیسٹ ہو چکے تھے۔ بظاہر کہیں کچھ غلط نہیں تھا مگر پھر بھی امید کا چراغ نہیں جل پا رہا تھا جسے صرف قدرت کا فیصلہ ہی کہا جا سکتا تھا مگر پھوپی اس کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

صفدر اس سے بہت پیار کرتا تھا اور اس محبت کی طاقت نے ہی انہیں ان مشکل حالات میں جوڑے رکھا تھا۔

وہاں اسلام آباد میں بھی ان کا گھر اب زیادہ تر خالی ہی رہتا تھا۔ نسا اور تیمور دو ہی بہن بھائی تھے۔ اس کے کراچی آنے کے چند سال بعد تیمور کینیڈا شفٹ ہو گیا تھا، اب اس کے ڈیڈ اور امی بھی وہیں اپنے بیٹے کے پاس تھے اور بہت خوش تھے، وہ تو نسا اور صفدر کو بھی وہاں بلاتے رہتے مگر صفدر اپنے اسپتال اور نسا اپنے کاز سے بندھی تھی۔ وہ سال ڈیڑھ سال میں ان سے مل آتے اور پھر نئی توانائی کے ساتھ اپنے کام میں لگ جاتے۔

کبھی کبھی خود نسا کو اپنا آپ نامکمل لگتا، کسی کی کمی محسوس ہوتی مگر اس کے بس میں کچھ نہیں تھا پھر جب وہ اپنے اردگرد پھیلی مایوسیاں، استحصال، تکلیفیں، دکھ، پریشانیاں، ردتوں کی بدصورتیاں دیکھتی تو اس کا سر اور دل اپنے رب کے شکر کے سجدے میں جھک جاتا۔ کمی تھی مگر اس ایک دکھ کے علاوہ بہت کچھ تھا جس کے لیے اگر وہ ہر لحظہ شکر ادا کرتی تو وہ بھی کم تھا۔

”میڈم آفس آگیا......“ امتیاز کی آواز اُسے پہلے کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی پھر وہ گویا زوم کر کے حال کے فریم میں لوٹ آئی۔

☆☆☆

وہ کھڑکی میں کھڑا سڑک سے گزرنے والے افراد کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا یہ دو کمروں کا فلیٹ شہر کے پرانے علاقے میں واقع ایک بوسیدہ سی عمارت کی تیسری منزل پر تھا۔ اس کی عمر 25 سال سے کم ہی تھی۔ گوری رنگت، درمیانی جسامت کے ساتھ وہ ایک اچھی شخصیت کا نوجوان تھا۔ عام حالات میں یقیناً وہ کافی پُرکشش نظر آتا ہو گا مگر اس وقت اس کے چہرے پر پریشانی پھیلی ہوئی تھی اور آنکھوں میں عجیب سی وحشت ناچ رہی تھی۔ وہ کسی معمول کی طرح اپنی جگہ ساکت کھڑا سڑک پر دوڑتی بھاگتی زندگی کو گھورے جا رہا تھا۔ اچانک دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے ہڑبڑا دیا۔ وہ چند لمحوں تک دزدیدہ نظروں سے دروازے کو دیکھتا رہا جیسے فیصلہ کر رہا ہو کہ دروازہ کھولنا بھی چاہیے کہ نہیں، آنے والا بھی گویا بہت جلدی میں تھا۔ اس نے دوبارہ پوری طاقت سے دروازے کو تھپتھپایا اس بار اس نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور خود کو جیسے گھسیٹتے ہوئے دروازے تک گیا اور چٹخنی گرائی۔

”یار کیا سو رہا تھا؟ اتنی دیر سے دروازہ پیٹ رہا ہوں۔“ اندر آنے والا بھی تقریباً اس کا ہم عمر ہی تھا۔ وہ سانولی رنگت، گٹھے ہوئے جسم کا مالک اور قدرے پستہ قامت تھا۔ اس کے ماتھے پر ایک زخم کا نشان تھا اور آنکھوں میں عیاری تھی۔

”نہیں سو تو نہیں رہا تھا۔“

”یار فراز تو نے اپنی کیا شکل بنا رکھی ہے، انسان بن...... یہ لے میں ناشتا لایا ہوں پہلے تو یہ نکال، بھوک سے آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں۔“ آنے والا اپنے ہاتھ میں موجود تھیلی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”اب کیا ہوا ہے......؟“ وہ فراز کو کچھ سوچتا ہوا دیکھ کر بولا۔

”کب تک تو میرا خیال رکھتا رہے گا۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ ناشتا تو میری وجہ سے لایا ہے۔“ اس کی آواز لرز رہی تھی۔

”تو اپنا یار ہے یار...... تو خود ہی اپنی پریشانی کو حل نہیں کرنا چاہتا تو میں کیا کروں، چل پہلے ناشتا لگا پھر بات کرتے ہیں۔“

”فراز تو میری بات مان لے...... تو نے اپنی سی کر لی...... اب کوئی اور راستہ نہیں ہے تیرے پاس...... یا پھر واپس اپنے گاؤں چلا جا۔“ ناشتے کے بعد پستہ قامت چائے کی چسکی لگاتا ہوا بولا۔

”امجد میں نے پوری کوشش کر کے دیکھی ہے مگر نوکری کا نام ہی نہیں ہے۔“ فراز مایوسی سے بولا۔ ”بی اے کرتے وقت سوچا تھا کہ جلد ہی کوئی نہ کوئی ملازمت تو مل ہی جائے گی مگر اب تو کھانے کے لالے پڑ گئے ہیں۔ واپس بھی کس منہ سے جاؤں؟ وہاں بھی کوئی خزانہ تو ہے نہیں۔ ابا جی نے کتنا کہا تھا کہ ان کا کام ہی سنبھالوں مگر مجھے بڑے شہر کی ملازمت کی دُھن سوار تھی۔ اب واپس جاتا ہوں اور وہ بھی

خالی ہاتھ...... تو سوچ کر بھی شرم آتی ہے۔" فراز ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔

"بس تو پھر چھوڑ سب اور ہمت کر...... یہ بڑا شہر ہے یار...... تو اپنے یار کو دیکھ نا کس چیز کی کمی ہے۔"

"مگر...... یہ خطرناک ہے امجد۔"

"بھوکے مرنے سے زیادہ خطرناک نہیں ہے اب تو اتنا مت سوچ...... میں ہوں نا۔" وہ زور دے کر بولا۔

"ٹھیک ہے۔" فراز دو لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔

"بس تو آج ہی شروع کرتے ہیں کام...... تو جلدی سے تیار ہو جا۔" امجد اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارتا ہوا بولا۔

فراز کے دوسرے کمرے میں جانے کے بعد وہ سامنے رکھی میز پر پیر پھیلا کر نیم دراز ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں مکارانہ چمک تھی۔

☆☆☆

نسا تین چار دن سے گھن چکر بنی ہوئی تھی۔ اس کے ایک پروجیکٹ کا غیر ملکی انچارج کراچی آیا ہوا تھا اور اسے تمام متعلقہ لوگوں سے ہر صورت میں ملنا تھا۔ دوسری طرف صفدر کو ایک میڈیکل کانفرنس میں شرکت کے لیے کھٹمنڈو جانا پڑ گیا تھا اگر ڈونر کی آمد کا مسئلہ نہ ہوتا تو وہ تین دن کے لیے صفدر کے ساتھ جا سکتی تھی مگر اس وقت یہ ناممکن تھا۔ مزید طرہ یہ تھا کہ امتیاز کی دو دن سے طبیعت خراب تھی یوں گاڑی چلانے کی ڈیوٹی نسا کے سر پر تھی اور دیگر چھوٹے موٹے کاموں میں اسے جو آسانی ڈرائیور کی موجودگی سے میسر آجاتی تھی، وہ بھی نہیں تھی۔ وہ اس وقت بینک میں اپنی باری کا انتظار کرتے ہوئے قدرے جھنجلائی ہوئی تھی۔ رش اتنا زیادہ نہیں تھا مگر تین میں سے صرف ایک کھڑکی پر آفیسر موجود تھا جس کی وجہ سے کام سست روی کا شکار تھا۔

"سر! دن کے اس وقت جبکہ تمام لوگوں کو اپنے اپنے کاموں پر پہنچنے کی جلدی ہوتی ہے، آپ کے کاؤنٹر کی دو ونڈوز پر کام نہیں ہو رہا ہے...... کیا آپ اس میں کوئی مدد کر سکتے ہیں؟" بالآخر وہ منیجر کے کمرے میں جا پہنچی تھی۔

"اوہ میڈم آپ تشریف رکھیں۔ اصل میں آج دو آفیسر چھٹی پر ہیں اور باقی بھی مصروف ہیں......"

"میں سمجھتی ہوں مگر یہ دوسرا کام کلائنٹ ڈیلنگ کے بعد بھی ہو سکتا ہے۔ میں تقریباً 20 منٹ سے انتظار کر رہی ہوں اور اب بھی میری باری آنے میں 10 نمبروں کی دیر ہے یعنی کم از کم آدھا گھنٹا...... اگر کام کی رفتار یہی رہی تو......"

"آپ مجھے اپنا چیک دیں میں کیش کرا دیتا ہوں۔" وہ مسکرایا۔

"شکریہ مگر کیا یہ درست ہوگا؟ باقی لوگ بھی تو انتظار کر رہے ہیں اس سے بہتر کیا یہ نہیں کہ آپ اپنے دو لوگوں کو کچھ دیر کے لیے کاؤنٹر پر بھیج دیں۔" وہ تحمل سے بولی۔

"چلیں میں دیکھتا ہوں۔" منیجر نیم دلی سے کھڑا ہوا تھا۔ تینوں کاؤنٹرز پر کام شروع ہوتے ہی چھ سات منٹ میں نسا کی باری آگئی تھی۔

ہمارا مسئلہ یہی ہے کہ ہم اپنے مسائل کے حل کے لیے قدم اٹھانے پر آمادہ ہی نہیں ہوتے ورنہ آدھے سے زیادہ ایشوز تو پائی پیسہ خرچ کیے بغیر صرف کوشش سے حل ہو سکتے ہیں۔

نسا نے کاؤنٹر پر ہی پیسوں کو چھوٹے والٹ میں رکھ لیا تھا جلدی کے چکر میں وہ والٹ کو ہاتھ میں لیے لیے ہی بینک سے باہر نکل آئی۔ اس کی گاڑی بینک سے تقریباً ایک بلاک کے فاصلے پر سڑک کی دوسری جانب پارک تھی وہ اسی طرح تیزی سے قدم بڑھاتی گاڑی کی طرف بڑھی۔

اس علاقے میں پارکنگ ہمیشہ ہی ایک مسئلہ رہتی تھی۔ امتیاز کی موجودگی میں اسے اس مسئلے کا اتنا احساس نہیں ہوتا تھا کہ بینک سے نکلتے ہی گاڑی سامنے کھڑی ہوتی تھی۔

پروردگار کی کتنی نعمتیں ہیں جنہیں ہم معمولی سمجھ کر شکر گزاری کا حق بھی ادا نہیں کرتے اور جب وہ ہمارے پاس نہیں ہوتیں تب ہی ہمیں ان کا احساس ہو پاتا ہے۔ اس سوچ کے ساتھ ہی اس نے رب کریم کا شکر ادا کیا اور اس کے فوراً بعد در آنے والی سوچ پر مسکرائی "آج میں کچھ زیادہ انقلابی اور فلسفی نہیں ہو رہی۔" خود سے سوال کرتے کرتے وہ فٹ پاتھ سے اتر کر سڑک کی جانب بڑھی ہی تھی کہ سامنے سے آتی موٹر سائیکل اس کے بالکل قریب آکر رکی، اس پر دو افراد سوار تھے۔ ان دونوں نے ہیلمٹ پہن رکھا تھا۔

اس سے قبل کہ نسا کچھ سمجھ پاتی، ان میں سے ایک نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے اس کا والٹ چھینا اور اگلے ہی لمحے موٹر سائیکل زن کرکے آگے نکل گئی۔ ایک لمحے کو تو نسا بالکل حواس باختہ سی ہو گئی تھی، اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اچانک کیا ہو گیا۔ چند لمحوں بعد اس کے حواس بحال ہوئے۔ اردگرد موجود کچھ لوگوں نے یہ سارا منظر دیکھا تھا اور وہ نسا سے ہمدردی کے اظہار کے لیے اس کے اردگرد جمع بھی

ہو رہے تھے۔
''ارے...... وہ میرا پرس لے کر بھاگا ہے۔'' وہ چیخی۔ ''اس کا پیچھا کریں۔''
''ارے میڈم وہ تو کہاں کے کہاں نکل گئے ہوں گے اب تک۔'' ایک صاحب بولے۔
''شکر کریں جان بچ گئی ورنہ یہ لوگ تو گولی مارنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ سمجھیں صدقہ گیا۔'' ایک اور بزرگ بولے۔
''ویسے بیٹا یہ ہاتھ میں والٹ لے کر نہیں چلنا چاہیے۔ آج کل اسٹریٹ کرائم اتنا زیادہ ہے۔ محتاط ہونا اچھا ہوتا ہے۔''
نسا سنی ان سنی کرتی ہوئی گاڑی میں بیٹھی اور تیزی سے آگے بڑھی۔
سڑک پر واقعی ان کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ وہ کافی آگے تک گئی مگر وہ لمحوں میں غائب ہو گئے تھے۔ نسا دفتر آ کر بھی اس حادثے کے اثر سے باہر نہیں نکل پائی تھی۔ والٹ میں روزمرہ کے استعمال کی رقم تھی' بینک سے اس نے چھ ہزار روپے نکالے تھے مگر اس سے زیادہ قیمتی اس کے بینک کارڈ، شناختی کارڈ اور دیگر چیزیں تھیں۔ سب کو بلاک کرا کر وہ اپنی کرسی پر جا گری۔
اس کا ذہن اب تک سائیں سائیں کر رہا تھا۔ ایک معمولی سا اسٹریٹ کرائم اعتماد اور خود پر یقین کو اتنی آسانی سے دھندلا دیتا ہے، یہ بات اسے زندگی میں پہلی بار سمجھ میں آئی تھی۔

☆☆☆

''9850 روپے اور باقی یہ سب فالتو کارڈ شارڈ......'' امجد کے ہاتھ میں نسا کا والٹ تھا۔ وہ اور فراز اسی فلیٹ میں موجود تھے۔ ''کپڑوں سے تو بڑی تھسے والی لگ رہی تھی اور جیب میں کل ملا کر دس ہزار بھی نہیں۔'' وہ حقارت سے بولا۔ ''چلو پھر بھی بوہنی کے لیے برا نہیں...... موقع نہیں تھا ورنہ موبائل بھی ہتھے لگ جاتا تو کچھ فائدہ ہو جاتا......اور تو کس سوچ میں گم بیٹھا ہے؟''
''میں بس یہ سوچ رہا تھا کہ پتا نہیں اس کے کس ضرورت کے پیسے ہوں۔'' فراز دھیمے لہجے میں بولا۔
''ابے چل اب خالہ اماں جیسی باتیں کرنے مت بیٹھ جا... جو ہاتھ میں آیا اپنا حق ہے سمجھ گیا اور تو یہ دیکھ کہ صبح تیری جیب میں ایک روپیا بھی نہیں تھا اور اب یہ پورے چار ہزار نو سو پچیس روپے تیرے ہیں یہ رکھ لے۔'' وہ نوٹ اس کی جانب بڑھاتا ہوا بولا۔
''تو بھی کیا پیسے پیسے کا حساب کر رہا ہے۔'' وہ بولا مگر اس نے نوٹ بہر حال پکڑ لیے تھے۔
''بھئی دھندے میں حساب کتاب پورا ہونا چاہیے' اب بول کیسا لگ رہا ہے؟''
''اچھا...... اچھا لگ رہا ہے۔'' فراز نے جواب دیا۔ واقعی اتنے دنوں بعد ہزار ہزار کے چار نوٹوں نے اسے عجیب سا سکون دیا تھا۔
''مانتا ہے بھائی کو؟'' امجد اس کی حالت دیکھ کر قہقہہ مار کر بولا۔
جواب میں فراز بھی مسکرایا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شرمندگی کی ہلکی سی لہر اب بھی موجود تھی مگر ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ اس پر بازی لے گئی تھی۔

☆☆☆

دفتر میں داخل ہوتے ہی اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔
''تم...... تم یہاں کیسے آئے؟'' وہ اُسے گھورتے ہوئے بولی۔ اس کے سامنے شہباز خان کھڑا تھا۔ اس نے اس وقت بھی کلف دار لٹھے کا جوڑا پہن رکھا تھا، سر پر مخصوص پگڑی تھی۔ فرق تھا تو صرف یہ کہ اس وقت اس کے چہرے پر ملائمت نظر آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا کیم شحیم شخص بھی تھا جو دیکھنے میں قدرے خطرناک سا لگ رہا تھا اور اس کی جیب میں یقینا ہتھیار بھی موجود تھا۔
''میں آپ سے ملنے آیا ہوں میڈم صاحبہ۔'' شہباز خان نہایت باادب انداز میں بولا۔
''کیوں...... کس لیے؟ اور تم باہر کیسے آئے؟'' وہ واقعی اسے اتنی جلد باہر دیکھ کر حیران تھی۔ ''اور کیا تم یہاں اس شخص کو لے کر مجھ سے بدلہ لینے آئے ہو بقول تمہارے سبق سکھانے۔'' نسا نے فون اٹھاتے ہوئے پوچھا۔
''نہیں بہن جی! ایسی کوئی بھی بات نہیں ہے۔'' شہباز خان گویا بالکل سیدھا ہو چکا تھا۔ ''آپ فون رکھ کر میری بات سنو...... میں انسپکٹر صاحب سے پوچھ کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ سے معافی مانگنے۔'' وہ سر جھکا کر بولا۔
''اور یہ میرا بھائی ہے چچا کا بیٹا، اس نے ہی میری ضمانت کرائی ہے اور بہت ڈانٹا ڈپٹا ہے۔''
نسا کو انسانوں کی اتنی جلدی ٹرانسفارمیشن پر تو کبھی فلموں اور ڈراموں میں بھی یقین نہیں آیا تھا۔
''تو پھر...... اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' وہ اسے

جانچتی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''سب سے پہلے تو اپنی بدتمیزی پر معافی مانگتا ہوں۔'' وہ ملائمت سے بولا۔ ''اور پھر آپ سے ایک درخواست ہے۔''

''وہ کیا؟''

''مجھے روزینہ سے ملا دیں۔ میں اُس سے بھی معافی مانگنا چاہتا ہوں۔''

''معافی مانگنا یا اس کا حشر کرنا؟'' نسا نے اسے گھورا۔

''بی بی بندہ کبھی کبھی لمحے بھر میں بھی بدل جاتا ہے اور اگر کوئی شرمندہ ہو تو اس کو ذلیل کرنا تو اچھی بات نہیں ہے۔'' اس کے ساتھ آنے والا سنجیدگی سے بولا۔ ''بھابی اس کا بیوی ہے اگر یہ شرمندہ ہے تو اس کو معافی مانگ لینے دیں تاکہ اس کا گھر بس جائے۔''

''اصل میں مجھے اس کے شرمندہ ہونے پر شک ہے۔'' نسا نے جواب دیا۔

''میں حقیقت میں اپنی غلطی پر خود افسوس کر رہا ہوں۔'' شہباز خان بولا۔

''اچھا بیٹھے میں انسپکٹر اکرم کو فون کر رہی ہوں، وہ آجائے اس سے مشورہ کر کے ہی میں اس بات کا جواب دے سکتی ہوں۔'' نسا کی سمجھ میں فوری طور پر یہی بات آئی تھی۔

''ٹھیک ہے میڈم۔ ہم یہاں انتظار کرتے ہیں۔'' شہباز خان ریسیپشن پر موجود صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے نصیران کو پانی اور چائے کا پوچھو۔'' وہ اپنے پیچھے مستعد کھڑے آفس بوائے کو ہدایت دیتی اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔

کچھ ہی دیر میں انسپکٹر اکرم بھی پہنچ گیا۔ نسا سے ساری بات سن کر اس نے بتایا کہ اس نے ہی انہیں نسا کے پاس بھیجا ہے۔

''میڈم یہ بہت شرمندہ ہے پھر یہ میاں بیوی کا معاملہ ہے، میں نے تو یہی مناسب سمجھا کہ انہیں صلح کا موقع دیا جائے باقی جیسے آپ کی مرضی...... یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کل وہ عورت ہی ہماری مخالف ہو جائے...... مگر میں پھر بھی فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔ ہمیں ایس پی صاحب نے پہلے ہی آپ کا خیال رکھنے کی ہدایت کی ہے۔''

نسا چند لمحوں تک سوچتی رہی۔ بات انسپکٹر کی بھی اتنی غلط نہیں تھی۔ شہباز خان بہت شرمندہ بھی نظر آ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے سارے کس بل نکل گئے ہوں مگر اس کے باوجود نسا کا دل مطمئن نہیں تھا نہ جانے کیوں اسے یہ سب قدرے مصنوعی لگ رہا تھا۔

مگر سارے فیصلے دل کی بات مان کر نہیں کیے جا سکتے، اس نے سوچا، اسے بہر حال یہ سب روزینہ کو بتانا تھا پھر فیصلہ اس کے ہاتھ تھا۔

نسا نے یہ بہر حال طے کر لیا تھا کہ وہ اس کی مرضی کے بغیر شہباز خان کو نہ اس کا پتا دے گی اور نہ ہی ملوائے گی۔

''ٹھیک ہے میڈم۔'' انسپکٹر اس کی بات سن کر بولا۔ ''یہ بالکل درست بات ہے آپ اس عورت سے بات کر لیں، میں ان دونوں کو کل آنے کی ہدایت کرتا ہوں اور آپ بالکل فکر نہ کیجیے گا۔ یہ یہاں ذرا بھی مسئلہ نہیں کر سکتا ورنہ ہم اسے الٹا ٹانگ دیں گے۔''

☆☆☆

''نہیں میڈم جی میں نے نہیں جانا۔'' روزینہ اس کی بات سنتے ہی نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی تھی۔

''میں سمجھتی ہوں اور یہ تمہارا حق ہے جو فیصلہ تم کرو گی وہی ہوگا۔'' نسا نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''وہ بہت زیادہ شرمندہ ہے مجھ سے بھی معافی مانگی ہے اور تم سے بھی معافی مانگنا چاہتا ہے۔''

''معافی......؟'' روزینہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''مجھ سے؟''

''ہاں تم سے...... کبھی کبھی ایک دھچکا خود کو فرعون سمجھنے والے کو بندے کا پتر بھی بنا دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ واقعی اس قید اور تمہاری جدائی نے اسے اپنی غلطی کا احساس دلا دیا ہو۔'' نسا بولی۔ روزینہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔

''میں تو خود تم سے یہ سب نہ کہتی مگر اس نے پولیس کو اور مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ تمہیں اچھی طرح رکھے گا۔ شکایت کا موقع نہیں دے گا۔ اب اگر تم چاہو تو اس سے ایک بار مل کر دیکھ لو...... تم اسے اچھی طرح جانتی ہو، با آسانی سمجھ سکو گی کہ وہ سچ بول رہا ہے یا مکاری کر رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے میڈم...... آپ کہتی ہیں تو میں اس سے ملوں گی۔'' وہ تیار ہو گئی۔

''میرے کہنے سے کوئی فیصلہ مت کرو، ملنے کے بعد اگر تمہیں لگے کہ اس کے ساتھ جانا ٹھیک ہے تو تم چلی جانا اور اگر تمہارا دل نہ مانے تو تمہاری مرضی۔'' نسا بولی۔

''ٹھیک ہے میڈم...... ویسے بھی میں کب تک یہاں بیٹھ سکتی ہوں آپ پر بوجھ بن کر۔'' وہ افسردگی سے بولی۔

''تم مجھ پر بوجھ نہیں ہو، بلکہ کسی پر بھی نہیں ہو۔ ابھی

تو یہ ثانوی مسئلہ تھا ورنہ دیکھو اللہ نے تمہیں بھی دو ہاتھ دیے ہیں سمجھ دی ہے، کام کرسکتی ہو اور اپنا بوجھ خود اٹھا سکتی ہو۔"

"میں پڑھی لکھی نہیں ہوں نہ ہی کوئی ہنر آتا ہے۔"

"یہی تو مسئلہ ہے کہ ہم اپنی بیٹیوں کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا اور اپنے بیٹوں کو عورتوں کی عزت کرنا اور خود کو دوسروں سے برتر نہ سمجھنا نہیں سکھاتے۔" نسا دکھ سے بولی۔

"بہرحال راستے نکل آتے ہیں فی الحال تم یہ سب مت سوچو...... کل شہباز خان سے ملو پھر جو تمہیں ٹھیک لگے، وہ کرو باقی سب دیکھ لیں گے۔"

"ٹھیک ہے میڈم، آپ کا بہت احسان ہے۔"

"فضول باتوں سے میرے پیٹ میں درد ہو جاتا ہے۔" وہ ہنس کر بولی اور کھڑی ہو گئی۔

"میڈم اگر میں نہ چاہوں تو وہ مجھے لے تو نہیں جاسکتا نا......" روزینہ نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔" نسا دروازے تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے مڑ کر اسے جواب دیا۔ "بالکل نہیں لے جاسکتا، فیصلہ تمہارا ہو گا۔" اور باہر نکل گئی۔

☆☆☆

روزینہ نے فیصلہ کرنے میں بمشکل دس منٹ لگائے تھے۔ شہباز خان نے پہلے سب کے سامنے اس سے معافی مانگی اور پھر انسپکٹر اور نسا کو گواہ بنا کر وعدہ کیا تھا کہ اب وہ اس سے کبھی بدسلوکی نہیں کرے گا۔ اس کے بعد نسا نے ان دونوں کو الگ کمرے میں بات کرنے کا موقع دیا۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اکیلے میں وہ اسے دھمکاتا ہے یا اپنی بات پر قائم رہتا ہے۔ روزینہ پانچ منٹ میں ہی باہر آ گئی تھی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا آنکھیں دمک رہی تھیں۔

"میڈم میں اپنے خاوند کے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔" اس نے آتے ہی نسا کے قریب آ کر اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

"تم نے سب سوچ اور جانچ لیا ہے نا؟" نسا نے پوچھا۔

"جی میڈم جی، وہ شرمندہ ہے، بدل گیا ہے۔" وہ بہت زیادہ خوش تھی۔ "اس نے تو کہا ہے کہ اگر میں نہیں آنا چاہتی تو کچھ دن سوچ لوں اور بس اسے معاف کر دوں...... مگر میں جانا چاہتی ہوں اپنے گھر......" وہ بولی۔

"پھر ٹھیک ہے۔" نسا نے سر ہلایا۔

"مگر شہباز خان تم اپنا وعدہ یاد رکھنا۔" اس نے اسے تنبیہ کی۔

"آپ بے فکر رہو میڈم اب بھی شہباز خان ایسا غلطی نہیں کرے گا۔"

وہ تینوں اور پھر انسپکٹر ایک کے بعد ایک رخصت ہو گئے تھے۔

سب کچھ بظاہر ٹھیک تھا مگر نسا کو نہ جانے کیوں عجیب سی بے چینی کا احساس ہو رہا تھا۔

ایسا کہ جیسے اس سے کوئی غلطی ہو گئی ہو۔ ایک عجیب سی الجھن جس کی وجہ خود اسے بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

☆☆☆

فراز کے شب و روز بدل چکے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا فلیٹ بھی، اب وہ ایک قدرے بہتر علاقے کا مکین تھا۔

وہ اور امجد ایک ٹیم کی طرح کام کر رہے تھے اور روزانہ اسی طرح پندرہ ہزار کما رہے تھے۔ وہ باقاعدگی سے گھر بھی روپے بھجوا رہا تھا اور کچھ رقم جمع کرنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ دو چار دنوں سے کام کچھ مندا جا رہا تھا۔

"یار یوں لگتا ہے کہ شہر میں سب ہی کنگلے ہو گئے ہیں۔" امجد صوفے پر گرتا ہوا بولا۔

"ہاں یار کئی دن سے کوئی بڑا ہاتھ نہیں مارا۔" فراز بولا۔ "شاید آخری تاریخیں ہیں اس کا اثر ہے۔"

"میں ایک بات سوچ رہا ہوں۔" امجد بولا۔

"کیا؟"

"یار تھوڑا نیا کرتے ہیں کچھ۔" امجد کے لہجے میں سسپنس تھا۔

"کیا نیا؟"

"میں نے سنا ہے کہ رات تک بیکریوں اور کریانے کی دکانوں میں اچھا مال جمع ہو جاتا ہے۔ ایک تو ان کے پاس گارڈ وارڈ نہیں ہوتے دوسرے یہ روز بینکوں کے چکر میں بھی نہیں پڑتے۔"

"نہیں یار۔" فراز جو صوفے پر نیم دراز تھا، اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "یہ خطرناک ہے۔ دکان پر ایک وقت میں دو تین بندے ہوتے ہیں، پاگل تو نہیں ہے تو...... مروائے گا سالے۔"

"بس تو ہمیشہ زنانیوں کی طرح ڈرتے رہنا۔" امجد اس کی پیٹھ پر دھپ رسید کرتے ہوئے بولا۔ "ایک ہی بات ہے راستے میں کسی کو پستول دکھایا یا دکان میں...... اور پستول بابا کے سامنے دو تین کیا چار پانچ بندے بھی سیدھے ہو جاتے ہیں اور تو یہ سوچ کہ ایک دن کے کام میں ہفتے بھر کا

سب پورا ہو جاتے ہیں۔

"بات تو صحیح کہہ رہا ہے تو۔" فراز بولا۔ "بس یار پکڑے نہ جائیں؟"

"نہیں پکڑے جائیں گے دیکھ بھال کر جائیں گے نا..... پہلے ریکی کریں گے دو دن۔" امجد بے فکری سے بولا۔

"تجھے یقین ہے کہ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا؟" فراز اب بھی سوچ میں پڑا ہوا تھا۔

"بالکل..... یوں بھی میں نے کہا نا کہ ٹینشن لینے کا نہیں دینے کا..... اگر کوئی مسئلہ بنا تو اسے صاف کر دیں گے۔" وہ سفاکی سے بولا۔

"فراز اس کا چہرہ دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

مصروفیات، بھاگ دوڑ، کام کاج کے چکروں میں روزینہ اور اس کے متعلق خدشات نسا کے ذہن کی سلیٹ سے مٹتے جا رہے تھے۔ یوں بھی جاتے ہوئے اس نے اسے تنہائی میں اپنا موبائل نمبر دیا تھا اور تاکید کی تھی کہ اگر اسے شہباز کی طرف سے کسی بھی پریشانی کا سامنا ہو تو وہ اسے فون کر سکتی ہے۔

اس کی جانب سے کوئی کال نہیں آئی تھی جس نے نسا کو کسی حد تک مطمئن کر دیا تھا۔ اس نے ایک دفعہ بھی نسا کو یاد نہیں کیا تھا اسے اس بات پر تھوڑا سا افسوس ضرور رہا تھا مگر اتنا تو وہ سمجھتی ہی تھی کہ وقت کی قلت کے اس دور میں کوئی کسی کو دل میں بھی یاد کرے تو وہ بڑی بات تھی۔

زندگی جینا ہو یا سڑک کا ٹریفک ہر کوئی اس تیزی سے دوڑا بھاگا جا رہا تھا جیسے لمحہ بھر کی تاخیر اس کا بہت بڑا نقصان کر دے گی جبکہ زندگی اصل میں حضرتِ انسان کو کولہو کے بیل کے مانند ایک ہی چکر میں گھمائے جا رہی تھی بس آنکھوں پر گمان کا پردہ ہے جو تخیل کی پرواز کو مہمیز دے کر نت نئی منزلوں کا خواب دکھاتا رہتا ہے۔

اس روز وہ صبح ہی سے آرام کے موڈ میں تھی۔ پہلے تو بہت تاخیر سے دفتر پہنچی اور دفتر آنے کے بعد کام میں بالکل دل نہیں لگ رہا تھا اگر پروجیکٹ کی ماہانہ رپورٹ کی آخری تاریخ کا معاملہ نہ ہوتا تو شاید وہ کام کو ہاتھ بھی نہ لگاتی مگر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اس وقت اس کے پاس کوئی اور آپشن تھا ہی نہیں سو ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کام سے لگ گئی تھی۔

"ساجد ایک کپ کافی بھیجو میرے لیے۔" رپورٹ

کہ کرتے ہی اسے کافی کی یاد آئی تھی۔

"میڈم آپ کے لیے ایک کال دو بار آئی تھی مگر آپ نے ڈسٹرب کرنے سے منع کیا تھا اس لیے نہیں بتایا۔" وہ کافی کے ساتھ خود بھی اندر چلا آیا تھا۔

"کس کی کال تھی؟"

"اس نمبر سے آئی تھی میڈم۔" وہ ایک پرچا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "سول اسپتال سے کال ہے، یہ کہہ رہا تھا وہ۔"

"سول اسپتال سے؟" نسا اب پرچے کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ "اللہ خیر کرے..... مگر یہ تو کوئی موبائل نمبر ہے۔" اس نے کافی کا کپ میز پر رکھ کر فوراً نمبر ملایا۔

"جی میں زیب النسا بول رہی ہوں، آپ نے کال کی تھی سول اسپتال سے۔"

دوسری طرف سے جو کچھ کہا گیا، اس پر نسا کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔

"اوکے..... میں آ رہی ہوں فوراً۔"

وہ فون بند کر کے بیگ سمیٹتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

"کیا ہو گیا میڈم..... کون تھا فون پر؟ سب خیریت ہے نا؟" وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں بولی۔

"برنس وارڈ میں ایک عورت لائی گئی ہے اس نے مجھے فون کرنے کو کہا تھا اور اس کی حالت اچھی نہیں ہے۔"

"اس کا نام نہیں بتایا میڈم....."

"نہیں..... اس کو نام معلوم نہیں صرف بیڈ نمبر معلوم ہے کیونکہ وہاں اگلے بیڈ پر اس کا کوئی رشتے دار ہے۔" نسا نے سر جھٹکا۔ "میں سول اسپتال جا رہی ہوں، تم وقت پر دفتر بند کر دینا۔"

راستے بھر اس کا ذہن سائیں سائیں کرتا رہا تھا۔ یوں تو اس کا کام ہی عورتوں سے متعلق تھا مگر اس فون کال کے حوالے سے نہ جانے کیوں اس کا دھیان بار بار روزینہ کی طرف جا رہا تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ روزینہ کے ساتھ کچھ برا ہو گیا ہے مگر ذہن ہر بار دلیلوں سے اس وسوسے کو جھٹلا رہا تھا۔ اتنی جلد ایسا کس طرح ہو سکتا تھا؟ شہباز خان اگر جھوٹ بھی بول رہا تھا تب بھی مہینے بھر کے اندر وہ اس حد تک کیسے جا سکتا تھا؟

سچ جو بھی ہے وہ تھوڑی دیر میں اس کی نظروں کے سامنے آنے والا تھا۔

☆☆☆

"سچ تو یہ ہے امجد کہ مجھے یہ کام پسند نہیں ہے مگر یہ بھی

تھیں۔ دو سال جوتیاں چٹخانے اور بی اے کی ڈگری ہاتھ میں لیے در در بھٹکنے کے بعد بھی کوئی نوکری نہیں مل پائی۔'' فراز افسوس سے کہہ رہا تھا۔

''اور اب دیکھ دو ماہ میں ہی بہتر گھر، ذاتی موٹر سائیکل، اچھا کھانا پینا، کپڑے سب آگیا نا، ویسے سچ تو یہ بھی ہے کہ تو میرا لکی چارم ہے جب سے تو اور میں دھندے میں پارٹنر بنے ہیں، اپنے بھی وارے نیارے ہو گئے ہیں اور تو دل چھوٹا کیوں کرتا ہے فلموں میں دیکھ ہیرو لوگ بھی تو اپنی طرح ہی ہوتے ہیں۔ کتنی واہ واہ ہوتی ہے اُن کی۔''

''وہ فلمیں ہیں یار...... پر میں نے ایک بات سوچی ہے۔ ہم تین ماہ اور یہ کام کریں گے اور پھر اس کے بعد مل کر کوئی دکان کھولیں گے۔'' فراز گویا خواب دیکھ رہا تھا۔

''اور پھر کوئی دوسرے فراز، امجد ہمیں لوٹ لیں گے آکر۔'' امجد قہقہہ مار کر بولا۔

''اچھا اچھا برا مت مان۔'' وہ اس کے گھورنے پر سیدھا ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔ ''جو تو کہے گا، وہ کریں گے پر ابھی تو نکل...... آج لمبا ہاتھ مارنا ہے ہمیں۔''

''ہاں چل......'' فراز اپنا ہیلمٹ اٹھاتا ہوا بولا۔

وہ پچھلے چار دن سے ایک بیکری اور اسٹور نما بڑی دکان پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ اسے دو بھائی مل کر چلاتے تھے۔ یہ دکان ڈیفنس کے کمرشل علاقے میں ہونے کے باوجود قدرے ہٹ کر تھی۔ دن بھر بلکہ نو بجے تک یہاں خاصا رش ہوا کرتا۔ عموماً اس علاقے میں نو ساڑھے نو تک دکانیں بند ہو جاتی تھیں مگر یہ دونوں بھائی دس بجے کے بعد دکان بند کیا کرتے۔ آخری آدھا گھنٹا دکان عموماً خالی ہوتی۔ اس دوران میں وہ غالباً حساب کتاب اور اگلی صبح کی تیاری کرتے تھے۔

امجد اور فراز کے لیے یہ آخری آدھا گھنٹا ہی واردات کا بہترین وقت تھا۔ اسی لیے وہ گزشتہ چار دنوں سے ان کے معمولات کی نگرانی کر رہے تھے۔ آج وہ مکمل تیاری سے آئے تھے۔ ان دونوں کے پاس پسٹل موجود تھے۔ دکان میں گھستے ہی فراز کو دروازہ بند کر کے ''بند ہے'' کا ٹیگ لٹکانا تھا اور تینوں سیلز مینوں کو ایک جگہ جمع کر کے نشانے پر رکھنا تھا جبکہ امجد ان میں سے کسی بھی بھائی سے رقم لوٹ لیتا اور پھر وہ دونوں وہاں سے نکل جاتے۔

دکان میں داخل ہونے کے بعد سب کچھ پلان کے

فراز اور امجد ایک ساتھ اندر داخل ہوئے تھے اور پھر پستولیں باہر نکال لی تھیں۔

''وہ تم...... تم تینوں اور تم بھی بڑے میاں یہاں آجاؤ اس کاؤنٹر کے سامنے۔'' فراز چیتے کی سی تیزی سے شیشے کا دروازہ بند کرتے ہوئے غرایا۔

''کیوں...... کیوں...... کون ہو تم لوگ؟''

''بکواس بند...... ورنہ گولی سر کے اندر ہوگی۔'' امجد سفاکی سے بولا۔ ''اور تم...... رقم نکالو۔'' وہ دوسرے بھائی کی طرف بڑھا۔

اتنی دیر میں فراز ان چاروں پر پستول تانے رہا تھا۔

''ہاں...... ہاں...... تم پیسا لے لو پر بھائی صاحب اور ان بے چاروں کو کچھ نہیں کہنا۔'' جونیئر سیٹھ کے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ وہ بمشکل گلے تک پہنچا جو کہ اصل میں ایک جدید کیش کاؤنٹر تھا اور اس میں سے تمام بڑے چھوٹے نوٹوں کی گڈی بنا کر امجد کی طرف بڑھا دی۔

''شاباش عقل سے کام لو گے تو کسی کو کچھ نہیں ہوگا۔'' امجد بولا۔

وہ نوٹ جیکٹ میں ٹھونس کر مڑا ہی تھا کہ پچھلے کاؤنٹر سے ایک قدرے عمر رسیدہ خاتون برآمد ہوئی۔ وہ غالباً کاؤنٹر کے پیچھے تھی اور ان دونوں کی نظروں سے چوک گئی تھی۔ اسے دکان میں ہونے والی اس کارروائی کی خبر نہیں ہو سکی تھی اور اب جو وہ کاؤنٹر سے باہر آئی تو اس کے ہاتھوں میں سامان کی کچھ تھیلیاں تھیں۔ جنہیں اس ہنگامے میں بھی اس نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا، وہ مسلسل چیختے ہوئے دروازے کی جانب بڑھ رہی تھی۔

منظر ایک دم بدل گیا تھا۔

بوڑھی عورت دروازے کے قریب پہنچنے والی تھی۔ اس شور شرابے میں سیلز مینوں نے اپنے سر سے ہاتھ ہٹا لیے تھے۔

اسی دوران جونیئر سیٹھ کے کاؤنٹر پر رکھا موبائل بھی بجنے لگا تھا۔

امجد کو لگ رہا تھا کہ اس عورت کی آواز اور موبائل کی گھنٹی اس کے دماغ کو چیرتی ہوئی گزر رہی ہوں۔ شدید ذہنی دباؤ اور ٹینشن میں امجد کا پستول والا ہاتھ بلند ہوا اور ٹریگر پر رکھی انگلی گویا غیر ارادی طور پر دب گئی۔ پسٹل سے نکلنے والا غیر مرئی شعلہ لمحے بھر میں خاتون کے سینے میں اتر گیا اور وہ بے یقینی کے انداز میں سینے سے ابلتے خون کو

...زمین پر جا گری۔

"او مارا خدا...... مار ڈالا......" سیٹھ کے حلق سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ برآمد ہو رہے تھے۔

"ہاں مار ڈالا...... اور کسی کو آواز نکالنی ہے؟" امجد فوراً ہوش میں آ گیا تھا۔ "اب تم میں سے کسی نے ذرا سی بھی حرکت کی تو اگلی گولی تمہارے سینے میں اترے گی۔"

وہ دونوں تیزی سے باہر نکلے، امجد موٹر سائیکل کے اسٹارٹ ہونے تک دروازے میں درز بنائے کھڑا رہا تھا اور پھر لپک کر فراز کے پیچھے بیٹھ گیا۔

☆☆☆

وہ وارڈ میں نہیں تھی۔

نسا نے وارڈ کا چکر لگایا۔ اسٹاف سے پوچھا مگر اسی وقت ڈیوٹی تبدیل ہوئی تھی۔ مریض کا نام اسے معلوم نہیں تھا اور مسئلہ یہ تھا کہ وہ بیڈ نمبر بھی بھول گئی تھی۔ وہ فون نمبر جس سے اسے فون آیا تھا اب بند جا رہا تھا۔

'شاید کسی نے مجھے احمق بنایا ہے۔' اس نے سوچا اور باہر کی طرف جانے کو مڑی۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے وہ سامنے بنے معلوماتی کاؤنٹر کی جانب بڑھ گئی۔

"مجھے آپ سے ایک بات معلوم کرنی ہے۔" اس نے کہا۔

"جی بولیے۔" نرس نے اکتاہٹ سے پوچھا۔

"کیا...... یہاں...... روزینہ نام کی کسی مریضہ کو لایا گیا ہے، روزینہ شہباز۔" نسا نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"روزینہ؟" نرس نے اپنے سامنے پڑے رجسٹر پر نظر دوڑائی۔ "جی ہاں وہ وارڈ میں تھی مگر آج اس کی حالت زیادہ بگڑ گئی ہے اس لیے اسے آئی سی یو میں لے جایا گیا ہے۔ آپ اس کی رشتے دار ہیں؟"

وہ مزید بھی کچھ کہہ رہی تھی مگر نسا کو اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کے بدترین اندیشے بڑے بڑے پھنوں والے سانپ بن کر حقیقت کا روپ دھارے اس کے سامنے ناچ رہے تھے۔

روزینہ کا ڈرا سہما آنسوؤں سے تر چہرہ، جاتے وقت اس کی خوشی، اس کی دہکتی آنکھیں، اس کا یقین سب کچھ اس ایک لمحے میں کسی فلیش بیک کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے تھے۔

"کک...... کیا میں اس سے مل سکتی ہوں؟" اس نے ایک لمحے بعد پوچھا۔

"جی...... آپ وہاں آئی سی یو میں جائیں وہاں ڈاکٹر موجود ہے وہ آپ کو اجازت دیں تو چلی جائیں۔"

ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر قدرے کم عمر اور نرم دل خاتون تھی۔ نسا کے سوال پر اس نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"کہیں وہ آپ کو میڈم جی تو نہیں کہتی؟"

"جی ہاں...... ہماری مختصر ملاقات رہی ہے، وہ مجھے میڈم جی ہی کہتی رہی ہے۔"

"پھر تو آپ اس سے ضرور مل لیجیے۔ وہ جب ہوش میں آتی ہے آپ کا ہی نام لیتی ہے۔"

"ڈاکٹر وہ کیسی ہے؟" اندر جاتے ہوئے اس نے پوچھ ہی لیا۔

"بی بی یہ جلے ہوئے لوگوں کا وارڈ ہے اور یہاں بھی وہ آئی سی یو میں ہے آپ خود ہی سوچ لیں کیسی ہوگی۔ بس زندہ ہے اور پتا نہیں بچ بھی پائے گی کہ نہیں۔"

روزینہ کے بیڈ کے قریب پہنچ کر نسا کو دھچکا سا لگا تھا۔ گردن تک اس کا تمام جسم ایک مستطیل سے لمبے سے اونچے بکس میں بند تھا اور اس پر چادر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے بازو بھی اسی طرح ملفوف کیے گئے تھے حیرت ناک طور پر اس کا خوب صورت چہرہ جلنے سے بچ گیا تھا۔ اس کا گورا چٹا رنگ سرمئی مائل سا نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے تھے۔ اس کی آنکھیں اس وقت بند تھیں۔

نسا نے اس سے قبل بھی عورتوں کی بری حالت دیکھی تھی مگر اس وقت روزینہ کو دیکھ کر اس کا دل غم سے پھٹا جا رہا تھا۔ وہ چند لمحے قریب سے اسے دیکھتی رہی پھر واپسی کے لیے مڑی۔

"میڈم جی......" یہ آواز نہیں کوئی سسکی تھی۔ وہ تیزی سے مڑی۔

"روزینہ ہاں یہ میں ہی ہوں...... یہ سب کیا ہوا ہے؟ کیسے جلی ہو تم؟ کس نے کیا ہے یہ سب؟ اور تم نے...... تم نے مجھے فون کیوں نہیں کیا؟" اس نے دل میں موجود تمام سوال اس پر داغ دیے تھے۔

"موقع...... موقع ہی نہیں ملا......" وہ بمشکل بولی۔

"یہ سب شہباز نے ہی کیا ہے نا؟" نسا نے دانت پر دانت جماتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں میڈم جی......" اس کے جواب پر نسا نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"پھر؟ پھر کیا ہوا؟ کیسے ہوا یہ سب کچھ؟"

"میں...... میں نے خود اپنے آپ کو آگ لگائی میڈم جی......" روزینہ کے ان الفاظ پر نسا کا دماغ بھک کر کے اڑ

لیا تھا۔

''کیا کہہ رہی ہو روزینہ...... کیوں؟''

''لمبی کہانی ہے۔ آپ کے روکنے اور سمجھانے کے باوجود بھی میں نے شہباز پر یقین کیا اور اس کے ساتھ گھر چلی گئی۔ وہ...... وہ جھوٹ بول رہا تھا میڈم جی...... پورا جھوٹ...... گھر جا کر اس نے مجھے......'' وہ خاموش ہوئی مگر اب اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔

''ڈاکٹر اس کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔'' نسا گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔

''روزینہ بی بی آپ چپ ہو جائیں بس آرام کریں۔ اب بولنا آپ کی صحت کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔'' ڈاکٹر انجکشن تیار کرتے ہوئے بولی۔

''ڈاکٹر جی صرف تھوڑی دیر بول لینے دیں پھر...... پھر موقع ملے یا نہیں......'' وہ حسرت سے بولی۔

''میڈم جی مجھ سے غلطی ہوگئی تھی اور آپ نے جو پوچھا فون کا...... کہاں سے کرتی۔ فون نہیں تھا میرے پاس......'' اس کی آواز دھیمی ہوتی جا رہی تھی۔ نسا اس کے بالکل قریب تھی پھر بھی اسے بمشکل سن پا رہی تھی۔

''میں اُسے چھوڑوں گی نہیں۔'' نسا غصے سے بولی۔

''وہ بہت خطرناک ہے، اس کے دوست بم بناتے ہیں۔ کئی لوگوں کو مار چکا ہے...... میں نے...... میں نے پولیس کو سب بتا دیا ہے۔''

''تم اب یہ سب مت سوچو، اچھا کیا تم نے پولیس کو بتا دیا تم ٹھیک ہو جاؤ گی پھر ہم اُسے سزا......''

''نہیں میڈم جی۔'' وہ سسکی۔ ''اب میں ٹھیک نہیں ہوں گی۔ میں جانتی ہوں، میں نہیں بچوں گی۔ پورا ڈبا مٹی کے تیل کا الٹ کے ماچس لگائی ہے میں نے...... جلنے کے بعد بچنا چاہتی تھی پر پھر میں خود بھی نہیں بچا سکی۔''

''کیوں...... کیوں کیا تم نے ایسا؟''

''شہباز خان نے میرا سودا کر دیا تھا۔ پیسے پکڑ لیے تھے۔ مجھے دکھا بھی رہا تھا۔ وہ روپے بھی جل گئے میرے ساتھ۔'' اس نے مسکرانے کی کوشش کی مگر اس کی آنکھوں سے آنسو لڑھک پڑے۔

''آپ اُس سے بچ کر رہیے گا میڈم جی، وہ برا آدمی ہے خطرناک ہے۔'' اس کے جسم کو جھٹکے سے لگ رہے تھے۔

''ڈاکٹر۔'' نسا چیخ پڑی۔ دیکھتے ہی دیکھتے روزینہ کا بستر ڈاکٹرز سے چھپ گیا تھا۔ کسی نرس نے ہاتھ پکڑ کر نسا کو وہاں سے دور کر دیا تھا۔ وہ دور کھڑی ان کی کوششوں کو دیکھ رہی تھی۔

پھر سب کچھ تھم گیا۔

ڈاکٹرز اور نرسز کی دوڑ بھاگ بھی رک گئی اور وہ ایک ایک کر کے روزینہ کے بیڈ کے پاس سے ہٹنے لگے۔

''کیا کچھ بہتر ہوئی اس کی حالت۔'' نسا نے ایک قدم آگے بڑھ کر پوچھا مگر اسی لمحے اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔

اب بیڈ پر لیٹی روزینہ کا چہرہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ سفید چادر نے اسے پوری طرح اپنے حلقے میں چھپا لیا تھا۔

☆☆☆

''یہ...... یہ ہم نے کیا کر دیا امجد، ہمارے ہاتھوں سے ایک انسان کا خون ہو گیا...... ہم...... ہم قاتل بن گئے ہیں...... قاتل۔'' فراز فلیٹ پر پہنچ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

''برا ہوا مگر اُس وقت کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ میں نے جو کیا اگر نہ کرتا تو شاید وہاں ہم پڑے ہوتے، مجبوری سمجھ کر بھول جا۔'' امجد اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے بولا۔

''کیا بھول جاؤں کہ ہماری وجہ سے کسی کا قتل ہو گیا؟ یہ کیسے بھول سکتا ہوں میں؟''

''تو پھر یاد رکھ اور روتا رہ...... یا جا کر گرفتاری دے دے، نہیں کر سکتا نا تو پھر بھول جا۔'' امجد بگڑ کر بولا۔ ''سکون کی گولی لے اور سو جا...... اس وقت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔''

مگر فراز دو دن گزرنے کے بعد بھی خود کو سنبھال نہیں پا رہا تھا۔

''اس کا ایک ہی حل ہے۔'' امجد جب اسے سمجھا سمجھا کر تھک گیا تو بولا۔

''وہ کیا؟''

''کام شروع کرتے ہیں، پچھلے ایک ہفتے سے گھر بیٹھے ہیں مصروفیت ہوگی تو خود کو بہتر محسوس کرے گا۔''

''نہیں امجد...... فی الحال میں نہیں کر پاؤں گا۔'' فراز کی آواز کانپنے لگی۔

''سب کر پائے گا تو...... یاد رکھ جس راستے پر تو چلا ہے نا اس میں واپسی نہیں ہوتی لہٰذا جتنی جلد خود کو سنبھال سکتا ہے سنبھال لے، اسی میں تیری بہتری ہے۔'' امجد اس بار لہجہ بدل کر بولا۔

''امجد تو میرا دوست ہے۔'' فراز اسے بے یقینی سے

دوست ہوں اس لیے سمجھا رہا ہوں، کوئی اور ہوتا تو کاٹ کے پھینک دیتا۔ اس طرح تو تو خود بھی پھنسے گا اور مجھے بھی پھنسوائے گا۔ اب دیکھ لے اتنے دن ہو گئے ہیں کچھ نہیں ہوا نا۔ پھر کیوں ڈرتا ہے۔ بس کہہ دیا میں نے دو دن اور آرام کر لے پھر کام پر چلنا ہے۔'' وہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

☆☆☆

وہ تیز تیز قدموں سے آگے اور آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

وہ کہاں جا رہا تھا؟ کیوں جا رہا تھا؟ یہ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔

اس کا دماغ ساکت سا ہو رہا تھا اور وہ منظر گویا اس کی آنکھوں میں جم سا گیا تھا۔ سنا تھا کہ ناگ اور ناگن کی آنکھوں میں مارنے والے کی تصویر جم جاتی ہے مگر یہ پہلا قاتل تھا جس کی آنکھوں میں مقتول کا چہرہ ٹھہر گیا تھا۔

اس عورت کی خوف زدہ نظریں، اس کے سینے سے بہتا خون کا فوارہ، اس کی لاش اسے مسلسل ہانٹ کر رہے تھے۔ اس کی آخری چیخ اس کے کانوں میں گونجتی رہتی تھی۔

وہ اس سب سے دور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اچانک اسے ہارن کی تیز آواز سنائی دی۔ روشنی کا ایک زوردار جھماکا سا نظر آیا اور اس کے بعد ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔

☆☆☆

نسا خود کو بہت تھکا تھکا سا محسوس کر رہی تھی۔ آج وہ چھ سات دن بعد دفتر آئی تھی۔ روزینہ کی موت نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کی لاش اس کی وصیت کے مطابق اس کے گاؤں بھجوا دی گئی تھی۔ نسا کوشش کے باوجود اس بوڑھی ماں کا غم بانٹنے پر خود کو آمادہ نہیں کر سکی تھی جس نے بیٹی کی تکلیفوں کو جاننے کے بعد بھی رواجوں کی غلامی کو ترجیح دی تھی۔

روزینہ پولیس کو بیان دے چکی تھی۔ پولیس کے علاوہ اس نے صرف نسا سے بات کی تھی۔ اس لیے پولیس نے نسا کا بیان بھی ریکارڈ کروایا تھا۔ روزینہ کے بیان کی روشنی میں شہباز خان دہشت گرد اور دہشت گردوں کا ساتھی متعین کیا گیا تھا۔ پولیس اس کی تلاش میں کئی جگہ چھاپے مار چکی تھی اور نہایت تندہی سے اس کی تلاش جاری تھی۔ انسپکٹر اکرم یوں بھی اس معاملے میں نسا سے خاصا شرمندہ تھا۔

علاقے کا ڈی ایس پی خاور، نسا اور صفدر دونوں کا فان بیورہ چکا تھا اور ان کی جانی کی بے تکلفانہ دوستی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ نسا اپنے کام اور تجربات کی روشنی میں اسے پولیس آفیسر ہونے کی وجہ سے کڑوی کسیلی سناتی رہتی مگر یہ وہ بھی بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ ڈی ایس پی خاور ڈپارٹمنٹ کے بہت کم ایماندار اور فرض شناس افسران میں شامل تھا۔ گزشتہ ہفتے میں خاور دو بار اس سے ملنے آیا تھا اور ابھی بھی وہ اس کے دفتر میں موجود تھا۔

''خاور تم کیا چاہتے ہو، میں اپنا کام کاج سب چھوڑ دوں؟'' اس نے خاور کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

''یہ میں نے کب کہا ہے مگر تم کو یہ سمجھنا پڑے گا کہ شہباز کے بارے میں جو معلومات سامنے آ رہی ہیں، ان کے مطابق اس کے نہایت خطرناک لوگوں کے ساتھ روابط رہے ہیں۔ اس کے کیس میں پولیس کے پاس اپنی تفتیش روزینہ کے بیان کے علاوہ صرف ایک گواہ ہے اور وہ تم ہو جس سے روزینہ نے وقتِ نزع گفتگو کی ہے۔'' وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''یہ تم پہلے بھی بتا چکے ہو، اب تو تم مجھے یہ بتاؤ کہ پھر اس کی روشنی میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اگر وہ خطرناک ہے تو تم لوگوں کو اسے پکڑنا چاہیے، یہ تمہاری ڈیوٹی ہے یا یہ کہ عوام مجرموں سے ڈر کر گھروں میں بیٹھ جائیں اور تم کہو کہ حالات قابو میں نہیں۔''

''میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ تمہارا اکیلے سفر کرنا، اکیلا اس دفتر میں بیٹھنا فی الحال ٹھیک نہیں ہے۔'' خاور نے جواب دیا۔

''میں امتیاز کے ساتھ آتی ہوں اور فار یور کائنڈ انفارمیشن اس دفتر میں دو افراد اور بھی موجود ہیں۔''

''امتیاز یا تمہارا اسٹاف تربیت یافتہ گارڈز نہیں ہیں نسا اور تم اتنی کم عقل نہیں ہو کہ میری یا صفدر کی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی ہو۔'' خاور سنجیدگی سے بولا۔

''تو تمہیں لگتا ہے کہ وہ مجھ پر حملہ کر سکتا ہے؟'' نسا نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''ہاں۔''

''تو پھر تو تمہارا کام آسان ہو جاتا ہے ڈیئر ڈی ایس پی......'' وہ مسکرائی۔

''تمہارا مطلب ہے کہ میں تمہیں قربانی کا بکرا بننے دوں۔'' خاور نے اسے گھورا۔

''بکرا نہیں بکری مائنڈ یور گرامر پلیز۔ اسے پکڑنے کا اگر یہ بہترین موقع ہو سکتا ہے تو میں تیار ہوں اور یہ میں خود

اپنے لیے کر رہی ہوں۔

''اپنے لیے؟''

''ہاں...... پتا نہیں کیوں مگر میں اب تک خود کو نہیں سمجھا سکی شاید میں روزینہ کو اس کے ساتھ نہ بھیج کر اسے بچا سکتی تھی۔ اگر میں اسے نہیں بچا سکی تو شہباز کو پکڑنے میں مدد کر کے شاید میں اس کا کفارہ ادا کر سکوں اور...... شاید کسی اور روزینہ کی زندگی تباہ ہونے سے بچ سکے۔'' وہ بھیگے ہوئے لہجے میں بول رہی تھی۔

''خود کو سنبھالو نسا، تم جو کر سکتی تھیں، تم نے کیا۔ مجھے بس اتنی اجازت دو کہ میرا ایک بندہ کل صبح سے تمہارے ساتھ رہ سکے۔ گھر پر، گاڑی میں اور دفتر میں بھی۔''

''ٹھیک ہے۔'' نسا نے کاندھے اچکائے۔ ''اسے جلد از جلد گرفتار کرو خاور...... میں بس یہی چاہتی ہوں۔''

''پکڑا جائے گا، اس کے گرد گھیرا تنگ ہو چکا ہے۔ اس نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ روزینہ کا خونِ ناحق اسے کتنا مہنگا پڑ سکتا ہے۔''

''ایک بات میں پوچھنا بھول گئی تھی، روزینہ کو اسپتال کون لایا تھا؟''

''محلے والے...... محلے والوں کے جمع ہو جانے پر شہباز فرار ہو گیا تھا۔'' خاور نے بتایا۔

خاور کے جانے کے بعد نسا کچھ دیر کام میں مصروف رہی پھر اس نے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ موسم یوں بھی صبح سے خاصا خراب تھا۔ کالے سیاہ بادلوں نے آسمان کا گھیراؤ کر رکھا تھا۔ بارش شروع ہو جاتی تو ایک طرف جہاں سڑکوں نے جھیل کا روپ دھار لینا تھا وہیں ٹریفک کا برا حال ہو جاتا۔

نسا اور امتیاز دفتر سے نکلے تب رات کی سیاہی اجالے کو مات دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ ٹریفک خاصا جام تھا۔

''میرا خیال ہے کہ تم اندر والی سڑک سے لے لو وہاں گلیاں تو ہیں مگر رش کم ملے گا۔'' نسا نے امتیاز سے کہا اور کانوں میں ہینڈ فری لگا کر آنکھیں موند لیں۔

اچانک لگنے والے زوردار بریک نے بیلٹ کے باوجود نسا کو اچھال دیا تھا۔

''کک کیا ہو گیا امتیاز......؟'' وہ چلائی۔

''وہ سامنے...... دیکھیے......'' امتیاز گھبرا کر بولا۔

''اوہ میرے خدا...... یہ تم نے کیا کیا؟'' نسا چلائی اور دروازہ کھول کر تیزی سے باہر آ گئی۔ سڑک پر ایک نوجوان گرا ہوا تھا۔ امتیاز کے بروقت بریک لگانے کے باوجود اسے گاڑی سے ٹکر لگ گئی تھی اور اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔

''میڈم یہ ایک دم سامنے آ گیا، میں نے بمشکل بریک لگا کر اسے بچانے کی کوشش کی۔'' امتیاز ڈر گیا تھا۔

''وہ تو ٹھیک ہے مگر پہلے اسے گاڑی میں ڈالو اور ڈاکٹر کی طرف چلو تیزی سے۔'' نسا بولی۔

زخمی ہوش میں تھا مگر وہ کچھ بول نہیں رہا تھا۔ گاڑی میں لٹاتے ہی وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

''تیز چلاؤ امتیاز، صفدر کے اسپتال کی طرف چلو۔ مجھے ڈر ہے کہ اسے کوئی اندرونی چوٹ نہ لگی ہو۔'' نسا اس کی نبض پر انگلیاں رکھتے ہوئے بولی۔

امتیاز کی انگلیاں اسٹیئرنگ پر لرز رہی تھیں مگر اس نے رفتار بہرحال بڑھا دی تھی۔

☆☆☆

''کیسا ہے اب وہ......؟'' صفدر کو ایمرجنسی سے باہر آتا دیکھ کر نسا نے پوچھا۔

''ٹھیک ہے ٹانکے لگا دیے ہیں شکر ہے کہ کوئی اندرونی چوٹ نہیں ہے بس......'' وہ کچھ سوچتے ہوئے چپ ہو گیا۔

''کیا بس......؟''

''لگتا ہے ڈپریشن کا شکار ہے۔ ہوش میں آ گیا ہے مگر نہ گھر کا بتاتا ہے اور نہ کسی سوال کا جواب دے رہا ہے۔ میں نے سکون آور دوائیں دی ہیں اسے۔''

''تو اب کیا کریں گے؟ کہاں جائے گا وہ؟''

''یہی سوچ رہا ہوں میں، اسے بس آرام اور دواؤں کی ضرورت ہے۔''

''پھر؟'' نسا نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''پھر یہ کہ امتیاز جرمانہ دے گا۔'' صفدر مسکرایا۔

''صاحب جی قسم لے لیں جو میری غلطی ہو، وہ آپ ہی سامنے آ گیا۔''

''ٹھیک ہے امتیاز میں یہ کہہ رہا ہوں کہ آج کی رات اسے گھر لے چلتے ہیں تمہارے کوارٹر میں اپنے ساتھ رکھو اور اس کی دیکھ بھال کرلو، صبح یہ کچھ بہتر ہوگا تو دیکھتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے صاحب جی۔'' امتیاز نے سر ہلایا۔

☆☆☆

فراز کو ہوش آیا تو وہ ایک آرام دہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ یہ اس کا گھر نہیں تھا۔ گھر کا خیال آتے ہی گزشتہ رات کے واقعات اس کی یاد میں تازہ ہونے لگے۔

روشنی کا جھماکا اور درد کا تیز احساس، اس کے بعد ہی شاید وہ جاگا تھا اور پھر سو گیا تھا۔

”شکر ہے تمہیں ہوش آ گیا۔ کیسے ہو؟ کچھ کھاؤ گے؟“ امتیاز نے اسے جاگتا دیکھ کر پوچھا۔

”میں کہاں ہوں؟“

”تم میرے کوارٹر میں ہو، رات تم ہماری گاڑی سے ٹکرا کر گر گئے تھے۔ ہمارے صاحب ڈاکٹر ہیں۔ انہوں نے تمہارے زخم پر ٹانکے لگائے اور تمہیں گھر لے آئے۔“ وہ بولا۔

”ویسے مسئلہ کیا تھا؟ تم ہارن کی آواز بھی نہیں سن رہے تھے اور سڑک کے بیچوں بیچ اس طرح آ گئے کہ اگر ٹریفک ذرا بھی زیادہ ہوتا تو تمہارا بچنا ناممکن تھا۔ وہ تو شکر کرو کہ صحیح وقت پر بریک لگ گیا ورنہ...... تم تو اپنی جان سے جاتے ہی مجھے بھی پریشانی میں ڈال دیا ہوتا۔“ وہ پھریری سی لے کر بولا۔ ”تمہارا گھر کہاں ہے؟ اور گھر والے؟ کسی کا نمبر وغیرہ یاد ہو تو دو تاکہ اسے اطلاع کر سکوں آخر وہ پریشان ہو رہے ہوں گے۔ ہم نے رات دیکھا تھا مگر تمہارے پاس نہ موبائل تھا اور نہ ہی کوئی اور شناخت...... شناختی کارڈ ہے تو اس پر بھی گاؤں کا پتا لکھا ہے۔“

امتیاز بولے جا رہا تھا جواب میں فراز خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے ذہن میں خیالات کا طوفان امنڈا ہوا تھا۔ وہ واپس اس زندگی میں امجد کے ساتھ رہنے اور دوبارہ وہی ”کام“ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ تو جینا ہی نہیں چاہ رہا تھا مگر موت کی تلاش میں نئی زندگی کی امید اس کے سامنے آ گئی تھی۔ اب وہ اس امید کی انگلی پکڑ کر اپنا نصیب آزمانا چاہتا تھا۔

”میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ نہ ہی میرے گھر والے اس شہر میں ہیں۔ انہیں تو علم بھی نہیں ہے کہ میں کس مشکل میں ہوں۔“ وہ بالآخر بولا۔

”کیا مطلب؟“ امتیاز نے اسے غور سے دیکھا۔

”نوکری کر رہا تھا یہاں، اچانک صاحب لوگوں نے کاروبار بند کر دیا۔ کافی عرصے سے کام تلاش کر رہا ہوں۔ نوکری گئی تو آخرکار کرائے کا کمرا بھی گیا۔ غریب کا کون دوست ہوتا ہے۔ پیچھے گھر پر بھی مسائل ہیں۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ کہانی کسی حد تک جھوٹی تھی مگر اس کے آنسو حقیقی تھے۔

”اوہو...... فکر نہ کرو اللہ بڑا کارساز اور رازق ہے۔ ہمارے صاحب اور میڈم دونوں بہت اچھے ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہارا مسئلہ حل ہو، لوفی الحال تم یہ چائے پیو۔“ امتیاز اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔

”چائے پی کر کیا میں تھوڑی سی چہل قدم کر سکتا ہوں؟“ فراز نے پوچھا۔

”ہاں...... کر لینا۔“ امتیاز نے جواب دیا۔ ”پر احتیاط کے ساتھ 8 ٹانکے لگے ہیں سر پر......“ اسے نہ جانے کیوں اس نوجوان سے ذرا سی دیر میں بہت ہمدردی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

ہمدردی ایک اچھا جذبہ ہے، تم جانتی ہو کہ میں نے اس حوالے سے کبھی تمہارے کسی فیصلے کی مخالفت نہیں کی مگر موجودہ حالت میں اتنی جلدی کسی پر بھروسا کرنا ٹھیک نہیں ہے۔“ صفدر ملامت سے کہہ رہا تھا۔

”میں جانتی ہوں، صفدر۔ خاور نے مجھ سے بھی بہت کچھ کہا ہے مگر وہ الگ معاملہ ہے۔ یہ پڑھا لکھا لڑکا بے روزگاری کا مارا ہوا ہے۔ ہمیں اس وقت دفتر میں ایک آدمی کی ضرورت بھی ہے کام کا ثابت ہوا تو ٹھیک ورنہ چھٹی کر دیں گے مگر کوشش تو کرنی چاہیے۔ پھر امتیاز اس کی گارنٹی بھی لے رہا ہے۔ جب تک اس کا کوئی بندوبست نہیں ہوتا، وہ امتیاز کے ساتھ ہی رہے گا۔ اس کا شناختی کارڈ بھی ہمارے پاس ہے اور مجھے اس میں کوئی مسئلہ نظر نہیں آ رہا۔“ نسا بولی۔

”ٹھیک ہے پھر۔“ صفدر مسکرایا۔ ”جس طرح ہماری بیگم صاحبہ خوش ہوں۔“

نسا بھی جواباً مسکرا دی۔

فراز نے چند ہی دنوں میں اس کے فیصلے کو درست ثابت کر دیا تھا۔ نسا اور صفدر کے روکنے کے باوجود اس نے اگلے روز سے ہی دفتر جانا شروع کر دیا تھا۔ اسے یہ کام بہت اچھا لگا تھا اور وہ دل لگا کر محنت کرنا چاہتا تھا۔ اپنے کیے کی خلش اسے بے چین کرتی تھی اور امجد کا خیال خوف زدہ مگر وہ اپنی ساری کمائی امجد کے لیے چھوڑ آیا تھا اس لیے اسے امید تھی کہ اس نے اسے زیادہ تلاش نہیں کیا ہوگا۔ وہ پچھلے چھ ماہ کو بھول جانا چاہتا تھا اور فی الحال وقت بھی اس کا ساتھ دے رہا تھا۔

☆☆☆

”خاور! یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔“ نسا پُرجوش انداز میں کہہ رہی تھی۔ ”مجھے یقین تھا کہ تم لوگ اسے ڈھونڈ نکالو گے مگر یہ سب اتنی جلد ممکن ہو جائے گا، اس کا علم نہیں تھا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری پولیس اگر کچھ کرنے کا ٹھان لے تو کر سکتی ہے۔''

''جی ہاں...... اور کرتی بھی ہے۔'' خاور بھاری لہجے میں بولا۔ ''اصل میں اچھے برے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں۔ کارنامے اور خرابیاں بھی ہر جگہ ہوتی ہیں مگر ہمارے ہاں اپنی اچھائیوں کو اجاگر کرنا غالباً خبر نہیں سمجھا جاتا تب ہی تو تم دیکھو کہ تمہیں اپنے ملک میں بے شمار ٹیلنٹ، بہت سے کارناموں، ریکارڈ، نئی تحقیق کی خبر کا پتا تک نہیں چلتا ہاں کچھ منفی ہو جائے تو آگ سی لگ جاتی ہے۔ بہر حال یہ تو الگ مسئلہ ہے۔ شہباز پکڑا گیا ہے۔ ہمارے ایک مخبر کی خبر پر انسپکٹر اکرم نے پولیس پارٹی کے ساتھ چھاپا مارا تھا۔ کافی مقابلے کے بعد تین افراد گرفت میں آئے ہیں۔ ان میں سے ایک شہباز ہے۔''

''ان میں سے ایک کا کیا مطلب؟ اکرم جانتا ہے شہباز کو......'' نسا نے ایک ابرو اچکا کر کہا۔

''ہاں...... مگر بری خبر یہ ہے کہ مقابلے میں اکرم شدید زخمی ہوا ہے اور وہ اسپتال میں ہے۔'' خاور نے جواب دیا۔

''اوہ، اللہ اُسے صحت عطا فرمائے، پھر اب تم کیا کرو گے؟''

''میں نہیں، اس معاملے میں تم ہماری مدد کر سکتی ہو، ہمیں ان کے اعتراف پر بھروسا نہیں ہے۔ تم شہباز کو شناخت کر سکتی ہو؟''

''بالکل، میں اس کی شکل کیسے بھول سکتی ہوں۔'' وہ نفرت سے بولی۔

''بس تو پھر تمہیں کل میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ میری صبح صفدر سے بھی بات ہوئی ہے۔ ہم نے بھی یہ سوچا تھا اور وہ بھی اسی بات پر راضی ہوا ہے کہ وہ تمہیں نہ دیکھ سکے۔ تم اُسے جالی کے پیچھے سے شناخت کر دو گی۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے اور میں اس سے ملنا بھی چاہتی ہوں۔'' نسا غصے سے بولی۔

''فی الحال یہ احتیاط اس لیے کی جا رہی ہے کہ ہمیں اس کے اردگرد کے لوگوں کے بارے میں مکمل معلومات نہیں ہیں۔'' خاور اٹھتا ہوا بولا۔ ''تمہیں کل صبح 10 بجے تھانے آنا ہوگا۔ تمہاری شناخت ہمارے لیے بہت اہم ہے۔''

''میں ضرور آؤں گی خاور۔'' نسا بولی۔ ''اس جیسے شیطان کو ضرور اس کے کیے کی سزا ملنی چاہیے۔''

☆☆☆

وہ دو گھنٹے سے ٹرک کا بونٹ کھولے اس سڑک پر کھڑا تھا۔ اس دوران دو بار ٹریفک کا سپاہی گھیرا ڈال چکا تھا۔ وہ ہر بار اسے ٹرک کی خرابی کی اطلاع اور سو کا نوٹ دے کر ٹال رہا تھا۔

''پتا نہیں کتنی دیر اور لگے گی۔'' وہ بڑبڑایا، اسے یہ بتایا گیا تھا کہ اس کا شکار چھ بجے دفتر سے باہر آجائے گا مگر اب ساڑھے چھ سے اوپر ہو چکے تھے۔ اس نے ایک بار پھر گھڑی کو دیکھا۔ اسی لمحے اس کا فون بج اٹھا۔ ''سکندر کیا ہو رہا ہے؟'' دوسری جانب سے پھنسی پھنسی سی آواز ابھری۔

''کچھ نہیں صاحب' انتظار کر رہا ہوں، اب تک وہ باہر ہی نہیں نکلی۔'' وہ حتی الامکان ادب سے بولا۔

''آہم...... کوئی بات نہیں بچے، تم انتظار کرو اور جو تمہیں کہا گیا ہے وہ تمہیں کرنا ہے۔'' وہی آواز تحکمانہ انداز میں گویا ہوئی۔

''جی صاحب...... میں وہی کروں گا آپ بے فکر رہیں۔'' اس نے فون بند کر کے ڈیش بورڈ پر رکھا۔ پھر تیزی سے اتر کر بونٹ بند کر کے دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ پر آبیٹھا۔ سامنے عمارت سے وہ کار نکل رہی تھی۔ وہ چند سال پرانی سیاہ رنگ کی سوک کار تھی۔ جس میں آگے ڈرائیور کے ساتھ ایک لڑکا بیٹھا تھا جبکہ پیچھے وہ موجود تھی۔ کار تیزی سے آگے نکل گئی تھی۔ سکندر نے ہونٹ بھینچ کر ٹرک اسٹارٹ کیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ وہ ایک محفوظ فاصلہ رکھ کر کار کا پیچھا کر رہا تھا۔ اس کے ذہن کے کینوس پر پوری کارروائی کا بلیو پرنٹ گویا چھپا ہوا تھا گاڑی اب اتحاد کی جانب مڑ رہی تھی۔ جوں جوں کار آگے بڑھ رہی تھی، ٹریفک کم ہوتا جا رہا تھا۔ سکندر نے اب ٹرک کی رفتار قدرے بڑھائی تھی جونہی اگلی کار نے پارک سے اندر ٹرن لیا، سکندر اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ ٹرک کی رفتار اب خاصی تیز تھی اور غالباً کار کے ڈرائیور کو بھی آنے والی افتاد کا مکمل علم نہ سہی مگر خاصا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس نے ٹرک سے فاصلہ بڑھانے کی فوری کوشش کی تھی مگر سکندر اپنے کام کا ماہر تھا۔ وہ اپنا ٹرک موٹر سائیکل کے مانند اڑا سکتا تھا۔ اس نے تیزی سے موڑ کاٹا اور لمحے بھر میں اس کا ٹرک گاڑی کو سائڈ مارتا آگے نکل گیا تھا۔ اس ٹکر نے سوک کو تھوڑا سا اچھال دیا تھا۔ ڈرائیور نے مشاقی سے گاڑی کو قابو کرنے کی پوری کوشش کی تھی مگر وہ لہراتی ہوئی دوسری جانب بنے پارک کی ریلنگ سے ٹکرا گئی تھی۔ یہ سب

چند لمحوں میں ہو گیا تھا۔ ٹرک کی آواز، ٹکر اور پھر ریلنگ سے ٹکرانے کی آوازوں نے اردگرد کے لوگوں کو متوجہ کر لیا تھا اور سیاہ کار کے گرد لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔

☆☆☆

نسا کو اپنے حواس بحال کرنے میں چند منٹ لگ گئے تھے۔ دو منٹ پہلے امتیاز نے اسے مضبوطی سے بیٹھنے کے لیے الرٹ کر دیا تھا۔

''یہ ٹرک والا پاگل ہو گیا ہے یا پھر اس کا بریک فیل ہے۔'' وہ بدحواسی سے بولا۔

اور پھر اگلے ہی لمحے ٹرک کار سے ٹکرا گیا تھا۔ وہ تینوں اس دہری ٹکر سے اچھلے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے اب بچنا مشکل ہی ہو۔ نسا نے آخری لمحے میں آنکھیں بند کر لی تھیں۔

''امتیاز..... فراز.....'' اس نے زور سے آواز دی اور سیٹ بیلٹ کھول کر اپنا جائزہ لیا۔ عموماً لوگ پچھلی سیٹ پر بیلٹ کی موجودگی کے باوجود اسے استعمال نہیں کرتے۔ نسا اس معاملے میں بہت سخت تھی۔ اس کی موجودگی میں کوئی بھی سیٹ بیلٹ لگائے بغیر گاڑی میں نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ آج اس کی یہی احتیاط اس کے کام آ گئی تھی ورنہ اسے بہت زیادہ چوٹ لگ سکتی تھی۔ اب بھی اس کی گردن، کمر جھٹکوں کی وجہ سے تکلیف میں تھی۔ اسے ان دونوں کی فکر تھی۔

''جی میڈم۔'' امتیاز کی آواز سن کر اسے کچھ اطمینان ہوا۔ ''میں ٹھیک ہوں بس یہ ہاتھ مڑ گیا ہے۔'' وہ تکلیف سے کراہتا ہوا بولا۔

''اور فراز.....؟'' وہ آگے جھکی۔

''میں بھی میڈم.....'' وہ بمشکل بولا۔ جھٹکے سے اس کے سر کا کوئی ٹانکا کھل گیا تھا یا کوئی نئی چوٹ لگی تھی جس کی وجہ سے خون رسنے لگا تھا۔ ''اسے دیکھو امتیاز۔'' وہ صفدر کو فون کرتے ہوئے بولی۔

کچھ ہی دیر میں وہ تینوں ایمبولینس میں تھے۔ تینوں کو ہلکی پھلکی چوٹیں آئی تھیں۔ امتیاز کے بازو میں فریکچر ہو گیا تھا۔ واپسی میں نسا بالکل چپ چپ تھی۔

''ہمت کرو نسا، کچھ نہیں ہوا ہے، ٹریفک کا حادثہ تھا۔ شکر کرو کہ بلا ٹل گئی۔'' صفدر اسے مسلسل چپ دیکھ کر بولا۔

''گاڑی تباہ ہو گئی ہے۔'' وہ خالی الذہنی کے عالم میں بولی۔

''اس کی فکر چھوڑو، وہ انشورڈ ہے۔ بس خیر ہو گئی ہے تم ٹھیک ہو ان دونوں کو بھی ہلکی پھلکی چوٹیں آئی ہیں۔ اس منحوس ٹرک کا تم لوگوں نے نمبر بھی نہیں دیکھا۔ بہرحال کسی نے تو دیکھا ہو گا۔ یہ کم بخت نشہ کر کے ٹرک چلاتے ہیں۔'' صفدر بڑبڑایا۔

''صفدر.....'' نسا چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ''مجھے یہ ایک عام حادثہ نہیں لگتا۔ وہ ساری سڑک چھوڑ کر ہمیں مارنے آیا تھا اور پھر سیدھا نکل گیا۔''

''وہم نہ کرو..... اور اگر ایسا بھی ہے تو ہمیں دیکھنا پڑے گا۔ فی الحال تم بالکل ٹینشن مت لو، اللہ پر بھروسا رکھو۔'' وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔

وہ گھر پہنچ کر چائے پی رہی تھی تب اس کا موبائل بجا۔ اسکرین پر کوئی اجنبی نمبر تھا۔ نسا نے فون ریسیو کیا۔

''ہیلو..... کیا حال ہے میڈم.....'' ایک عجیب سی پھنسی پھنسی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''کون بول رہا ہے؟''

''کون بول رہا ہے، یہ اہم نہیں ہے میڈم جی کیا بول رہا ہے، یہ اہم ہے۔ عقل مند لوگ جلد سبق لے لیتے ہیں۔ آج جو کچھ ہوا وہ بھی ایک معمولی سا سبق تھا۔''

''یعنی..... یعنی تم ہمیں مارنا چاہتے تھے، ہو کون تم؟'' وہ غرائی۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم میں سیکھنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ ابھی تو کہا کہ کون ہوں، اس سے تمہارا کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے اور ہاں ہم تمہیں مارنا نہیں صرف ہوشیار کرنا چاہتے تھے۔ مارنا چاہتے تو مار دیتے۔'' وہ سادگی سے بولا۔

''کیا چاہتے ہو؟'' نسا نے تحمل سے پوچھا۔

''صرف یہ کہ جس بات سے تمہارا تعلق نہیں اس سے دور رہو۔'' اسی پھنسی پھنسی آواز میں کہا گیا۔

''مطلب.....؟''

''پولیس، شہباز اور اس کے ہر معاملے سے دور رہو، اگر کل تم تھانے گئیں تو اگلی بار ٹریلر نہیں پوری فلم چلے گی۔'' اس جملے کے ساتھ کال کٹ گئی تھی۔

☆☆☆

''کیا تم دونوں نے کسی سے..... اور کسی سے میرا مطلب ہے کسی سے بھی، گھر یا دفتر میں اس حوالے سے کوئی بات کی تھی؟'' ڈی ایس پی خاور نے پوچھا۔ وہ اس وقت نسا اور صفدر کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کی فراخ پیشانی شکنوں سے بھری ہوئی تھی اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''نہیں، ہمیں اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ حتیٰ کہ میری اور صفدر کی ملاقات بھی حادثے کے بعد ہوئی ہے۔ امتیاز اور

فراز دفتر سے باہر تھے۔ سارا دن اور باقی اسٹاف میں سے بھی کوئی تم سے بات کرتے ہوئے کمرے میں نہیں تھا۔'' نسا بولی۔ ''یہ کہانی تمہارے تھانے سے باہر گئی ہے اور یہ کوئی نئی یا انہونی بات تو ہے بھی نہیں۔''

''ہم...... تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ بہرحال وہ جو کوئی بھی ہے اس کالی بھیڑ کو میں ڈھونڈ نکالوں گا۔'' خاور غصے سے بولا۔

''وہ ٹھیک ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیا ایسی صورتِ حال میں نسا کا تھانے جا کر شناختی عمل سے گزرنا مناسب ہے؟'' صفدر نے پوچھا۔ ''یہ معاملہ میری سوچ سے زیادہ خطرناک ثابت ہو رہا ہے خاور...... اور میں نسا کی زندگی و سلامتی کے حوالے سے کوئی رسک نہیں لے سکتا۔''

''میں سمجھتا ہوں صفدر......'' خاور نے جواب دیا۔

''یوں تو میں بھی کوئی ہیروئن نہیں ہوں اور یہ بات سمجھنے کے لیے بھی خاصی بڑی ہو چکی ہوں کہ زندگی تین گھنٹے کی فلم نہیں ہوتی مگر مجھے تم دونوں سے اس نکتے پر اختلاف ہے۔'' نسا ملائمت سے بولی۔

''کیسا اختلاف؟'' صفدر نے اسے گھورا۔

''اگر ہم سب اس طرح دھمکیوں سے ڈرنے لگے تو ایک دن سب ختم ہو جائے گا صرف ڈر باقی رہ جائے گا۔'' وہ سادگی سے بولی۔

''تم سمجھ نہیں رہی ہو نسا، آج ہی تمہیں مارنے کی کوشش کی گئی ہے اور وہ سچ کہہ رہا تھا کہ وہ صرف ڈرا رہے تھے ورنہ اس خالی سڑک پر وہ ٹرک تم لوگوں کو کچل کر بھی جا سکتا تھا۔'' صفدر زور سے بولا۔ ''اور اگر تم اس کو شناخت کر بھی لو گی تو کیا قیامت آ جائے گی۔ جو لوگ ایک کانفیڈینشل بات سے فوراً مطلع ہو سکتے ہیں، وہ اسے بچا بھی سکتے ہیں۔''

''فرق پڑے گا صفدر...... یہاں نہ چاہتے ہوئے بھی میں نسا کے ساتھ کھڑا ہوں۔'' خاور بولا۔

''اگر کل اس کی شناخت نہ ہوئی تو وہ ضمانت پر باہر آ جائے گا۔''

''صفدر پلیز مجھے اس کام کی اجازت دو۔ اس سے صرف میں ہی نہیں نہ جانے کتنی روزینائیں اور ہم سب کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔'' نسا نے دھیرے سے کہا۔

''مجھے بھی ڈر لگ رہا ہے مگر اگر کل کوئی ایسی کال کر کے کوئی اور حکم دے اور پھر پرسوں تیسرا تو ہم کیا کریں گے؟''

صفدر اسے چند لمحے دیکھتا رہا پھر خاور کی طرف مڑا۔

''نسا کو کچھ نہیں ہونا چاہیے خاور اور یہ کہ کل میں بھی تم لوگوں کے ساتھ چلوں گا۔''

☆☆☆

شناخت کے عمل میں دس منٹ بھی نہیں لگے تھے۔ نسا خصوصی شیشے کے دروازے کے پیچھے کھڑی تھی اور وہاں سے ان تینوں افراد کو گزارا گیا تھا۔ اس شیشے کے پار وہ سب کچھ بہت آسانی سے دیکھ سکتی تھی مگر دوسری جانب سے شیشے کے اس پار دیکھنا ناممکن تھا۔

نسا نے لمحے بھر میں شہباز کو پہچان لیا تھا۔ وہ پہلے کے مقابلے میں مزید بھاری ہو گیا تھا۔ شناخت کے بعد وہ صفدر اور خاور کے ساتھ گھر لوٹ آئی تھی۔ خاور انہیں چھوڑ کر فوراً واپس چلا گیا تھا۔

نسا کے گھر اور دفتر پر سادہ لباس میں پولیس اہلکار تعینات کر دیے گئے تھے۔ صفدر نے اس کے علاوہ ایک سیکیورٹی کمپنی سے بقول ان کی زبان میں نہایت چیتے قسم کے گارڈ کا انتظام بھی کر لیا تھا جسے سادہ لباس میں ہر وقت نسا کے ساتھ رہنا تھا۔ ٹرک والے واقعے اور پھر شناخت کے بعد سے صفدر بہت الرٹ ہو گیا تھا اور وہ ذرہ برابر بھی رسک لینے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ تو اسے اس بات پر بھی آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ چند دنوں کے لیے تیمور اور ممی ڈیڈ کے پاس کینیڈا چلی جائے مگر نسا اس کے لیے تیار نہیں تھی پھر خاور نے بھی صفدر کو سمجھایا تھا کہ انہیں اس مقدمے میں نسا کی گواہی کی ضرورت پڑے گی۔

شہباز اور اس کے ساتھیوں پر قتل و غارت گری اور دہشت گردی کے مقدمات بنائے گئے تھے۔ تفتیش میں اس کے کارناموں کی پول کھلتی جا رہی تھی اور اس کے مزید ساتھیوں کی گرفتاریاں عمل میں لائی جا رہی تھیں۔ وہ دہشت گردی کے ایک فعال نیٹ ورک کا حصہ تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس مقدمے میں روزینہ کا ذکر بھی صرف حوالے کے طور پر تھا جس پر روا رکھے جانے والا ظلم اور جس کا خونِ ناحق ہی اصل میں اس کی بربادی کا سبب بنا تھا۔

مقدمہ خصوصی عدالت میں تھا۔ پولیس کی پوری کوشش بھی تھی کہ مقدمے کو جلد از جلد کسی منطقی انجام تک پہنچا دیا جائے۔ چینلز اور اخبارات پر بھی اس حوالے سے خوب شور شرابا ہو رہا تھا جو عوامی دباؤ میں اضافہ کر رہا تھا۔

جوں جوں مقدمے کی کارروائی آگے بڑھ رہی تھی۔ خاور کی ہدایات پر نسا کی حفاظت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا آج کل وہ گھر کو ہی سب آفس بنا کر کام کر رہی تھی۔ اسے حالات کی نزاکت کا مکمل اندازہ تھا پھر بھی وہ اکثر و بیشتر

صفدر اور خاور پر برستی رہتی۔

"یہ ٹھیک ہے مجرم آزاد ہیں اور بے چاری عوام نظر بند۔"

"یہ نظر بندی نہیں حفاظتی تحویل ہے میڈم۔" خاور ہنسا۔ "اور یہ بہت جلد ختم ہو جائے گی۔"

☆☆☆

وہ بت بنا اخبار کو گھورے جا رہا تھا۔

یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے کوئی آسیب دیکھ لیا ہو۔

اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

سٹی پیج پر موجود دو کالمی چھوٹی سے تصویر اور خبر اس کی توجہ کا مرکز تھی۔

عوام نے دو ڈاکوؤں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا اور انہیں سڑک پر پیٹرول چھڑک کر آگ لگا دی تھی۔ تفصیلات کے مطابق اس علاقے میں گزشتہ دو ماہ سے ڈکیتیوں اور اسٹریٹ کرائمز کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ کئی افراد ان واقعات کے دوران مزاحمت یا ڈاکوؤں کی سفاکی کا نشانہ بن کر موت کے گھاٹ بھی اتر چکے تھے۔ گزشتہ شب ایک بیکری کو لوٹ کر فرار ہوتے ہوئے دو ڈاکو شہریوں نے پکڑ لیے تھے۔ پولیس کی آمد سے پہلے پہلے ڈپریشن، بے بسی، بے یقینی اور غصے کے شکار شہریوں نے وہیں سڑک پر پیٹرول چھڑک کر ڈاکوؤں کو آگ لگا دی تھی۔ ان میں سے ایک ڈاکو موقع پر ہی ہلاک ہو گیا تھا جبکہ دوسرا شدید زخمی کیفیت میں اسپتال پہنچایا گیا تھا۔ مرنے والے ڈاکو کی شناخت امجد کے نام سے ہوئی تھی۔

خبر میں آگے بھی بہت کچھ لکھا تھا مگر فراز کی نظریں اس آخری سطر پر جمی رہ گئی تھیں۔ اس نے خود پر جبر کر کے تصویر کو غور سے دیکھا جس میں دونوں ڈاکوؤں کے چہرے شناخت کے لیے دکھائے گئے تھے۔ وہ امجد ہی تھا۔ اس کی بے نور آنکھیں گویا فراز کو تک رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ سے اخبار چھوٹ گیا۔ اس کی آنکھوں میں پانی تیر رہا تھا۔ اس کا دل شکر کے سجدے میں پڑا تھا اور کانوں میں ایک ہی آواز گونج رہی تھی اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

☆☆☆

شہباز اور اس کے ساتھیوں کے خلاف مقدمہ تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی اگلی پیشی فیصلہ کن ثابت ہونے والی تھی۔ پولیس اپنی تفتیش اور ثبوت پیش کر چکی تھی۔ مسئلہ گواہوں کا تھا۔ گزشتہ دو پیشیوں میں بھی استغاثے کے تینوں گواہ عدالت حاضر نہیں ہوئے تھے جس پر جج صاحب نے اپنی برہمی کا اظہار بھی کیا تھا۔ اس پیشی میں نسا کو پیش ہونا تھا۔ وہ روزینہ کے نزعی بیان کی گواہ تھی اور اس کی گواہی مقدمے میں نہایت اہمیت کی حامل تھی۔

اس روز کے بعد سے اسے نہ تو کوئی دھمکی آمیز کال ریسیو ہوئی تھی اور نہ ہی کسی اور برے واقعے کا سامنا کرنا پڑا تھا مگر اس کے باوجود کسی انہونی کے ہو جانے کا خوف ان سب کو اپنی لپیٹ میں لیے رکھتا تھا۔ گزشتہ ایک ہفتے سے تو نسا کا گھر سے باہر نکلنا بالکل ہی بند تھا۔ صفدر اور خاور ذرا سا بھی رسک لینے پر تیار نہیں تھے۔

اس روز بھی صفدر اسپتال جا چکا تھا۔ نسا کا عارضی دفتر لاؤنج میں سجا ہوا تھا۔ فراز اور دیگر دو لڑکے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے کام کر رہے تھے جبکہ وہ خود صوفے پر بیٹھی لیپ ٹاپ پر کوئی ڈاکیومنٹ تیار کر رہی تھی۔

"یہ امتیاز کہاں رہ گیا؟" کام کرتے کرتے اسے یاد آیا۔ عین اسی وقت اندرونی بیل بجی اور گارڈ نے دروازہ کھولا۔

"لو بھائی یہ تو شیطان سے لمبی عمر لے کر آئے ہیں۔ ابھی آپ نے یاد کیا اور ابھی حاضر۔" امتیاز کو اندر آتے دیکھ کر عاطف بولا۔

"واقعی...... تم کہاں رہ گئے تھے امتیاز؟" نسا نے اسے گھورا۔ "اور یہ کیا لائے ہو؟"

امتیاز کے ہاتھوں میں شہر کی معروف بیکری کا کیک کے لیے تیار کردہ چوکور بیگ تھا جس میں یقیناً کیک ہی تھا۔

"یہ میں نے نہیں لیا میڈم، صاحب نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔" وہ مسکرایا۔ "ابھی بیکری والا دے کر گیا ہے۔ صاحب نے کہا ہے کہ اسے آپ ہی کھولیں۔"

"واؤ...... یقیناً چاکلیٹ کیک ہوگا، صفدر کو معلوم ہے کہ مجھے ان کا اسپیشل چاکلیٹ کیک کتنا پسند ہے۔ فردوس چمچ پلیٹ چھری کانٹے سارے آلات جمع کرو۔" وہ خوش دلی سے بولی۔ "اور امتیاز تم یہ کیک فراز میاں کو دو تا کہ وہ ٹیبل سیٹ کریں۔ ماہدولت اسے خود کاٹیں گی۔"

"ٹھیک ہے میڈم۔" فراز، امتیاز سے کیک لے کر ڈائننگ ٹیبل کی طرف مڑا۔ عاطف اس دوران وہاں سے لیپ ٹاپ وغیرہ ہٹانے لگا اور فردوس پلیٹیں رکھ رہی تھی۔ نسا صوفے سے کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ ڈائننگ ٹیبل کی طرف مڑی ہی تھی کہ اس کا فون بج اٹھا۔

[illegible]۔ وہ فون ہاتھ میں لیے لاؤنج کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اندر اکثر اوقات سگنلز کا مسئلہ ہو جاتا تھا جس کی وجہ سے آواز ٹوٹ ٹوٹ کر بالکل ایسے آتی جیسے فون کرنے والا چاند سے بول رہا ہو۔

''جی سرکار......'' وہ فون ریسیو کر کے بولی۔

''واہ...... موڈ بہت اچھا ہے۔'' صفدر نے جواب دیا۔

''کیوں نہیں ہوگا اگر کسی کا اتنا اچھا شوہر اس کے لیے بغیر فرمائش اس کا پسندیدہ چاکلیٹ کیک بھیجے گا تو موڈ تو اچھا ہوگا نا۔'' وہ ہنسی۔

''ہاں اتنا اچھا شوہر تو میں ہوں مگر ٹھہرو تم نے ابھی کیا کہا؟ میں نے تمہیں کیا بھجوایا ہے؟''

''چاکلیٹ کیک اور کیا؟ ابھی بیکری والا دے کر گیا ہے۔''

''نہیں...... نسا میں نے کوئی کیک نہیں بھجوایا۔ وہ کیک کہاں ہے؟ تم کہاں ہو اُسے ہاتھ مت لگانا...... گارڈ کہاں ہے؟'' صفدر اچانک وحشت زدہ سا ہو گیا تھا۔

''تم...... تم نے نہیں بھجوایا؟'' نسا کو بات سمجھنے میں دو لمحے لگ گئے تھے۔ ''کیک...... ؟ وہ تو......'' نسا نے گھوم کر لاؤنج کے آخری حصے میں رکھی ڈائننگ ٹیبل کی جانب دیکھا جہاں اس وقت گھا گہمی نظر آ رہی تھی۔ فراز کیک کا ڈبا کھول ہی رہا تھا۔

''فراز......'' نسا زور سے چلائی۔ ''مت کھولو...... ڈبے کو چھوڑ دو...... ہٹ جاؤ سب وہاں سے۔''

اس کی چیخ پر فراز اور سب ہی چونک گئے۔ امتیاز تیزی سے اس کی جانب لپکا۔ گارڈ ٹیبل کی طرف بڑھا۔ اس گڑبڑاہٹ میں فراز کے ہاتھ سے کیک کا ڈبا زمین پر جا گرا۔

زمین پر گرتے ہی ڈبا پوری طرح کھل گیا تھا اور پھر آگ کی لپک کے ساتھ دھماکے کی آواز بلند ہوئی۔ گارڈ اور امتیاز دونوں نسا کی جانب لپکے۔ وہ پہلے ہی لاؤنج کے بیرونی دروازے کے ساتھ ہی کھڑی تھی۔ گارڈ کے زوردار دھکے نے اسے برآمدے کی جانب دھکیل دیا۔

''وہاں کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیسا دھماکا تھا...... نسا...... نسا مجھے جواب دو، تم ٹھیک ہونا، یا اللہ میں کیا کروں۔'' صفدر مسلسل بولی رہا تھا۔

نسا کو اس ابتدائی دھچکے سے باہر نکلتے نکلتے چند لمحے

جیلر نے کال کوٹھری کا دروازہ کھول کر ملکھا سنگھ کو بتایا۔ ''سب تیاریاں مکمل ہیں۔ تم کو کل صبح آٹھ بجے پھانسی دے دی جائے گی۔''

ملکھا سنگھ نے یہ سن کر زوردار قہقہہ لگایا۔ ''کیسے دو گے؟ میں تو گیارہ بجے سے پہلے سو کر ہی نہیں اٹھتا۔''

اپریشن

آپریشن کے بعد ڈاکٹر نے نہایت معذرت کے ساتھ سردار بھگت سنگھ سے کہا۔ ''سر! آپریشن دوبارہ کرنا ہو گا۔ میری غلطی سے ایک دستانہ آپ کے پیٹ میں رہ گیا ہے۔''

''دستانہ کتنے میں آتا ہے؟'' سردار جی نے تیزی سے پوچھا۔

''سرجیکل دستانہ ہے۔ دو ڈھائی سو میں ملتا ہے۔'' ڈاکٹر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

''میں دے دوں گا...... نیا لے آنا۔ آپریشن کی کوئی ضرورت نہیں۔'' سردار جی نے فیاضانہ تنکی سے کہا۔

منڈی بہاؤالدین سے امتیاز احمد کی جیرت

لگ گئے تھے۔

''فراز...... عاطف، فردوس سب اندر ہیں۔'' نسا تیزی سے کھڑی ہو کر اندر کی جانب لپکی۔

''نہیں میڈم۔'' گارڈ اس کے سامنے آ گیا تھا۔ ''آپ یہاں دروازے کے قریب رہیں اور ہمیں دیکھنے دیں۔''

ذرا ہی دیر میں ایمبولینس، خاور، صفدر، پولیس سب ہی پہنچ گئے تھے۔ دھماکے سے وہ تینوں ہی زخمی ہوئے تھے مگر سب سے زیادہ چوٹ فراز کو آئی تھی۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ کوئی بہت شدید زخمی نہیں ہوا تھا اور وہ تینوں بھی ہوش میں تھے۔ انہیں ایمبولینس میں فوراً اسپتال لے جایا گیا تھا۔ نسا، صفدر اور خاور کے ساتھ لاؤنج میں داخل ہوئی۔ ڈائننگ ایریا تقریباً برباد ہو گیا تھا۔ میز کی باقیات سے اب بھی دھواں نکل رہا تھا۔ سٹنگ ایریا کو البتہ تھوڑا بہت نقصان ہوا تھا۔

''آخر انہوں نے اپنا کام دکھا ہی دیا۔'' دو گھنٹے بعد ابتدائی کارروائی سے نمٹنے کے بعد وہ سب اندر کمرے میں بیٹھے تھے۔ خاور اُن کے ساتھ تھا۔

''اللہ نے بچایا ہے مجھے بس۔'' نسا کانپتے ہوئے

صفدر کا فون آ گیا۔ تمہیں معلوم ہے نا کہ اندر سگنلز نہیں آتے ٹھیک سے، اس لیے مجھے باہر نکلنا پڑا۔ پھر جب صفدر نے بتایا کہ انہوں نے کیک بھیجا ہی نہیں ہے تو میرے تو پیروں سے زمین نکل گئی۔ میرے چیخنے کی وجہ سے ہی فراز سے وہ کیک زمین پر گرا اور پھٹ گیا۔'' وہ افسوس سے کہہ رہی تھی۔

''تمہارے چیخنے کی وجہ سے ہی وہ بچ گیا۔'' خاور سنجیدگی سے بولا۔ ''اور صفدر کے فون کی وجہ سے تم۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ یہ ہلکی نوعیت کا بم تھا۔ پیکٹ یا لفافہ وغیرہ ظاہر ہے کہ لوگ بالکل قریب سے کھولتے ہیں۔ اس قسم کے بم کھولنے والے کو شدید زخمی کر سکتے ہیں بعض صورتوں میں جان بھی جا سکتی ہے مگر اس کی طاقت نہایت کم ہوتی ہے۔ بم زمین پر گر کر پھٹا اس لیے فراز کا چہرہ سب سے بڑھ کر آنکھیں وغیرہ محفوظ رہی ہیں۔''

''اوہ......'' نسا بولی۔

''ہمارا خیال تھا کہ ہماری مسلسل کارروائیوں نے انہیں خاصا پیچھے دھکیل دیا ہے اور اب وہ کسی بڑی کارروائی کی ہمت نہیں کر سکیں گے مگر ایسا نہیں ہے۔ ان کا نیٹ ورک اسی طرح کام کر رہا ہے۔'' خاور بڑبڑایا۔ ''یہ سب نسا کو گواہی دینے سے روکنے کے لیے کیا گیا ہے اگر آج وہ اس سازش کا شکار ہو جاتی تو کسی بھی صورت میں کل گواہی نہیں دے سکتی تھی۔''

''مجھے یہی ڈر تھا۔'' صفدر کی آواز لرز رہی تھی۔ ''میں نے تم سے کہا تھا کہ یہ بہت خطرناک لوگ ہیں، ہم ان سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مجھے تمہاری بات سننا ہی نہیں چاہیے تھی اور تمہیں تیمور کے پاس بھیج دینا چاہیے تھا مگر اب میں یہی کروں گا...... خاور، نسا گواہی نہیں دے گی۔''

''نہیں صفدر...... تم گھبراؤ نہیں...... مجھے کچھ نہیں ہو گا۔ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہوتا ہے اور پھر ہمارا ایمان ہے نا کہ جو رات قبر میں طے ہے وہ باہر نہیں ہو سکتی۔'' نسا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''مجھے بھی ڈر لگ رہا ہے صفدر بلکہ پہلے.... زیادہ لگ رہا تھا۔ آج ان کی ناکامی نے میرا حوصلہ بڑھایا ہے۔ میں شہباز کے خلاف گواہی ضرور دوں گی، انشاء اللہ۔'' وہ یقین سے بولی۔ ''روزینہ نے اپنی آخری سانسوں میں اپنا دکھ میرے حوالے کیا تھا۔ میں اس کے ساتھ دغا نہیں کر سکتی۔ شہباز اب دوبارہ آزاد

☆☆☆

نسا اس سے قبل بھی مختلف کاموں سے عدالت آ چکی تھی۔ اس کی تنظیم عورتوں کے حقوق کے لیے کام کرتی تھی۔ اس حوالے سے کورٹ اور پولیس سے ان کا واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ عدالت کا مخصوص ماحول، لوگوں کا رش، جیل کی گاڑیاں، ہتھکڑی اور بیڑی لگے ملزمان یہ سب اس کے لیے بالکل نیا منظر بہرحال نہیں تھا مگر آج کورٹ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کا دل لرز رہا تھا۔

اس مقدمے کے کئی گواہ غائب ہو چکے تھے۔ مختصر سی مدت میں استغاثہ کا ایک وکیل حادثے کا شکار ہو کر اور دوسرا ذاتی وجوہات پر کیس چھوڑ چکا تھا۔ اگر ڈی ایس پی خاور اور پولیس ڈپارٹمنٹ کے پاس مضبوط ثبوت نہ ہوتے تو اب تک شہباز کو ضمانت بھی مل چکی ہوتی۔

سماعت تھوڑی تاخیر سے شروع ہوئی تھی۔ نسا دوسری قطار میں خاور اور صفدر کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی۔ چند لمحوں میں شہباز کو کٹہرے میں لا کر کھڑا کر دیا گیا۔ اس نے آتے ہی نسا کی طرف دیکھا۔ وہ اسے دیکھ کر ایک لمحے کو حیران سا ہوا تھا جیسے اسے اس کے یہاں نہ آنے کا یقین ہو۔ اس کی دوسری نظر دھمکی اور نفرت سے بھرپور تھی۔ نسا ایک لمحے کے لیے خوف زدہ سی ہو گئی تھی مگر پھر اس نے گھور کر اسے دیکھا اور مسکرا دی۔ اسی دوران استغاثہ کے وکیل کے ابتدائی بیان کے بعد شہباز کا وکیل اٹھ کھڑا ہوا۔

''می لارڈ جو کچھ ابھی میرے دوست نے کہا ہے وہ کسی فلمی کہانی سے کم نہیں ہے۔ ان کے مطابق میرے موکل نے اپنی بیوی پر ظلم و ستم کیا اور اسے جلا کر مار دیا اور پھر اس کے ساتھ ساتھ میرا موکل ایک قاتل ہے پیسے لے کر لوگوں کو قتل کرتا ہے اور دہشت گردوں کا ساتھی ہے اور نہ جانے کیا کیا...... جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے می لارڈ......''

''آپ کے موکل کا اقبالی بیان عدالت میں موجود ہے وکیل صاحب۔'' استغاثہ کے وکیل نے بولنے کی اجازت پا کر کہا۔ ''شاید آپ اسے پڑھ نہیں پائے ہیں۔ اس کے علاوہ پولیس کے پاس شہباز کے خلاف کئی ثبوت موجود ہیں جن میں اسلحہ کی ڈیلنگ اور قتل و غارت گری کی کئی وارداتوں کے علاوہ دہشت گردوں کی سہولت کاری بھی شامل ہے۔''

''می لارڈ! پولیس اقبالی بیان کیسے لیتی ہے یہ سب جانتے ہیں۔'' وکیل بڑے انداز سے بولا۔

[illegible]
ہو رہا ہے؟'' جج نے پوچھا۔
''می لارڈ وہ بیان تشدد کے زور پر لیا گیا تھا۔ دراصل میرا موکل کسی غلط کام میں ملوث نہیں ہے...... نہیں میں یہ نہیں کہہ رہا کہ پولیس کی تحقیقات غلط ہیں۔ میں ایسا کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ مسئلہ یہ ہے سر کہ یہاں یہ ساری غلط فہمی صرف نام کی وجہ سے ہوئی ہے۔ یقیناً وہ کوئی اور شہباز ہوگا جس کے گناہوں کی گٹھری اس شہباز کے سر باندھی جا رہی ہے اور ایسا پہلی بار نہیں ہو رہا۔ پولیس پر کام کا بوجھ اتنا ہے کہ وہ اس غلطی کو دہراتی رہتی ہے۔'' اس کے ان الفاظ پر عدالت میں ہنسی کی ہلکی سی آواز گونجی۔ خاور کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا مگر وہ خاموشی سے بیٹھا تھا۔
''اور آپ کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ وہ شہباز نہیں ہے؟'' جج نے تحمل سے پوچھا۔
''می لارڈ! یہاں مقدمے کی ابتدا ایک عورت کے بیان سے شروع ہوئی ہے جسے میرے موکل کی بیوی بتایا جا رہا ہے مگر اب میں جس گواہ کو پیش کرنے جا رہا ہوں وہ اس مقدمے کا رخ ہی بدل دے گا۔''
''پیش کیجیے۔'' جج کی آواز پر نسا بھی سنبھل کر بیٹھ گئی۔
گواہی کے کٹہرے میں ایک عورت داخل ہو رہی تھی۔ اس کا رنگ گورا تھا عمر یہی چوبیس پچیس کے لگ بھگ تھی۔
''بی بی آپ کا نام کیا ہے اور آپ کا اس شخص سے کیا تعلق ہے؟'' حلف لینے کے بعد وکیل نے اس عورت سے پوچھا۔
''وکیل صاحب وہ میرا گھر والا ہے میرا نام روزینہ ہے۔'' اس کے الفاظ بم کی طرح نسا کی سماعت پر گرے تھے۔
''یہ جھوٹ بول رہی ہے۔'' وہ سوچے سمجھے بغیر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی۔
''میڈم آپ کو جو کہنا ہو، وہ آپ گواہ کے بعد یہاں باکس میں آ کر کہہ سکتی ہیں۔'' جج کے بولنے پر وہ بیٹھ گئی۔
اس عورت کے بیان کے مطابق ان کی شادی کو کئی سال ہو گئے تھے اور ان کے درمیان بھی کوئی جھگڑا تک نہیں ہوا تھا۔
اس کی گواہی اور جرح کے بعد ایک اور گواہ نے اُن دونوں کے میاں بیوی ہونے اور ساتھ رہنے کی گواہی دی تھی

[illegible] کے لیے بنایا گیا۔
شہباز نے جب سے اسے دیکھا تھا وہ خاصا بے چین نظر آ رہا تھا۔ اسے کٹہرے کی طرف جاتے دیکھ کر اس کی وحشت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کا وکیل دھیمے لفظوں میں اسے کچھ سمجھا رہا تھا۔
حلف اور نسا کے بیان کے دوران وہ کٹہرے میں کھڑا ہاتھ ملتا رہا تھا۔ استغاثہ کے سوالات کے بعد وکیل صفائی اس کی جانب بڑھا۔
''مس نسا آپ شہباز اور اس کی بیوی کو کتنے عرصے سے جانتی ہیں؟''
''اتنے عرصے سے کہ اسے بہ آسانی شناخت کر سکتی ہوں وکیل صاحب۔'' وہ بولی۔
''پھر بھی سال...... دو سال......؟''
''چھ ماہ۔'' وہ بولی۔ ''آپ نے شاید سنا نہیں میں نے اسے سڑک پر روزینہ کو مارتے دیکھ کر تھانے میں بند کرایا تھا۔ اس کے بعد یہ مجھ سے معافیاں مانگ کر تھانے میں باقاعدہ معافی نامہ درج کرا کر آزاد ہوا تھا جس کا پورا ریکارڈ عدالت کے پاس موجود تھا۔ اس کی بیوی روزینہ کئی روز میرے پاس رہی تھی۔ میں ان کی شناخت میں غلطی نہیں کر سکتی۔'' اس کے انداز پر وکیل کے چہرے کا رنگ ہلکا پڑ گیا تھا۔
''آپ جو کہانی لائے ہیں، وہ خاصی بچکانا ہے وہ بھی اس صورت میں جبکہ میں یہاں موجود ہوں۔'' اس کی اس بات پر وکیل نے مڑ کر شہباز کی جانب دیکھا جیسے نسا کی یہاں موجودگی اس کا قصور ہو پھر دوبارہ اس کی طرف مڑا۔
''غلطی یا ابہام کسی سے بھی ہو سکتا ہے میڈم۔ لوگوں کی شکلیں بھی بعض اوقات آپس میں ملتی ہیں جس سے یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے جس تھانے کی آپ بات کر رہی ہیں گزشتہ سماعت میں اس کا محرر عدالت میں تسلیم کر چکا ہے کہ میرے موکل کی شکل اس شخص سے ملتی ہے جس کا آپ ذکر کر رہی ہیں مگر وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ وہی شخص ہے۔''
''میں پورے یقین سے کہہ رہی ہوں کہ یہی شہباز ہے اور روزینہ وہی تھی جس نے میری آنکھوں کے سامنے اسپتال میں دم توڑا تھا۔'' نسا نے ملائمت سے کہا۔
''اور می لارڈ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہی وہ شخص ہے جو دہشت گردی کے واقعات میں ملوث ہے۔ اسلحہ کے ایک بڑے نیٹ ورک کا حصہ ہے۔ میرے فاضل دوست اس کی

شناخت کو مسئلہ بنا کر عدالت کا کافی وقت اور تاریخیں ضائع کر چکے ہیں۔ اب مشہور سماجی ورکر میڈم نسا کی گواہی کے بعد اس میں کوئی شک باقی نہیں بچتا کہ یہی شہباز ہے۔'' وکیل استغاثہ نے کہا اس کے ساتھ ہی اس نے چند کاغذات جج صاحب کی خدمت میں پیش کیے۔ شہباز دزدیدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

غصے سے اُس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔

اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اس بکواسی عورت کا گلا دبا دے۔ صرف اس کی وجہ سے اس کا سارا منصوبہ خاک میں ملتا نظر آ رہا تھا۔ اس کی وجہ سے ہی اسے زندگی میں پہلی بار تھانے کا منہ دیکھنا پڑا تھا اس نے تو اسی وقت یہ طے کر لیا تھا کہ وہ روزینہ اور اسے دونوں کو نہیں چھوڑے گا مگر پھر پولیس کے درمیان میں ہونے اور خصوصاً اس انسپکٹر اکرم کی وجہ سے اور ساتھیوں کے سمجھانے کی وجہ سے اس نے اسے چھوڑ دیا۔ یہی اس کی سب سے بڑی غلطی ہے۔ اگر تب ہی اس کے سر میں ایک گولی اتار دیتا تو آج یہ سب نہ ہو رہا ہوتا۔ اس نے مٹھیاں بھینچیں۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک جا رہا تھا۔ اس کے ساتھی تمام گواہوں کو بدل چکے تھے۔ اس کے وکیل نے اسے بچانے کے لیے بہترین پینترا اختیار کیا تھا مگر اس کا کچھ نہیں ہو سکا تھا۔ اسے اپنے ساتھیوں داور، بشیر اور آفاق پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ ایک عورت کی زبان بند نہیں کرا پائے تھے۔

''جی جج صاحب میں پورے ہوش و حواس میں یقین سے کہتی ہوں کہ یہی شہباز ہے۔'' اس کی آواز برمے کی طرح اس کے دماغ میں گھسے جا رہی تھی۔ ''میرے پاس ایک ثبوت اور بھی ہے جج صاحب۔'' نسا کے ان الفاظ پر اس نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ ''میں عدالت سے معافی چاہتی ہوں مگر اس کا خیال میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔'' وہ اب براہِ راست شہباز کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ ''جب میں کمرائے عدالت میں داخل ہوئی تب مجھے یاد آیا کہ جس روز شہباز اور اس کا ایک ساتھی انسپکٹر اکرم کے ساتھ میرے دفتر آئے تھے اور روزینہ ان کے ساتھ گئی تھی۔ اس وقت میرے دفتر کے ایک ساتھی نے یادگار کے طور پر اپنے موبائل سے کچھ تصاویر اتاری تھیں۔'' وہ ڈرامائی انداز میں کہہ رہی تھی۔ ''میں نے وہ موبائل منگوالیا ہے۔ اور میں اسے آپ کی خدمت میں پیش کر رہی ہوں۔ اس سے آپ کو میرے بیان کی صداقت کا یقین آجائے گا۔''

اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی شہباز کا دماغ بھک کر کے اُڑ گیا تھا۔ اس عورت نے اسے برباد کر دیا تھا۔ غصے کی شدت میں وہ سب کچھ بھول گیا اور زور سے چلایا۔ ''مجھے تجھے اسی دن ختم کر دینا چاہیے تھا۔ یہی میری سب سے بڑی غلطی ہے مگر آج میں اس غلطی کو درست کر کے رہوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ کٹہرے سے باہر نکل کر نسا کی جانب لپکا۔

کمرائے عدالت میں ایک دم ہنگامہ سا مچ گیا تھا۔ کانسٹیبل اور پولیس کے لوگ شہباز کو پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جج صاحب زور زور سے اپنا ہتھوڑا بجا رہے تھے۔ خاور اور صفدر بھی نسا کی طرف دوڑے تھے۔ شہباز پولیس والوں کو جھٹکتا ہوا لمحے بھر میں نسا کے سر پر پہنچ گیا تھا اور اس نے اس کی گردن کو اپنے طاقتور ہاتھوں میں جکڑ لیا تھا۔

''خدائی فوجدار ہے، عورتوں کی وکیل ہے، آج میں تیرا قصہ تمام کر دوں گا۔'' غصے میں اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ وہ اتنا بپھرا ہوا تھا کہ چار پانچ افراد کے کھینچنے کے باوجود وہ کسی کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔

''اسے چھوڑ دو شہباز ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گا۔'' خاور جیب سے پسٹل نکالتا ہوا بولا۔

اس کے ہاتھوں کی گرفت اتنی سخت اور جان لیوا تھی کہ لمحے بھر میں نسا کو یوں لگا تھا کہ وہ بچ نہیں پائے گی۔ اردگرد چیختی چلاتی آوازیں آہستہ آہستہ دور ہوتی جا رہی تھیں۔ سانس لے پانا گویا اس کے لیے زندگی کی سب سے بڑی تمنا ہو گئی تھی۔ اس کے گلے سے سینے تک خراشیں پڑ گئی تھیں اور یہ خراشیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ پھر ایک دھماکا سا ہوا اور نسا کے اردگرد اندھیرا چھا گیا۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تو بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ ''نسا......'' صفدر کی آواز اس کے ذہن کو خاموش اندھیروں سے روشنی کی طرف لے آئی۔

''صفدر......'' وہ بمشکل بول پائی۔ اسے نہ صرف سخت کمزوری کا احساس ہو رہا تھا بلکہ بولتے ہوئے گلے میں بھی درد محسوس ہو رہا تھا۔

''نسا...... تم بالکل ٹھیک ہو، بالکل مت ڈرو۔ ہم یہاں اسپتال میں ہیں۔'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

''اس نے...... اس نے تو مجھے مار ہی دیا تھا۔'' وہ اپنی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ گردن پر اسے موٹی

ہی ابھری ہوئی لکیریں محسوس ہوئی تھیں جنہیں چھونے سے بھی تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔

"وہ تمہیں نہیں مار سکا تھا مگر خود گھٹتے کی موت مارا گیا۔" صفدر نفرت سے بولا۔ "بہت ہی عجیب شخص تھا وہ بندہ..... پولیس والے، ہم سب اسے کھینچ رہے تھے۔ راڈوں اور کرسیوں سے مار رہے تھے مگر وہ تمہیں چھوڑ ہی نہیں رہا تھا۔ بالآخر اسے ڈیوٹی پر موجود انسپکٹر نے گولی مار دی۔ موقع پر ہی مر گیا ہے۔ عدالت تو شاید اسے چھوڑ دیتی یا قید کی سزا دیتی مگر اس نے خود ہی اپنے لیے موت کی سزا چن لی۔"

"تو مر گیا وہ۔" نسا آنکھیں بند کرتے ہوئے بولی۔ اس کی نظروں کے سامنے روزینہ کا تکلیف سے کھنچا ہوا چہرہ آ گیا تھا۔

"مجھے بھوک لگ رہی ہے صفدر۔" وہ چند لمحوں بعد بولی۔

"تم ایک دو دن تک زیادہ سخت چیزیں نہیں کھا پاؤ گی۔" وہ اس کے بال درست کرتے ہوئے بولا۔

"اور اس کے بعد بھی آپ کو اپنے کھانے پینے کا مکمل چارٹ بنانا ہوگا اور اس معاملے میں نہایت محتاط رہنا ہوگا۔" ڈاکٹر سعدیہ، صفدر کی کولیگ تھیں۔ ان کے ہاتھ میں کچھ کاغذ تھے اور وہ مسکرا رہی تھیں۔

"کیا مطلب؟" صفدر کھڑے ہوتا ہوا بولا۔ "ڈاکٹر سعدیہ آپ یہ کیوں کہہ رہی ہوں کیا خدانخواستہ کوئی کمپلی کیشن ہے؟"

"بالکل ہے اور اس کی وجہ سے آپ کی بیگم کو لمبے عرصے تک آپ کی خاص توجہ درکار ہوگی۔"

"وہ تو ان کے لیے ہے ہی..... پلیز مجھے یہ فائل دیں۔" صفدر کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی تھی۔

"یہ فائل میں آپ کو دینے ہی آئی ہوں مگر ڈاکٹر صفدر یہ آپ کو ایسے تو نہیں ملے گی۔" وہ شرارت سے مسکرائیں "آپ کو ہم سب کو ایک بہت اچھا لنچ کرانا ہوگا کیونکہ اس فائل میں آپ کے لیے ایک بہت بڑی خوش خبری موجود ہے۔ آپ کی مسز ماں بننے والی ہیں۔"

"واقعی۔" صفدر زور سے بولا پھر اس نے اس کے ہاتھ سے فائل لی اور مسکرا کر نسا کو دیکھا جو اسے بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔

"نسا..... وہاں سے مہربانی کا کرم ہو گیا ہے۔" وہ خوشی سے بولا۔ "دینے والے نے جھولی بھر دی ہے۔"

نسا نے طمانیت سے بھرپور احساس کے ساتھ آنکھیں بند کیں، وہ بہت زیادہ خوش تھی اتنی کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

تھوڑی دیر میں کمرے میں جشن کا سا ماحول ہو گیا تھا۔ صفدر نے امی اور ڈیڈ کو بھی فون کر دیا تھا۔

"میں تم سے..... بہت خوش ہوں نسا اور جو کچھ گزرا اسے سن کر بہت پریشان ہوئی ہوں۔ خدا نہ کرے تمہیں کچھ ہو جاتا تو ہم کیا کرتے اور تم نے ہمیں اتنا کچھ ہونے پر بھی خبر تک نہیں کی۔" امی اسے مبارک باد بھی دے رہی تھیں اور ڈانٹ بھی رہی تھیں۔

"امی سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ مجھے خود نہیں سمجھ آ رہی تھی کہ میں کیا کروں مگر اب سب ٹھیک ہو گیا ہے۔" وہ بولی۔

"شکر ہے اور اب اللہ نے اتنی بڑی خوش خبری بھی دے دی ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ اب تم اور صفدر وہاں اپنے سب کاموں کا وائنڈ اپ کر دو۔"

"کیا مطلب امی.....؟" نسا کو گویا حیرت کا جھٹکا سا لگا۔ "بچہ ہونے کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ میں سب کام چھوڑ دوں۔"

"میں یہ نہیں کہہ رہی بے وقوف..... بلکہ یہ کہہ رہی ہوں کہ اب وہاں کام ختم کر کے تم لوگ بھی کینیڈا آ جاؤ۔ پاکستان کے حالات تم سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے تم اپنے بچے کو ان مشکل حالات میں رکھنا تو نہیں چاہو گی نا.....؟"

"امی یہ ممکن نہیں ہے۔" وہ چند لمحوں بعد ملائمت سے بولی۔ "پاکستان میں مشکلات ہیں لیکن یہ تو ہمارا ملک ہے نا اگر ہم ہی اپنا گھر اس لیے چھوڑ دیں گے کہ ہم اسے اچھا نہیں کر سکتے تو پھر کون کرے گا؟"

"بیٹا یہ کتابی باتیں ہیں۔"

"نہیں امی، ان چند دنوں میں تو مجھے اپنے ملک سے محبت کا پہلے سے کئی گنا زیادہ احساس ہوا ہے۔ یہاں اچھے لوگوں کی تعداد کو بڑھنا چاہیے تب ہی تو برے منتر کا سحر ختم ہو گا اور ہر طرف امن ہوگا۔" وہ بات ختم کرتے ہوئے بولی۔

"بس تو پھر طے ہو گیا۔" صفدر اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

"کیا....." نسا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"اگر بیٹا ہوا تو اس کا نام 'امن' رکھیں گے اور بیٹی ہوئی تو اس کا نام 'سکون' ٹھیک ہے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔" وہ مسکرا دی۔